

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ  
سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2016

گلشنِ وفا  
معراجِ رسول



AUG-2016 PRICE RS. 60/-

REGD. NO. MC-II

DIGEST

Monthly Suk

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM





07

غیر حلال سے ایک  
صاحب دل کا توحہ الم



08

ایک کے خط  
مدیر اعلیٰ



61

تنویر ریاض  
لفظوں کی بھیڑ میں محبت کی  
چاشنی سے دور ایک مصنف کا احوال



107

ذاکٹر عبد الرب بھٹی  
دل کے ٹکڑے کرنے والے کے ہاتھوں  
دل کے ٹکڑے کی پامالی کا توحہ



155

علی اختر  
ایک بلیک میلر کی خباثت کی  
شرانگیزی اور عبرت ناک انجام



16

الیاس سینا پوری  
ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار  
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



70

اسماء قادری  
اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف مہر سطرنگ  
بدلتی واردات قلبی کی عکاسی دلچسپ داستان



124

حکمرانی  
ملک صندر حیات  
حکمرانی پرانے کے یقین اور دل سے محنت  
کرنے والے ایک پولیس آفیسر کی ہمت کی کہانی

جلد 46 • شمارہ 08 اگست 2016 • زیر سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 (021) 35802551 فیکس: (021) 35802551 E-mail: jdpgroup@hotmail.com



## محفل شعروں کا

168

قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ  
آپ کی پسند، آپ کے ذوق کے ہم آہنگ

## دھماکا

171

عظیم جمال

ایک دوسرے کو پانے کی تمنا میں فتنے  
ہو جانے والے عاشقوں کا قصہ

## آگ کا دیبا

225

منظر امام

عشق میں مریبلند کرنے والے ایک  
معصوم عاشق کی کار فرمائیاں

## مارگو کی

176

محی الدین نواب

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی  
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ

## دھونک

243

سلیم انور

محبرمانہ بساط پر قانون کی چالیں  
چلنے والے کچھ مہم دارا افسران کا قصہ

## شیخ الحدیث کی زندگی

231

عباس نسیم لکڑمی

اللہ پر توکل کرنے والے ایک  
متوکل علی کی مستقل مسزاجی

## کتریں

000

ادارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکے،  
اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

## اسیر خیال

248

کاشف زبیر

معاشرتی رشتوں اور فستائونی اداروں  
کے مابین زخمی مسافتوں کی پراثر داستان

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور-C-63 فیز آئی ایکس لینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500  
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی





محترم قارئین  
السلام علیکم!

اگست 2016ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ ہر سال جب 365 کا دائرہ مکمل ہوتا ہے تو مختلف انداز سے تاریخی لمحات و واقعات کی یاد منانے کا اہتمام بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے۔ واقعے کی مناسبت سے کچھ ارادے، وعدے اور دعوے بھی کیے جاتے ہیں مگر وہ شاید وقتی جوش و جذبات میں کہے گئے فقط الفاظ ہی ہوتے ہیں جن پر عمل کرنے کی نیت ہرگز نہیں ہوتی۔ اسی تناظر میں لیجئے جناب 14 اگست کے تاریخی لمحات 2016ء میں بھی اپنی اہمیت کا احساس دلارہے ہیں مگر کون ہے جو ان دکھوں اور قربانیوں کی لاج رکھے جن کے بدلے یہ سرزمین ہمارے حصے میں آئی اور ہم اپنے حصے کا حق ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ مضبوط معیشت، پرسکون ماحول، اعلیٰ تعلیمی معیار، بے روزگاری کا خاتمہ، اچھے دنوں کی آس اور دہشت گردی کا خاتمہ سب دیوانے کا خواب ہیں شاید جن کے متعلق مانگ پاتھوں میں لے کر با اختیار طبقہ کہتا اور سمجھاتا تو پھر تا ہے مگر خود سمجھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں..... کیا امجد صابری قوال کا دن وہاں ٹرے، ہیما نہ قتل ان دعوؤں کی نفی نہیں کر رہا جو آئے دن عوام سے کیے جاتے ہیں۔ اس سال چھ ماہ کے عرصے میں 160 دہشت گردی کی وارداتیں کیا ہمارے لیے لمحہ فکریہ نہیں ہیں؟ صرف ایک واقعے سے دوسرے واقعے کے درمیان آجانے والے خاموش وقفے کو ہم ملک میں امن و امان کی صورت حال کو بہترین قرار دے کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ نہ تو قائد اعظم محمد علی جناح کا یہ مقصد حیات تھا اور نہ ہی شاعر مشرق کا یہ خواب اور نہ ہی ان مظلوم معصوم اور سادہ لوح پر خلوص لوگوں کی قربانیوں کا یہ حق ادا کیا جا رہا ہے۔ کراچی میں پے در پے ایسے واقعات سیکورٹی کے حوالے سے ایک سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔ جب تک فتنے داران نیک نیتی اور پختہ عزم کے ساتھ دہشت گردی اور بھتاخوری کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے تب تک ایسی وارداتیں ہوتی رہیں گی لیکن افسوس اس ”نیک نیتی“ کا ہی تو فقدان ہے ہمارے ہاں۔ ویسے بھی دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کے خلاف قدم اٹھانا کسی ایک فرد یا ادارے کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ہر طبقہ فکر کے ساتھ مل کر سیاست دانوں کو بھی اقدامات کرنا چاہئیں۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مضبوط حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔ رمضان المبارک میں جہاں یہ حادثہ پیش آیا وہیں ذمہ داران کے دعوؤں اور وعدوں کی قطعی بھی مکمل گئی۔ بہت دعوے سے وعدہ کیا گیا تھا کہ بحر اور افطار کے دوران لوڈ شیڈنگ بالکل نہیں ہوگی اور ہوا کیا..... خاص طور پر انہی اوقات کو ہدف بنا کر معصوم لوگوں کو کتنی اذیتوں سے دوچار کیا گیا۔ چھ ماہ کے وعدے سے لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ کرنے والوں کو آج تقریباً تین سال ہو چکے مگر آج بھی یہی نعرہ زندہ ہے کہ ”بہت جلد لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ وقت دور نہیں جب ملک سے اندھیرے چھٹ جائیں گے اور پورا ملک روشن ہوگا۔“ یہ کیسا اسلامی ملک ہے جہاں انسانیت کی قدر ہے اور نہ ہی اسلامی جہواروں کا خیال کیا جاتا ہے۔ طبقہ اشرافیہ کو اپنے وسائل سے لطف اندوز ہونے سے فرصت نہیں اور باقی طبقات اپنے اپنے دائرے میں عزت اور تحفظ سے جینے کی گویا جنگ میں مبتلا ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ صرف دن منانے سے کچھ نہیں ہوتا..... خلوص کے ساتھ عملی اقدامات کی شدت سے ضرورت ہے۔ اگر اب بھی سنجیدگی سے مثبت رویہ اختیار نہ کیا گیا تو مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا..... عید کی گہما گہمی اور موسم کی گرما گرمی سے فراغت کے بعد اب چلتے ہیں اپنی نٹ کھٹ سی محفل کی جانب جہاں نئے نئے سند لیے ہمارے منتظر ہیں۔

✽ قیصر اقبال کچے بکول، ضلع بھکر سے محفل کی رونق بن رہے ہیں ”کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر سے اپنی محفل میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے مگر اس مصروف زندگی میں بھی اگر زندگی کا محور ہمارے گرد گھومتا ہے تو مینے کا محور سپنس کے گرد گھومتا ہے۔ 2016ء کا ساتواں شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی ماہ جبیں حیران اور کھوئی کھوئی سی ہے۔ شاید کراچی کی ٹھنڈی آب و ہوا سے پنجاب کی گرم آب و ہوا میں آگئی ہے (ارے صاحب اب کراچی کی آب و ہوا میں ٹھنڈک کہاں..... آگ ہی آگ ہے) چلو سانو کی۔ انشائیہ حقیقت حال کا لب لباب یہ ہے کہ ہم سوالوں کے آدی ہیں اور جوابوں سے ہماری جھولی خالی ہے۔ اپنی محفل میں محمد خواجہ صدارت کے منصب پر نظر آئے۔ مبارک باد۔ اشفاق شاہین کو ان کے حال پر چھوڑا تو ہیلو ہائے کی تحریم شاہ سے مگر موصوفہ کو ٹائٹل گرل کی جیولری کے چکر میں پایا تو ہم قاسم رحمان کو چکر دے کر زرین آفریدی کے پاس جا ٹھہرے۔ موصوفہ کو بے انتہا باتونی پایا تو ان کو ان

اگست 2016ء

سپنس ڈائجسٹ



# ایک آرزو

انشائیہ  
جون ایلیا

میں جگہ کرتا ہوں، میں لہو میں تھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بڑی طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے ان جانے ہنرمندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفاکی سے لتاڑا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے اجاڑا ہے۔

”جون ایلیا ایہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔“  
”ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ تھا، وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہونے جارہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دکھ بھینکنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خورد کھجوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔“  
”ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پھپھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں۔ اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روزیہ طلب کروں گا؟“

”تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمہارا روگ بھی عجیب ہے۔“  
”ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجیب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔ میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پاسکتا۔“  
”تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پاسکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟“

”ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں ہمارا مقوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہ میری بود و بود ہے۔ ہماری بود و بود ہے۔“  
”لوگو! کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیت مانی کے ساتھ تڑپا یا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے لہو سے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون، میں کوئی بھی تو نہیں ہوں۔ یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!“

”میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرہ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرنوشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار روتا یا جائے؟“  
”ہاں، تمہاری سرنوشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار روتا یا جائے۔“

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا جھگڑا تھا کہ وہ نے جھگڑا ہوگا جیسا جھگڑا تم نے جھگڑا۔ مجھے تمہارا ہونا، ہر لمحہ ہونا بہت ہی اولوا و لوگ تھا ہے، بہت ہی اولوا و لوگ کہ ہوا اور ہرگز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بلا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا کھن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردائیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے نواگرا میر خسر داس کھن اور اس آہنگ کو سننے تو کتنے چاؤ سے سر دھنتے!

”اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیار دار کون؟“  
”اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیار دار کون..... یہی تو کہنا تو نے؟“  
”ہاں، میں نے یہی کہا اور اپنی اس کہن کو سہا۔“

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیار دار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پر اس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادر یوں کی برادری کا شہر ہے۔

”اے شہر! یہ میرا ہی نے یہ رولٹم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دکھ سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے چوٹے بھی سوچ گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیت سے لہکان رکھتے ہیں۔ تیری گھٹیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے لٹھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے، میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اٹھاؤں؟“  
”میں تجھے صبح سے تازہ دم و کھنچا ہوتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کے سنتا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تو بہت بار امارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو بھی نہ ہارنا۔“



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

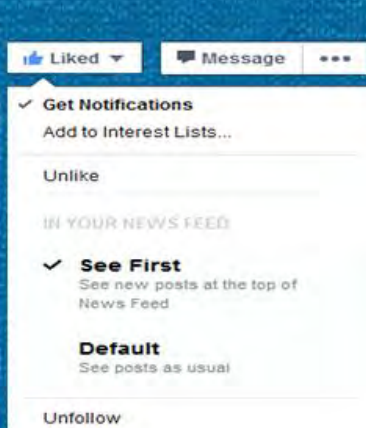
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**







کی ہی باتوں کا چکر دے کر ہم اور بیس خان کی نظر بچا کر صادق معاویہ سے جا ملے مگر موصوف کو احتجاج کرتا دیکھ کر حافظ شعیب، عبادت کاظمی اور بشیر ایاز کو ان کے پاس چھوڑا اور خود صفدر معاویہ کو ساتھ لے کر مر جاگل کے پاس جا ٹھہرے۔ احتجاج سے جان بچا کر نکلے تھے تو یہاں مر جاگل صاحبہ دھرنے کی تیاری میں تھیں۔ وارث ملاح، عبدالغفار اور پاشا انکل کو دھرنے میں بٹھایا اور دور سے ہی عبدالجبار صاحب کو سلام کیا۔ بلیک ہول کے قیدیوں کے ساتھ اظہارِ افسوس کیا۔ کہانیوں کا رخ کیا۔ ابتدا شیش محل سے کی۔ ہنگاموں سے لبریز اس قسط میں فاروق بملہ بھائیہ کے اہم راز سے واقف ہو چکا ہے۔ رہن واداک کی عارف سے ملاقات بھی خوب رہی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ مرحوم نواب انکل کی ماروی بھی اپنے جوہن پر ہے۔ مراد، زیب النساء اور ہم زاد کی ہنگاموں بھری زندگی میں پیدا ہونے والی بچی کی صورت میں کچھ انوکھے باب کھلنے والے ہیں۔ حکایت سودوزیاں آخری صفحات کی ایک بہترین کہانی مگر انجام تشدد سا لگا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ دس سال کا چپ لگا کر سیف الدین کے بچوں کو بھی کامیابی کے تخت پر بٹھادیا جاتا۔ (زندگی میں سب کچھ ویسا تو نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں) بیگ صاحب کا پہلا ہتھکڑیاں نشانے پر لگا اور جہاں وہ اپنے مؤکل عرفان کو بچانے میں کامیاب ہوئے، وہاں اصل قاتل جواد حسین بھی ان کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ محبت اور فاصلے میں بہر ادا نے دو پیار کرنے والوں کو ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تویر ریاض کی دام میں میری کی موت کا دکھ ہوا مگر ایڈورڈ اپنی زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے قاتل کو بے نقاب کر گیا۔ امانت آج کے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت، بانو اور کریم دادا سی انجام کے مستحق تھے۔ سویٹر گرل میں جونی شیرل کے ہاتھوں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔ عزت کا سوال میں دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے والے رئیس کی اپنی عزت کسی کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ داستان گوگٹوں کی..... بے شک گونگا بن جانے میں ہی عاقبت ہے۔ گم شدہ اور مات بھی خوب رہیں۔ اللہ کے ولی فضل رحمن کے ایمان افروز واقعات دل کی دنیا کو منور کر گئے۔ ابتدائی صفحات پر بیشت زار کا اختتام کیا۔ عروج کو زوال آیا اور خورشاہ، جبار اور اسد قبر کی مٹی کی خوراک بنے۔ کترنوں سے محفوظ ہوئے تو محفل شعر و سخن میں اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔ مجموعی طور پر جولائی کا شمار بہترین رہا۔“ (مجموعی طور پر آپ کا تبصرہ بھی شاندار رہا)

صادق معاویہ سعیدی، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تشریف لائے ہیں۔ جولائی 2016ء کا سسپنس لینے کو کتنی دوپہر میں بک اسٹال پر گئے۔ سسپنس مل گیا۔ قرار آ گیا۔ واپس اپنی شاپ پر پہنچے تو بجلی غائب، شدید گرمی، ایک ہاتھ میں ڈائجسٹ دوسرے ہاتھ میں ہمت فین (ہاتھ کا پنکھا) دل کی اتھاہ گہرائیوں سے..... واپڈا کے لیے اور نظریں سرورق پُر سرورق کی دوشیزہ، پیکر غیرت نسوانی عذرا ہاشمی اور مونا رضوان کی منظر محسوس ہوئی۔ فہرست پر نگاہ ڈالی اور پیارے کاشف زبیر کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے آپ کا ادارہ پڑھا۔ مختلف ایام پر نمود و نمائش کے لیے کیے جانے والے بے تحاشا اخراجات۔ اگر متعلقہ معاملہ سدھارنے پر دیانت داری سے خرچ کیے جائیں تو معاملات بہت بہتر ہو سکتے ہیں۔ اپنی محفل میں آئے تو محمد خواجہ کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ سوا لاکھ مبارکات۔ بڑی باریک بینی اور عرق ریزی سے لکھا تبصرہ صدارت کا حقدار تھا۔ بہت خوب جناب اور وزارت اشفاق شاہین کے نام۔ پہلے تو لو، پھر بولو کے مصداق چنییدہ الفاظ کے ساتھ مختصر تبصرہ۔ کیا کہنے اشفاق شاہین جی اور سفارت تحریم شاہ کے حصے میں آئی۔ ایگزامز کی مصروفیت کے باوجود سسپنس پر جاندار اور منفرد انداز کا تبصرہ ہمیں تو بہت اچھا لگا۔ عبادت کاظمی اللہ کریم آپ کے والد گرامی کی مغفرت فرمائے اور آخرت کی تمام منزلیں آسان فرمائے (آمین) اور اپنے ہی شہر سے حافظ شعیب معاویہ کی تشریف آوری جن آون، انکھیں ٹھہرن۔ رانا حبیب الرحمان لوٹ آؤ یا، باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی ٹھیک تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ یہ قسط بھی لا جواب رہی۔ اساتذہ نے اس قسط میں بھی فاروق اور جولیٹ پر ترس نہیں کھایا اور ماروی پوری رفتار سے بھاگ رہی ہے۔ طاہر جاوید مغل فہرست میں موجود ہوں تو لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ محبت اور فاصلے یادگار کہانی ہے۔ ابراہیم جمالی کی عزت کا سوال حقائق کی ترجمان اور بے باک تحریر تھی۔ انتہائی سبق آموز اور عبرت انگیز۔ واقعی اگر ہم کسی کی عزت کے درپے ہوں گے تو ہماری عزت بھی برباد ہو کر رہے گی۔ ویلڈن ابراہیم جمالی اور داستان گوگٹوں کی منظر امام معاشرے کے نبض شناس نکھاری ہیں۔ حکایت سودوزیاں ناہید سلطانہ اختر کا آخری صفحات کے لیے لازوال تحفہ تھی۔ ہمارے بے حس معاشرے کی عکاس اور ہمارے مجموعی رویوں کی ترجمان کاوشیں۔ کاش کہ ہم ایسی تحریریں صرف چنارے کے لیے نہ پڑھیں بلکہ ان تحریروں سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے رویے بھی ٹھیک کریں (اللہ کریم توفیق دے، آمین) ضیاء نسیم بلگرامی کی فضل رحمان، اللہ کے برگزیدہ ولی کی داستان حیات دل منور کر گئی۔ کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ ہر مرتبہ ایمان و عقیدت میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ حضرت فضل رحمان کی پیارے نبی ﷺ کی مقدس سنتوں کا عاشقانہ اتباع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے والہانہ عشق پڑھ کر اللہ کی قسم کھاتے ہو گئے۔ اگر ممکن ہو تو فیچہ نہ چلائیے گا آپ کا احسان ہوگا۔“ (ارے صاحب اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔ ورنہ یہ سارے قارئین دھرنے کے کر بیٹھ جائیں گے..... پھر کیا ہوگا؟)

مسز صدیقی بکشن اقبال کراچی سے تشریف لائی ہیں۔ جنوری کے بعد آج ایک بار پھر تویر ریاض کی معمولی عورت نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ بہترین کہانی نکھی ہے۔ بے شک جب کسی کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو پھر وہ بھی کچھ کر گزرتا ہے کہ دھکی دل ہی دوسروں



کا دکھ سمجھتا ہے۔ اس نے طوفان سے لڑ کر ایک بندی کوئی زندگی دی، دل خوش ہو گیا پڑھ کر میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ غم گسار دوسری کہانی سلیم انور کی دل چھو لینے والی عمدہ تحریر، ان کو بھی بہت مبارکباد۔ خدا ان لوگوں کی تحریروں میں اور نکھار لائے اور یہ آپ کے رسالوں کو چار چاند لگاتے رہیں۔ اب بزم میں شرکت کرنے والوں نے جس طرح مجھے پندیرائی دی، بے حد شکر گزار ہوں۔ بیٹی طاہرہ گلزار، مرزا گل، زرین آفریدی، بیٹے صفدر معاذ یہ آپ جیسے بیٹوں پر پاکستان کو فخر ہے۔ خدا لمبی عمر صحت و تندرستی اور خوشیاں دے اور آپ اپنے خاندان کا نام روشن کریں۔ میں پیاری بیٹیوں کو جس میں سعدیہ بخاری بھی شامل ہیں، دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ خداتم سب پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ اچھے نصیب، خوشیاں، صحت و تندرستی سے پھولو پھلو اور میرے لیے بھی دعا کرنا کہ خدا اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین۔ آخر میں جو بات کہنی ہے، وہ بہت مشکل لگ رہی ہے۔ کاشف زبیر لاکھوں لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا کر جنت میں گھر بسا بیٹھے، خدا وہاں انہیں بہترین درجات عطا کرے۔ آمین۔“

✽ محمد انعام، لودھراں سے چلے آ رہے ہیں ”سب سے پہلے ادارہ پڑھا کہ اعلیٰ عہدیداروں کو دوسرے کے مسائل حل کرنے کا کچھ پتا نہیں لیکن خود کروڑ پتی، اپنی تنخواہ اور مراعات بڑھانے کے لیے کتنے فکرمند ہیں۔ محمد خواجہ اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ عوام اور طالب علم غیر نصابی کتابیں پڑھ کر اپنے علم میں اضافہ کریں۔ ہمارے خود غرض حکمرانوں نے اسکولوں اور کالجوں کی کتابوں سے معیاری مواد نکال لیا ہے۔ سسپنس ذہن کو فریش کر دیتا ہے۔ قاسم رحمان دوستوں کی تعریف کرتے ہوئے۔ کیوں بھی پیپر اچھے ہوئے یا پھر..... کہانیوں کا آغاز شیش محل سے کیا۔ میری پسندیدہ کہانی میں بدنام لوگوں کے دل کے اندر خلوص، پیار محبت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اتنا پیار محبت خون کے رشتوں میں بھی نہیں۔ رہن اگر اپنے آدمی نہ بھیجتا تو رامو کا کام ہو جانا تھا۔ رہن جو لیٹ سے اس کے دشمن کے بارے میں انکوائے میں ناکام رہا۔ اشارے کے ذریعے دلدار آغا تک پہنچ کر بدلہ لے گا۔ ماروی کہانی بس تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ بہشت زار بہت زیادہ مزہ دے گئی۔ معلومات کے ساتھ جب ہلا کو خان نے اپنی فوج بھیجی تب جا کے خورشاد شکست مان کر ہلا کو خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چھرا بند سے دلچسپی ہلا کو خان کے لیے تعجب خیز تھی۔ جبار اور اسد نے ان کی جنت کا راز فاش کیا۔ حکایت سودر یاں میں معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مفاد پرست خونی رشتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ احسان کرو، اس کو بھول جاؤ۔ اس کا اجر لوگوں سے نہیں، اللہ سے ملے گا اور یہ کہ فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے اور اس کہانی کا اہم پہلو کہ شادی وقت پر کرو۔ نہیں تو سیف الدین کی طرح خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ محبت اور فاصلے میں بہزاد نے اپنا مکان دے کر شہزاد کو مایوسی سے بچالیا۔ امانت میں خیانت کرنے سے کریم داد کو اس کی قیمت بہت بڑی چیز یعنی جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ سویٹر گرل دولت کے حصول کے لیے مردوں کو نشوونما کی طرح بدلتی آئی۔ آخر کار ایڈز کا شکار ہو کر مری۔ پہلا پتھر میں عرفان بے گناہ ٹھنسن گیا۔ بیگ صاحب ہمیشہ کی طرح اس کو بھی بچا کر لے گئے۔ جواد حسین کو بے نقاب کر کے سزا دلوائی۔ آخر میں ادارے سے پُر زور درخواست ہے کہ نامور مسلم سائنس دان کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان لوگوں نے بہت بڑی خدمات سرانجام دیں۔ اس کے باوجود ہمارے ذہنوں میں یہ خیال کیسے سا گیا کہ ہر ایجادات یا کام بس مغربی سائنس دانوں کی تحقیق کا ثمر ہے۔“ (رسالے سے داہنٹی کا بے حد شکریہ)

✽ رانا بشیر احمد ایاز، احسان پور، رحیم یار خان سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”سرورق پر اس دفعہ ٹاکسل گرل کچھ ایویں سی تھی۔ لگتا ہے ڈاکٹر انگل اس دفعہ ڈنڈی مار گئے ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا حقیقت حال بیان کر رہے تھے جو کہ تشویش ناک اور کافی خندوش تھی۔ آگے سیدھا اپنی محفل میں قدم رنج فرمایا جہاں کراچی سے محمد خواجہ میر محفل بنے بیٹھے تھے۔ مبارکباد خواجہ بھائی۔ اشفاق شاہین، طاہر جاوید سے کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے نظر آئے۔ سید عبادت کاظمی اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے پر خفا نظر آئے۔ جناب، آپ لگتا ہے خطوط غور سے نہیں پڑھتے ورنہ اس ناچیز کے ہر خط میں آپ کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بہشت زار پڑھی۔ عمدہ کردار نگاری اور دلچسپ انداز بیان۔ شیخ الجبال آخر کار اپنے انجام کو پہنچا۔ طاہرہ اور ذوبہ نے جبار اور اسد سے دھوکا کیا لیکن ہاتھ پھر بھی کچھ نہ آیا۔ محبت اور فاصلے مغل اعظم صاحب نے دل کے تار ہلا دیے۔ شہزاد کی محنت اچھی لگی لیکن بہزاد کی ایثار پسندی نے اپنی محبت کی شکل میں ایک سسکتی ہوئی محبت کو زندگی دے دی۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ابھی تک دنیا آباد ہے۔ شیش محل میں کوکا بدلہ لینے کے لیے رامو نے جوش میں آ کر حملہ تو کر دیا لیکن نقصان کافی اٹھایا مگر عین وقت پر رہن دادانے آ کر کمک پہنچائی تو جا کر گلو خلاصی ہوئی۔ چاند بانو کی بے غرض محبت لگتا ہے فاروق پر اثر کر رہی ہے۔ خط میں انگوروں کی شوقین بیوی کو اس کے شوہر نے بے آسانی ٹھکانے لگا دیا لیکن ڈاکٹر کی ذہانت کی وجہ سے اپنے جال میں پھنس گیا۔ مرزا امجد بیگ صاحب اس دفعہ پہلا پتھر مارتے نظر آئے۔ کافی اچھی کہانی رہی۔ بیگ صاحب ہر دفعہ قانع بن کر عدالت سے باہر آتے ہیں۔ کبھی کوئی ایسا کیس بھی شائع کر دیں جس میں وہ ہارے ہوں۔ محمد زبیر سلیمانی امانت لے کر آئے۔ رئیس کو اپنی عزت کا خیال تھا تو وہ صاحب کے لیے اس کی نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے چکر میں ہر حد کراس کر گیا۔ جانو نے بھی خوب وفاداری نبھائی۔ سویٹر گرل بھی مناسب کہانی تھی۔ تاواقف بس گزارے لائق تھی۔ ماروی بھی بہت زبردست رہی اس دفعہ۔“





خصوصاً عالی کا کردار سپر ہٹ جا رہا ہے۔ فضل رحمان کے حالات زندگی پڑھ کر بہت معلومات ملیں۔ یہی اہل اللہ کی پہچان ہے کہ وہ مشکل حالات میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کافی ایمان افروز داستان تھی۔ منظر امام اس دفعہ گوگنوں کی داستان لے کر آئے۔ یہ داستان صرف فرضی نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ہمارے پورے معاشرے کا الیہ ہے۔ حکایت سو دوزیاں ناہید سلطانہ اختر کا مخصوص امداد تحریر۔ سیف الدین ساری زندگی بھائیوں اور بہنوں کے لیے قربانی دیتے رہے لیکن آخر میں انہی بہن بھائیوں نے مزہ موڑ لیا اور اتنا تک کہہ دیا کہ بھائی صاحب ساری زندگی اسراف کرتے رہے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ بھائی نے ان کی زندگی سنوار دی ہے۔ اس دفعہ محفل شعرو سخن بہت دل کش رہی۔ سنیہ منظور کا انتخاب بہت اچھا رہا۔ سیدہ ثانیہ کاظمی، شاعظیم، اظہر حسین، مدحت، بشری غزل اور مرزا اینڈز مناکل بھی خوب صورت اشعار کے ساتھ محفل میں جلوہ گر تھے۔ (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)

حافظ شعیب معاویہ، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے محفل میں حاضری لگا رہے ہیں۔ جولائی 16ء کا سہنس 16 کو ملا۔ میرا پہلا خط شرف قبولیت پا گیا۔ اچھا لگا۔ آپ نے غیر حاضری پر جرمانے کی دھمکی دی۔ اس لیے غیر حاضری سے بچنے کے لیے حاضری لگوانے کو حاضر ہیں۔ (شاباش..... یہی عقلمندی کا تقاضا ہے) کیونکہ میں تراویح میں قرآن پاک سنار ہا ہوں۔ وقت کی بجلی ہے تفصیلی تبصرہ تو نہ لکھ سکوں گا (ماشاء اللہ..... بہت خوب) محمد خواجہ کو مبارکباد، بہت اچھا لگا آپ کا تبصرہ۔ اشفاق شاہین، تحریم شاہ، زرین آفریدی، محمد صفدر معاویہ خوب صورت تبصروں کے ساتھ رونق محفل تھے۔ اپنے شہر کے صادق معاویہ کی توجہ کے لیے ہم شہر ہونا اچھا لگا۔ کہانیوں میں صرف شیش محل پڑھی۔ مزہ آگیا، خدا کرے زور قلم اور زیادہ اور پھر جمع سنت عاشق صحابہ حضرت فضل رحمان کی داستان حیات پڑھی۔ اتنی محبت کے ساتھ اتباع سنت اور صحابہ کرام سے والہانہ عشق حضرت فضل رحمان کی حیات مبارکہ کا چمکا دکھایا ہے۔ پڑھ کر سکون آگیا، بے شک ان اولیاء اللہ کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ ویسے صادق معاویہ کا یہ جملہ اچھا لگتا ہے۔ حیات باقی، ملاقات باقی۔ (اپنے قیمتی وقت میں سے آپ نے کچھ تو وقت دیا..... بہت شکریہ)

وارث علی ملاح، سندیلانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "ناٹل گرل ذرا بھی پسند نہیں آئی۔ اسٹیلی اس کی مخروطی انگلیاں دیکھ کر تو صبح معنوں میں جھرجھری سی آگئی..... (ارے بھی کیوں..... وضاحت نہیں کی آپ نے) جون الیہ کی حقیقت پڑھی جو ہمارے طبقے کے امراء اشرافیہ بلکہ ہم سب کی حقیقت ہے جسے ہم بدلنے پہ قطعی متفق نہیں۔ آپ کے ادارے میں آپ کی سنی اور پھر اپنے دوستوں کی..... محمد خواجہ کورنگی والے (تساں نو بڑی ڈاڈھی مبارک ہوئے) آپ سے پوچھنا ہے کہ کیا حیدر آباد وہی علاقہ ہے جس پر بھارت نے زبردستی قبضہ کیا تھا۔ اشفاق شاہین ہمارا بھی ماروی کے بارے میں آپ جیسا ہی گمان ہے۔ تحریم شاہ جی، یہ لوڈ شیڈنگ تو اب ہماری آنے والی سلسلوں کو بھی یقیناً بھگتنا ہوگی۔ چھ مہینے سے اعلانات ہو رہے تھے کہ ماہ میام میں بجلی کم از کم سحر و افطاری کے دوران تو نہیں جائے گی لیکن ہوا بالکل الٹ رہا ہے۔ (یہی تو سیاست ہے نادانوں! بات کو سمجھا کرو) خود تو حکمران اعلیٰ بیرون ممالک میں اہل پسندی فرما رہے ہیں اور ہمارا اب اللہ ہی والی ہے..... میرے ننھے منے لعل ماسٹر شاگرد علی رحمان کو پورے سال بعد دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ بیٹا جی اب مستقل آتے رہے گا..... صادق معاویہ جی ایہہ کی گل اے جب پڑھنا ہی ہے تو اسی وقت پڑھ لیتے ناراض دوشیزاؤں کی طرح روٹھے کس سے رہے؟ سید عبادت کاظمی کافی عرصے بعد نظر آئے۔ اچھا تبصرہ تھا۔ آپ کے دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ رانا بشیر احمد بیچاری کاغذی لڑکی کی تعریف میں سر دھنتے نظر آئے..... (بہت خوب) صفدر معاویہ کا تبصرہ بھی بڑا سونہا تھا..... مرزا گل جی میرے خیال میں اس دفعہ آپ پھر سرورق پہ چھا گئی ہیں۔ ماروی تو واقعی اب بورنگ ہوئی جا رہی ہے۔ عبدالغفار فردوس لگتا ہے آپ کو اردو زیادہ اچھی نہیں لگتی جیسی وقتاً فوقتاً ہندی بھاشا یاد کر رہے ہو۔ (اوہ سیر کو سوا سیر..... آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں) کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل میں انٹری دی لیکن وہی کچھوے کی رفتار مافق و جی رفتار سے ہمارا صبر آزمائی ہیں اسما قادری صاحبہ..... فاروق سے تھوڑی خوشی ملی کہ اس نے بملا کو آمینہ دکھایا..... بملا اب کنیش سے یقیناً چاند بانو کو ہی ٹھکانے لگوانے کا کہتی ہے۔ جوزفین کو اب حویلی میں عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آخری صفحات پر اپنی موسٹ فیورٹ ناہید سلطانہ کو پڑھا..... انہوں نے اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت اہم پلاٹ منتخب کیا۔ اے کاش کہ بدلے میں سیف الدین سے کوئی بھی بہن بھائی ہمدردی ہی دکھا دیتا..... ان کے بہن بھائیوں کی طوطا چمشی پہ چنداں حسرت نہ ہوئی کیونکہ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کوئی بے غرض ہو کر کام کرے بھی تو صلہ کبھی نہیں ملتا۔ پلکوں کے گوشے نم کرتی تحریر رلا ہی گئی آخر سے تھوڑا پہلے..... طاہر جاوید مغل کی محبت اور فاصلے عظیم داستان محبت تھی۔ ہمیشہ کی طرح دلوں کے تار چھو گئی۔ طاہر جی پلیز آخری صفحات پہ آئیں۔ کاشف زبیر صاحب کی کمی پوری کریں۔ سوئزر گرل علی اختر نے ایک دوشیزہ کی داستان حیات لکھی۔ خوشیاں کشید کرتے کرتے خود ہی ایڈز میں مبتلا ہو گئی۔ ماروی دیوتا جیسی بنتی جا رہی ہے۔ عزت کا سوال میں ریکس کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا۔ اور وہی عزتوں سے کھیلنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے، سکینہ کب تک برداشت کرتی..... کشدہ ثمر عباس کی ہلکی پھلکی تحریر بھی تقریباً صحیح ہی رہی۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح معاشرے کی بے جسی کا کھلا مظاہرہ کرتی تحریر لے کر آئے اور چھانگئے۔ داستان گوگنوں کی بہت سبق آموز کہانی تھی۔ سچ ہے دوسروں کے



معاملات میں ٹانگ اڑا کر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، سوائے ذلت و رسوائی کے۔ مشرقی کہانیوں کی کمی کے باوجود زبردست رہا پورا سسپنس..... سنت رسول پر عمل پیرا فضل رحمن کا فسانہ حیات بھی بہت زبردست تھا۔“ (بہت عمدہ تبصرہ رہا)

✽ اور ایس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے رونق محفل ہے ہیں ”عید الفطر کی خوشیاں سب ہی قارئین اور اہل پاکستان کو مبارک ہوں۔ اللہ تعالیٰ دنیا بھر میں امن و امان کا دور دورہ ہو۔ آمین۔ جولائی کا خوش رنگوں سے سجا سسپنس ڈائجسٹ دل کو بھایا۔ حسب روایت ناسٹل بھی مہارت کی تصویر لیے ہوئے تھا اندر انشائیہ میں دانش اور دانشوری کا ہی بول بالا رہا جس میں حقیقت کا ادراک کیا گیا جو ہماری زندگیوں پر محیط ہے۔ اپنی محفل میں سرفہرست محمد خواجہ آف کو رنگی نظر آرہے تھے، مبارکباد اور دیگر دوستوں کی بھی حاضری بھر پور تھی جو اپنی اپنی آرا سے مستفید کر رہے تھے۔ بہشت زار کا اختتام ہوا۔ دوسری تحریر کہنہ مشق قلم کار اسما قادری کی منہ بولتی تحریر شیش کل تھی۔ جو پہلی قسط سے ہی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ ان کا ہر فقرہ دل کی کتاب پر لکھ جاتا ہے۔ آخری سطر تک احساس نہیں ہوتا اور تحریر ختم ہو جاتی ہے۔ دام بھی خوب صورت تحریر لگی۔ خط بھی بہتر انداز لیے ہوئے تھی۔ دنیا میں عجیب عجیب عادات کے حامل لوگ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارنی میڈلین کی بیوی تھی کہ اس کو پیپر پر چھپے انگوڑ کھانے کا عشق آیز جنون تھا۔ واقعی اس کو یا گلین ہی کہیں گے کہ تصویروں سے ہی محض اتنی جنونی محبت کی جائے۔ امانت بھی تاثر انگیز تحریر تھی جو ایک گاؤں کے پس منظر پر لکھی گئی کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن نے بھی محظوظ کیا اور معیاری اشعار نے پُر لطف کیا۔ سوئٹر گرل بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ ناواقف میں ایک شاطر اور مجرم ذہن رکھنے والے جوزف نے محض اپنی عقل کو ہی سب سے بہتر اور کارگر سمجھ کر داؤ چلنے کی کوشش کی جس کا وہ برسوں سے تمنائی تھا مگر اس سے بھی شاطر اور حاضر دماغ وکیل نے آخر کار اس کو مات اس وقت دے دی جب جج کے نشے میں چور جوزف دولت لے کر تہ خانے سے برآمد ہو رہا تھا مگر وکیل نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ عزت کا سوال بھی عبرت انگیز کہانی تھی ان کے لیے جو طاقت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ گرم شدہ بھی اچھا انداز لیے ہوئے تھی۔ ضیائے نسیم بلگرامی کی تحریر نے بھی دلوں کو ایمان اور یقین کی روشنی سے اجلا کیا۔ آخری کہانی حکایت سودو زیاں ناہید سلطانہ اختر کی بہترین کہانی تھی، کتر نہیں بھی بے مثال رہیں۔“

✽ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ ”جولائی 2016ء کا شمارہ 15 جون کی ایک خوب صورت دوپہر میں سرور میں ملا۔ سرورق کو بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا۔ بہت ہی خوب صورت ماڈل ویسی پس منظر پیش کرتے ہوئے لگتا ہے کہ اپنے پیارے انتظار میں ہے کہ عید آگئی سا جن تم نہیں آئے۔ جون ایلیا محترم حقیقت حال کو بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کرتے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا، بالکل ٹھیک کہا کہ خالی دن منانے کا فائدہ جب کوئی اس سے مستفید ہی نہ ہو سکے۔ یہ سارے سیاسی ہمیں دکھانے کے لیے ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اندرون خانہ یہ سب ایک ہیں۔ اللہ ہی ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ دوستوں کی محفل میں آئے تو محمد خواجہ کو رنگی والے کو بہت خوب صورت انداز کے ساتھ تبصرہ کرتے کر سی صدارت پر براجمان پایا۔ مبارک ہو خواجہ بھائی۔ اشفاق شاہین، تحریم شاہ، قاسم رحمان کی عمدہ انٹری۔ رانا امتیاز 8 سال بعد ویکلم بیک، زرین آفریدی کا بہت پیارا تبصرہ۔ علی رحمان کی سال بعد واپسی۔ اور ایس احمد خان، صادق معاویہ سعیدی کی بہترین تبصرہ نگاری۔ حافظ شعیب معاویہ کو ویکلم کرتے ہیں۔ اس دفعہ تو معاویہ چھا گئے۔ کاظمی بھائی کا دکھ بڑا ہے اللہ پاک آپ کو حوصلہ عطا کرے۔ بشیر احمد ایاز بہت خوب، بڑے مخفی ہو یا۔ بہشت زار سے شروعات کریں۔ اس دفعہ بس اس کے اختتام پر یہی کہوں گا جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا۔ محبت اور فاصلے طاہر جاوید کے قلم سے ایک گمشدہ محبت کے طفل ایک رونی سسکتی محبت کوئی زندگی مل رہی تھی۔ بہت ہی پیاری اسٹوری بہت عمدہ مغل صاحب۔ شیش کل اس دفعہ کی قسط بہت ہی دلچسپ رہی۔ فاروق کا بھلا کو سختی دکھانا بہت اچھا لگا۔ لگتا ہے بھلانے چاند بانو کے لیے کنیش کی خدمات حاصل کر لیں۔ رہن دادا کا جولیٹ کے معاملے میں مجرم کے نام تک پہنچنا گویا دلدار آغا کی موت ہے۔ خویر ریاض کی دام بھی بہت اچھی رہی۔ ایک نرس کے قتل پر گھومتی کہانی اچھی لگی۔ بابر نسیم خبط لے کر آئے۔ ڈاکٹر بلشن نے ارنی میڈلین کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ چال اس نے اچھی چلی پر اس کی قسمت وال پیپر پر لگے انگوڑ کھانا کافی انٹرسٹنگ تھا۔ مرزا امجد بیگ پہلا تبصرہ لے کر آئے۔ بیگ صاحب نے اپنے موکل کو قانونی جنگ لڑ کر رہائی دلائی، وہیں اصل مجرم کو بھی بے نقاب کرنے میں پولیس کی مدد کی۔ لالچ انسان سے کیا کچھ کراتا ہے جیسا کہ جواد نے کیا۔ محمد زبیر سلمانی امانت میں کیا خوب حق ادا کیا کریم داد نے، لعنت ہے ایسی دوستی پر اشرف نے بھی خوب بدلہ لیا دونوں سے۔ بانو نے بھی توبے و فاقی کی توصلہ اٹھا لیا۔ پہلا گھر سے نکلتا غلط قدم پھر محبوب سے بے وفائی۔ محفل شعر و سخن بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ اشعار سے مزین رہی۔ علی اختر سوئٹر گرل لے کر آئے، کافی اچھی اسٹوری تھی۔ مرسیڈیز نے اچھا نکتہ استعمال کیا زندگی گزارنے کا۔ پر آخر میں اس کے ساتھ برا ہوا۔ نسیم جاوید کی ناواقف میں جوزف کلارک کی 6 سال جلاوطنی اور انتظار بھی اسے نہ بچا سکا کیونکہ وہ وقت کے فرق کو نہ سمجھ سکا۔ نواب انکل مرحوم کی مادی کی یہ قسط بہت عمدہ رہی، کیا کہنے۔ اس دفعہ جمائلہ اور شمائلہ اضافہ اچھا رہا۔ آخر غائبی نے نکاح کر ہی لیا۔ مراوی کی طرح غائبی بھی جدھر جاتا ہے لاشیں ہی گرتی ہیں۔ ابراہیم جمالی کی عزت کا سوال کیا خوب تھی۔ رحیم کی عزت اور لوں کی بہن بیٹیوں کے لیے غلط کرتا تھا، وہ اس کی عزت کا سوال ہوتا اور گھر میں سکینہ اور جانو





کے تعلقات کو کیا نام دے گا وہ۔ سچ کہا ہے کسی نے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ شرعاً اس کی تم شدہ بھی اچھی رہی۔ میلیا پار کرنے کیا خوب کھیل کھیلا اپنے شوہر سے جان چھڑوانے کے لیے۔ فیاض نسیم بلگرامی نیک اشخاص کے واقعات میں سے فضل رحمن کا واقعہ لے کر آئے، پڑھ کر روح کو سکون سامیسا گیا۔ واقعی وہی کامل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ کے حکم پر اور نبی کریم کے طریقوں پر چل کر زندگی گزارنے والے۔ منظر امام گوگنوں کی داستان کے ساتھ آئے۔ ویسے آج کے حالات ایسے ہی ہیں کہ بندہ گونگا ہی بن جائے کیونکہ یہاں عام آدمی کچھ بول کر مصیبت میں پڑتا ہے یہاں کون کسی کی سنتا ہے۔ سلیم انور کی مات بھی عمدہ رہی۔ کارل بے چارے کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ ناہید سلطانہ اختر کا قلم آخری صفحات پر حکایت سودوزیاں بہت ہی اچھے موضوع کو زیر بحث لایا۔ سیف نے جو کچھ کیا بھائی بیٹوں کے لیے کیا۔ وہ اس کا حق ضرور بنتا ہے لیکن باقی لوگ بھی اپنا حق ضرور ادا کرتے پر ہر کسی نے اپنا مطلب دیکھا وہ تو پھر بھائی تھا۔ یہ تو انسان نو جوانی اور پیسے کے غرور میں ماں باپ تک کو بھلا دیتا ہے جنہوں نے دن رات ایک کر دیے اس کے لیے ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کو صحیح معنوں میں بڑوں کے حقوق جاننے کی توفیق دے۔“ (اتنا عمدہ تبصرہ لکھنے کا شکریہ)

سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے تشریف لائے ہیں ”فاصلوں کا احساس تب ہو جب میں نے کہا ٹھیک ہو اور اس نے مان لیا، کہتے ہیں خوش رہنا اور دوسروں کے چہروں پر خوشی لانا ضروری ہے لیکن یہ بھی ہے کہ غم بھی زندگی کا لازمی حصہ ہیں اور ہمارے غم زدہ لمحوں میں ہمارا سہنس ہمارے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ آج کل شب و روز اداس گزر رہے ہیں۔ یونہی شمار ہاتھ میں آتے ہی ٹھنڈے جھونکے کا احساس ہوا اور دل و دماغ پر چھائی ادا سی غائب ہو گئی۔ سرورق کو ہم نے بہت دنوں کے بعد غور سے دیکھا۔ حسینہ کے دیکھنے کا انداز اچھا لگا۔ مجموعی طور پر سرورق بہترین تھا۔ جون ایلیا ہمیشہ سچی اور کڑوی باتیں کرتے ہیں۔ آج کل کے دور میں لوگ رشتوں کی قدر کہاں کرتے ہیں۔ کورنگی سے محمد خواجہ محفل دوستان کے اس ماہ کے مکی ممبر ٹھہرے۔ مبارک باد قبول کریں۔ رسالوں سے ان کی محبت دیکھ کر اچھا محسوس ہوا۔ اشفاق شاہین اچھا تبصرہ تھا۔ قاسم رحمان کی مکی محسوس کرنے کا شکریہ۔ آپ کی محبت آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر۔ آپ نے دو بہترین ناول تحفے میں ارسال کیے بہت شکریہ۔ رومی شادی کی مبارک ہو آپ کو۔ ہمیشہ کی طرح شیش محل سے اشارت کی کہانیوں کی محفل۔ جولیت مجھے نواب خون لگتی ہے۔ ہلا بڑی شاطر لگی، رہن اب دلدار آغا کو سبق سکھا کر رہے گا۔ مغل صاحب کے قلم میں توجہ اور فاصلے ورد سے بھری تحریر رلا گئی۔ شہزاد کو شاہینہ سے ملانے والے بہنادر صاحب کی محبت کی داستان ہمیشہ یاد رہے گی۔ زندگی میں کچھ ہارنا بھی پڑتا ہے یہ اس تحریر سے سیکھا۔ ماروی کتنی رہتی ہے؟ مات، سوئٹر گرل، ناواقف اچھی کہانیاں تھیں۔ بہشت زار خوب صورت تحریر تھی۔ ابو کے بغیر یہ پہلی عید گزرے گی۔ سہنس کی محفل دوستان کو اور ادارے کو میری طرف سے عید مبارک.....“ (اللہ آپ کو جو صلہ دے۔ دنیا کا نظام صدیوں سے اسی طرح چلتا آ رہا ہے)

محمد خواجہ، کورنگی کراچی سے تبصرے کے ساتھ محفل میں حاضر ہیں ”جولائی کا شمارہ 15 تاریخ کو موصول ہو گیا۔ یہ شمارہ میرے لیے بہت ہی خوش آئند رہا۔ میرے خط کو بڑی پذیرائی ملی۔ مجھے صدارت کی کرسی نصیب ہوئی۔ سرورق پر ایک بہت معصوم صورت لڑکی کی تصویر۔ آنکھیں روشن اور اس میں اچھے وقتوں کی آس نظر آتی ہے۔ جون ایلیا نے حقیقت حال پر بڑا پراثر حال لکھا ہے۔ اب ہم کئی طبقتوں میں بٹ چکے ہیں۔ ایک طبقہ دوسرے کی بات نہ سمجھتا چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگ اچھی سے اچھی بات کو سننے سے پہلے ہی اپنا احقانہ نکتہ بیان کرتے ہیں۔ چاہے وہ سیاست پر ہو، معاشرتی ہو یا مذہبی۔ مذہب پر بھی ایسے نکتے نکال لیتے ہیں جو نہ قرآن میں نہ حدیث میں۔ بہشت زار، ہلا کو خان کے زمانے کی حیرت انگیز تحریر۔ ہلا کو خان کی بربریت اور خون ریزی سے ہٹ کر عجیب دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی داستان۔ محبت اور فاصلے، محبت کے گزرے ہوئے لمحات کی ایک دل گداز کہانی۔ سچی محبت کو دل میں بسا کر کس طرح لوگ ساری زندگی اس کی یاد اور آبیاری کرتے رہتے ہیں۔ بات صرف ایک مکان کی نہیں لیکن محبت کے ایک جذبے کی دل گداز کہانی دل میں اتر جانے والی۔ بہت عمدہ تحریر۔ شیش محل، رہن دادا کے دلغریب کردار نے پاڑے کے غنڈے کا کردار بہت بلند کر دیا۔ لڑائی جھگڑے، محبت، لوگوں کا ساتھ دینا اپنے لوگوں کو بچانا اور ساتھ دینا ایک عظیم کردار، ساتھ ہی جو فین کا کردار اور کہانی کو ایک خوب صورت موڑ دیتا ہے۔ واقعات کی عکس بندی اور مقامات کی وضاحت بہت خوب لیکن فاروق کے کردار کو پیش پشت کر دیا گیا ہے۔ امید ہے وہ آگے ایکشن میں آجائے۔ کہانی بہت دلچسپ ہے۔ اس کی دلچسپی کو برقرار رکھنا مصنف کے ہاتھ میں ہے جس کی پوری امید ہے۔ دام، ہلکی پھلکی تحریر، میری مرتے ہوئے کچھ قاتلوں کی نشاندہی کر دیتی لیکن بہت دیر ہو گئی۔ قاتل گزر گئے۔ خط، عجیب شوق کی ہو شر با کہانی۔ انکور کھانے کا شوق وہ بھی اصلی نہیں بلکہ وال پیپر پر بنے انکور، یہ کیسا شوق ہے۔ مارنے والے نے وال پیپر پر ساٹھ ساٹھ زہر لگا دیا۔ کہانی نے دلچسپی سے زیادہ حیرت زدہ کیا۔ پہلا پتھر، بیگ صاحب کی وکالت کا جواب نہیں لیکن اس کہانی میں بیگ صاحب کو اس کیس میں بڑی مشکل پڑتی نظر آئی۔ ایک نو جوان کی تن سازی اس کے لیے مسئلہ بن گئی۔ مجرم نے خوب جالا لکی دکھائی لیکن سامنے بیگ صاحب جیسا وکیل ہو تو مجرم کا بچنا ناممکن ہے۔ سوئٹر گرل، یورپ میں عجیب چال چلن ہے۔ ایک شریف لیکن حسین لڑکی بہت چاہنے والے۔ آخر لڑکی نے اپنا





روپ بدل ڈالا۔ حسن کی کشش سے دولت کمانے کا شوق اس کو مشکلات میں لے گیا۔ نادانانہ، ایک خطرناک مجرم جو اپنی ذہانت سے بچ نکلا۔ آخر اس کو فخر تھا کہ وہ جرم کا اقرار بھی کر لے تو اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک فرض شناس اخباری نمائندہ سے کی کوشش اور وقت حالات اور قدرت کے انصاف کے آگے وہ جلد باز مجرم قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ امانت، اس دفعہ کی بہت بہترین کہانی۔ ایک شخص کی محبت حوصلہ مندی۔ ایک دوست پر اعتبار اس کو معلوم نہ تھا کہ نہ لڑکی وفادار ہے نہ دوست۔ لیکن اس نے ایسا بھیا تک کھیل کھیلایا کہ دونوں دھوکے باز موت کے گھاٹ اتر گئے۔ عزت کا سوال، علاقے کے رئیس، وزیرے تھانیدار اپنے گاؤں کی لڑکیوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ رئیس کا جراثیم پیشہ مجرم ہی رئیس کی بہن کی عزت سے کھیلتا رہا۔ بڑی لرزہ خیز کہانی ہے۔ کم شدہ، ایک جرم کی داستان حالانکہ یہ جرم یا قتل کی واردات نہیں تھی۔ لیکن ایک چالاک اور ذہین عورت نے ایک ظالم شوہر سے جان چھڑانے کے لیے اتنی زبردست پلاننگ کی کہ شوہر سے جان چھوٹ گئی۔ بڑی چونکا دینے والی کہانی۔ لاش نہ ملنے کے باوجود عدالت کا فیصلہ بھی عجیب لگا۔ فضل رحمن، ایک ایمان افروز کہانی۔ بزرگان دین کی ریاضت، علم حاصل کرنے کا شوق اپنے سے شرم آتی ہے کہ کیا ہم ان سے سبق حاصل کریں گے۔ کیارتی برابراں کی پیروی کر پائیں گے۔ داستان گوئوں کی، ہمارے موجودہ معاشرے کی سچ داستان، ایک مجبور شخص ایک ڈبل روٹی چراتا ہے۔ ایک رحم دل شخص بات کو سمجھ جاتا ہے۔ لیکن جب تعلقات کی بات بنی تو اس کی مالی مدد بھی کر دی گئی۔ اگر تعلقات نہ ہوتے تو سزا تو ہو جاتی تھی۔ مجبوری ہار جاتی۔ کیا سب کو نکلے بن جائیں۔ مات، بہت عمدہ کہانی۔ حقیقت سے دل کو چھو لینے والی تحریر۔ ایک شخص ساری زندگی، بھائی بہنوں کی زندگی بنانے میں مصروف رہا۔ اپنے آپ کو بھلا کر اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کو نظر انداز کرنے والا آخر میں بالکل تنہا رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اس لیے یہ کہانی سیدھا دل میں اتر گئی۔ اشعار کی محفل بڑی رنگین رہی۔ خاص کر ملائکہ حریم، ظفر احمد اور رمضان پاشا کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ کتر نہیں اور لطائف کی کمی خاص کر محسوس ہوئی۔ یہ رسالے کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔“ (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ میں اس دیکھ پہ آرمی والے بھائی کے پاس آئی ہوں اور میری کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں بیٹھ کے اپنا تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ (بہت خوب) جب اگست کا شمارہ آئے گا تب تک عید کو گزرے 10 یا 11 دن گزر چکے ہوں گے پھر ادارے والوں کو اور سب دوستوں کو عید مبارک۔۔۔ اس بار عید کا شیف زبیر اور نواب انکل کے بغیر بالکل اچھی نہیں گزرے گی۔ میں نے قرآن پاک کی پہلی ختم کا شیف زبیر کو بخشی ہے اور دوسری نواب انکل کو بخشوں گی اللہ ان کو اس کا ثواب عطا کرے۔ آمین۔ کہانیوں کی فہرست میں اپنے فورٹ مغل اعظم، بابرنیم، منظر امام اور عزت کا سوال لے کر ابراہیم جمالی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اب تو اللہ کا کرم ہے کہ کراچی کا ماحول پرسکون ہو گیا ہے۔ (یہ خوش فہمی ہے آپ کی) اس بار جون ایلیا دانش اور دانائی کی باتیں لے کر حاضر تھے۔ اس قوم کی بد نصیبی کہ یہ قوم کتابوں میں صرف یہ الفاظ دانش اور دانائی پڑھتے ہیں لیکن نہ سمجھتا چاہتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہتے۔ معراج انکل اور وادب کے آسمان ہیں اور تمام رائٹرز اور ادارے کے کام والے اور قاری ان کے ستارے ہیں۔ ٹائٹل گرل تو آمد عید کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ قیص اور دوپٹے کے کلر بہت پیارے ہیں۔ خیر انکل معراج کی دانش مندانہ باتیں پڑھیں۔ واہ اس بار تو انکل نے پھر ہم پاکستانیوں کی روح جھنجھوڑنے کی سعی کی ہے لیکن ہم بد نصیب اور بے حس مسلمان بھی کیا کریں جو اپنی اسلامی روایات اور طور و طریقے چھوڑ کر غیروں کی رسومات کو بڑے شان سے اپنا کے بیٹھے ہیں۔ اللہ ہم سب بے رحم کرے۔ چلتے ہیں اپنے دوستوں کی گھٹی ٹیٹھی محفل کی طرف۔ مجھے تو میرے ہر دل عزیز دوست رضوان سلطان تنولی حسب عادت 15 جون کو بتا چکے کہ تم تو اس بار بلک لسٹ میں بھی نہیں ہو۔ کوئی بات نہیں ایسا چلکار ہوتا ہے۔ خطوط کے محل کا دروازہ ناک کیا تو دروازہ میرے پیارے بھائی محمد خواجہ کو رنگی نے کھولا۔ مبارک! بھائی پتا نہیں کیوں میں جب بھی محمد خواجہ بھائی کا نام پڑھتی ہوں تو مجھے اپنے ایک پسندیدہ تبصرہ نگار مدنی کی یاد آ جاتی ہے۔ ادارے والوں سے تھوڑا گلہ کہ مجھے Birthday کاوش نہیں کیا۔۔۔ (اوہو سوری۔۔۔۔۔ دُش تو تب کرتے جب آپ کی ڈیٹ معلوم ہوتی) ویلکم علی رحمان بھائی کہانی کو کہانی سمجھ کے پڑھو اس کو عام زندگی سے نہ ملاؤ۔ دیوتا کا سحر ہے ہی ایسا کہ اس کی گرفت سے قاری ابھی تک نہیں نکلا۔۔۔۔۔ صادق معاویہ یہ کیا احتجاج کی سزا اپنے محبوب سسپنس کو دی بری بات ادارے کی یہ ظالم فینچی تو بڑے بڑے تبصرہ نگاروں کے خطوط پہ دشمنان انڈیا کی طرح چلتی ہے تو آپ اور ہم کس کھاتے میں بیچ جائیں گے لیکن خوشی ہے کہ یہاں انصاف کے ساتھ فینچی چلائی جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک سال تک سسپنس میں خیل لکھنا بند کر دیا تھا۔ لیکن میں نے ایک منٹ کے لیے بھی سسپنس کو خود سے دور نہیں کیا اور سب سے آخری خط ہمارے بہت ہی سویت اور نفیس دوست عبدالجبار رومی کا رہا۔ اب دیکھتے ہیں کہ شادی کے بعد اسی طرح رواں تبصرہ لکھتے ہیں کہ نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل۔ واہ اس بار کیا تیز ٹیپ، کیا انداز تحریر کیا، منظر نگاری کس کس بات کی تعریف کریں۔ قلم میں استازہ کہاں سے لائیں۔ ربن دادا کی حکمت عملی، جو زمین کی داستان کوئی، فاروق کا کمو کے لیے وہی ہونا اچھا لگا لیکن مجھے یہ ذرا اچھا نہیں لگتا کہ فاروق اپنی محبت کو بھول کر چاند بانو اور بھلا کی قربت میں رہے۔ یہ تو محبوب سے دھوکا ہے۔ فاروق کا بھلا کو جواب دینا بہت اچھا لگا۔ ماروی کی یہ قسط بھی لا جواب رہی۔ اسلامی صفحات پر اس بار ضیائیں، بلگرامی، فضل رحمن کی بابرکت شخصیت لے کر حاضر۔ اللہ کی شان دیکھی۔ ناہید سلطانہ آخر ایک بار پھر ایک شاہکار تحریر حکایت





سودوزیاں لے کر حاضر تھیں جو ہمارے معاشرے کی عکاسی کر رہی تھی۔ سیف صاحب جیسے لوگ اب اس معاشرے میں کہاں۔ اب تو ہر طرف نفسی کا دور ہے۔ ویلڈن ناہید سلطانہ صاحبہ اس بار کے سسٹن کا شاہکار کہانیوں کا سرتاج آپ کی تحریر رہی۔ اس بار پھر میرے اور آپ سب کے فیورٹ رائٹر مغل اعظم محبتوں کے امین۔ اپنے ایک اور شاہکار محبت اور فاصلے لے کر حاضر تھے۔ شہزاد اور بہن از صاحب ایک ہی کشتی کے سوار، محبت میں ناکام بہن از سے شہزاد کی ناکامی برداشت نہ ہو سکی اور اس کا ساتھ دیا دنیا میں۔ ایسے لوگ آئے میں تمک کے برابر ہوتے ہیں ویلڈن مغل اعظم۔ الیاس سیٹا پوری کی تحریروں کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس بار تو منظر امام صاحب ایک اور انمول تحریر داستان گوگوں کی لائے جو ہمارے معاشرے کے منہ پہ تما نچا ہے۔ ابراہیم جمالی اپنی لاجواب تحریر عزت کا سوال لے کر حاضر تھے۔ ہمارے معاشرے کی منافقت رکس اور تھانیدارد دوسروں کی عزت کو پامال کرتے رہے اور جانو اس کی بہن سکینہ کے ساتھ مل کر ان کی عزت کو پامال کرتا رہا ایک لحاظ سے سکینہ حق بجانب تھی۔ شہر عباس اپنی مختصر مغربی تحریر گمشدہ لے کر حاضر تھے۔ میلسیا پار کرنے بہت اچھا کیا۔ ایسے ظالم اور بے حس شوہر سے جان چھڑائی۔ ناواقف نسیم جاوید سید کی مغربی تحریر جو مجرم اور قانون کے درمیان ایک سرو جنگ رہی۔ جوزف نے بہت کامیابی کے ساتھ چھیل کھیلنا مگر قانون آخر قانون ہے۔ ایک نکتہ جس سے قانون جیت گیا، وہ جوزف کو سمجھ نہیں آیا۔ اس بار مرزا امجد بیگ اپنا نیا کیس پہلا پتھر لائے اور کتنے طریقے سے اپنے موکل عرفان کو بے گناہ ثابت کیا۔ تنویر ریاض کی ایک بہت ہی لاجواب تحریر۔ ڈاکٹروں نے بھی اب اپنے پیسے کو بدنام کر دیا ہے ورنہ ڈاکٹر تو مسیحا ہوتے ہیں۔ آخر میں تمام دوستوں اور اہل پاکستان کو عید مبارک۔ اتحاد و اتفاق میں رہنے کی دعا اس لیے نہیں دے رہی کہ ہم میں یہ جذبہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔“

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے لکھ رہے ہیں ”میری دعا ہے کہ آپ اور عملے کے تمام افراد خیر خیریت سے ہوں۔ میں بھی بفضل خدا خیریت سے ہوں۔ ڈاکٹر کی دوا سے زیادہ آپ کے ایک جملے نے کام کر دکھایا اور اب رو بہ صحت ہوں، الحمد للہ! اور اب تازہ شمارے پر تبصرہ۔ تازہ شمارے کا سرورق نہایت سادہ اور حسب ضرورت خوبصورت بنایا ہے۔ فہرست کی ترتیب بھی بہت ہی سادہ اور پانسیقہ ہے۔ انٹرایٹ میں اس بار جون صاحب نے حقیقت حال واضح کر دی، اب جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ تاریخی کہانی کے بارے میں اس بار وہی گزشتہ ماہ کا جلد دہراؤں گا کہ ”یاد ماضی عذاب ہے یارب“ اب کسی کو برا لگے یا بھلا، ان کی مرضی۔ محبت اور فاصلے، مغل صاحب واپس اپنے ٹریک پر آگئے ہیں اور اب مسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ آتے رہیں تو اچھا ہے گا۔ شیش گل کی اس قسط نے تو بندے کو ہلا جلا کے رکھ دیا۔ دام کہانی مختصر اور پُرکشش تھی۔ اسی طرح خط بھی مختصر تھی، یہ ایک انوکھی اور احمقانہ خواہش کا شاخسانہ۔ اس دفعہ بیگ صاحب کو بڑا اچھا اور عمدہ کس ملا۔ پہلا پتھر عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ امانت، یہ ایک پرانی کہانی کو نئے انداز میں تحریر کیا ہے، جو کہ اچھی لگی اور خوب مزہ بھی آیا۔ سویٹر گرل کہانی اثر انگیز تھی، اختتام بھی اچھا تھا۔ ناواقف، یہ کہانی واقعی دلچسپ تھی مگر اسے اتنی وسعت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماروی کے اختتام پر ہی تبصرہ اچھا لگے گا، اس کی آخری قسط کے بارے میں سوچ کر دکھ ہو رہا ہے، کون لکھے گا آخری قسط؟ عزت کا سوال کہانی بھلی لگی، اختتام چونکا دینے والا تھا۔ گمشدہ بھی دلچسپ کہانی تھی۔ داستان گوگوں کی منظر امام نے نہی نہی میں ایک بھر پور طنز بھی دے مارا مگر کس پر؟ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ مات مختصر اور دلچسپ، انسان جو سوچتا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ قدرت نے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہوتا ہے۔ حکایت سودوزیاں زبردست اور سبق آموز کہانی تھی۔ اس کہانی میں خواتین کی دلچسپی کا سامان وافر مقدار اور تعداد میں موجود تھا۔ اشعار کی محفل میں ملائکہ حریم، سنعیہ منظور، ماہا ایمان، زرین آفریدی، زویب احمد ملک کے اشعار قابل داد تھے۔“ (بہت شکر یہ جناب سسٹن سے آپ کی محبت کا)

محمد شہباز ناز، سرگودھا سے تشریف لائے ہیں ”سب سے پہلے تو میں شکر گزار ہوں ادارہ سسٹن ڈائجسٹ کا کہ میرا پہلا خط شائع ہونے پر، اس کے بعد ٹاسٹل کی بات کرتے ہیں تو حسینہ 402 ماہ رمضان میں بھی ایسے لگتی تھی جیسے کسی ہوٹل سے لچ کر کے نکلی ہو۔ خدا بچائے ان حسینوں سے شریف آدمی ان کے چنگل میں پھنس جاتا۔ چلو چھڈو جی اس گل نون آگے کی بات کرتے ہیں۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے آپس کی نوک جھونک میں بہت مزہ آتا ہے۔ جب سب دوست پیار و محبت میں ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد شاد رکھے۔ سسٹن کے پرانے قاری رانا ثار سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں دوسرے رسالے پڑھتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے میرے پاس رسالہ دیکھا۔ کہا کہ آپ سب رسالے چھوڑ دیں سسٹن پڑھا کریں۔ اس کے بعد سسٹن پڑھنا شروع کیا تو باقی سب بھول گیا۔ (زبردست۔۔۔۔۔ یہ ہوئی بات) ایک درخواست ہے کہ دیوتا جیسی کہانی لکھی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے سسٹن کے قاری زیادہ ہوں گے۔ بہشت دار علی پائے کی کہانی ہے، ماروی اچھی کہانی ہے۔ امانت اچھی تھی۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

مختار احمد، راولپنڈی۔ احمد انصاری، ملتان۔ عابد علی، سیالکوٹ۔ ثمنہ، کراچی۔ مدثر خان، پشاور۔ مہتاب علی خان، اسلام آباد۔ فرید احمد، ساہیوال۔ محرم سرور، حیدر آباد۔ ظہیر الدین، کراچی۔ زویب احمد، کراچی۔ شمرین، سکھر۔ ممتاز علی خان، کوئٹہ۔



ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

## داستان رزم و بزم

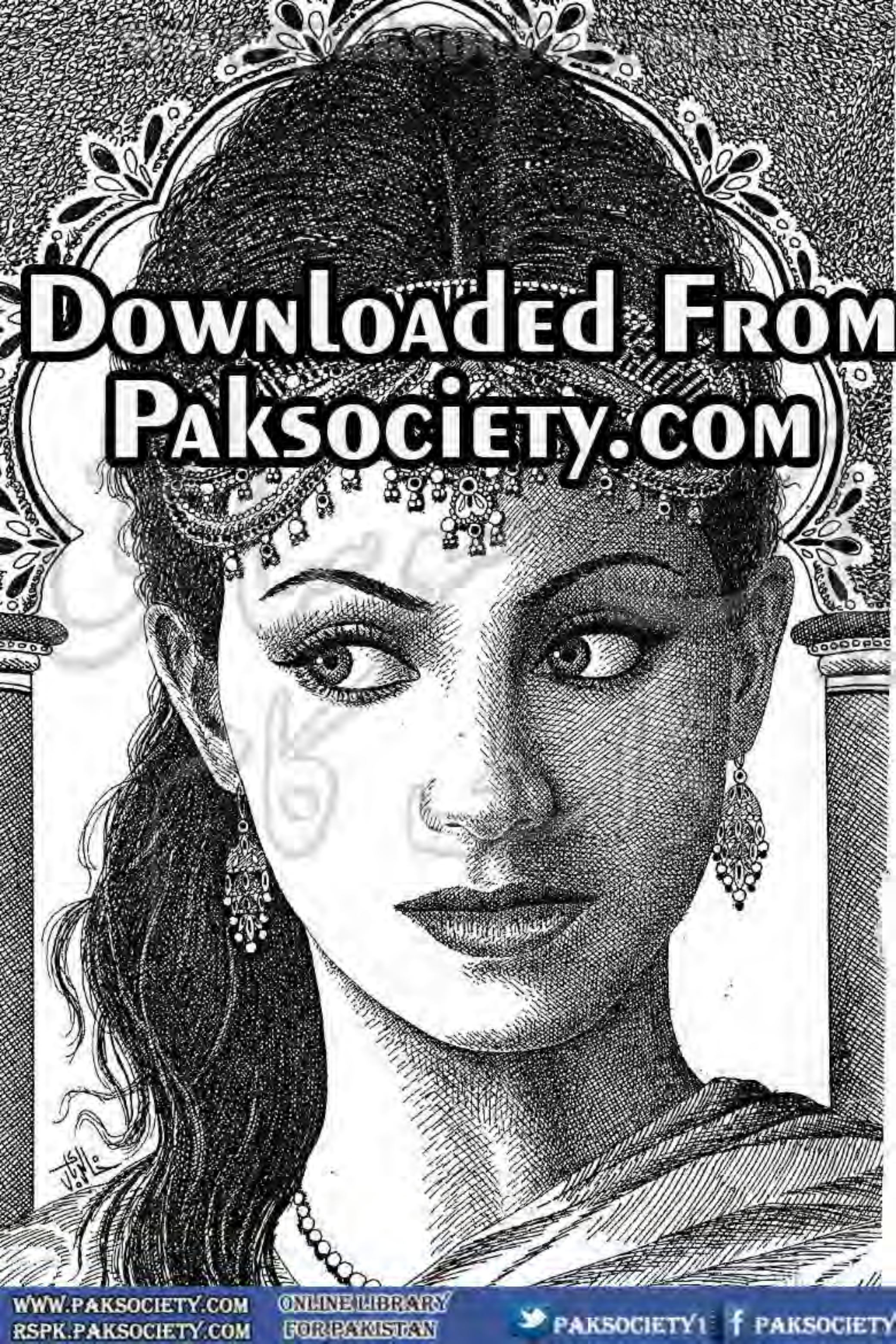
الیا سیتاپوری

ماضی جیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے مگر... جیسا بھی گزرے یادوں میں محفوظ بھی رہتا ہے۔ انفرادی زندگی کی بات الگ ہے لیکن... اجتماعی طور پر قوموں کے حوالے سے تاریخی لمحات کی اہمیت ایک اٹل حقیقت ہے۔ انہی اقوام عالم میں سے ایک قوم منگول نے بھی تاریخ میں اپنی انفرادیت اور شناخت کو یوں محفوظ کیا کہ آج بھی یہ قوم وحشت دہشت اور بربریت کے احساس تلے یاد کی جاتی ہے۔ ماضی میں منگولوں نے جب بغداد کا رخ کیا تو جنگ سے پہلے سیاسی بساط پر کچھ ایسی جوڑ توڑ شروع کی کہ بڑے بڑے بازی گران کی حکمت عملی اور دلیرانہ اقدامات پر حیران رہ گئے۔ یہ لوگ اپنی قوم کے شاطروں کو اکٹھا کر کے جنگی تربیت اور سیاسی چالوں سے مخالف کو شکست دینے کے لیے کسی بھی انتہا پر جا کر لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ جنگ کے دوران نہ صرف اپنے حریف کے جسموں کو زخمی کرو بلکہ ان کے دل و دماغ کو بھی مجروح کر کے انتشار اور اختلال کے حربوں سے معطل کر دو۔ انسانی جبلت کا حسین مرقع، بشری حسن اور بد صورتی کی دلنشین داستان۔

Downloaded From  
Paksociety.com







**Downloaded From**  
**PAKSOCIETY.COM**



باطنیوں کی بیخ کنی کے بعد ہلاکو خان نے ذرا دم لیا۔ اس کے آس پاس ارمنی عیسائی اور صلیبی جنگجو تک جمع ہو چکے تھے۔ وہ یروشلم جو متحدہ یورپ کی یلغار سے بھی حاصل نہیں کیا جاسکا تھا، اب اسے منگول عفریت کی مدد سے شاید بہ آسانی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ہلاکو خان کی عیسائی بیوی دوقوز اپنے چوبلی چیمپل (درومی کیتھولک گرجا) میں بڑی مستعدی سے حاضری دیا کرتی۔ یہاں اس کے ہم مذہب بھائی بھی حاضریاں دیتے اور باتوں ہی باتوں میں دوقوز کو یاد دلاتے کہ یروشلم کو مسلمانوں سے حاصل کیے بغیر واپس جانا ایسا ہی ہے جیسے عبادت گاہ سے عبادت کے بغیر واپس چلے جانا۔ دوقوز چیمپل کے سرخ پردوں کے پیچھے سے جواب دیتی۔

”میرا شوہر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا۔ میں جانتی ہوں کہ خاقان نے میرے شوہر کو کیا حکم دے رکھا ہے۔ خاقان کا حکم ہے کہ سرفرد سے مصر کے آخری سرے تک چنگیز خان کے قوانین کو رواج دو۔ جو تمہارے آگے سر جھکا دیں، ان سے فیاضی سے پیش آؤ۔ جو سرکشی اختیار کریں، انہیں ذلیل و خوار کر دو۔“

ایک صلیبی نے کہا۔ ”محترم خاتون! آپ کو یہ بات تو معلوم ہی ہوگی کہ یروشلم پر جو ہاتھ قابض ہے، اس کا جسم کہاں ہے؟“

دوقوز نے جواب دیا۔ ”میں جانتی ہوں اور خوب جانتی ہوں، بغداد کا خلیفہ..... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تک جسدِ خلافت پر فیصلہ کن چوٹ نہیں پڑے گی، یروشلم مسلمانوں کے دستِ ظلم سے نجات نہیں حاصل کر سکے گا۔“

صلیبی مجاہد بارغ بارغ ہو گیا۔ اس نے اپنے سینے پر اشاروں سے صلیب بنائی اور دوقوز کو مؤدبانہ مخاطب کیا۔ ”خاتون محترم! اگر آپ نے یہ کام کرادیا تو آپ پر ہمیشہ آسمانی برکتوں کا نزول ہوتا رہے گا۔“

دوقوز چیمپل سے نکل کر اپنے خیمے میں چلی گئی۔ وہاں یہ پیغام ملا کہ ہلاکو خان نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ دربار میں دوقوز کی جگہ، ہلاکو خان کے برابر داہنی جانب تھی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے دوقوز کو کہیں باہر سے نہیں، خیمے کے عقبی دروازے سے داخل ہونا پڑا۔ دوقوز نے اس دربار میں منگول سرداروں، شامانوں (ساحروں) عیسائی حلیفوں اور مشہور جنرل قطبوغا کو یوں کھڑے دیکھا کہ ان کی نظریں ہلاکو کی طرف نہیں اٹھ رہی تھیں۔ ہلاکو کے بائیں طرف اس کے بیٹے بیٹھے تھے لیکن دوقوز کی نظریں

ایک ایسے شخص پر پڑ کر رک گئیں جو اپنے لباس اور وضع قطع سے مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ دوقوز نے ہلاکو کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس اجنبی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”خان محترم! آپ کے دربار میں یہ کون شخص ہے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”نصیر الدین طوسی، شیخ الجبال کا وزیر۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہمارے پاس رہے گا۔“

دوقوز نے پوچھا۔ ”کیا یہ مسلمان ہے؟“

ہلاکو نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ مسلمان ہے۔“

دوقوز کے چہرے پر فکر مندی کے بادل چھا گئے۔ وہ نصیر الدین کی بابت کھل کر گفتگو نہیں کر سکتی تھی۔ ہلاکو نے اس کے تردد کو بھانپ لیا۔ پوچھا۔ ”کیا تو کچھ کہنا چاہتی ہے؟“

دوقوز نے جواب دیا۔ ”خان محترم! مجھ کو نہیں معلوم کہ نصیر الدین ہمارے ساتھ کتنی وفاداری دکھائے گا لیکن میں مسلمانوں پر اعتبار نہیں کر سکتی۔“

ہلاکو نے دوقوز کو نصیر الدین کی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کی، بولا۔ ”ہم نے شیخ الجبال پر قابو اسی شخص کے مشوروں سے پایا تھا۔ یہ میرا نمک خوار بن چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ تمک کا حق ادا کرے گا۔“

دوقوز نے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ ”کیا بغداد کے خلاف بھی، یروشلم کے خلاف بھی؟“

ہلاکو نے جواب دیا۔ ”ہاں، ان دونوں کے خلاف بھی۔ نصیر الدین طوسی نہایت دیانت دار انسان ہے، کم از کم میں تو اسے دھوکے باز نہیں کہہ سکتا۔“

ہلاکو خان نے دربار میں موجود کئی مسلمانوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے سوال کیا۔ ”میرے مسلمان دوستو! خدا تمہیں راہِ حق پر لائے۔ ذرا یہ تو بتانا کہ تمہارا خلیفہ ہم سے مقابلہ کر کے کیا فائدہ یا نقصان اٹھائے گا؟“

ایک مسلمان نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے آپ کا لشکر بغداد کو فتح کر لے لیکن فتح بغداد کے بعد امیر المومنین کو نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔“

ہلاکو خان نے چونک کر پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

مسلمان نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین کا تعلق رسول اللہ کے خاندان سے ہے چنانچہ اگر امیر المومنین کا خون زمین پر گر گیا تو زمین کا نپنے لگے گی اور آسمان آگ برسائے گا۔“

نصیر الدین طوسی مسکرانے لگا۔ ہلاکو نے ایک دوسرے مسلمان سے پوچھا۔ ”اور اس سلسلے میں تو کیا کہتا ہے؟“

اس دوسرے مسلمان نے رک رک کر نظریں ملائے



کرتے ہیں۔ تم ہمیں بغداد میں داخلے سے نہیں روک سکتے کیونکہ ہم طاقتور بھی ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ اپنا حق کس طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ دیکھو، خبردار..... یا ک کے نو دموں والے چنگیزی پرچم کے مقابلے پر نہ آنا۔ اگر ایسی غلطی کی تو تمہاری خیر نہیں۔“

اس خط کو ایک موٹے تازے منگول کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ منگول بھیڑیے کی بھوری کھال اوڑھے ہوئے تھا اور اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ دشوار گزار ہندی نالوں اور اونچے اونچے پرچے کو ہستانی سلسلوں کو عبور کرنے میں ماہر تھا۔ ہلاکو نے اس کو چار آدمی اور دے دیے۔ ان چاروں نے بھی بھیڑیوں کی کھالیں اوڑھ رکھی تھیں اور ان سب کے گھوڑوں کی راس میں چاندی کے سکے پروئے ہوئے تھے۔ قاصدوں کو رخصت کر دینے کے بعد ہلاکو خان نے دربار برخواست کر دیا۔ دو قوز عقبی دروازے سے دوسرے خیمے میں چل گئی۔ خواجہ طوسی اور چند عیسائی درباری ہلاکو کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

دو قوز کے اشارے پر ایک راہب نے ہلاکو خان کو راستے میں روک لیا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خان محترم! ہمیں معلوم ہے کہ خدا اور خداوند مسیح نے آپ کو مسیحیت کا نجات دہندہ بنا کے بھیجا ہے۔ یروشلیم آپ کو آواز دے رہا ہے، آپ کے بازوؤں میں خدا نے قوت کے شعلے بھر دیے ہیں۔ آپ قہر خداوندی ہیں جو باطل پر برقِ خاطر بن کر گرے گا۔“

ہلاکو نے خواجہ طوسی سے پوچھا۔ ”کیا یہ شخص عربی بول رہا ہے؟“

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ ”جی بندہ پرورد۔ یہ شامی معلوم ہوتا ہے۔“

ہلاکو نے پوچھا۔ ”ابھی ابھی یہ کیا کہہ رہا تھا؟“ خواجہ نے اس کا مطلب سمجھا دیا۔ ہلاکو نے راہب سے پوچھا۔ ”خدا نے اپنا قہر کسی عیسائی کی شکل میں کیوں نہیں نازل کیا؟“

راہب نے جواب دیا۔ ”خدا اپنے کام جس سے چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ وہ بڑی قدرت والا ہے۔“

اسی وقت اس کے سامنے سے دو قوز کی سواری گزری جو پھیل کی طرف جا رہی تھی۔ سواری کے دائیں بائیں اور پیچھے مسیحیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی چل رہی تھی۔ راہب نے عرض کیا۔ ”جناب والا! خدا انسانوں کو راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیا پھیل تک چلنے کی

بغیر جواب دیا۔ ”میں اپنے مسلمان بھائی کا ہم خیال ہوں۔ امیر المومنین کا خون اگر زمین پر گر گیا تو اللہ اس حصہ زمین کو الٹ دے گا اور آسمان امیر المومنین کے قاتلوں سے عبرت ناک انتقام لے گا۔ مجھ کو جو کچھ معلوم تھا، بتا دیا..... آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔“

ہلاکو نے نصیر الدین سے پوچھا۔ ”اور تو کیا کہتا ہے؟“ نصیر الدین نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اپنے مسلمان بھائیوں سے پوچھا۔ ”تم دونوں کو یہ بات کس نے بتائی کہ اگر امیر المومنین کا خون بہا تو خدا اس حصہ زمین کو الٹ دے گا اور آسمان امیر المومنین کے قاتلوں سے عبرت ناک انتقام لے گا؟“

ایک مسلمان نے جواب دیا۔ ”خواجہ طوسی! آپ کو یہ بات ہم سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔“

خواجہ نے کہا۔ ”بے شک یہ بات میں تمام مسلمانوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتا ہوں۔“ پھر ہلاکو خان کو مخاطب کیا۔ ”محترم ایل خان! (چھوٹے خان) امیر المومنین کی ہلاکت پر نہ تو زمین کانپے گی اور نہ ہی آسمان ناراض ہوگا۔ ذرا ان سادہ لوح مسلمانوں سے یہ تو پوچھیے کہ جب زکریاؑ پیغمبر کو آرے سے چیر کر اور پیغمبر یحییٰؑ کا خون بہا کر مار دیا گیا تھا اور حسین ابن علیؑ کو کر بلا میں شہید کر دیا گیا تھا تو اس وقت نہ تو زمین ہلے تھی، نہ ہی آسمان کانپا تھا پھر کیا مستعصم باللہ ان مذکورہ ہستیوں سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔“

ہلاکو نصیر الدین طوسی کے طرز استدلال سے بہت خوش ہوا۔ دو قوز سے کہا۔ ”میں اس دانا دینا کی وفاداری پر یقین رکھتا ہوں۔“

دربار میں موجود مسلمان لا جواب ہو چکے تھے۔ ہلاکو نے انہیں ذلیل کر کے خیمے سے نکلوا دیا۔ عیسائیوں کے چہرے خوشی سے تہمتارے تھے۔

ہلاکو نے خواجہ طوسی کو حکم دیا۔ ”اسی وقت خلافت بغداد کو ایک خط لکھ دے کیونکہ تجھ کو خلیفہ کی زبان آتی ہے۔“ چنانچہ ہلاکو خان کی طرف سے خواجہ طوسی نے ایک چند سطر کی خط لکھ دیا۔

”تم جانتے ہو کہ چنگیز خان کے زمانے سے اب تک دنیا کی مختلف قوموں کا منگول فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہو چکا ہے۔ ہم بغداد آرہے ہیں۔ اپنے معزز مہمانوں کے لیے اس کے سارے دروازے کھول دو۔ چونکہ ماضی میں بغداد کے دروازے خوارزمیوں اور سلجوقیوں کے لیے کھولے جا چکے ہیں اس لیے اسی حق کو اپنے لیے استعمال



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





آپ بھی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟“

ہلاکو نے جواب دیا۔ ”دو قوتوں تو جا رہی ہے میں وہاں جا کر کیا کروں گا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ خدا اس بھیڑ بھاڑ کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ خدا خواہ مخواہ پریشانی اٹھائے۔“

راہب منہ لٹکا کر ایک طرف جانے لگا۔ ہلاکو اس کی مایوس اور افسردہ شکل دیکھ کر مسکرایا اور اس کو روک کر حکم دیا۔ ”تو چپقل میں چلا جا، وہاں تیرے مذہب اور تیری قوم کے کافی لوگ موجود ہوں گے۔ تم سب اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔“

راہب چلا گیا۔ ہلاکو خان ٹہل ٹہل کر خواجہ طوسی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے خلافت عباسیہ کو دھمکی آمیز خط بھیج تو دیا تھا مگر ادھر سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ اپنے دادا چنگیز خان کی طرح اس کو بھی خلافت عباسیہ کی طاقت کی عظمت کا احساس تھا۔

خواجہ نصیر الدین کی تیز نظریں ہلاکو خان کی بے چینی کو بھانپ رہی تھیں اور ہلاکو خان حتی الامکان اپنے اندرونی خلفشار کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ خواجہ طوسی کیا خلافت عباسیہ آج بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنی سالوں پہلے صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں تھی؟“ خواجہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اب وہ انحطاط پذیر ہے، زوال آمادہ مائل بہ انتشار۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”خواجہ طوسی! ہمارا آبائی طریقہ جنگ یہ ہے کہ ہم اپنے دشمن کے خلاف بیک وقت کئی محاذ جنگ کھول دیتے ہیں اور جب ان میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر اسلحہ اور گھوڑوں کے ساتھ میدان جنگ میں اتر پڑتے ہیں۔“

خواجہ نے کہا۔ ”بے شک! جنگ کا ماہرانہ طریقہ بھی یہی ہے۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”خلافت عباسیہ لاکھ لٹ گئی ہو مگر پھر بھی وہ عالم اسلام کی طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ عباسی خلیفہ مستعصم نااہل ہے اور اس کے لوگ اس سے خوش نہیں ہیں۔“

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! دنیا کے بیشتر حکمرانوں سے ان کی رعایا کبھی خوش نہیں رہی۔ لوگ تبدیلیاں چاہتے ہیں اور برسر اقتدار شخص سے زیادہ عرصہ خوش نہیں رہتے اور یہ برسر اقتدار شخص نااہل، نااہل، احمق اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہو تو اس کے امراء اس کو بہ

آسانی دیوے کر اپنی مرضی اور پسند کا کوئی کمزور شخص بٹھا کر اس کی آڑ میں حکومت کرنے لگتے ہیں۔“

ہلاکو خان مسکراتے لگا۔ ”میں یہی بات کہنا چاہتا تھا۔ تم مستعصم کے امراء سے رابطہ قائم کرو اور انہیں بتاؤ کہ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ بغداد میں امن و امان رہے اور وہاں کے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو عدم تحفظ کا احساس نہ ہو۔ میں بغداد اس لیے پہنچنا چاہتا ہوں کہ وہاں کے چند امراء مجھ سے درخواست کر رہے ہیں کہ میں ان کی مدد کروں اور بغداد کی حکومت کسی لائق فائق شخص کے حوالے کر دوں۔“

خواجہ طوسی کے خلافت بغداد کے وزیر ابن علقمی سے خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ کئی سال پہلے خواجہ طوسی نے ایک کتاب (اپنی تصنیف) کے ذریعے بغداد کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر ابن علقمی کی شرارت کی وجہ سے خواجہ طوسی ناکام اور مایوس ہو گیا تھا۔ خواجہ طوسی کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب وہ بہت جلد خلیفہ اور اس کے وزیر سے انتقام لے سکے گا۔

ہلاکو خان ہر روز اپنے لشکر میں گھوم پھر کر اپنی سپاہ کے جوش و خروش کا اندازہ لگایا کرتا تھا۔ اس نے لوہاروں کو ہتھیار بناتے دیکھا۔ تیر، تلواریں، نیزے کی انیاں، خنجر، حربے اور جانے کیا کیا۔ بڑھی تیر بناتے رہتے۔ اس تیر میں لوہے کے پھل پیوست کرتے رہتے۔ لشکر کے بچوں سچ یا ک کی نودموں والا پرچم نصب تھا جس کے لیے ہلاکو خان اور اس کی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ خان اعظم چنگیز خان کی روح اس میں حلول کر گئی ہے اور یہ پرچم جہاں بھی جائے گا فتح مندی اس کا مقدر ہوگی۔

ہلاکو خان جدھر سے بھی گزر جاتا، اپنے رعب اور دیدے کے اثرات چھوڑ جاتا۔ خواجہ طوسی اس کے ساتھ رہتا اور دونوں مختلف موضوعات، واقعات، حالات اور شخصیات پر باتیں کرتے رہتے۔ ہلاکو خواجہ طوسی سے بہت متاثر تھا لیکن ایک بات ہلاکو کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے لشکر میں عیسائیوں کی بہتات دیکھی تھی۔ یہ لوگ متفقہ طور پر اس کوشش میں لگے رہتے کہ وہ کسی بھی طرح ہلاکو خان اور اس کے لشکر کو یروشلم اور بغداد تک لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تاکہ مسلمانوں کو فیصلہ کن شکست دے کر وہ یروشلم کو آزاد صلیب کے سائے میں دیکھ سکیں۔ اس کی فوج میں یہودی بھی تھے اور انہیں بھی اپنی قوم کا فائدہ مقصود تھا لیکن ان سب کے برعکس اس کی فوج کے مسلمان اس



طرح نہیں سوچتے تھے۔ خواجہ طوسی نے شیخ الجبال اور اس کے متبعین کے خلاف ہلاکو خان کا ساتھ دیا تھا اور اب خواجہ خلافت عباسیہ بغداد کے خلاف ہلاکو خان کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ وہ خواجہ طوسی کی بڑی عزت کرتا تھا مگر یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ ایک مسلمان دانش مند اپنی قوم اور اپنے ہم مذہبوں کے خلاف اس کی کیوں مدد کر رہا ہے؟

ہلاکو خان نے اپنی بیوی دو قوز کو چھپل سے لٹکتے دیکھا۔۔۔۔۔ دو قوز کو چند سچی اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی سے پوچھا۔ ”خواجہ! تیری بابت ایک سوال میرے دل و دماغ کو ہر وقت پریشان کرتا رہتا ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ میں تجھ سے یہ سوال نہ کروں اور خود ہی اس کا جواب تلاش کر لوں لیکن تھک ہار کر آج میں تجھ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔“

خواجہ طوسی نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔ ”محترم ایل خان! اپنا سوال فرمائیں، اللہ نے چاہا تو میں اس کا اطمینان بخش جواب دے کر آپ کو خوش کر دوں گا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”خواجہ طوسی! میں تیری بڑی عزت کرتا ہوں۔ آج تک میں اپنا یہ سوال اس لیے نہیں کر سکا تھا کہ اگر تو اس کا کوئی معقول اور اطمینان بخش جواب نہ دے سکا تو، تو خواجہ میری نظر سے گر جائے گا۔“ خواجہ طوسی پریشان ہو رہا تھا لیکن اپنی اس پریشانی کو چھپائے ہوئے تھا۔

ہلاکو خان نے کہا۔ ”خواجہ! میں دیکھتا ہوں میرے لشکر کے عیسائی اپنی قوم کا بھلا چاہتے ہیں اور میری دسالت سے یروشلم کی آزادی اور بغداد کی بربادی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح یہودی بھی اپنے مفاد کی سوچتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کے برعکس ایک تو ہے کہ میرے مفاد اور اپنی قوم کے خلاف سوچنے اور قدم اٹھانے میں بڑی سرگرمی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔ آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

خواجہ طوسی نے اطمینان کی سانس لی، بولا۔ ”اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ تعصب دنیا کی بدترین اور بہترین چیز ہے۔ تعصب ہی کسی قوم اور مذہب کو بام عروج تک لے جاتا ہے اور تعصب ہی اسے قعر مذلت میں گرا کر نمونہ عبرت بنا دیتا ہے۔“

ہلاکو خان اس کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ خواجہ طوسی نے ذرا سادہ لیا اور پھر بولنے لگا۔ ”محترم

خان! آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ میں اچھے اور برے تعصب کی تعریف کر دوں۔۔۔۔۔ اچھا تعصب یہ ہے کہ ناجائز اور نامعقولوں کے مقابلے میں میں اپنے بھائی، اپنے ہم مذہب اور ہم قوم کی جائز اور معقول معاملات میں مدد کروں اور بدترین تعصب یہ ہے کہ میں اپنے نامعقول، ناجائز اور غلط بھائی کا معقول اور جائز غیر کے مقابلے میں ساتھ دوں۔ اس کی مدد کروں۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ ایک عادل اور سچا غیر میرے نامعقول، جھوٹے اور ناجائز بھائیوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا ہے تو مجھے مجبوراً اور اخلاقاً اس عادل اور سچے غیر کا ساتھ دینا پڑا۔ رہ گئے عیسائی اور یہودی تو وہ اپنے مظلوم بھائیوں کا ساتھ دے کر حق کا ساتھ دے رہے ہیں۔“

خواجہ طوسی کی طاقت لسانی نے ہلاکو خان کو زیر کر لیا تھا۔ وہ حیرت سے خواجہ کی صورت دیکھتا رہ گیا، پوچھا۔ ”کیا تو مجھ کو واقعی سچا اور عادل سمجھتا ہے؟“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”سچا اور عادل سمجھنا کیا معنی؟ میں نے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ رکھا ہے۔“

ہلاکو نے اپنی خوشی کو اندر ہی اندر دبا رکھا تھا، بولا۔ ”تجھ جیسے عقل مند اور بے لاگ شخص کی زبان سے اپنے بارے میں کچھ جان کر خوشی ہو رہی ہے۔ جاودانی نیلا آسمان مجھے تیرے معیار پر پورا اتارے۔“

خواجہ طوسی نے عرض کیا۔ ”خدا آپ کے ساتھ ہے۔ میرے اپنے عقیدے کے مطابق آپ کے دادا، آپ کے چچا، بھائی اور خود آپ کے ہاتھوں جتنے مسلمان مارے گئے ہیں، وہ مسلمان نہیں تھے، بے دین اور بے عقیدہ لوگ تھے۔ اگر خدا ہمیں وہ بینائی عطا فرماتا جس سے ہم انسانوں کو ان کی فطری اور حقیقی خصوصیات کی شکل میں دیکھ سکتے تو ان مرنے والوں کی شکلوں میں سانپ، بھیڑیے، کتے، شیر اور بچھو دکھائی دیتے۔ یہ انسانوں کی شکل میں جانور ہیں۔“

ہلاکو خان کو خواجہ طوسی نے مطمئن اور لا جواب کر دیا تھا۔ وہ خواجہ طوسی کو ایک سبزہ زار پر لے گیا۔ یہاں گھاس پر لوگ پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہلاکو خان کو اس سبزے پر آتے دیکھا تو ادھر ادھر چلے گئے لیکن ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو جہاں بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا۔ یہ شخص اپنے حلیے، لباس اور چہرے کے خط و خال سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس نے ہلاکو کو اپنے سر پر آتا دیکھا تو کھڑے ہو کر خندہ پیشانی سے عرض کیا۔ ”محترم ایل خان! میں آپ



”کیا تو واقعی تائی جوت قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”محترم خان! جیسا کہ خود آپ بھی جانتے ہیں، ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔“

خواجہ طوسی نے کہا۔ ”درداغ! چونکہ تو زبان و بیان اور اپنے طور طریق سے تائی جوت نہیں لگ رہا، اس لیے خان محترم کو شک ہے۔ اب تو یہ بتا کہ اتنا مہذب کیونکر ہو گیا؟ کیا تجھ کو ہماری زبانیں آتی ہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”جب سو بودائی بہادر ہنگری میں داؤد شجاعت دے رہا تھا، میں اپنے باپ کے ساتھ بخارا چلا آیا تھا پھر میرا باپ مر گیا اور میں کرائت قبیلے کے ایک شخص کے زیر سایہ چلا گیا۔ مجھ کو مسلمانوں کی تہذیب اور مشق نے متاثر کیا اور میں دن رات اس کوشش اور جدوجہد میں رہا کہ کسی طرح میں بھی انہی جیسا ہو جاؤں۔ ان لوگوں میں کھل مل جاؤں۔ میں نے فارسی پڑھی، عربی پڑھی، میں ترکی بھی جانتا ہوں اور فقہاء کی کئی زبانیں بھی آتی ہیں۔ ان زبانوں نے میرا تہذیب بھی بدل دیا اور مزاج کی تبدیلی اور کوشش کی جگہ نرمی اور سکون آگئی اور اب میں اپنے چہرے اور خدو خال سے تو تائی جوت قبیلے کا ایک فرد ہوں مگر لباس، اس کی تراش و خراش اور اپنی وضع قطع میں یہاں کا مسلمان ہوں۔“

ہلاکو خان نے نفرت سے منہ پھیر لیا، پوچھا۔ ”کیا تو مسلمان ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں تائی جوت قبیلے کا ایک شخص ہوں اور جاودانی نیلے آسمان پر یقین رکھتا ہوں۔“

خواجہ طوسی نے درداغ سے پہلے تو فارسی میں باتیں کیں، اس کے بعد عربی ذریعہ گفتگو بن گئی۔ خواجہ کو حیرت اس بات کی تھی کہ درداغ کا لہجہ بھی فارسی یا عربی بن گیا تھا، پوچھا۔ ”تیرا خیمہ؟“

درداغ اپنے در پر ہی کھڑا ہوا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رہا میرا خیمہ۔“

ہلاکو خان کا عجب حال تھا۔ وہ درداغ سے خوش بھی تھا اور ناخوش بھی۔ خوش اس لیے تھا کہ ایک تائی جوت جوان عربی، فارسی اور کئی دوسری زبانیں سیکھ کر انہی جیسا بن گیا اور ناخوش اس بات پر تھا کہ اس نے یہ کیا کیا کہ اپنی وضع قطع اور طریقہ بودو ماندیک چھوڑ دیا تھا۔

خواجہ طوسی نے کہا۔ ”محترم خان! درداغ کے لیے کوئی حکم۔“

ہلاکو خان نے درداغ کو خوشوار نظروں سے دیکھا اور پھر

کو آداب بجالاتا ہوں۔“ ہلاکو خان نے اس شخص کو سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھا۔ ”تیرا کس ملک سے کس مذہب سے اور کس قوم سے تعلق ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! میں آدم کا بیٹا ہوں اور آپ بھی آدم ہی کے بیٹے ہیں۔ کیا ہم دونوں بھائی بھائی نہیں ہیں؟“

ہلاکو خان چکرا گیا۔ یہ کیسا نڈر اور دلیر شخص تھا جو اس کے رعب میں نہیں آتا تھا۔ اس نے تیوریاں چڑھائیں اور ڈانٹا۔ ”اوبد نصیب انسان! کیا تو مجھے نہیں جانتا، میں ہلاکو خان ہوں۔ جب میں بولتا ہوں تو دوسرے گنگ ہو جاتے ہیں۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”محترم خان! میں نے آپ سے باتیں تو کی ہیں مگر گستاخی سے نہیں پیش آیا۔ اگر میں نے کسی قسم کی بے ادبی کی ہے اور آپ کے احساس برتری کو مجروح کیا ہے تو مجھے معاف فرما دیجیے کیونکہ عفو، درگزر، چشم پوشی اور ستاری آپ جیسے بڑے انسانوں کے زیور مردانگی ہیں۔“

ہلاکو خان بہت برہم تھا، بولا۔ ”میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو زیور بہن کر عورتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں تجھ کو تیری جسارت اور گستاخی کی سزا ضرور دوں گا۔“

خواجہ طوسی اس شخص سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے ہلاکو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بندہ پرور! میرا دل کہتا ہے کہ یہ شخص ہمارے کام آئے گا اس لیے اس کو سزا نہ دی جائے۔“

ہلاکو خان اس شخص کے چہرے مہرے اور خدو خال سے اس کو متکول سمجھنے پر مجبور تھا مگر اس کی باتیں اسے خوارزم اور بخارا سے بغداد تک کے درمیانی علاقے کا ثابت کر رہی تھیں۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ”میں اس وقت تک اسے نہیں معاف کروں گا جب تک یہ مجھے اپنے حسب نسب کی بابت صاف صاف نہیں بتا دے گا۔“

خواجہ طوسی نے پوچھا۔ ”اے شخص تیرا نام؟“

اس نے جواب دیا۔ ”درداغ۔“

ہلاکو خان نے چونک کر اس شخص کو دیکھا، پوچھا۔ ”لیکن یہ نام تو صحرائے گوبی کے اس پار جھیل بیکال کے آس پاس رکھے جاتے ہیں؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”خان محترم! میں تائی جوت قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا خاندان جھیل بیکال کے شمال مشرق میں آباد تھا۔“

ہلاکو خان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔



دھڑب اور جنگ و جرح میں وہی طریقے اختیار کریں گی جو ان کے مقابل اختیار کیے جاتے رہے ہیں۔“

ہلاکو خان نے شاید خواجہ طوسی کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرا دادا چنگیز خان یوں تو کتاب والوں کو بیکار، بزدل اور نکما سمجھتا تھا مگر ختائی دانش ور۔۔ لیوچت سائی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ میرا خیال ہے درداغ بھی مجھ سے عزت کرائے گا۔“

## قارئین متوجہ ہوں

پرچا  
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیا ب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام -

☆ ممکن ہو تو تک اسٹال کا PTCL مامو مائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

## جاسوسی دائجست پبلی کیشنز

سپنس، حاسوی، یا لیزہ، سرگزشت

63-C فیۃ الیکستینش انیشس باؤ سنگ اتھارٹی بین ونگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: [jdpgroup@hotmail.com](mailto:jdpgroup@hotmail.com)

خواجہ طوسی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔  
میں چاہتا ہوں کہ اس جوان سے کوئی کام لیا جائے۔“

خواجہ طوسی نے پوچھا۔ ”درواغ ہمارے کس کام آسکتا ہے خاقان محترم! یہ ہمارے لشکر میں تو شامل ہی ہے، وقت آنے پر یہ ہمارے کام یوں بھی آئے گا۔“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”نہیں، یہ کام نہیں..... لڑنے کے لیے میرے لشکر میں سپاہیوں کی کوئی کمی نہیں۔ میں اس سے کوئی اور کام لینا چاہتا ہوں۔“ پھر اچانک درواغ سے پوچھا۔ ”تو تنہا ہے یا کچھ رشتے دار بھی ہیں تیرے؟“ درواغ نے جواب دیا۔ ”میں تنہا ہوں خانِ محترم! بالکل تنہا۔“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”تب پھر تو کل صبح مجھ سے ملاقات کرے گا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”میں بہت خوش ہوں، بہت زیادہ خوش کہ تائی جوت قبیلے کا جوان مسلمانوں کی کئی زبانیں جانتا ہے، حیرت! گویا کہ تو کتابی آدمی ہے۔ بخارا کی کتابیں پڑھنے والوں جیسا..... یعنی اب ہم میں بھی ایسے جوان موجود ہیں جو سفارت اور.....“ اچانک خواجہ طوسی کی طرف گھوم گیا۔ ”خواجہ طوسی! میرا دادا چنگیز خان جس طرح جنگیں لڑا کرتا تھا، میں اس میں ذرا سی تبدیلی، ذرا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں، تیرا کیا خیال ہے خواجہ محترم!“ خواجہ طوسی نے دبی زبان میں عرض کیا۔ ”جب تک مجھے آپ کی ذرا سی تبدیلی اور اضافے کا علم نہ ہو جائے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔“

ہلا کو خان نے دردِ اغ کو علم دیا۔ ”اب میں واپس جا رہا ہوں۔ کل علی الصباح..... ضروری ہے..... میں تیرا انتظار کروں گا۔“

ہلا کو خان خواجہ طوسی کے ساتھ واپس ہوا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ خواجہ سے کہنے لگا۔ ”خواجہ طوسی! آج سے پہلے تو میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارے قبائل میں بھی کتابوں والے پیدا ہوں گے۔ کیا تو نے غور نہیں کیا، درداغ کو مسلمانوں کی کئی زبانیں آتی ہیں۔ کمال کر دیا اس جوان نے!“

خواجہ طوسی نے آہستہ سے کہا۔ ”خان محترم! جنگیں قوموں کو قریب لے آتی ہیں اور ان کی زبانوں میں اضافے ہونے لگتے ہیں۔ ان کا تمدن بھی ایک دوسرے سے متاثر ہو جاتا ہے جس طرح درداغ نے ہماری زبانیں اور ہمارا تمدن حاصل کر لیا ہے، اسی طرح ایک دن یہ بھی دیکھنے میں آئے گا کہ خاں محترم سے نبرد آزما قومیں حرب



ہوسکتا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”اس زعم میں نہ رہ۔ میں انسانوں سے کام لینا جانتا ہوں۔ میں سفارت کا کام کسی بھی شخص سے لے سکتا ہوں۔“

خواجہ طوسی نے جوان کی سفارش کر دی۔ ”خداں محترم! یہ ہمارے جسم کا ایک حصہ ہے، صحرائے گوبی کے اس پار قبائل کا ایک نہایت قیمتی نوجوان..... دیکھیے اس کو بھی ضائع نہ کر دیجیے گا۔“

ہلاکو خان نے دردراغ کو حکم دیا۔ ”تو اس وقت تک خاموش بیٹھا رہے گا جب تک میں خود تجھ کو مخاطب نہ کروں۔“ دردراغ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ہلاکو خان حاضرین دربار سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے انہیں بغداد اور خلیفہ بغداد کی بابت بتایا کہ وہ کیسا لالچی، کنبوس اور عاقبت نااندیش اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہے۔ ”ہمارا آئندہ مقابلہ اسی سے ہوگا، جہاں تک میں جانتا ہوں میرے آدمیوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ مستعصم ہم سے نہیں لڑے گا۔ ہم اس پر کئی احسان کر چکے ہیں.....“

خواجہ طوسی نے حیرت سے پوچھا۔ ”پوری بات سنے بغیر یہ تمک جلال آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آپ نے عباسی خلیفہ مستعصم پر کون سے احسانات فرمائے ہیں؟“ ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”وہ شیخ الجبال کے فدائیوں سے عاجز تھا، میں نے ان کا قلع قمع کر دیا۔ کیا اس ایک سو ستر سالہ قتلے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا آسان کام تھا؟ کیا یہ غیر معمولی کام نہیں تھا؟ کیا میں نے اس طرح خلیفہ پر احسان عظیم نہیں کر دیا؟“

خواجہ طوسی نے سر جھکا لیا، بولا۔ ”بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔“

ہلاکو خان کہتا رہا۔ ”میں خلیفہ کو ہٹانا نہیں چاہتا لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں کہ خلیفہ کے دار الخلافہ بغداد میں دو فرقے آپس میں خون خرابا کریں۔ کسی بھی حکمران کے لیے یہ بڑی شرمناک بات ہے کہ جس جگہ وہ تشریف فرما ہو، وہیں اس کے آس پاس لوگ ہاتھ پائی میں مشغول ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس حکمران کا جلال اور اقبال اس کا ساتھ چھوڑ چکا اور یہ حقیقت ہے کہ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ خلیفہ بغداد کا اقبال اس سے چھن چکا ہے تو میں نے بہ تائید ایزدی اس نا اہل سے حکومت چھین کر کسی اہل کے سپرد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔“

دردراغ ہلاکو خان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا

خان سے جدا ہو کر اپنی قیام گاہ میں چلا گیا۔ خواجہ کا دماغ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ وہ عالم خیال میں بغداد کی سیر کر رہا تھا۔ اس نے قصر الذہب میں خلیفہ مستعصم باللہ کو بے دست و پا دیکھا۔ خلیفہ کے خوشامدی عیش پرست مصاحبین زندہ مستعصم سے یوں چٹے ہوئے تھے جس طرح بوڑھے گدھ مردہ یا نیم مردہ لاشوں سے چٹے ہوں۔

☆☆☆

ہلاکو خان کچھ دیر کے لیے اپنے خیمے سے باہر نکلا اور اس کی نظروں نے دور تک دردراغ کو تلاش کیا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آیا تو وہ دوبارہ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ دردراغ سے ناراض ہو چکا تھا۔

خواجہ طوسی جب ہلاکو خان کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ بہت برہم تھا۔ ہلاکو خان کے سامنے غیر معمولی حیثیت کے لوگ موجود تھے اور یہ سارے کے سارے ہلاکو خان میں اس تبدیلی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہلاکو خان نے خواجہ طوسی کو نہایت برہمی سے مخاطب کیا۔ ”خواجہ طوسی! یہ کتاب والے لوگ قول و قرار اور عہد معاہدے کے پابند نہیں ہوتے، بس ان کی یہی چیز ناقابل برداشت ہوتی ہے اور میں یہ چیز نہیں برداشت کر سکتا۔“ اس نے دربان نے ہلاکو خان کو مطلع کیا۔ ”ایک دردراغ نامی جوان باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔“

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”اس کو فوراً حاضر کیا جائے۔“ کچھ دیر بعد دردراغ کو ہلاکو خان کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ ہلاکو اس کو دیکھتے ہی گرم ہو گیا۔ ”تجھ کو میں نے طلب کیا تھا پھر اتنی دیر کہاں لگا دی؟ میں پوچھتا ہوں کیا تو اسی طرح اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے کیا؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”محترم خان! میں ذرا پہلے بھی آ سکتا تھا مگر شخص اس خیال سے نہیں آیا کہ آپ ممکن ہے کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔ آپ اپنے اہل لوگوں کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کر رہے ہوں۔“

ہلاکو خان نے ڈانٹ دیا۔ ”بند کر اپنی بکواس۔ میں تجھ پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ پر اعتبار کریں گے۔ ضرور کریں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ جھیل بیکال کے چاروں طرف آباد قبائل علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں لیکن میں جو تائی جوت کا ایک شریف ترین فرد ہوں مسلمانوں کی زبانیں سیکھ چکا ہوں خان محترم! سفارتی معاملات میں جتنا وفادار میں ہو سکتا ہوں، کوئی اور نہیں



محبت: جس کے دم سے ریسٹورنٹ آباد ہیں۔  
اسٹوڈنٹ: مستقبل کا بے روزگار طبقہ۔  
پردہ: جسے لڑکیاں کھڑکیوں پر لٹکاتی ہیں۔  
دل: بغیر آپریشن کے دیے جانے والا عضو  
کالج: تفریح گاہ

یونیورسٹی: خوشگوار زندگی کے آخری ایام  
شادی: ان تمام گناہوں کی سزا

مرسلہ: محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

حریف کو کس طرح چت کیا جاسکتا ہے۔ رزم گاہ حیات میں ہوشیار اور لائق انسانوں کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے، اپنے دشمن کو بالکل مغلوب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے جسم کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو بھی مجروح کر دیا جائے۔ اس کے دل و دماغ میں انتشار اور اختلال پیدا کر دیا جائے۔ میرے دادا چنگیز خان کی طرح میرا علم بھی کتابی نہیں اکتسابی اور تجرباتی ہے۔ میں اور میری فوج خلیفہ بغداد اور اس کی سپاہ کے جسموں کو زخمی کر دیں گے لیکن دردناک اور اس جیسے دوسرے جوان خلیفہ اور اس کی فوج کے دل و دماغ کو زخمی کر سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دردناک بغداد پہنچ کر مسلمان ہو جائے اور خلیفہ کو میرے ارادوں سے غافل کر دے۔ مستعصم باللہ کو یقین دلا دے کہ میں اس کے خلاف لشکر کشی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ دردناک خلیفہ اور اس کے مقررین کو یہ بھی بتائے گا کہ میں ہلاکو خان بھی اسلام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں اور کسی بھی دن اپنے مسلمان ہو جانے کا اعلان کر دوں گا۔ اس طرح خلیفہ میری طرف سے غافل اور مطمئن ہو جائے گا اور میں اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلافت عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“

خواجہ طوسی ہلاکو خان کی تجویز سن کر سکتے میں آگیا۔ ہلاکو خان کہتا رہا۔ ”تو اپنے ہی جیسے چند جوانوں کو لے کر بغداد چلا جا اور وہاں کسی مشہور اور بااثر شخص کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لے اور کوشش کر کہ تجھ کو خلیفہ اور اس کے خاص مقررین تک رسائی حاصل ہو جائے۔ تقرب حاصل کرنے کے بعد تو نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے مسلمانوں میں انتشار پھیلاتا رہے گا اور خلیفہ کو یہ باور کرائے گا کہ ہلاکو خان بھی بہت جلد مسلمان ہونے والا ہے۔ یہ ایک خاکہ ہے جس میں رنگ آمیزی تو خود کرے گا۔ جب تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا تو کسی پراسرار شاطر بازی گر کی طرح

تھا۔ ہلاکو خان بولتا رہا۔ ”میں اسلام یا مسلمانوں سے کوئی عناد نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس جمود کو دور کر دوں جو کئی صدیوں سے بغداد پر چھایا ہوا ہے۔“ اس کے بعد ہلاکو خان نے اپنے سرداروں کو یہ حکم دیا کہ وہ بے مثال تیاری شروع کر دیں۔ بغداد پر حملے کی بے مثال تیاریاں..... کیونکہ ہلاکو کا خیال تھا کہ اس کا موجودہ حریف پچھلے تمام حریفوں سے قطعی مختلف اور زیادہ طاقتور ہے۔ طاقتور ان معنی میں کہ پورے عالم اسلام کی عقیدت اور وابستگی کی وجہ سے ہلاکو خان کا بغداد پر حملہ کرنا، گویا حملہ مسلمانوں اور اسلامی قوتوں پر حملہ کرنا ہے۔

دربار پر خاست ہوا مگر درداغ اور خواجہ طوسی کو روک لیا گیا۔ ہلاکو خان دردناک پر ایک بار پھر برہم ہوا۔ ”بتائی جوت کے جوان! یاد رکھ وقت کی پابندی اور انسان کی مستعدی کا رزار حیات میں ہمیشہ بہت اہم رہی ہے۔ اس بات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میرا دادا چنگیز خان فاتح عالم کس طرح بن گیا۔ اس نے اپنے عہد کی عظیم طاقتوں کو کس طرح خاک میں ملا دیا اور اس کی کامیابیوں کا راز کیا تھا؟ آج اس راز پر سے میں پردہ اٹھاتا ہوں۔ میرا دادا چنگیز خان حملے اور دشمن کی سرکوبی برق رفتاری سے کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کے سر پران کی توقع سے پہلے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ بہت تیز تھی، بالکل لکوار کی دھار کی طرح۔ جب وہ اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑتا تو زمین کی طنائیں پہنچ جاتی تھیں، میرا دادا زبردست مردم شناس تھا۔ وہ اقوام عالم کا نباض تھا۔ وہ اپنے سامنے موجود اور مجبور انسانوں کی زبانوں سے ناواقف اور نا آشنا ہونے کے باوجود ان کے چہروں کے تاثرات سے ان کے دلوں کا حال اور ارادے جان لیا کرتا تھا۔ اس کو دھوکا دینا ناممکن تھا۔ میرے کردار اور طریق عمل میں میرے دادا چنگیز خان کی پرچھائیں ملے گی۔ میں بھی اپنے دشمن کو سوچنے اور تیاریاں کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا اور دردناک ست اور خاموش کتابوں کی طرح تو بھی ڈھیلا ڈھالا ہو کر رہ گیا ہے۔ تو نہیں جانتا کہ میں تجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہوں۔“

خواجہ طوسی ہلاکو خان کی باتوں سے بیزار سا لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہلاکو خان کو جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دے، اس کے لیے اتنی تمہید باندھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی کے احساسات کو اس کے... چہرے کے تاثرات سے پڑھ لیا، بولا۔ ”یہ نصیر الدین جو علم و دانش کا پتلا ہے، یہ بھی اس راز سے واقف نہیں کہ اپنے کسی



درداغ نے پریشانی سے پوچھا۔ ”مگر مجھے یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ قبلہ کدھر ہے؟“

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ ”تو جہاں بھی جائے گا، تجھے مساجد سرائے کھڑی دکھائی دیں گی اور یہ طے ہے کہ ہر مسجد کا رخ قبلہ کی طرف ہوگا۔“

درداغ نے اس بات کو لکھ لیا تاکہ جب بھی ضرورت پڑے دیکھ کر سمجھ لیا کرے۔

ہلا کو خان نے درداغ سے پوچھا۔ ”بغداد تو تنہا جائے گا یا چند نوجوان اور ساتھ کر دیے جائیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نی الحال تو مجھے جانے دیجیے۔ دو چار ماہ بعد میری ہی طرح چند نوجوانوں کو بھیج دیا جائے تاکہ خلیفہ عباسی اور بغداد کے مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔“

درداغ کی یہ تجویز ہلا کو خان اور خواجہ طوسی کو یکساں پسند آئی۔ درداغ نے پانی کی چھاگل، چند ہتھیار، زادراہ کے طور پر کچھ کھانے کا سامان، چند کپڑے ساتھ لیے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے لشکر سے جدا ہو گیا۔ اس نے اپنے جسم پر بھیڑیے کی کھال ڈال لی جس سے ہر دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ شخص دوسروں سے قطعی مختلف ہے۔ درداغ کئی دن بعد ایک پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک قافلہ بغداد جانے کے لیے تیار تھا۔ اس قافلے میں انسانی معاشرے کے کافی لوگ شامل تھے۔ سپاہی بھی، تاجر بھی، کاشتکار بھی اور اہل حرفہ بھی۔ دین دار بھی اور دنیا دار بھی۔ عالم بھی اور جاہل بھی۔ درداغ نے اس قافلے میں اپنے لیے ایک دین دار کا انتخاب کیا۔ یہ دین دار عمر رسیدہ شخص خاصا حشم و خدم رکھتا تھا۔ اس کا خیمہ اور دوسرا سامان اونٹوں اور گدھوں پر سفر کر رہا تھا۔ اس کے پاس کھانے پینے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ قافلے کے مسلمانوں کی امامت کا فریضہ بھی انجام دیتا جا رہا تھا۔ قافلے میں عیسائی بھی موجود تھے لیکن یہ کم تھے۔

درداغ کو ایک کوہستانی سلسلے میں پڑاؤ کے دوران بڑی پریشانی پیش آئی۔ یہاں سخت سردی تھی۔ درداغ رات کو کسی چٹان کے نیچے لیٹ کر نیند مار لیتا۔ اس کے پاس بستر بھی نہیں تھا۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ دین دار مسلمان کی طرح اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ وہ کئی بار اس کے سامنے سے گزرا بھی مگر درداغ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ قافلے کے دوسرے لوگ تو درداغ کو دلچسپی سے دیکھتے رہتے لیکن دین دار شخص کو گویا اس سے نفرت تھی۔ وہ

میں نمودار ہو جاؤں گا اور اپنے حصے کا کام کر کے فراغت حاصل کر لوں گا۔“

درداغ کو اس کام میں خطرات بھی محسوس ہوئے اور دلچسپی بھی۔ وہ بغداد جانے اور ہلا کو خان کی تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہلا کو خان نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ”خواجہ طوسی! درداغ کو نماز پڑھنا سکھا دے اور دین اسلام کی بنیادی باتیں بھی سکھا بتا دے تاکہ یہ بغداد میں مار نہ کھا جائے۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”جناب والا! اگر میں اس تجویز میں ذرا سی تبدیلی کر دوں تو؟“

ہلا کو خان نے پوچھا۔ ”کیسی تبدیلی؟“

خواجہ طوسی نے عرض کیا۔ ”محترم خان کی تجویز میں کسی تبدیلی کی بظاہر تو کوئی گنجائش نہیں، یوں سن لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں بغداد کے علمائے کرام کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں گا کہ منگول معاشرے نے یہ جاننے کے بعد کہ میں اسلام کی طرف مائل ہوں اور مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں، مجھ پر بڑے ظلم کیے اور میرا جینا دوبھر ہو گیا۔“

ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”میری طرف سے اجازت ہے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے میرا مقصد حاصل ہو جائے۔“

خواجہ طوسی نے کہا۔ ”میں درداغ کو ایک حد تک نماز روزہ سکھا بتا دوں گا کیونکہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں سال چھ مہینے میں ایسا کر دیتا کہ خلیفہ بھاگا بھاگا پھرتا اور ہر وقت میرے گیت گایا کرتا۔“

درداغ کو ہلا کو خان نے دیر تک سمجھایا اور ہلا کو کی ہر بات سے یہی محسوس ہوتا رہا کہ وہ تائی جوت کے جوان کے پڑھ لکھ جانے سے بے حد خوش ہے اور اب وہ اقوام عالم کے بیچ میں بیٹھ کر مردانہ وار یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے جنگجو اور وحشی قبائل میں بھی پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔

خواجہ طوسی نے اسے کلمہ یاد کرایا، وضو کا طریقہ بتایا، چند سورتیں یاد کرائیں اور بیچ وقت نماز کی بابت سب کچھ یاد کرادیا۔ اس نے ہلا کو خان کے سامنے دو رکعت نماز پڑھ کر دکھا دی۔ خواجہ طوسی نے درداغ کو ذہن نشین کرا دیا۔ ”تو جب بھی نماز پڑھے گا اس بات کا خیال رکھے گا کہ تیرا منہ قبلہ کی طرف رہے۔“



## اقوال زریں

مولانا رومی سے پوچھا گیا زہر کسے کہتے ہیں؟

جواب دیا۔ ہر وہ چیز جو ہماری ضرورت سے زائد ہو وہ ہمارے لیے زہر ہے۔ خواہ وہ قوت اقتدار ہو، دولت ہو، بھوک ہو، انایت ہو، لالچ ہو، سستی و کامیابی ہو محبت ہو، نفرت ہو یا کچھ بھی ہو۔

پوچھا گیا خوف کس چیز کا نام ہے؟  
جواب ملا غیر متوقع صورت حال کو قبول نہ کرنے کا نام خوف ہے۔ اگر ہم غیر متوقع صورت حال کو قبول کر لیں تو یہ ایک ایڈوانس ایک مہم جوئی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پھر پوچھا گیا، حسد سے کہتے ہیں؟  
جواب ملا۔ دوسروں میں خیر اور خوبی کو تسلیم نہ کرنے کا نام حسد ہے۔

پوچھا غصہ کس بلا کا نام ہے؟  
جواب ملا جو امور ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں، ان کو تسلیم نہ کرنے کا نام غصہ ہے۔  
نفرت کسے کہتے ہیں؟  
جواب ملا۔ کسی شخص کو جیسا کہ وہ ہے، تسلیم نہ کرنے کا نام نفرت ہے۔

مرسلہ۔ ظفر اقبال ظفر، کامرہ شرقی  
☆ امیر اور غریب کا فرق کس درجہ غیر فطری ہے۔ ایک ہی دن کی بھوک اور ایک ہی گھنٹے کی پیاس دونوں کو برابر کر دیتی ہے۔

☆ تاریخ کے تجربوں سے ہم سبق نہیں لیتے اس لیے تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہرائی رہتی ہے۔  
☆ دشمن کو بطور تحفہ دینے کے لیے بہترین چیز معافی، مخالف کے لیے قوت برداشت، دوست کو دل، بچے کو اعلیٰ مثال، باپ کو احترام ہے۔

☆ جو لوگ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، ان کے بارے میں طے ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہوتا ہے۔

☆ ارباب ستم ابھی تک ایسی بیڑیاں ایجاد نہیں کر سکے جو انسانی دماغ کو جکڑ سکیں۔

☆ انصاف کا موتی رحم کی سیپ میں ملتا ہے۔

مرسلہ۔ ریاض ہٹ سن ابدال

آخر درداغ کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ قافلہ ایک کوہستانی وادی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ایک چشمے پر نمازی ایک ساتھ وضو کرتے اور بھاگ کر دین دار شخص کی اقتدا میں نماز ادا کرتے۔ درداغ نے جب یہ دیکھا کہ سب نے اس عمر رسیدہ شخص کی امامت میں پیچھے کھڑے ہو کر فجر کی نماز پڑھ لی ہے تو وہ چشمے پر تنہا وضو کرنے پہنچ گیا۔ دین دار شخص اپنے خیمے کے در پر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ارادت مندوں نے اس کی توجہ درداغ کی طرف منعطف کرائی، درداغ وضو کر رہا تھا۔ دین دار شخص آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درداغ کو دیکھ رہا تھا۔

وضو کر چکنے کے بعد درداغ نے سبزے پر قبلہ رو ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ دین دار شخص بڑے اٹھاک سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ بیٹھریے کی بھوری پوتین اس کے جسم کو ڈھانپنے ہوئے تھی۔

دین دار شخص نے اپنے ایک ارادت مند سے کہا۔  
”تو نے کچھ دیکھا، مجھ کو یہ وحشی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔“  
ارادت مند نے عرض کیا۔ ”حضرت! اس کو آپ نے آج دیکھا ہے نماز پڑھتے۔ یہ توجہ سے ہمارے قافلے میں آیا ہے، میں اس کو اسی طرح نمازیں پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔“  
دین دار شخص نے کہا۔ ”جاء اس کو میرے پاس بلا لا۔ میں اس سے چند باتیں کروں گا۔“

وہ شخص درداغ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد درداغ نے اس شخص پر سرسری نظر ڈالی اور ایک طرف جانے لگا۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر درداغ کا راستہ روک لیا، مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا! اگر میں آپ کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ میرے اندازے کے مطابق کسی وحشی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟“

درداغ نے خونخوار نظروں سے اس شخص کو دیکھا۔  
”اگر میرے دل و دماغ کو اسلام نے مسخر نہ کر لیا ہوتا تو میں تیری باتوں کا جواب تم کو اسے دیتا۔ وحشی خاندان! کون سا وحشی خاندان..... کس کا وحشی خاندان؟“

وہ شخص گھبرا گیا، بولا۔ ”بھائی میرے! آپ کو مدرسہ مستنصریہ کے استاد حضرت شمس الدین مدظلہ العالی یاد فرما رہے ہیں۔“

درداغ نے تجاہل سے کام لیا۔ ”کون؟ یہ کون صاحب ہیں؟ شاید میں انہیں نہیں جانتا۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ انہیں نہیں



قافلے میں شامل ہو گیا۔ دوران سفر میں اس خوف سے کانپتا رہتا ہوں کہ کہیں ہلاکو خان کے آدمی میرے تعاقب میں تو نہیں آ رہے۔“

شمس الدین نے اس کو تسلی دی۔ ”نو جوان! تو نے اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اللہ دلوں کا حال جاننے والا ہے وہ تیرے خلوص اور ایمان کے عوض تجھے ہلاکو خان کے حوالے نہیں کر سکتا۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔“

شمس الدین نے پوچھا۔ ”تیرا خیمہ کہاں ہے؟“

درداغ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”افسوس کہ میرا کوئی خیمہ نہیں۔ میں غلت میں بھاگا ہوں، اس لیے میں اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں لاسکا۔“

شمس الدین نے کہا۔ ”اچھا پھر ایسا کرتے ہیں کہ تجھ کو اپنے ہی خیمے میں کچھ جگہ دے دیتے ہیں۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”پھر آپ کو پریشانی ہو جائے گی۔“

شمس الدین نے جواب دیا۔ ”اسلام کی خاطر تو پریشانیاں اٹھائے، یہ میں کس طرح گوارا کر لوں۔“

درداغ نے آہستہ سے کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔ میں کیا عرض کروں۔“

شمس الدین کو ایسا بات پر اور حیرت ہوئی کہ یہ وحشی شخص عربی بھی جانتا تھا۔ درداغ کو شمس الدین نے اپنے خیمے میں جگہ دے دی تھی۔ یہاں درداغ نے شمس الدین سے درخواست کی کہ اسے قرآن پاک پڑھا دیں۔ شمس الدین نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو قرآن پاک بھی پڑھاؤں گا اور دینی تعلیم بھی دوں گا مگر دوران سفر نہیں۔ بغداد پہنچنے کے بعد..... چنانچہ میں تجھ کو یہ مشورہ دوں گا کہ تو ابھی خانہ کعبہ کا سفر نہ کر۔ پہلے دینی تعلیم حاصل کر، اس کے بعد مکہ معظمہ جا۔“

درداغ نے شکر گزار نظروں سے شمس الدین کو دیکھا۔ ”میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ جیسا مشورہ دیں گے میں اسی پر عمل کروں گا۔“

شمس الدین نے شام کا کھانا اسے اپنے ساتھ کھلایا۔ انہوں نے دیکھا، ان کا تائی جوت قبیلے کا مہمان گوشت خور ضرورت سے زیادہ واقع ہوا ہے۔ اس کی خوراک بھی زیادہ ہی تھی۔ نیند بھی بہت اچھی آتی تھی۔ ہاں، سردی دوسروں کی نسبت کم لگتی تھی۔

اچانک معلوم نہیں کیوں شمس الدین کو ہلاکو خان اور منگولوں کا خیال آ گیا۔ انہوں نے نصف رات کے لگ

جانتے ہوں گے، بہر حال اس وقت تو آپ میرے ساتھ چلے کیونکہ استاد نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے اس لیے میں ہی آپ کو اپنے ساتھ لے کر واپس جاؤں گا۔“

درداغ اس شخص کے ساتھ دین دار شخص شمس الدین کے پاس چلا گیا۔ شمس الدین نے درداغ کو اپنے روبرو دیکھتے ہی کرسی چھوڑ دی اور کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا، پوچھا۔ ”کیا تو مسلمان ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں مسلمان ہوں لیکن آپ جیسا مسلمان نہیں ہوں۔“

شمس الدین نے حیرت سے کہا۔ ”میں تیرا مطلب نہیں سمجھا، میں مسلمان ہوں لیکن آپ جیسا نہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اسلام کی چمک دمک نے مجھ کو اپنی طرف مائل کرایا ہے۔ میں نے مختلف مسلمانوں سے اپنے طور پر جو کچھ بھی معلوم کیا تھا، اس کے مطابق نماز وغیرہ پڑھ لیتا ہوں، ورنہ ابھی تک میں باقاعدہ مسلمان نہیں ہوا۔“

شمس الدین نے پوچھا۔ ”کیا تو کلمہ بھی پڑھ سکتا ہے؟“

درداغ نے کلمہ پڑھ کر سنا دیا، بولا۔ ”میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا ہوں جناب۔“

شمس الدین کا چہرہ خوشی سے تھمتھانے لگا، بولے۔ ”جب تو نے کلمہ پڑھ لیا تو، تو مسلمان بھی ہو گیا۔ اب تو مسلمان ہے۔ تو نے نماز کس سے سیکھی؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”کسی ایک سے نہیں، نماز کے سلسلے میں میرے کئی استاد ہیں۔“

شمس الدین نے کہا۔ ”میں نے تجھ کو نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ تو نے بالکل صحیح نماز پڑھی۔ بخدا میں نے تجھ کو جس حال میں دیکھا ہے، اس سے میری زندگی میں کئی دنوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میری بیٹائی میں تیری اور توانائی میں زیادتی پیدا ہو گئی۔ ہاں تو نے یہ نہیں بتایا کہ تو ہے کون؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟ جبکہ میں تیری وضع قطع دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ تو شمال کے کسی دور افتادہ سرد ترین علاقے سے تعلق رکھتا ہے اور تیرے خدو خال تجھے منگول ثابت کر رہے ہیں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں جھیل بیکال کے شمال مشرق میں آباد تائی جوت قبیلے کا ایک فرد ہوں۔ کئی دن پہلے تک میں ہلاکو خان کے لشکر میں تھا مگر جب اسلام کی پیاس نے پریشان کیا تو میں خانہ کعبہ کی زیارت اور ثواب کی خاطر چوری سے بھاگ کر اس



کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ خدا اس کے عذاب سے اپنی مخلوق کو محفوظ رکھے۔“

شمس الدین کے خیمے سے ملحق ایک دوسرا خیمہ بھی تھا۔ اس خیمے میں شمس الدین کا خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان میں کون کون تھا، کم از کم درداغ کو اس کا ذرا سا بھی علم نہیں تھا۔

شمس الدین اور اس کے ارادت مندوں نے درداغ کے اسلام اور حب الاسلامی کو خاصا مشہور کر دیا تھا۔ درداغ جدھر سے بھی گزر جاتا شائقین اس کو دیکھنے لگتے۔ درداغ کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی لیکن درداغ کا اپنا یہ حال تھا کہ اس کو نہ تو کسی بات کی خوشی تھی اور نہ ہی کسی بات کا غم۔ وہ شب و روز دین کی تعلیم میں مست اور مگن رہتا۔ کوہستان کی وادی سے کوچ کر کے یہ قافلہ اور آگے بڑھا۔

شمس الدین جو خود کھاتا، وہی درداغ کو کھلاتا۔ جو خود پہنتا درداغ کو پہنتا۔ ان کو یہ احساس غمزہ کر دیتا کہ درداغ کو اسلام کی خاطر اپنا ماضی اپنے عزیز و اقارب اپنا سب کچھ چھوڑنا پڑ گیا۔ شمس الدین کے اپنے خیمے سے متصل اس کے گھر والوں کا خیمہ نصب کیا جاتا۔ اس خیمے میں اس کی بیوی، چند خادمائیں اور ایک کنیز فروکش ہوتیں۔ اس کنیز کو شمس الدین نے کسی یونانی تاجر سے خریدا تھا اور اس میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو کسی حسین ترین کنیز میں ہونی چاہئیں۔ بذلہ سخی، حاضر جوابی، فن موسیقی میں مہارت، مردم شناسی اور مجلسی آداب میں یدِ طولیٰ رکھنے والی۔ شمس الدین کے گھر والوں کو بھی درداغ سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ ان سب کی ایک ہی خواہش تھی۔ یہ سب بھی درداغ کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھیں لیکن شمس الدین کے خوف سے یہ بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔

شمس الدین اور درداغ رات کو کھانے کے بعد اپنے چند احباب کے ساتھ ادب اور شاعری پر باتیں کرنے لگے۔ درداغ اس گفتگو میں بس ہاں ہوں کی حد تک شامل رہا۔ شمس الدین نے معلومات اور علم کے دریا بہا دیے۔ شمس الدین کے دوست دم بخود شمس الدین کی باتیں سننے میں مشغول رہے۔ آخر میں شمس الدین نے شکوہ کیا کہ افسوس شاعری اور ادب میں لوگوں کی معلومات اتنی ہیں کہ وہ سکوت کو بولنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ شمس الدین نے انہیں شرم دلانے کے لیے اپنی کنیز کی مثال دی، بولے۔ ”ادب اور شاعری کے معاملے میں میری کنیز علیہ کا علم تم سب سے زیادہ ہے اور اس کا مذاق بھی بہتوں سے سہرا ہے۔“

بھگ درداغ سے پوچھا۔ ”میرے معزز مہمان! تو نے ہلاکو خان کا ذکر کیا تھا شاید؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے ہلاکو خان کا ذکر کیا تو تھا مگر؟“

شمس الدین نے کہا۔ ”میں وہی تو جانتا چاہتا ہوں کہ تو نے کیا ذکر کیا تھا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ کہا تھا کہ میں چونکہ چوری سے فرار ہوا ہوں، اس لیے کہیں ہلاکو خان کے آدمی میرا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔“

شمس الدین کو جھرجھری سی آگئی۔ ”ہلاکو خان کے آدمی تیرا تعاقب کیوں کریں گے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”صرف اس لیے کہ مجھے اسلام قبول کرنے سے روکا جائے۔“

شمس الدین نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ ہلاکو خان کی نظریں بغداد پر لگی ہوئی ہیں؟“

درداغ نے بے دھڑک جواب دیا۔ ”نہیں، شاید ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہلاکو خان بغداد کی طرف نہیں آئے گا کیونکہ اس کے دل میں کسی طرح سے یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ خلافت عباسیہ عسکری لحاظ سے بہت مضبوط ہے اور پورا عالم اسلام خلفہ کی پشت پر ہے۔“

شمس الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا سچ؟ کیا ہلاکو اس طرح سوچ رہا ہے؟“

درداغ نے عرض کیا۔ ”میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں، میں نے ہلاکو خان کے لشکر میں جو دیکھا، جو سنا اور جو محسوس کیا آپ کے سامنے عرض کر دیا بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ہلاکو خان خود بھی اسلام کی بابت سوچنے لگا ہے۔ اس کو اسلام سے انس ہو گیا ہے اور شاید وہ دن زیادہ دور نہیں جب دنیا کے کان یہ عجیب و غریب خبر بھی سن لیں گے کہ ہلاکو اسلام قبول کرنے والا ہے۔“

شمس الدین نے کہا۔ ”اس خبر میں کوئی صداقت نہیں معلوم ہوتی۔ ہلاکو خان اسلام قبول کرنے والا ہے، خدا جانے ایسی خبریں کون اور کہاں سے لاتا ہے۔ میں اس خبر کو افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دوں گا۔“

درداغ گھبرا گیا۔ اس نے سوچا اگر اس طرح بغداد میں دوسروں نے بھی بے یقینی کا رویہ رکھا تو کیا ہوگا؟

شمس الدین نے کہا۔ ”معلوم نہیں، میں خود بھی ہلاکو خان کا خوف محسوس کرتا ہوں۔ سنا ہے وہ آدمی سے زیادہ بھیڑیا ہے جو انسانی گلوں میں سے جس کو دبوچ پاتا ہے اس



ہو جائیں گے۔“

اس جواب نے ہر شخص کو لاجواب کر دیا۔ کسی نے کہا۔ ”صاحبان! اس منگول کو احمق نہ سمجھیں، آپ سب نے اس کا جواب ملاحظہ فرمایا۔“

پہلے شخص نے کہا۔ ”صاحبان! استاد شمس الدین نے علیہ کے سلسلے میں امیر المومنین کا ذکر اس لیے کر دیا کہ ہمیں آپ لوگ علیہ پر عاشق نہ ہو جائیں اور اس کے بارے میں غلط سلسلہ انداز میں سوچنے لگیں۔“

اسی دوران استاد شمس الدین علیہ کو لے کر واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنے دوست کی باتیں سن لی تھیں، بولے۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں میں ایک لائق فائق اور بڑا ہلکا شخص ہوں۔ علیہ میری موجودگی میں کسی اور طرف غم طرح راغب ہو سکتی ہے؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں علیہ کو امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔“

شمس الدین نے علیہ کو ایک چوکی پر بٹھا دیا۔ اس پر بھیڑیے کی بھوری کھال بچھی ہوئی تھی۔ شمس الدین نے علیہ والے حصے میں سنی بڑی بڑی شمعیں جلا کر جگہ کو بقعہ نور بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے دوست احباب سے کہا۔ ”حضرات! اب آپ لوگ علیہ سے باتیں کر سکتے ہیں۔“

شمس الدین نے علیہ کو غور سے دیکھا۔ ان میں دردناک بھی شامل تھا۔ ہر شخص علیہ کی تعریف کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر پا رہا تھا۔ علیہ کا چہرہ کئی شمعوں کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کے چھلے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کا رنگ قدرتی سرخ تھا۔ اس نے اپنے بالوں کو گلابی رومال سے باندھ رکھا تھا۔

مجلس کا ہر شخص گونگا بن چکا تھا۔ شمس الدین نے علیہ سے کہا۔ ”علیہ! یہ سب تو خاموش ہیں، میں نے حیرے ادبی اور شعری مذاق کی تعریف کر دی تھی۔ تو خود بھی شاعر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تو انہیں اپنے چند اشعار ہی سنا دے گی تو بات بن جائے گی۔“

علیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے کہا۔ ”صاحبان! چند اشعار حسب حال موزوں ہو گئے ہیں، وہی سنائے دیتی ہوں۔ اگر پسند آجائیں تو میری خوش قسمتی اور ناپسند ہوں تو میری قسمت۔“

مجلس میں ہر طرف سے ایک ہی صدا بلند ہوئی۔ ”ارشاد ارشاد۔“

علیہ نے ترنم میں سنانا شروع کیا۔

”خدا نے تمہیں جو کچھ بھی دیا ہے اسے کام میں لانا چاہیے۔“

آنکھیں ملی ہیں تو ان سے دیکھو اور صانع حقیقی کے

علیہ کے ذکر نے ہر ایک کے دل میں اس کی دید کا اشتیاق پیدا کر دیا۔ شمس الدین کے ایک دوست نے کہا۔ ”ہمیں کیا پتا کہ علیہ کا علم اور مذاق ہم سب سے زیادہ اور ستھرا ہے۔ اپنی کنیزوں کے بارے میں عموماً لوگ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔“

شمس الدین نے کہا۔ ”رات زیادہ ہو چکی ہے ورنہ میں اس کو اسی وقت تم لوگوں کے سامنے لے آتا اور پھر دیکھتا کہ کون اس کا مقابلہ کرتا ہے۔“

اسی دوست نے جواب دیا۔ ”ابھی کتنی رات مہنی ہے اور پھر راتیں تو ہوتی ہی ہیں ایسی باتوں کے لیے۔ میرا خیال ہے اگر آپ اسی وقت علیہ کو بلوائیں تو ہم سب اس کے شستہ اور ستھرے مذاق سے لطف اندوز ہو لیں گے۔“

شمس الدین بھی کنیز کے ذکر اور اس کی پیشی میں احساس برتری محسوس کر رہے تھے، بولے۔ ”علیہ آ تو اسی وقت جائے گی لیکن صاحبان! ایک بات کا خاص خیال رہے۔ علیہ کے حسن، ذہانت، علمی و ادبی اور شعری ذوق کو دیکھتے ہوئے اسے خریدنے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھ کو اگر موقع ملا تو میں اس تحفے کو امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر دوں گا کیونکہ اس تحفے کے لیے مجھ کو امیر المومنین کا خیال ہر وقت ستاتا رہتا ہے۔ میں اپنے اس تحفے کو کہیں اور ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

اس کے بعد شمس الدین نے جاتے ہوئے کہا۔ ”صاحبان! آپ یہیں تشریف رکھیں، میں علیہ کو لے کر ابھی آیا۔“

شمس الدین کے جانے کے بعد وہ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”کچھ پتا ہے آپ لوگوں کو استاد شمس الدین نے علیہ کو ہمارے سامنے لانے سے پہلے یہ بات کیوں کہی کہ وہ علیہ کو امیر المومنین کے لیے لائے ہیں؟“

کسی نے پوچھا۔ ”کیوں؟ ہمیں کیا پتا کہ استاد نے ایسی بات کیوں کی؟“

ایک نے دردناک سے ازراہ مذاق کہا۔ ”بھائی تو کیوں خاموش ہے..... کیا تیرے منہ میں زبان نہیں ہے؟“ پھر اسی شخص نے دوسروں سے کہا۔ ”بڑا کرم ہوگا اگر یہ بتا دیا جائے کہ استاد شمس الدین نے علیہ کے سلسلے میں امیر المومنین کا ذکر کیوں کیا؟“

مجلس کا ہر شخص دردناک کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔

دردناک نے جواب دیا۔ ”صاحبان! آپ لوگوں کے سامنے میں اپنی زبان اس لیے نہیں کھولنا چاہتا کہ میں ابھی آپ کی زبان پر قدرت نہیں رکھتا۔ اگر میں اپنی مادری زبان میں آپ سے باتیں کروں گا تو آپ سب گونگے



جلووں میں گم ہو جاؤ۔

کان ملے ہیں تو ان سے سنو، اچھی باتیں، سترنم آوازیں، اپنے محبوب کے دس بھرے بول۔

قوتِ شامہ سے سوکھو تاکہ اچھی بُری چیزوں میں امتیاز کر سکو۔

شباب کے بھی کچھ تقاضے ہیں، یہ قیمتی وقت کے مانند حالتِ سفر میں ہے۔

اس کو نقد کرتا رہ ورنہ کل پچھتائے گا کیونکہ آنے والا کل اسے ماضی کے کل سے بدل دے گا۔

تجھے زبان ملی ہے، بولنے کے لیے، اگر تو خاموش رہے گا تو تو گونگا سمجھا جائے گا۔

دریا اگر بہنا بند کر دے اور ٹھہر کر رہ جائے تو لوگ اس کو ساحل سمجھنے لگیں گے۔

بول، باتیں کر، ورنہ تیرا محبوب تجھے گونگا سمجھ کر کسی زبان والے پر ملتفت ہو جائے گا۔

علیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ دردِ داغ نے کھڑے ہو کر خلاف توقع بولنا شروع کر دیا۔ ”افسوس کہ میں آپ لوگوں کی زبان پر قدرت نہیں رکھتا۔ ورنہ لڑکی کو ایسا جواب دیتا کہ دوبارہ ہمیں نصیحتیں نہ کر سکتی۔“

علیہ نے اس نوجوان کو بڑے اشتیاق اور غور سے دیکھا۔ اس نے دردِ داغ کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس نوجوان کو دیکھنے کی تمنا میں وحشت زدہ سی ادھر ادھر چلتی پھرتی رہی تھی۔ اس نے استاد شمس الدین سے پوچھا۔ ”استاد محترم! کیا یہ وہی نوجوان ہے جو ہلا کو خان کو چھوڑ کر اسلام کے زیر سایہ آ گیا ہے؟“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ وہی خوش قسمت نوجوان ہے دردِ داغ۔ بہت ہی اچھا اور.....“

علیہ نے پوچھا۔ ”نوجوان! تو نے جس ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔“

دردِ داغ نے حاضرینِ مجلس کا مذاق اڑایا۔ ”میں نے تو اپنی جرات، حوصلے اور شوقِ تجسس اور ذوقِ طلب کا یوں اظہار کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، آپ لوگوں میں آ گیا اور یہ کم حوصلہ ہیں کہ بولنا تک بھول گئے۔ لڑکی! تجھ کو اور استاد شمس الدین کو شاید میری بات اچھی نہ لگے لیکن میں زبان تک آ جانے والی بات کو روکتا نہیں، صاف صاف کہہ دیا کرتا ہوں۔ اگر سارے مسلمان ایسے ہی ہیں، ان لوگوں جیسے تو ہلا کو خان اور اس کے عساکر کو تباہی اور بربادی سے باز رکھنا ممکن نہ ہوگا۔“

استاد شمس الدین نے دردِ داغ کو ایسی باتیں کرنے

## ٹکٹ

بس میں بھیڑ کی زیادتی کی وجہ سے ایک آدمی بیچ میں کھڑا دھکے کھا رہا تھا۔ کبھی کسی کے دھکے سے آگے چلا جاتا۔ کبھی پیچھے۔ جب وہ اترنے لگا تو کنڈیکٹر نے کہا۔ ”ٹکٹ تو لے لیجیے۔“ وہ کہنے لگا۔

”ٹکٹ کس خوشی میں لوں، میں تو سارا راستہ پیدل چل کر آ رہا ہوں۔“

## پٹرول

ایک آدمی کی لاٹری میں کار ٹیکل آیمکر وہ خوش ہونے کی بجائے پریشان ہو گیا۔ اس کے دوست نے وجہ پوچھی۔

”یار تم اتنے دیکھی کیوں ہو؟“

جواب ملا۔ ”کار گھر تک لے جانے کے لیے میرے پاس پٹرول کے پیسے نہیں ہیں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

## خاندان والے

ایک آدمی کے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا تھا۔ اس نے میونسپل کمیٹی کو فون کیا اور کہا۔ ”میرے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا ہے۔ ذرا اسے اٹھوائیں۔“

کمیٹی سے جواب ملا۔ ”وہیں دفن کر دو۔“ وہ آدمی تھوڑی دیر تو خاموش رہا۔ پھر جل کر بولا۔ ”دفن کر دیتا مگر میں نے سوچا پہلے مرحوم کے خاندان والوں کو خبر کر دوں۔“

## کرکٹر

ایک کرکٹر مریض نرس سے۔ ”میرا ٹمپریچر کتنا ہے؟“

نرس۔ ”ایک سو دو۔“

مریض۔ ”بہت خوب یعنی ایک سنچری اور دو رنز۔“

نرس۔ ”ہاں لیکن ہم آپ کو ابھی آؤٹ نہیں ہونے دیں گے۔“

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں



کی رہائش گاہ میں لے گئے۔ یہاں شمس الدین نے درداغ کے ساتھ نہایت مخلصانہ رویہ رکھا لیکن خود درداغ جس ذہنی اور قلبی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا، اس کا کوئی حل نہیں نظر آتا تھا۔ درداغ کو علیہ میں حسن اور ذہانت کا حسین ترین امتزاج نظر آیا تھا۔ علیہ جیسی لڑکیاں اور عورتیں اس نے کہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ بڑھی لکھی، مہذب، مستطیع، شستہ اور خوش اطوار..... اس کی زندگی میں علیہ دبے قدموں غیر محسوس طور پر جانے کب داخل ہو گئی تھی۔ وہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا، اسے بھلاتا جا رہا تھا۔ اب اس کا سارا وقت اسی سوچ اور اسی فکر میں ضائع جاتا کہ وہ علیہ سے دوبارہ کہاں اور کیونکر ملے۔ اس کو علیہ کی بابت اس انکشاف نے پریشان کر دیا تھا کہ استاد شمس الدین اس لڑکی کو امیر المومنین کے لیے لائے ہیں۔ وہ سوچتا ایک ایسی لڑکی کے بارے میں مسلسل سوچتے رہنا جو خلیفہ بغداد کی امانت ہو، بہت خطرناک بات ہے۔

استاد شمس الدین نے اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں درداغ کو بہت کچھ بتا دیا تھا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ درداغ کو اسلامی تعلیمات میں پختہ اور ماہر بنا دیں گے تو وہ اس کو قصر خلافت میں لے جا کر امیر المومنین مستعصم باللہ سے ملوادیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ خلیفہ اس بات سے بہت خوش ہوگا کہ انہوں نے ایک منگول کو مسلمان کر لیا اور جب وہ یہ عجیب و غریب انکشاف کرے گا کہ ہلاکو خان خود بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں وہ بغداد آئے گا، خلیفہ سے ملے گا اور شاید اس کے ہاتھ پر مسلمان ہو جائے گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ بغداد کی شان و شوکت اور پُر تکلف معاشرے نے اس میں کسی قدر احساس کمتری بھی پیدا کر دیا تھا۔

استاد شمس الدین نے اپنے مکان سے ملحق جس حصے میں درداغ کو ٹھہرایا تھا، وہ دراصل ایک چھوٹا سا پائین باغ تھا۔ اس باغ میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ درداغ انہی دو کمروں میں رہ رہا تھا۔ استاد شمس الدین یہاں تشریف لاتے اور درداغ کو اچھی باتیں بتا کر مدرسے چلے جاتے۔ ان باتوں نے درداغ میں غیر محسوس طور پر انقلاب برپا کرنا شروع کر دیا تھا۔

استاد شمس الدین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرصوبت اور کٹھن زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہوئے کہا۔ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ان سرکشوں اور خونخواروں کے درمیان تبلیغ حق کا کام شروع فرمایا تھا جو اپنے دیوتاؤں اور خود ساختہ خداؤں کے خلاف ایک لفظ بھی

سے منع کیا، کہا۔ ”درداغ! تیری یہ باتیں امیر المومنین کے گوش گزار کر دی جائیں گی اور میں نہیں چاہتا کہ یہاں تو سیاسی، مذہبی یا فرقہ واری سازش کا شکار ہو جائے۔“

درداغ خاموش ہو گیا۔  
مجلس کا ایک سب سے زیادہ تیز طرار شخص بمشکل کھڑا ہوا، بولا۔ ”استاد محترم! میرے منہ میں بھی زبان ہے میں بھی بول سکتا ہوں لیکن میرے لیے مشکل یہ ہے کہ علیہ امیر المومنین کی امانت ہے..... ہم تو اس سے باتیں کرنے میں بھی محتاط رہیں گے کیونکہ وہ جیسا کہ سنا ہے کہ.....“

علیہ نے کہا۔ ”اگر باتیں ادب کے دائرے میں کی جائیں اور جانبین بازاری انداز نہ اختیار کریں تو لطف اندوز ہونے کے لیے، بہت کچھ کہا اور سنا جاسکتا ہے۔“  
استاد شمس الدین نے درداغ سے خواہش کی۔ ”دوستو! اس منگول کی باتیں سنو، دیکھو یہ نو مسلم منگول ہلاکو خان کی بابت کیا بتاتا ہے۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کیا ہلاکو خان کوئی مہیب صورت بھیا تک انسان ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ بھیا تک شکل صورت کا نہیں، مردانہ وجاہت کا پیکر ہے۔ اپنے باپ تو لو کی خان کی طرح حسین۔“

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”اگر وہ بد صورت یا مہیب صورت نہیں تو درشت مزاج تو ضرور ہی ہوگا۔“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”وہ درشت مزاج بھی نہیں، وہ بہت ہنس مکھ اور پُر مزاح انسان ہے۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کیا ہلاکو خان تجھ پر مہربان تھا؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”بہت زیادہ..... وہ مجھ سے بہت زیادہ انسیت رکھتا تھا لیکن افسوس وہ کافر ہے۔ اے کاش وہ مسلمان ہو جاتا۔“

حاضرین مجلس نے آئین کہا۔ استاد شمس الدین نے مکہ معظمہ کی طرف دست دعا دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”بارِ الہا! ہلاکو کو اسلام کی دولت سے سرفراز فرما اور اس کے دل و دماغ پر پڑے ہوئے ظلم و بربریت کے گھٹاؤنے پردے دور فرما۔“ حاضرین نے ایک بار پھر آئین کہا اور چپ ہو گئے۔

☆☆☆

قافلہ بغداد میں باب الشام کے راستے سے داخل ہو گیا۔ مدرسے مستنصریہ میں اس کے اساتذہ کے لیے رہائش کا بندوبست تھا چنانچہ استاد شمس الدین درداغ کو بھی مدرسے



”درداغ! میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔“

درداغ نے بہ آواز بلند جواب دیا۔ ”محترم خان! مجھ کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سحر نے بے دست و پا کر دیا تھا۔ مجھ کو ایک موقع اور دیا جائے۔“

کسی نسوانی آواز نے اس کی پشت سے سوال کیا۔ ”کس بات کا موقع؟ کون محترم خان؟ منگول نو جوان! تو اپنے ہوش و حواس میں تو ہے اس وقت؟“

درداغ نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو علیہ مسکراتی نظر آئی۔ اس نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”علیہ یہ تم! یہاں میرے پاس اس جگہ کیسے؟“

علیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا استاد شمس الدین یہاں تشریف رکھتے ہیں؟“

درداغ بہت زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ بے خیالی میں اس کے اندر کا چور پکڑا گیا تھا، بولا۔ ”نہیں، استاد شمس الدین کا قصر خلافت سے بلاوا آ گیا تھا۔ وہ وہاں گئے ہوئے ہیں۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”منگول نو جوان! یہ تو یہاں باتیں کس سے کر رہا تھا ابھی؟“

درداغ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا، گھبرا کر بولا۔ ”بس یوں ہی ذرا سا پریشان ہو گیا تھا میں۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کس بات سے پریشان ہو گئے تھے؟“

درداغ اس موضوع سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا، کہا۔ ”علیہ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس وقت یہاں کیونکر آ گئیں؟“

علیہ نے پائیں باغ کے ایک سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھ رہے ہو؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، دیکھ رہا ہوں۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس پائیں باغ کا چھوٹا سا قصر۔“

علیہ نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اور وہ کیا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”کھڑکی۔“

علیہ نے کہا۔ ”میں اس کھڑکی سے تجھ کو دیکھتی رہتی ہوں مگر تو ادھر بھولے سے بھی نہیں دیکھتا۔ معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتا ہے؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا تم اس کھڑکی میں رہتی ہو؟“

علیہ اس کی تجویز الحواسی پر ہنسنے لگی۔ بولی۔ ”میں اس کھڑکی میں نہیں، اس کمرے میں اکثر موجود رہتی ہوں جس میں یہ کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تو اپنے

سننا پسند نہ کرتے تھے۔ انسان کو جان سے مار دینا ان کا معمولی مشغلہ تھا۔ آپ نے کسی مصلحت کا خیال کیے بغیر انہیں یہ بتایا کہ وہ جس نوع کی زندگی گزار رہے ہیں، وہ انہیں جہنم کی طرف لے جائے گی۔ جوا، شراب، دختر کشی اور بات بات پر خون خرابا ان کا روزمرہ تھا۔ آپ نے انہیں بتایا۔ یہ دنیا آخرت کی ٹھیکتی ہے، آج اس میں جو کچھ ہووے گا اسی کی فصل کاٹو گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

علاقت سے پہلے فراغت، بڑھاپے سے پہلے جوانی اور افلاس اور تنگ دستی سے پہلے آسودہ حالی بہتر ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آنے والے وقت سے ڈرو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے دولت، حسب و نسب اور حکومت کی وجہ سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ انسان اگر بڑا

ہے تو اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم میں کوئی بڑا نہیں، سب برابر ہیں۔ ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ رنگ نسل کوئی چیز نہیں۔ آپ نے حکمران کو رعایا کا راعی قرار دیا، اس گزریے کی طرح جو موبیشیوں کے ریوڑ کی رکھوالی کر رہا ہو۔“

درداغ استاد شمس الدین کی باتیں سن رہا اور یوں محسوس کیا گویا ان باتوں میں کوئی سحر ہے جو دل میں اترتا جا رہا ہے۔ وہ خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگا۔ وہ ہلاکو خان کا منصوبہ بھولنے لگا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی ایسی بات محسوس ہو رہی تھی جو انسانوں کو یکسر بدل دیا کرتی ہے۔ وہ اپنی سابقہ زندگی کو فراموش کرتا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ استاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارے میں بتاتے رہیں اور وہ سن رہا ہے۔

استاد شمس الدین کا اچانک قصر خلافت سے بلاوا آ گیا۔ وہ چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں درداغ آنے والے دنوں کی بابت سوچنے لگا۔ وہ ہلاکو خان سے خوف محسوس کر رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کو بغداد سے واپس ضرور جانا ہوگا۔ پھر جب وہ واپس جا کر ہلاکو خان سے ملے گا تو اس کو کیا جواب دے گا؟

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالم خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔



ورنہ اگر تو میرے اپنے علاقے، میری اپنی حدود میں ہوتی تو میں تجھ کو اپنی جرأت، دلیری اور بے باکی کا تماشا دکھاتا۔“ علیہ نے کہا۔ ”تجھ کو ایک خوش خبری سنا دوں۔ استاد شمس الدین نے آج صبح مجھ کو اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ میں دن میں دو ایک بار یہاں آجایا کروں۔ استاد شمس الدین تجھ کو بہت نیک اور شریف سمجھتے ہیں۔ وہ تجھ پر بہت زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے مجھے تیرے پاس آنے کی اجازت دے دی۔“

درداغ نے اس کی توجیہ پیش کی، بولا۔ ”علیہ! استاد شمس الدین نہایت پڑھے لکھے اور تجربہ کار انسان ہیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ ہم دونوں کو آزار دہے ہوں.....“ علیہ بات کانٹے ہوئے بولی۔ ”یہ بھی ممکن ہے کیونکہ جب انہوں نے مجھ کو یہاں آنے کی اجازت دی تھی، ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ خبردار! حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“

درداغ نے کہا۔ ”اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ تو یہاں سے چلی جا۔“

علیہ نے جواب دیا۔ ”میں تیرے کہنے سے نہیں جاؤں گی۔ جاؤں گی تو اپنی مرضی سے جاؤں گی۔“ درداغ نے علیہ کو وہیں چھوڑا اور خود بھاگ کر ایک کمرے میں گھس گیا اور اس کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہیں سے بے آواز بلند علیہ کو جواب دیا۔ ”علیہ! میں استاد شمس الدین کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔“

علیہ اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”درداغ! میں تجھ کو بہت عقل مند سمجھ رہی تھی مگر تو، تو احمق نکلا۔ بے وقوف اس طرح استاد شمس الدین ہم دونوں کا امتحان لے رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو استاد شمس الدین ہم دونوں پر خصوصی توجہ دیں گے ورنہ عامیوں کی طرح چند دن گوارا کر کے دھکا دے دیں گے۔“

درداغ ایک بار پھر لا جواب ہو گیا۔ علیہ نے کہا۔ ”درداغ! باہر نکل، مت گھبرا..... میں یہاں استاد شمس الدین کی اجازت سے آئی ہوں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”جب تک میں خود استاد شمس الدین سے اس موضوع پر مکمل کربات نہ کر لوں، میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔“

علیہ نے کہا۔ ”دیکھ مجھ کو غصہ نہ دلا۔ میری بڑی بے عزتی ہو رہی ہے۔ میں چاہوں تو اس کا بدلہ لے سکتی ہوں۔“

ہوش و حواس میں بالکل نہیں۔“ درداغ اپنی حماقت اور بدحواسی پر خود بھی ہنسنے لگا۔ درداغ نے کہا۔ ”علیہ! میں تجھ کو یہاں اپنے پاس تنہا دیکھ کر پریشان ہو رہا ہوں۔ جب سے مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ تو امیر المومنین کی امانت ہے، میں تیرے خیال تک سے خوف کھانے لگا ہوں۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”مگر اس میں خوف کھانے کی بات کیا ہے؟ آخر میں کیوں نہیں ڈرتی؟“

درداغ نے کہا۔ ”اچھا اس وقت تو، تو واپس جا، کوئی آگیا یہاں تو بڑی بد مزگی ہوگی۔“

علیہ نے نہایت پرسکون اور مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ”منگول نو جوان! مت گھبرا..... یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ یہ قصر میرا ہے، اس میں، میں تنہا رہتی ہوں۔ یہاں میرا کوئی نگران یا پیہرے دار نہیں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”یہ قصر تیرا ہے؟ یہاں تو تنہا رہتی ہے؟“ علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ قصر میرا ہے اور میں یہاں تنہا رہتی ہوں، بالکل تیری طرح۔ جس طرح تو یہاں رہتا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”پھر بھی یہ بات کہاں تک مناسب ہے کہ یہاں مجھ سے ملنے چلی آئی۔ تو نے مجھ سے استاد شمس الدین کی بابت سوال کیا، میں نے اس کا جواب دے دیا۔ اب بات ختم ہو گئی، واپس جا۔“

علیہ نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال تھا، استاد شمس الدین کی صحبت اور تعلیمات نے تجھ کو کسی نہ کسی حد تک مہذب ضرور بنا دیا ہوگا لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تو اب بھی نرا منگول ہی ہے اجڈ، وحشی منگول۔“

درداغ نے شرمسار ہو کر پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“ علیہ نے جواب دیا۔ ”وہ اس طرح کہ اس وقت میں تیری مہمان ہوں مگر تو نے مجھ کو بٹھایا تک نہیں۔“

درداغ نے عاجزی سے کہا۔ ”مگر میں تجھ کو کیوں بٹھاؤں۔ تجھ کو یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔“ درداغ نے بے بسی سے کہا۔ ”اگر تجھ کو کسی نے میرے ساتھ یوں باتیں کرتے دیکھ لیا تو؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”تو کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ تو منگول ہے جو کسی سے ڈرتے نہیں مگر تو ڈر رہا ہے اور میں لڑکی ہونے کے باوجود نڈر ہوں۔“

درداغ نے کہا۔ ”علیہ! میں استاد شمس الدین کا مہمان ہوں۔ اس نازک رشتے نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے



درداغ نے جواب دیا۔ ”میں مجبور ہوں، میں استاد شمس الدین کے اعتماد کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“  
علیہ نے کہا۔ ”اچھا میں جا رہی ہوں لیکن اس بات کو یاد رکھنا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں یاد رکھوں گا، بالکل یاد رکھوں گا۔“

علیہ چلی گئی۔ درداغ نے علیہ کے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن کر کھڑکی کھولی اور اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ علیہ تیز تیز قدموں سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے قصر میں داخل ہوئی تو دروازے کو اتنی زور سے بند کیا کہ اس کی آواز درداغ نے بھی سنی۔

درداغ باہر نکلا اور اس کھڑکی کی طرف نظریں جما کر کھڑا ہو گیا جہاں علیہ خود اپنے بقول کھڑے ہو کر درداغ کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ کھڑکی بند تھی، وہ دیر تک ادھر دیکھتا رہا مگر کھڑکی نہیں کھلی۔ معلوم نہیں کیوں اور کون اس کے دل میں بیٹھا اس سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کھڑکی کھلے گی، ضرور کھلے گی، ایک بار ضرور کھلے گی مگر وہ نہیں کھلی۔ کئی گھنٹے انتظار کرنے کے باوجود نہیں کھلی۔ اس کو دکھ سا محسوس ہوا۔ علیہ ناراض ہو گئی، اس بات کا دکھ، علیہ کو اس نے تکلیف پہنچائی، اس احساس کا دکھ..... وہ کرب کے عالم میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ کھڑکی اس کی کمزوری بن چکی تھی۔ گھنٹوں بار بار اٹھنے اور جھکنے کے عمل نے اس کی گردن میں درد پیدا کر دیا تھا۔

☆☆☆

قصر خلافت سے واپس آنے کے بعد استاد شمس الدین نے درداغ سے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنے شاگرد کے چہرے پر اضطراب اور مایوسی کی لمبی جلی جھلک دیکھی۔ وہ درداغ کو کمرے میں لے گئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تو اس لیے پریشان اور مضطرب ہے کہ مجھ کو امیر المومنین نے کیوں طلب کیا تھا؟“

درداغ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ استاد شمس الدین سے نظریں بھی نہیں ملا رہا تھا۔

استاد شمس الدین سنجیدہ ہو گئے۔ ”اگر تیرے چہرے کے اضطراب اور پریشانی کا کوئی اور سبب ہے تو وہ مجھے معلوم ہونا چاہیے کیونکہ میں تجھے پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔“

درداغ نے کہا۔ ”آپ ہی بتائیے، میں آپ کے اعتماد کو کس طرح خدشہ پہنچا سکتا ہوں؟“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”پہلے پوری بات بتا، پھر

کوئی اور بات ہوگی۔“  
درداغ نے کہا۔ ”آپ کی عدم موجودگی میں علیہ یہاں آئی تھی.....“ اور پھر پوری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔

استاد شمس الدین کو ہنسی آ گئی، بولے۔ ”اس میں پریشانی یا شرمندگی کی کیا بات ہے؟ علیہ نے تجھ سے جو کچھ کہا، درست کہا۔ اس کو میں نے ہی یہاں آنے کی اجازت دی تھی۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”استاد محترم! کیا یہ بات بھی درست ہے کہ اس قصر میں علیہ تمہارے رہ رہے؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ بات بھی درست ہے۔ اس میں اتنا سا اضافہ کر لے۔ علیہ کے ساتھ دو خدمت گار بوڑھی خواتین بھی رہتی ہیں۔“

درداغ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”استاد محترم! مجھے تو یہاں سے کہیں اور بھیج دیجیے۔“

استاد نے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں خوفزدہ ہوں کہ علیہ امیر المومنین کی امانت ہے، کہیں میں کسی وجہ سے مورد الزام نہ بنوں۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”درداغ! میں اسلامی تعلیمات میں تجھ کو اتنا پختہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تیرے چاروں طرف تحریص اور ترغیب کے کتنے ہی پھندے کیوں نہ ہوں مگر تو اس سے محفوظ رہے۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کے امتحان اور آپ کی آزمائش میں پورا اتروں گا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں، مجھ کو اس پر یقین ہے۔ میں تجھ پر اعتماد کرتا ہوں، بھروسہ کرتا ہوں۔“

درداغ نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خدا یا! مجھ کو شرمندگی سے بچانا، نجالت سے محفوظ رکھنا۔“

استاد شمس الدین اپنے شاگرد سے اور زیادہ خوش ہو گئے۔ انہوں نے درداغ کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ آج امیر المومنین نے مجھ کو کیوں بلایا تھا؟“

درداغ نے لٹی میں گردن ہلائی، بولا۔ ”مجھے تو کیا معلوم استاد محترم۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”جب میں قصر خلافت میں داخل ہوا تو وہاں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔ امیر المومنین نے چند قدم چل کر میرا استقبال کیا اور وزیر ابن عقیلی نے فرط محبت



ہوتے ہیں۔“

درداغ رونے لگا۔ اس کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ استاد شمس الدین نے اس سے پہلی بار ذرا جھڑک کر غصے میں بات کی ہے۔ استاد شمس الدین نے اس کو روتے دیکھا تو ہنسنے لگے، بولے۔ ”یہ کیا، یہ آنسو کیوں؟ کیا تو عورت ہے؟ ارے نالائق! مرد نہیں رویا کرتے۔ لوگ تجھ کو روتے دیکھیں گے تو ہنس گے۔“

درداغ برابر روتا رہا اور استاد شمس الدین اسے چپ کراتے رہے پھر وہاں سے چلے گئے۔ اچانک کچھ کہنے سے بغیر۔ درداغ کو اس بات کا بھی بڑا دکھ ہوا۔ کئی بار جی میں آئی کہ وہ انہیں آواز دے کر روک لے لیکن وہ بے حس و حرکت خاموش بیٹھا روتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس نے دیکھا، استاد شمس الدین علیہ کے ساتھ واپس چلے آ رہے ہیں۔ درداغ کا دل دھڑکنے لگا۔ دوران خون میں تیزی آگئی اور وہ ان دونوں کے قریب آنے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ استاد شمس الدین نے علیہ کو درداغ کے روبرو کھڑا کر دیا، کہا۔ ”درداغ! ادھر ہماری طرف دیکھ، یہ عورتوں کی طرح ٹسوے کیوں بہاتا ہے؟“

درداغ نے نظر اڑھائی اور علیہ کو اچھتی سرسری نظروں سے دیکھا۔ استاد شمس الدین نے کہا۔ ”افسوس کہ تو نے علیہ کو بھی ناراض کر دیا۔ یہ تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“ درداغ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں ٹھہرا ایک غریب الوطن غریب الدیار۔ آپ لوگ جس طرح چاہیں، مجھے ذلیل اور شرمندہ کرتے رہیں۔“

استاد شمس الدین نے ایک بار پھر سرزنش کی، کہا۔ ”لڑکے! یہ کیسا انداز گفتگو ہے تیرا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تجھ کو سمجھنے اور پہچاننے میں سخت غلطی کی ہے۔ میں تجھ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”استاد محترم! اگر آپ علیہ کو اس پر آمادہ کر لیں کہ یہ میرے کسی معاملے میں دخل نہیں دے گی اور مجھ کو آزمائش میں نہیں ڈالے گی تو میں بھی آپ کو.....“ استاد شمس الدین نے دیکھا، علیہ بہت بے چین ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے۔ درداغ کی بات کاٹ دی اور علیہ سے کہا۔ ”تجھ کو کچھ کہنا ہے؟“

علیہ نے کہا۔ ”اس نے میری بڑی بے عزتی کی ہے اس لیے میں خود بھی اس سے دور رہنا چاہتی ہوں۔“ استاد شمس الدین نے کہا۔ ”درداغ! میں نے یہ سوچ کر کہ تو یہاں تنہا رہتا ہے اور تیرا کوئی کنبہ نہیں، علیہ سے یہ

اور عقیدت میں میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔“

درداغ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”استاد محترم! ایسا کیوں ہو رہا تھا؟“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”بڑی سیدھی سی بات ہے برخوردار..... امیر المومنین تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ میں ایک منگول کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اس کو دینی تعلیم دے رہا ہوں کیونکہ وہ مسلمان ہو چکا ہے، امیر المومنین کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“

درداغ خاموش ہو گیا۔ استاد شمس الدین بولتے رہے۔ ”میں نے امیر المومنین سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ حکومت کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، کسی پر بھروسہ نہ کریں۔“

درداغ نے کہا۔ ”آپ تو قصر میں کافی دیر رہے ہیں، کیا صرف اتنی سی باتیں ہوئی تھیں یا کچھ اور؟“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”نہیں تو..... اور بہت ساری باتیں بھی ہوئیں۔ امیر المومنین تو مجھ سے یہ خواہش کر رہے تھے کہ میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر قصر خلافت چلا جاؤں اور تیری ملاقات امیر المومنین سے کرادوں۔“

درداغ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”لیکن ان باتوں سے حاصل کیا ہوگا؟“

استاد شمس الدین نے چراغ پا ہو کر اپنے شاگرد کو ڈانٹ دیا۔ ”زیادہ باتوں سے حاصل تو کچھ ہوتا نہیں مگر دوسروں کو اس سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، استاد محترم!“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”امیر المومنین کے آس پاس جو لوگ ہوتے ہیں، ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ خاص کر وزیر ابن علقمی پر۔ اس شخص نے امیر المومنین کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”استاد محترم! کوئی اچھا ہو یا برا، مجھ کو کسی سے کیا لینا دینا۔ میرا خیال ہے آپ بھی محتاط ہو جائیے۔“ استاد شمس الدین نے کہا۔ ”پھر وہی حماقت کی باتیں۔ میں تجھ کو قصر خلافت لے جانا چاہتا ہوں لیکن پہلے تجھ کو یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ امیر المومنین کے سامنے تو زیادہ نہیں بولے گا۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”استاد محترم! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھا۔ ہر آگ، ہر آواز، ہر طرح، ہر



پسند نہیں، پھر میں خود کس طرح افسردگی اور مایوسی سے پیش آؤں گی۔“

استاد شمس الدین نے دونوں کو سمجھایا۔ ”لیکن خیال رہے کہ اخلاقیات، احتیاط اور آداب کی حدیں برقرار رہیں کیونکہ اسی میں ہم سب کی آبرو اور عزت ہے۔“

درداغ نے سر جھکا کر وعدہ کیا۔ ”اللہ نے چاہا تو میں نہ صرف خود شرمندگی اور خجالت سے بچوں گا بلکہ دوسروں کو بھی بچاؤں گا۔“

علیہ نے کوئی وعدہ نہیں کیا، وہ نظریں جھکائے ان دونوں کی باتوں پر مسکراتی رہی۔

☆☆☆

درداغ نے اب تک جو کچھ دیکھا، جانا اور سمجھا تھا، وہ ایسا نہیں تھا کہ ہلا کو خان کے لیے کار آمد ہو۔ وہ ابھی تک خلیفہ سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بھی مارا مارا نہیں پھرتا تھا۔ وہ تو استاد شمس الدین کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اس کو استاد شمس الدین پر رحم آ رہا تھا۔ سادہ لوح، شریف اور نیک انسان۔ وہ اگر چاہتا تو استاد شمس الدین کو ذلیل و خوار کر کے واپس چلا جاتا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ استاد شمس الدین کی خوش اخلاقیات، مہربانیاں، نوازشیں اور چاہتیں درداغ کو اسیر کر چکی تھیں۔ اب علیہ بھی آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے استاد شمس الدین سے خواہش کی کہ وہ بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”کیا میں نے تجھ کو کہیں آنے جانے سے روکا ہے؟“

درداغ اس جواب سے خوش ہو گیا مگر استاد شمس الدین نے اچانک ایک تجویز پیش کر دی، کہا۔ ”لیکن درداغ! میں چاہتا ہوں جب تک تیری ملاقات امیر المومنین سے نہ ہو جائے تو کہیں بھی مت جا۔ خود کو بار بار اور سنجیدہ باور کرا۔ میں نہیں چاہتا کہ تیرے بارے میں معلومات اور اطلاعات دوسروں کے ذریعے امیر المومنین تک پہنچیں۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”استاد محترم! میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ میں آپ کی مرضی اور اجازت کے بغیر کچھ بھی نہ کروں گا۔ آپ جب چاہیں مجھے امیر المومنین سے ملوا دیجیے اور جب چاہیں، بغداد میں گھومنے پھرنے کی اجازت دے دیں۔“

استاد شمس الدین گئے تو علیہ آگئی، اس نے پوچھا۔

کہہ دیا تھا کہ یہ تیرا دل بہلایا کرے اور تیری تنہائی کے بوجھ کو کم کر دیا کرے مگر تو نے معلوم نہیں کیا سمجھا اور اس کو ذلیل کر کے چلتا کر دیا۔“

درداغ کو اپنے کیے پر ندامت تھی، بولا۔ ”میں نے تو جو کچھ کیا، آپ کے پاس ادب سے۔ اگر میرا یہ عذر مسموع نہیں تو میری بدقسمتی۔“

استاد شمس الدین نے علیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”علیہ! یہ نادم ہے۔ میرا خیال ہے اس کو معاف کر دو۔ یہ ایک سادہ لوح نوجوان ہے اس لیے اس کا محاسبہ بردست مناسب نہیں ہے۔“

علیہ نے عرض کیا۔ ”میرے آقا! میرے استاد! اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس منگول نوجوان کو معاف کر دوں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

استاد شمس الدین نے زور سے تالی بجائی۔ تالی کی آوازیں کر ایک خدمت گار حاضر ہو گیا۔ استاد شمس الدین نے حکم دیا۔ ”فواکہات حاضر کیے جائیں۔“

خدمت گار واپس چلا گیا اور جب وہ واپس آیا تو خشک میوؤں کی طشت اس کے سر پر تھی۔ اس طشت کو ان تینوں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ استاد شمس الدین نے دونوں سے کہا۔ ”فواکہات حاضر ہیں۔ تم دونوں کھاؤ اور دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف عناد نکال دو۔“

علیہ نے بادام کی گری اٹھا کر درداغ کی طرف بڑھادی کہا۔ ”کھا، تکلف نہ کر۔“

درداغ نے کسی قسم کا تکلف کے بغیر بادام کی گری اٹھا کر علیہ کی طرف بڑھادی، بولا۔ ”تو بھی کھا۔“

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ سے گری لے لی اور کھانے لگے۔ بادام، پستہ، کشمش، خشک انجیر اور کھجور..... باری باری وہ سب کھایا گیا جو طشت میں موجود تھا۔ استاد شمس الدین ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ آخر میں رخصت ہوتے وقت ان دونوں سے کہا۔ ”تم دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہو، تمہیں اچھے پڑوسیوں کی طرح خوش اخلاقی سے رہنا چاہیے۔“

درداغ نے جواب میں کہا۔ ”ہم منگولوں میں اتنی زیادہ خوش اخلاقی نہیں ملے گی لیکن جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کے لیے خوش اخلاقی سے مسکرا دینا بھی عین ثواب اور عبادت ہے، میں اس پر سختی سے کار بند ہوتا جا رہا ہوں۔“

علیہ نے کہا۔ ”مجھے روتے بسورتے چہرے ذرا بھی



درداغ علیہ کی دلیری اور بے باکی سے پریشان ہو رہا تھا، کہا۔ ”علیہ! خدا کے لیے بس کرو اور اس وعدے کا خیال کرو جو ہم دونوں استادس الدین سے کر چکے ہیں۔“ علیہ نے جواب دیا۔ ”میں نے جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہوں لیکن میں نے یہ وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ میں دل کو خوش کرنے کے لیے مزید باتیں بھی نہیں کروں گی۔“

درداغ کو یقین ہو چکا تھا کہ علیہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور علیہ سے کہا۔ ”تو یہیں ٹھہر، میں ابھی آیا۔“

وہ پائیں باغ سے نکل کر سڑک پر آگیا، یہاں شاہراہ کے دونوں طرف مکانات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ مکانات کے سامنے کہیں کہیں درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے سائے میں لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہیں کہیں مکانات کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور وہاں ایک گلی بن گئی تھی۔ پچاس پچپن گز چھوٹی ہوئی جگہ کے بعد مکانات کا دوبارہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان گلیوں میں بچے بھاگ دوڑ رہے تھے۔

سڑک پر عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت سے بڑی چہل پہل تھی۔ عورتیں رداؤں میں منہ چھپائے بڑی مہارت سے چل پھر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والوں کے علاوہ گھڑسوار بھی ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ گھوڑے کی ٹاپ سے اٹھنے والی گرد اور آواز سے کان اور نتھنے خاصے متاثر ہو رہے تھے۔ ساربان اپنے اپنے اونٹوں کی مہار پکڑے پیدل سفر کر رہے تھے۔ کسی کسی اونٹ پر عورتیں اور بچے بیٹھے چمکولے کھارے تھے اور شربان ہلکے سروں میں حدی خوانی کر رہے تھے۔

درداغ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اجنبی اور اجنبیوں کے اس شہر میں وہ دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ مکانات کا سلسلہ ختم ہوا اور وہ ایک بازار میں داخل ہو گیا۔ یہاں عمارتوں اور دکانوں کی دیواروں کا نچلا حصہ کولتار سے سیاہ چٹا ہوا تھا اور اوپر کا حصہ سفید گچ سے پوٹ دیا گیا تھا۔ سفیدی میں کہیں کہیں سرخی کی آمیزش بھی پائی جاتی تھی۔ اس نے دیکھا ان دکانوں اور مکانوں میں لوگ آ جا رہے تھے۔ کچھ لوگ اندر چلے جاتے ہیں اور کچھ باہر نکل آتے ہیں۔ آنے جانے والوں کا انداز یہ بتاتا تھا کہ نہ تو یہ مکانات تھے اور نہ ہی دکانیں۔ وہ شوق تجسس میں ایک دکان کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت دو آدمی

”منگول نوجوان! تو لڑکی کیوں بن گیا؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”میں لڑکی تو کبھی بھی نہیں بنا۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“

علیہ نے کہا۔ ”میں شب و روز تجھے یہیں اسی پائیں باغ میں موجود دیکھ رہی ہوں، کوئی مرد تو اس طرح ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”علیہ! تو خوش قسمت ہے کہ تو پیدا انٹی مسلمان ہے۔ مجھے اسلام کے بارے میں اب معلوم کرنا پڑ رہا ہے اور یہ کام ایسا نہیں ہے کہ میں گوشہ نشینی اور محنت شاقہ کیے بغیر حاصل کر لوں۔“

علیہ مسکرا رہی تھی، بولی۔ ”تو تو خاصا حلق معلوم ہوتا ہے، اپنا کام نکال اور گھر کی راہ لے۔ تیری جگہ میں ہوتی تو یہی کرتی۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”علیہ! میں تنہا کیلا انسان ہوں۔ میرا کوئی کنبہ کوئی خاندان نہیں۔ اس حال میں اگر مجھے کسی کا سہارا مل جائے تو میں بہت کارآمد بن سکتا ہوں۔ ایک پسندیدہ، خواہش اور مرضی کے مطابق سہارا۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”سہارا مرد کا ہو یا عورت کا؟“  
درداغ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”عورت کا، میں مرد ہوں علیہ!“

علیہ نے پوچھا۔ ”کوئی سہارا تلاش بھی کیا یا تلاش اور جستجو کے بغیر اپنا مقصد پانچ جانے کی آرزو کر رہے ہو؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”علیہ! میں اس سوال کا فی الحال کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“

علیہ نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔ ”لیکن میں تیرے جواب سے آگاہ ہو گئی، کوئی اور سہارا تلاش کر لے۔“  
درداغ چڑسا گیا، بولا۔ ”تو معلوم نہیں کیا سمجھ رہی ہے۔ شاید خوش فہمی کا شکار ہو گئی ہے۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”میں یا تو؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”تو..... اور کون؟“  
علیہ برابر مسکرا رہی تھی۔ ”سبحان اللہ! مجھے پر رکھ کر اپنی بات کر رہا ہے تو..... خدا تجھ پر رحم کرے۔“

درداغ نے کہا۔ ”علیہ! کیا اس وقت ہم دونوں کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، بالکل کر سکتے ہیں مگر اس سے زیادہ پُر لطف، لذیذ اور سد بہار موضوع اور نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں لطف و لذت اسی موضوع سے ہے، کم از کم میں یہی سمجھتی ہوں۔“



ہے اور تیسرا جسم پونچھنے کے کام آتا ہے۔“  
درداغ کا نہانے کو جی چاہنے لگا۔ یہ شخص کچھ زیادہ  
مہربان اور شریف تھا، پوچھا۔ ”دوست! کیا تم نہاؤ گے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”جی تو چاہتا ہے غسل کرنے  
کو لیکن اس وقت میرے پاس رقم نہیں ہے۔“  
اس شخص نے کہا۔ ”رقم کی فکر نہ کر میرے بھائی، تو  
نہانے چلا جا، رقم میں ادا کر دوں گا۔“

درداغ کچھ پس و پیش کے بعد غسل کرنے چلا گیا۔  
وہاں اس کو تین تہ بند دے دیے گئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ  
تینوں تہ بند سنبھالے اندر چلا گیا۔ دروازے کو اندر سے بند  
کر کے اس نے کپڑے اتارے اور ایک تہ بند باندھ کر  
دونوں ٹونٹیوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ٹونٹی کھولی  
تو اس میں سے گرم پانی نکلا۔ درداغ ہنسنے لگا، پھر اس نے  
دوسری ٹونٹی کھولی۔ اس میں سے ٹھنڈا پانی نکلا۔ اس کو  
جھر جھری سی آگئی۔

جب کچھ دیر بعد وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے اجنبی  
مہربان کو انتظار کرتے دیکھا۔ اس نے درداغ کے غسل کی  
رقم ادا کی اور پھر درداغ کے ساتھ باہر سڑک پر آ گیا، اس  
نے پوچھا۔ ”تو یہاں کس کے پاس ٹھہرا ہوا ہے؟“  
درداغ استاد شمس الدین کا نام لے کر اسے ذلیل نہیں  
کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”بھائی میرے! یہاں  
میرا کوئی بھی نہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ میں ہلا کو خان کی فوج  
کا بھگوڑا ہوں۔ میں یہاں بغداد بھاگ کر اس لیے آیا تھا  
کہ اسلام کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لوں اور اگر یہ مذہب  
سمجھ میں آجائے تو اس کو اختیار کر لوں۔“

اس شخص نے پوچھا۔ ”پھر کچھ سمجھ میں آیا اسلام؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”بہت کچھ سمجھ میں آچکا ہے  
اور ایسا لگتا ہے کہ شاید میں مسلمان ہو کر رہی رہوں گا۔ اسلام  
کی سیدھی سادی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی اثر انگیز زندگی  
ان دونوں نے مجھے اپنا بندہ بے دامن بنالیا ہے۔“  
اس شخص نے دعا کی۔ ”خدا تجھ کو صراطِ مستقیم دکھائے  
اور اصرار دھر جھکنے سے بچائے۔“

درداغ اس سے جدا ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ اس انتظار  
میں تھا کہ یہ اجنبی اس سے کہے کہ اچھا بھائی اب چلتے ہیں  
خدا حافظ اور درداغ فوراً اپنی راہ لے لی لیکن اس شخص کو معلوم  
نہیں کیا ہو گیا تھا کہ درداغ کے ساتھ ساتھ تو چل رہا تھا مگر  
خدا حافظ نہیں کہہ رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر درداغ ہی کو کہنا  
پڑا۔ ”اچھا جناب! بہت بہت شکریہ پھر کسی دن ملاقات

اس کے اندر چلے گئے اور ذرا دیر بعد ایک شخص اندر سے  
نمودار ہوا۔ یہ شخص صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس  
شخص نے درداغ کو بغور دیکھا اور ٹھنک کر کھڑا ہو گیا۔  
درداغ بھی اس کو بغور دیکھنے لگا پھر اس شخص نے عربی میں  
پوچھا۔ ”کیا تجھے عربی زبان آتی ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، کچھ کچھ۔ بہت زیادہ  
نہیں۔ بس کام چلا لیتا ہوں۔“

اس شخص نے پوچھا۔ ”کیا تو منگول ہے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں منگول ہوں۔ کیا  
کسی کا منگول ہونا جرم ہے؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں  
تو بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔“ پھر پوچھا۔ ”بغداد میں کیا لینے  
آئے ہو؟“

درداغ نے اس کی بات کا تو کوئی جواب دیا نہیں، الٹا  
سوال کر دیا، پوچھا۔ ”مشفق و مہربان دوست! ان دکانوں  
میں کیا بکتا ہے؟“

وہ شخص مسکرایا، بولا۔ ”یہ دکانیں نہیں ہیں، یہ حمام  
ہیں۔ یہاں لوگ غسل کرنے آتے ہیں۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا  
تو غسل کرے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، جب میرے پاس  
گھر موجود ہے تو پھر یہاں حمام میں نہانے سے فائدہ؟“

وہ شخص نے جارہا تھا، بولا۔ ”میں بھی نہا کر نکلا ہوں، کیا  
میرا گھر نہیں ہے اور یہ لوگ جو صبح سے شام تک یہاں آتے  
جاتے رہتے ہیں، کیا سب کے سب بے گھر ہیں؟ ہرگز نہیں۔“  
درداغ نے پوچھا۔ ”پھر یہ لوگ بازاروں میں کیوں  
نہاتے ہیں؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”یہاں سہولتیں بہت ہوتی  
ہیں۔ ٹھنڈا اور گرم پانی الگ الگ ٹونٹیوں سے نکلتا ہے جبکہ  
گھروں میں ایسا نہیں ہوتا۔“

درداغ کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسی ٹونٹیاں ہیں کہ  
جن سے بیک وقت گرم پانی بھی نکلتا ہے اور ٹھنڈا بھی۔  
پوچھا۔ ”کیا میں انہیں اندر سے دیکھ سکتا ہوں؟“

اس شخص کو اس سادہ لوح نوجوان پر رحم آ رہا تھا، وہ  
درداغ کو اندر لے گیا۔ وہاں اس نے ایک قطار میں تہ بند  
لٹکے دیکھے، پوچھا۔ ”یہ اتنے بہت سارے تہ بند کس کام  
آتے ہیں؟“

اس آدمی نے جواب دیا۔ ”ایک تہ بند تو باندھ کر  
نہانے کے کام آتا ہے، دوسرا غسل کے بعد پہننے کے کام آتا



وہ شخص دردناخ کو پیدل چلا کر کافی دور لے گیا۔  
دردناخ نے بغداد کی اس عجیب و غریب جگہ کو دیکھا تو سمجھ میں  
نہ آیا کہ اس لمبی چوڑی فوجی بارکوں جیسی جگہ میں کون لوگ  
رہتے ہیں۔ بالکل اصطبلوں جیسی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔  
ایک سرے سے دوسرے سرے تک دور وہ حجرے سے  
بنے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے پانی کے حوض اور چھوٹی  
چھوٹی نہریں تھیں، ان حوضوں اور نہروں میں بطخیں تیر رہی  
تھیں۔

وہ شخص دردناخ کو ان حجروں کے اوپر بنے ہوئے  
حجروں میں لے گیا۔ شروع میں ایک بڑا سا پھانک بنا تھا  
جس کے دو ہاتھیوں جتنی بلندی کے چوہی پھانک آغوش مادر  
کی طرح واسطے اور پھانک کے دونوں طرف ان کے پیچھے  
اوپر جانے کے لیے زینے بنے ہوئے تھے۔ وہ دردناخ کو  
ایک درمیانی حجرے کے سامنے پہنچا کر کھڑا ہو گیا۔ حجرے کا  
دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس شخص نے آہستہ سے دروازے  
پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے پوچھا۔ ”کون؟ ارے  
بھائی! کون؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ارے بھائی میرے!  
دروازہ تو کھول پھر پہچان تو کہ یہ کون ہیں اور میں کس کو لے  
کر آیا ہوں۔“

ذرا سی دیر میں حجرے کا در کھل گیا۔ دونوں نے ایک  
دوسرے کو دیکھا۔ دردناخ کو یاد آ رہا تھا کہ اس شخص کو وہ ہلاکو  
خان کے آس پاس دیکھ چکا ہے لیکن وہ اس کا نام نہیں جانتا  
تھا۔ اس اجنبی منگول نے دردناخ کو مخاطب کیا۔ ”ارے  
دردناخ! یہ تو..... میں نے تجھ کو بہت تلاش کیا اور اب ناکام  
ہو کر میں واپس جانے ہی والا تھا۔“

دردناخ نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ”خیریت تو  
ہے، تم یہاں کیا لینے آ گئے؟“

اس منگول نے اجنبی شخص کی طرف دیکھتے ہوئے  
جواب دیا۔ ”میں بھی تیری طرح اسلام کے سوا کسی اور  
مذہب کو پسند نہیں کرتا۔ اب میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ  
بغداد کے اہل علم اور فاضل و باکمال لوگوں سے مل کر ان سے  
اسلامی تعلیمات کا درس لوں۔“

دردناخ نے کہا۔ ”بڑا اچھا خیال ہے آپ کا۔ میرا  
خیال ہے کہ ہم دونوں کے بعد جھگوڑے منگولوں کا ایک تاننا  
سا لگ جائے گا۔“ اس کے بعد یہ دونوں اپنے مہربان اجنبی  
کی طرف رجوع ہو گئے۔ دردناخ نے کہا۔ ”اب تو جناب  
آپ کو اپنا پتا ہمیں سمجھانا ہوگا تاکہ ہم دونوں آپ کا شکریہ

ہو جائے گی اگر اللہ نے چاہا تو۔“  
اس شخص نے کہا۔ ”پھر کسی دن کیا معنی، میں تجھے تو ایک  
شخص سے ملوانا چاہتا ہوں۔“  
دردناخ نے پوچھا۔ ”کس شخص سے میرے بھائی!  
میں تو یہاں کسی کو پہچانتا بھی نہیں۔“

اس شخص نے ہنس کر جواب دیا۔ ”لیکن میں تجھ کو جس  
شخص سے ملواؤں گا تو اسے ضرور پہچان لے گا۔“

دردناخ کو ان باتوں سے وحشت بھی ہو رہی تھی اور  
غصہ بھی آ رہا تھا، بولا۔ ”بھائی میرے! کیا آپ میری بات  
نہیں سمجھ رہے ہیں؟ میں نے کہہ جو دیا کہ اس شہر بغداد میں،  
میں بالکل اجنبی ہوں۔ مجھ سے کوئی بھی واقف نہیں، یہاں  
میرا کوئی بھی دوست یا شاسا نہیں۔“

اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرے  
بھائی! میں بھی تجھ سے غلط نہیں کہہ رہا۔ تو اس شخص کو ضرور  
جانتا ہے اور وہ شخص تجھ سے ضرور واقف ہے، ذرا میرے  
ساتھ تو چل۔“

دردناخ نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ”پتا نہیں آپ مجھ  
سے کس قسم کا اور کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ جانتا  
کہ مجھ کو اپنے غسل کی یہ قیمت ادا کرنا پڑے گی تو میں آپ  
کی رقم سے ہرگز غسل نہ کرتا۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”کیا تیرا نام دردناخ ہے؟  
اگر تیرا یہی نام ہے تو تجھے میری باتوں پر یقین کر لینا چاہیے  
کہ تیرا ایک ساتھی، تجھے دو دن سے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔  
کل وہ اتفاق سے ہی بازار میں مل گیا تھا۔ آج تو مل گیا تو  
میں نے سوچا کہ میں یہ نیک کام انجام دے دوں۔“

اب دردناخ کو سنجیدگی سے قائل ہو جانا پڑ گیا تھا کہ یہ  
اجنبی شخص جو حجام کے باہر اتفاقہ طور پر مل گیا تھا، اس سے کسی  
قسم کا مذاق نہیں کر رہا ہے۔ اس شخص کو دردناخ کا نام تک  
معلوم ہو گیا تھا۔ دردناخ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔  
دردناخ کو خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”تو گویا تجھ  
کو میری بات کا یقین آ گیا ہے؟“

دردناخ نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ ”ہاں  
میرے بھائی! مجھے یقین تو آ گیا لیکن یہ بات اب بھی میری  
سمجھ میں نہیں آرہی کہ اس شہر میں وہ کون شخص ہے جو مجھ کو  
تلاش کرتا پھر رہا ہے اور میں اس کو جانتا ہی نہیں۔“

اس شخص نے کہا۔ ”یہ مسئلہ بھی جلد ہی حل ہو جائے  
گا۔ جب تم دونوں کا آمناسا منا ہوگا تو خود ہی ایک دوسرے  
کو پہچان لو گے۔“



اور ان کے چاروں طرف خریداروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہم دونوں اپنے چہرے مہرے اور خاص خدوخال کی وجہ سے دور ہی سے الگ نظر آتے ہیں۔ وہاں مچھلی اور کباب وغیرہ کھانے والے لوگ ہمیں دلچسپی سے دیکھیں گے۔ بس جب وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے تو میں اپنی تقریر شروع کر دوں گا۔“

گوت کی سمجھ میں دردراغ کی بات نہیں آئی مگر وہ اسی وقت سرائے سے نکلا اور دجلہ کے کنارے پہنچ گیا۔ دجلہ کے کنارے کباب، مچھلی، روٹی والے دکانیں سجائے بیٹھے تھے اور کھانے والوں کے ہجوم نے انہیں اپنے بیچ میں دبا رکھا تھا۔ ان دونوں کے پہنچتے ہی لوگوں نے انہیں دیکھنا اور... چہ میگوئیاں کرنا شروع کر دیں۔ ان دونوں نے کچی اور بھنی ہوئی مچھلیاں خریدیں اور مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ دردراغ نے کہا: ”کیسی مزے کی مچھلیاں ہیں یہاں..... واہ واہ مزہ آگیا۔“

گوت نے کہا: ”میں نے ایسی مچھلی دنیا بھر میں نہیں دیکھی اور ان کا مزہ..... بس کیا کہیں واہ واہ۔“ آس پاس کے لوگوں نے ان دونوں کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ دردراغ نے کہا: ”گوت! کیا خیال ہے ہم منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔“

گوت نے جواب دیا: ”ہاں یہ تو ہے۔ اسلام میں کوئی ایسی بات ہے ضرور جو دل و دماغ پر اپنا قبضہ جمالتی ہے۔“ دردراغ نے کہا: ”اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ میں تو اس پر حیران ہو رہا ہوں کہ برتائی خان مسلمان ہو چکا ہے اور اب ہلاکو خان بھی اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ پہلے اس کا یہ ارادہ تھا کہ وہ خراسان ہی میں کسی مسلمان عالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لے لیکن پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ہلاکو خان نے کسی مسلمان سے پوچھا کہ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا مسلمان کون ہے تب اس کو یہ بتایا گیا کہ بغداد کے حکمران امیر المومنین مستعصم باللہ سے بڑا کوئی مسلمان نہیں۔ چنانچہ ہلاکو خان نے اعلان کر دیا کہ وہ بغداد میں امیر المومنین کے دربار میں حاضری دے گا اور وہیں مسلمان ہو جائے گا۔“

گوت نے جواب دیا: ”یہی باتیں میں نے بھی سنی ہیں۔“ بغداد کے لوگ ان دونوں کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ کسی عمر رسیدہ مسلمان نے پوچھا: ”تم دونوں کون ہو؟“

ادا کرنے کے لیے آپ کے گھر آئیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا پتا بالکل سیدھا سادہ ہے۔ آپ دونوں محلہ عتابیہ میں آجائے، یہاں بغداد کا مشہور کپڑا عتابیہ تیار ہوتا ہے۔ اس محلے میں عتابیہ بننے کا سب سے بڑا کارخانہ میرا ہی ہے۔ میرا نام ہے سیف الدین۔“

وہ شخص اپنا پتا سمجھانے کے بعد وہاں نہیں رکا۔ فوراً جدا ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی اجنبی منگول نے کہا: ”دردراغ! میرا نام گوت ہے۔ مجھے کوخان محترم ہلاکو خان اور نصیر الدین طوسی نے تیری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ تیری ہی طرح میں بھی یہی کہوں گا کہ میں یہاں اسلام قبول کرنے آیا ہوں اور میں بھی تیری طرح ہر جگہ یہی کہتا پھروں گا کہ ہلاکو خان اور منگول خلافت عباسیہ سے خوفزدہ ہیں اور وہ بغداد پر حملے کا ارادہ نہیں رکھتے اور یہ کہ منگولوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔“

دردراغ نے کہا: ”بڑا اچھا خیال ہے۔ میں نے یہاں کے مدرسہ مستنصریہ کے ایک لائق فائق استاد شمس الدین کا سہارا پکڑ لیا ہے۔ میں انہی کے پائیں باغ میں رہتا ہوں اور استاد شمس الدین کی میری بابت امیر المومنین سے کچھ بات بھی ہو چکی ہے۔ میں خان محترم کا منصوبہ ہر وقت ذہن نشین رکھتا ہوں۔“

گوت نے کہا: ”دردراغ! ہلاکو خان کہتا تھا کہ اگر کسی نے مجھے دھوکا دیا تو میں اس کو دھوکا دوں گا اور قبر کی گہرائیوں تک سے اس کو نکال لاؤں گا۔“ دردراغ کو جھرجھری سی آگئی، نجیف سی آواز میں بولا: ”لیکن اس کو کوئی دھوکا دے گا ہی کیوں اور کس کی شامت آئی ہے جو ہلاکو خان سے غداری کرے گا۔“

گوت نے کہا: ”دردراغ! معلوم نہیں کس طرح ہلاکو خان اور نصیر الدین طوسی کو تیری بابت یہ شبہ ہو گیا ہے کہ تو ان کے لیے کام نہیں کرے گا۔ اسی اندیشے کے پیش نظر مجھ کو یہاں بھیجا گیا ہے۔“

دردراغ نے کہا: ”مجھ پر خواہ مخواہ شبہ کیا گیا ہے۔“ پھر پوچھا: ”گوت! تیرے پاس بغدادی درہم دینار ہوں گے؟“

گوت نے جواب دیا: ”ہاں ہیں تو سبھی، کیوں؟ کوئی خاص بات؟ کوئی خاص کام؟“

دردراغ نے کہا: ”ہم دونوں اسی وقت دجلہ کے کنارے چلتے ہیں۔ وہاں مچھلی اور کباب والے بیٹھے ہیں



یہ دونوں ان سب کو باتوں میں لگا کر وہاں سے چلے آئے۔ راستے میں گوتم نے پوچھا۔ ”اب تو کہاں جائے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”استاد شمس الدین کے گھر لیکن مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ مجھے اپنے گھر کا راستہ ہی نہیں یاد آ رہا ہے میں اب جاؤں گا کہاں؟“

گوتم نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ تو اپنے گھر کا راستہ کیونکر بھول گیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میں اس گھر سے پہلی بار بدحواسی میں نکلا تھا۔ میں کوئی نشانی یا علامت ذہن میں محفوظ کیے بغیر چلتا رہا۔ بعد میں جب ذرا ہوش آیا تو میں اتنی دور پہنچ چکا تھا کہ وہاں سے اپنے گھر تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو چکا تھا۔“

گوتم نے پوچھا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟“

درداغ نے کہا۔ ”لیکن تو کیوں پریشان ہے تو، تو اپنی سرائے میں واپس جائے گا، پریشان تو مجھ کو دونا چاہیے۔“

گوتم زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”کیا اب بھی میں سرائے ہی میں ٹھہروں گا؟ ارے نہیں بھائی! میں تو تیرے ساتھ رہوں گا۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ اپنی خدمات انجام دیں گے۔“

درداغ نے فکر مندی سے کہا۔ ”اب معلوم نہیں استاد شمس الدین تجھ کو میرے پاس رہنے کی اجازت دیں گے یا نہیں، میں اپنی طرف سے تو کوئی وعدہ کرنے سے رہا۔“

گوتم نے تیوری بدل کر کہا۔ ”درداغ! تو ہے کس ہوا میں؟ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تیرے ساتھ رہوں۔“

درداغ پریشان یوں تھا کہ وہاں علیہ بھی رہتی تھی اور گوتم خواستواہ کیاب میں ہڈی بن کر چپک جائے گا۔ بولا۔

”گوتم! چند دنوں کے لیے تجھے سرائے میں رہنا چاہیے۔ اس کے بعد جب میں استاد شمس الدین کو راضی کر لوں گا تو، تو میرے پاس چلے آنا۔“

گوتم نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں خان محترم ہلاکو خان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔“

درداغ نے ایک نیا عذر پیش کیا۔ ”اس وقت ایک اور مشکل بھی آپڑی ہے۔ میں اپنا گھر بھول چکا ہوں۔ پتا نہیں اب میں گھر پہنچوں گا کس طرح؟“

گوتم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”درداغ! زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کر۔۔۔ تو جہاں رہتا تھا، اس کو میں تلاش کر لوں گا۔“

گوتم نے اس کو نہایت غور سے دیکھا، جواب دیا۔

”ہم دونوں مسلمان ہیں۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”نہیں، میں یہ نہیں پوچھ رہا کہ اس وقت تم کون ہو کیا ہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مسلمان ہونے سے پہلے تم کیا تھے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”حضرت! ہم دونوں نسلاً منگول ہیں۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”بہت خوب! تو اب تم دونوں مسلمان ہو چکے ہو شاید؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”بمحلہ۔“

ایک تیس پینتیس سالہ خوب رو جوان ان دونوں کے پیاس کھڑے ہو کر کھجلی کھانے لگا، پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہم جھوٹ کیوں بولیں گے۔ اگر ہلاکو خان جیسا کہ سننے میں آیا ہے مسلمان ہو گیا تو اس کے ساتھ لاکھوں منگول چشم زدن میں اسلام قبول کر لیں گے۔“

کسی طرف سے آواز آئی۔ ”لیکن میں نے تو یہ سنا ہے کہ ہلاکو خان نے امیر المومنین کو حاکمی آمیز خط بھی لکھا ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ضرور لکھا ہوگا کیونکہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے درباروں سے رسمی کارروائیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ہلاکو خان نے امیر المومنین کو جو کچھ بھی لکھا ہوگا رسمی طور پر لکھا ہوگا۔ ورنہ اس کا دل اسلام کی محبت سے سرشار ہے۔ جب میں ہلاکو خان کے بالکل قریب تھا تو میں نے سنا تھا کہ ہلاکو خان فرط عقیدت میں اپنی بیٹی کی شادی امیر المومنین کے بڑے صاحبزادے ابوبکر سے کرنے والا ہے۔“

دجلہ کے کنارے جو بھی یہ باتیں سن رہا تھا، خوش ہو رہا تھا۔ یہ دونوں اتنی باتیں کر کے خاموش ہو گئے۔ اب دوسرے اسی موضوع پر بحث مباحثہ کرنے لگے۔ ان سب میں خوب گرم گرم بحث ہونے لگی۔ کچھ کا خیال تھا کہ ہلاکو خان امیر المومنین کی عزت و احترام تو کرے گا مگر شاید اسلام نہ قبول کرے مگر دوسرے صاحب اس کو سختی سے مسترد کرنے لگے۔ انہوں نے فرط جوش میں کہا۔ ”اگر اسلام کی خوبیاں ہلاکو خان کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی ہیں تو کون ہے جو اس خونخوار انسان کو اسلام قبول کرنے سے روک سکے۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”خدا یا! مجھے اس دن تک زندہ رکھ، جب ہلاکو خان اسلام قبول کرے گا۔“



تعلق، گناہ اور بے وقعت ہو کر۔“  
دکاندار ان دونوں کی باتیں نہیں سمجھ پاتا تھا۔ اب اس نے ان کی باتوں میں مداخلت کی، دردناغ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”جناب! یہ آپ دونوں کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”اپنی مادری منگول زبان میں۔“  
دکاندار نے گوت کی عربی زبان سے متاثر ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم دونوں کو عربی زبان بھی آتی ہے؟“  
گوت نے دکاندار کا مذاق اڑایا۔ ”اگر عربی زبان آتی نہیں ہے تو میں نے اس زبان میں جواب کس طرح دے دیا؟“

دکاندار گوت کے تلخ لہجے سے گھبرا کر رہ گیا، پوچھا۔  
”آپ دونوں کا بغداد آنا کس طرح ہوا؟“  
گوت نے جواب دیا۔ ”گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر اور کس طرح؟“

دردناغ نے گوت کو منگول زبان میں سمجھایا۔ ”خدا کے لیے یہاں اس طرح بات نہ کر، ہمیں ان کے دلوں میں جگہ بنانی ہے، انہیں اعتماد میں لے کر اپنا مقصد حاصل کرنا ہے۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”ان سے کام بھی نکالنا ہے اور انہیں اعتماد میں لے کر مرعوب بھی کرنا ہے۔“

دکاندار نے وحشت زدہ سی کیفیت میں پوچھا۔  
”ارے تم دونوں کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ اچھی خاصی عربی بولتے بولتے پھر اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے، پتا نہیں ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہے ہو یا کچھ اور.....“

دردناغ نے کہا۔ ”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا ساتھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بغداد کے لوگ کتنے مہذب اور خوش اخلاق ہیں۔ میں نے دنیا کا جتنا حصہ دیکھا ہے، ان میں بغداد سب پر فضیلت رکھتا ہے، ایک افضل شہر.....“

گوت مسکرایا۔ ”منگول زبان میں کہا۔“ حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ابھی تک۔“

دردناغ نے کہا۔ ”اجڈ انسان! میں عنقریب امیر المومنین سے ملاقات کرنے والا ہوں۔ اگر یہاں کے لوگوں میں ہم بدنام ہو گئے اور امیر المومنین تک کوئی ایسی ویسی بات پہنچ گئی تو پھر ہمیشہ ذلیل و خوار کر کے یہاں رکھا جائے گا۔“

گوت نے اکر کر جواب دیا۔ ”کون ہے وہ جو ہمیں ذلیل و خوار کرے۔ بغداد میں امیر المومنین سمیت ابھی وہ

دردناغ کو گوت پر غصہ آ رہا تھا، ذرا تلخ لہجے میں بولا۔ ”گوت! میں اڑنے کی کوشش کیوں کروں گا؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیوں کرے گا مگر میں اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر دم لوں گا۔“

دردناغ نے ایک بار پھر خوشامد کی۔ ”گوت! میں تجھے کو کیونکر یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں بھی جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔“

دونوں دیر تک باتوں میں الجھے رہے۔ آخر کار گوت نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کام کل کرنا ہے، وہ آج ہی اسی وقت ہونا چاہیے۔

دردناغ نے گوت سے کہا۔ ”تو نے جب یہ فیصلہ ہی کر لیا ہے کہ جو کام تیرے سپرد کیا گیا وہ فوراً کیا جائے گا تو پھر میں کیا بولوں۔“

دونوں مکان کی تلاش میں چل پڑے۔ دردناغ کے لیے منحنی خیز بات یہ تھی کہ اسے اپنے محلے کے نام اور محل وقوع کا کچھ پتا نہ تھا۔ وہ دونوں بغداد کے ایک بازار میں مارے مارے پھرتے رہے گوت اپنے لباس اور اپنے حلیے کی وجہ سے ہر جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہا۔ جس بازار میں یہ دونوں گئے تھے، وہ شہر کے بازار تھا۔ ہر طرف برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گوت بغداد کے مال و زر کا معترف اور مداح تھا۔ ایک جگہ برتنوں پر قلعی کا کام ہو رہا تھا۔ گوت اور دردناغ کھڑے ہو کر یہ کام دیکھنے لگے۔ دکاندار بھی انہیں بہت غور سے دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان دونوں کے پیچھے بے تعلق بن کے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد گوت نے منگول زبان میں دردناغ سے کہا۔ ”شہری زندگی میں آرام کتنا ہوتا ہے۔“

دردناغ نے بھی منگول زبان میں جواب دیا۔ ”اور یہی آرام انسان کو کابل اور بزدل بنا دیتا ہے۔“

گوت نے کہا۔ ”کچھ جانتا ہے خان اعظم چنگیز خان نے اس سلسلے میں کیا کہا تھا؟“

دردناغ نے جواب دیا۔ ”معلوم ہے، خان اعظم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ شہروں میں مت آباد ہو جانا اور یہ بھی کہ قراقرم کو مت چھوڑنا کیونکہ جو قراقرم اور اپنے خاندان کو چھوڑ کر دور دراز کے علاقوں اور شہروں میں جا بسے گا، اس کی مثال اس تیر جیسی ہوگی جو کمان سے نکل کر اونچی اونچی گھاسوں یا گہرے نیلے پانی میں جا گرا ہو..... بے



رند بھی۔ مسلمان صوفی ہم منگولوں کے روبرو اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اس تبلیغ کا یہ اثر ہو چکا ہے کہ ہلاکو خان مسلمان ہونے کو تیار ہے اور اسی مقصد سے وہ بغداد کی طرف چل چکا ہے۔“

دکاندار نے پوچھا۔ ”اور تم دونوں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں اسلام قبول کرنے میں ہلاکو خان کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتے ہیں اسی لیے بغداد میں پہلے آ گئے۔“

دکاندار بہت خوش ہوا، بولا۔ ”میں تم دونوں کو بغداد میں دیکھ کر گھبرا گیا تھا کیونکہ یہاں یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ منگول بغداد کو برباد کرنے آرہے ہیں اور خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہو چکا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”نہیں تو..... ایسی تو کوئی بات نہیں، افواہوں کا کیا، روز پھیلتی رہتی ہیں۔“

دکاندار نے کہا۔ ”آپ دونوں میرے مہمان رہیں اور جب ہلاکو خان آجائے تو اس سے ہماری سفارش فرما دیجیے گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان عام انسانوں سے قطعی مختلف ہے، وہ سفارش وغیرہ کو پسند نہیں کرتا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو ہلاکو خان یا اس کے بیٹوں میں سے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

دکاندار کی جان میں جان آئی، کہنے لگا۔ ”ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ یہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہلاکو خان نے اپنے پوتے کو اس بات پر بہت برا بھلا کہا ہے کہ وہ مسلمان کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ ہلاکو خان نے امیر المومنین کو بہت سخت خط لکھ دیا ہے اور امیر المومنین اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نے بھی یہ سنا تھا اور میں بہت جلد امیر المومنین سے ملاقات کرنے والا ہوں، وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ ہلاکو خان اور امیر المومنین کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کیا جائے۔“

دکاندار نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون؟ تم امیر المومنین سے ملاقات کرنے والے ہو؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں امیر المومنین سے ملنے والا ہوں۔“

دکاندار نے چر مسرت لہجے میں کہا۔ ”تب پھر تم میرا ایک کام بھی ضرور کر دینا۔“

درداغ دکاندار کی شکل دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کون

آدمی نہیں پیدا ہوا جو ہم سے تیوری بدل کر بات کر سکے۔“

دکاندار ان دونوں سے مرعوب بھی تھا اور ان کی دلیری سے متاثر بھی۔ بولا۔ ”صاحبان! آپ دونوں ہمارے مہمان ہیں۔ کیا آپ دونوں اسی وقت میرے ساتھ میرے گھر چلنا گوارا فرمائیں گے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، میں تیرے ساتھ تیرے گھر ضرور چلوں گا کیونکہ کچھ دن مہمان بن کے کسی کے گھر پڑ رہنا ہمارا مقدر بن چکا ہے۔“

درداغ گوت کی باتوں سے تنگ آچکا تھا، بولا۔ ”گوت! میں کسی کا مہمان بننے کو تیار نہیں۔ ہاں اگر تم چاہو تو اس دکاندار کو شرفِ میزبانی بخش سکتے ہو۔“

دکاندار ان دونوں کو اپنی دکان کے اندر لے گیا اور انہیں نہایت عزت سے بٹھایا۔ پوچھا۔ ”آپ لوگوں کا فی الحال قیام کہاں ہے..... غالباً سرائے ہیں؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”ہاں، میرا قیام تو سرائے میں ہے لیکن میرے ساتھی کا کسی اور جگہ۔“

ان دونوں کو دیکھنے کے لیے دکان کے آگے دس بارہ آدمی جمع ہو چکے تھے۔ گوت نے کہا۔ ”جناب والا! اگر ہم دونوں یہاں کچھ دیر اور رہے تو دکان کے باہر ہمارے شاہین دید جگمگنا لگادیں گے۔“

دکاندار نے ان دونوں کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ دکاندار کا گھر بہت شاندار تھا۔ اس کے عظیم الشان پھانک پر دو دربان دربانی کر رہے تھے۔ دکاندار نے ان دونوں کو پاس بلا کر سمجھایا۔ ”کبھی چل پھر بھی لیا کرو۔“

دونوں نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”بے شک بے شک۔“

دکاندار ان دونوں کو اپنے محل کے اندرونی حصوں میں لے گیا۔ ایک تخت پر خود بیٹھ گیا اور دوسرے تخت پر ان دونوں کو بٹھایا، بولا۔ ”ہاں جناب! اب آپ دونوں ذرا اپنا تعارف بھی کرادیں۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”ہمارا تعارف یہ ہے کہ ہم دونوں ہلاکو خان کے لشکر سے تعلق رکھتے ہیں۔“

دکاندار نے کہا۔ ”یہ تو کوئی تعارف نہ ہوا۔“

درداغ اب تک برداشت کرتا رہا تھا مگر اب بات ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی، دکاندار کو سمجھایا۔ ”بھائی میرے! بات یہ ہے کہ ہلاکو خان اور اس کے لشکر میں اسلام کا چرچا بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمارے لشکر میں مسلمان بھی ہیں، ان میں صوفی بھی ہیں اور مست المست



سا کام؟

دکاندار نے کہا۔ ”میرے پڑوسی نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اپنے گھر کی ساری گندگی میرے پھانک کے سامنے ڈالوا دیتا ہے۔ اس پڑوسی نے چھ سات ماہ پہلے مجھ سے کچھ سامان قرض لیا تھا، میں جب اس کا تقاضا کرتا ہوں تو ہفتہ عشرے پر ٹال دیتا ہے۔ اس ہفتہ عشرے میں چھ ماہ گزر گئے۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میری طرف سے امیر المومنین سے کہنا کہ میری رقم دلوادیں، بخدا میں تمہارا بے حد شکر گزار رہوں گا۔“

درداغ نے ازراہ مذاق پوچھا۔ ”اور کچھ یا بس؟“  
دکاندار نے جواب دیا۔ ”اور امیر المومنین سے میری طرف سے یہ بھی کہنا کہ دربار کے کئی آدمی میری دکان سے کافی سامان ادھار لے جا چکے ہیں۔ جب میں ان سے اپنی رقم کا تقاضا کرتا ہوں تو وہ مجھے دھمکیاں دینے لگتے ہیں۔ تم امیر المومنین سے کہنا کہ ایسے لوگوں کو دربار میں نہ گھسنے دیں اور میری رقم دلوادیں۔“

دکاندار جیسے ہی چپ ہوا، درداغ نے ازراہ مذاق پھر سوال کیا۔ ”اور کچھ یا بس؟“

دکاندار نے کہا۔ ”اور یہ کہ امیر المومنین کبھی مجھے بھی شرفِ باریابی بخشیں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں یہ بھی کروں گا اور کچھ؟“  
دکاندار نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تو بس اتنا ہی یاد آ رہا ہے۔ امیر المومنین کے پاس جانے سے پہلے تم مجھ سے ملتے جانا۔ اس وقت تک میں اور یاد کروں گا۔“

گوت کو دکاندار کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا، جل بھن کر بولا۔ ”کیا تو اسی لیے ہمیں اپنا مہمان بنا رہا ہے؟“

دکاندار گھگھکیا، لگا، بولا۔ ”نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

گوت نے درداغ سے کہا۔ ”تو اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو یہاں سے اسی وقت بھاگ۔ یہ آدمی ہے یا معیبت۔“

دکاندار نے گوت کی خوشامد کی۔ ”نہیں بھائی ایسا غضب نہ کرنا۔ میں نے دنوں بعد تم رسا حضرات کو پایا ہے۔ اب اگر تم بھی میرا کام نہیں کرو گے تو کون کرے گا۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں یہاں اپنے مسائل لے کر آیا ہوں، کسی اور کے کیا کام آؤں گا۔“

لیکن درداغ نے دکاندار کو سہارا دیا۔ ”بہر حال میں

اپنی سی کوشش کر دیکھوں گا، آگے اللہ مالک ہے۔“

دکاندار نے ان دونوں کی بڑی خاطر مدارت کی۔ دونوں نے ایک رات دکاندار کے گھر میں بسر کی، دوسرے دن صبح وہ دونوں دکاندار کی مدد سے مدرسہ مستنصریہ پہنچے کیونکہ استاد شمس الدین کا قیام اسی مدرسہ کی ایک عمارت میں تھا۔ درداغ کو یہ سوچ کر بڑا افسوس ہوا کہ اس نے لوگوں سے مدرسہ مستنصریہ کا پتا کیوں نہ پوچھا کیونکہ مدرسہ نظامیہ کے بعد اور اس سے اعلیٰ مدرسہ مستنصریہ دور دور تک شہرت رکھتا تھا۔ یہ مدرسہ خلیفہ عباسی مستنصرم باللہ کے باپ خلیفہ مستنصر باللہ نے قائم کیا تھا۔

استاد شمس الدین نے درداغ کو ایک منگول اور دوسرے مقامی آدمی کے ساتھ اپنے سامنے دیکھ کر نہایت غصے سے پوچھا۔ ”یہ تو کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے بلا وجہ پریشان کر ڈالا۔ میں کل دن بھر اور شام رات گئے تک تیری تلاش میں سرگرداں رہا۔ تو نے حد کر دی بے پروائی کی۔“  
درداغ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں راستہ بھول گیا تھا۔“

استاد شمس الدین نے گوت اور بغدادی دکاندار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون ہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”یہ گوت میرا ہم قوم ساتھی ہے، یہ مجھے تلاش کرتا ہوا بغداد چلا آیا۔ اب یہ بھی مسلمان ہوتا چاہتا ہے۔“ پھر دکاندار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ صاحب ہم دونوں کے محسن، برتنوں کے بازار کے ایک تاجر ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنے مکان میں ٹھہرایا، میزبانی کی اور اس وقت آپ کے پاس پہنچانے چلے آئے۔“

استاد شمس الدین نے گوت کو خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے دیکھا اور اسے خوش آمدید کہا۔ دکاندار کو تحسین و آفرین کی نظروں سے دیکھتے ہوئے خود بھی شکر یہ ادا کیا، کہا۔ ”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ دونوں اس شہر میں اجنبی ہیں، حق کی تلاش انہیں یہاں پہنچانے لائی ہے۔“

دکاندار نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ دونوں میری دکان کے سامنے کھڑے بڑی دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں غیر ملکی اور غیر قومی سمجھ کر اپنے گھر میں پناہ دی اور اب.....“

استاد شمس الدین نے دکاندار سے اخلاقیات کہا۔ ”امید ہے کہ اب آپ بھی یہاں تشریف لاتے رہیں گے۔“

دکاندار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جناب!



درداغ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! یہ میرا دوست گوت ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ منگولوں میں اسلام کا بڑا چرچا ہے اور ہم لوگ تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ میرے دوست گوت نے بھی ہلاکو خان کا ساتھ چھوڑ دیا اور مجھ کو تلاش کرتا ہوا بغداد چلا آیا۔ خوش قسمتی سے یہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے۔“

استاد شمس الدین نے گوت کو بڑی دلچسپی اور ہمدردانہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”مرحبا میرے دوست! تجھ کو اسلام مبارک ہو۔“

گوت نے آگے بڑھ کر استاد شمس الدین کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا مگر استاد شمس الدین نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور کہا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں)۔“

درداغ نے استاد شمس الدین سے درخواست کی۔ ”استاد محترم! میرے دوست کا بھی بغداد میں کوئی ٹھکانا نہیں اس لیے اسے بھی آپ کی توجہ درکار ہے۔“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”فی الحال تو اس کو اپنے پاس ہی رکھ، پھر کوئی دوسرا انتظام بھی ہو جائے گا۔“  
درداغ یہی نہیں چاہتا تھا، بولا۔ ”جیسا آپ کا حکم لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہم دونوں کا کوئی مستقل انتظام ہونا چاہیے۔“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”کل تجھ کو میرے ساتھ امیر المومنین کے پاس چلنا ہے۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اپنے ساتھ گوت کو بھی لیتا چلوں لیکن اتنی عجلت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

استاد شمس الدین نے ان دونوں کو پائیں باغ والے دو کمروں کے مکان میں پہنچا دیا۔  
گوت نے ان کمروں کا بغور جائزہ لیا۔ درداغ نے کہا۔ ”دوست! کمرے تو بہت اچھے ہیں۔ تجھ کو استاد کی شکل میں ایک ہمدردانہ انسان خوب مل گیا ہے۔“

استاد شمس الدین جا چکے تھے۔ درداغ نے ازراہ احتیاط منگول زبان میں بات شروع کر دی، بولا۔ ”دوست! استاد شمس الدین بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کی نیکیوں اور اچھائیوں کے پیش نظر جی نہیں چاہتا کہ انہیں دھوکا دیا جائے، ان سے دھوکا کیا جائے۔“

گوت مسکرائے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز تھا، شرارت تھی، بولا۔ ”درداغ! خان محترم ہلاکو خان کا تیری بابت یہ خیال ہے کہ تو بغداد کی تہذیب اور اسلام کے

اب تو آپ مجھے بلائیں یا نہ بلائیں، میں آتا رہوں گا کیونکہ جب سے مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ جوان اپنے امیر المومنین سے ملاقات کرنے والا ہے، میں نے اس کے سپرد اپنے کئی کام کر دیے ہیں۔ جب تک میں اس سے اپنے وہ کام پورے نہیں کرالوں گا، دم نہیں لوں گا۔“

استاد شمس الدین نے درداغ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”امیر المومنین سے کون اور کب ملنے جا رہا ہے؟“  
دکاندار نے درداغ کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”یہ اور کون؟“  
استاد شمس الدین نے کہا۔ ”مجھے تو اس قسم کی کسی خبر کا کوئی علم نہیں۔“

درداغ سمجھ گیا کہ استاد شمس الدین خلیفہ سے ملاقات کی خبر کو عام نہیں کرنا چاہتے، چھپا رہے ہیں اس لیے دکاندار سے اپنا منہ چھپا لیا۔

دکاندار نے گوگو حالت میں پہلے تو استاد شمس الدین کی طرف دیکھا، اس کے بعد درداغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تیرا کیا نام ہے؟“

درداغ نے اپنا نام بتا دیا، دکاندار نے کہا۔ ”درداغ عجیب سا نام ہے تیرا اچھا دو چار دن میں مجھ سے ملنا ضرور، میں تیرا انتظار کروں گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں ضرور آؤں گا۔ آپ میرا انتظار کیجیے گا۔“

جب دکاندار چلا گیا تو استاد شمس الدین نے درداغ کو ڈانٹا۔ ”تو نے اتنی بڑی بات اس غیر ذمے دار اجنبی سے کہہ کیوں دی؟ یہ پیٹ کے ہلکے اور چھپھورے لوگ چند دنوں میں پورے شہر میں یہ خبر پھیلا دیں گے اور جب یہ خبر امیر المومنین تک پہنچے گی تو وہ ہماری بابت کیا سوچیں گے۔ کیا کہیں گے اور ہمارے خلاف کیا قدم اٹھائیں گے، ہمیں کچھ پتا نہیں۔“

درداغ نے پشیمانی سے جواب دیا۔ ”میں شرمندہ ہوں استاد محترم! مجھے معاف فرما دیجیے۔“

استاد شمس الدین نرم پڑ گئے، بولے۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تو یہاں شرمندگی اٹھائے۔ یہاں کے لوگ بہت شاطر اور عیار ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہے گی۔“

درداغ نے ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ آئندہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ اس بار معاف کر دیجیے آئندہ خیال رکھیوں گا۔“

استاد شمس الدین نے گوت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں اب بتا، اپنے ہم قوم دوست کی بابت۔“



ہاتھوں مفتوح ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوں خان محترم نے کتنی سچی بات کہی تھی۔“

درداغ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”گوت! ایسی کوئی بات نہیں..... تو نے میری بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں تو بس ایک ہی بات جانتا ہوں درداغ..... ہمیں بغداد میں یہاں کے عام اور خاص آدمی کے ذہن میں بس ایک ہی بات بٹھانا ہے، وہ یہ کہ منگول تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ہلا کو خان بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور وہ بغداد میں محض اس لیے آرہا ہے کہ امیر المؤمنین کے دستِ حق پر اسلام قبول کرے۔ اگر ہم لوگ اس افواہ کو یقین کی حد تک پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تو خلیفہ ہماری طرف سے غافل اور مطمئن ہو کر رنگ رلیوں اور عیش و عشرت میں مشغول ہو جائے گا اور بغداد کو فتح کرنے میں خان محترم ہلا کو خان کو آسانی ہو جائے گی۔“

درداغ کا دل رور ہا تھا، اس کو بڑا دکھ ہو رہا تھا مگر وہ بے بس اور مجبور تھا۔ علی الصباح جب درداغ سوکراٹھا تو اس نے دیکھا، گوت گہری نیند سو یا ہوا ہے اور اس کے خراٹے کمرے کے باہر بھی سنے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے بستر سے نکل کر باہر چلا گیا۔ یہاں سے اس نے علیہ کی کھڑکی کی طرف دیکھا، وہ کھلی ہوئی تھی اور شاید اس میں علیہ موجود بھی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا علیہ کے کمرے کے در پر پہنچ گیا، اس نے آہستہ آہستہ کئی بار دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے درداغ کو پہچان لیا اور اندر واپس چلی گئی، کچھ دیر بعد پھر واپس آئی اور درداغ کو اندر بلا کر لے گئی۔

درداغ بہت پریشان تھا، بولا۔ ”میں خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”یگم صاحبہ فرما رہی ہیں کہ اندر آجائیں۔“

درداغ نے چونک کر پوچھا۔ ”اندر آ جاؤں؟ کیا تجھے کو واقعی یہ حکم دیا گیا ہے کہ مجھے اندر لے جائے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”میں سچ عرض کر رہی ہوں۔“

درداغ کو اندر جانے میں پس و پیش تھا، بولا۔ ”میں اندر نہیں آؤں گا کیونکہ اس طرح میں استاد شمس الدین کے دل سے اپنا اعتماد ضائع کر دوں گا۔“

استے میں علیہ خود دروازے پر آگئی، بولی۔ ”فضول باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہا ہے تو..... اندر آ جا، استاد

شمس الدین کو میں سمجھا لوں گی۔ تو..... فکر کیوں کرتا ہے۔“  
درداغ ہمت کر کے اندر چلا گیا۔ وہاں اس کو جس کمرے میں بٹھایا گیا تھا، اس میں بہت کم سامان رکھا گیا تھا۔ ایک چوکی جس پر جائے نماز چھپی تھی مگر اس کا اگلا ایک کونا لٹا ہوا تھا۔ ایک سٹینچ جو جائے نماز کے بیچ میں رکھی تھی۔ کمرے کے سفید فرش پر گاؤں کے لگے ہوئے تھے۔ چاروں کونوں پر منقش لکڑی کی چھوٹی چھوٹی میزیں رکھی تھیں اور ان میزوں پر گلدان رکھے تھے۔ ان کے تازہ پھول یہ بتا رہے تھے کہ انہیں ہر روز علی الصباح بدل دیا جاتا ہے۔ چوکی کے آگے ایک آبنوی میز پر قرآن پاک رکھا تھا۔

درداغ فرش پر گاؤں کے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ علیہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی، اس نے خادمہ سے کہا۔ ”دیکھ، اگر استاد شمس الدین تشریف لائیں تو انہیں بھی یہیں لے آنا۔ ان سے بھی چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

درداغ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”استاد شمس الدین کو آپ یہاں اس کمرے میں بلا رہی ہیں؟ کیا ان کے یہاں آنے کا امکان ہے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”آنے کا امکان ہے بھی نہیں۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ میری خادمہ کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ میں نے تجھ کو اس کمرے میں بٹھا کر کوئی ایسا اخلاقی جرم نہیں کیا جس سے استاد شمس الدین کی نظر میں حقیر ٹھہروں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا استاد شمس الدین کو میرے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں؟“

علیہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”نہیں، استاد کو کوئی اعتراض نہیں کیونکہ انہیں تجھ پر اعتماد ہے۔“

درداغ نے افسوس کیا۔ ”تب پھر میں بہت متاسف ہوں کہ میں آپ سے بلا وجہ لڑتا جھگڑتا رہا۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”اچھا یہ بتا کہ یہ تیرے ساتھ اور کون آیا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میرا ہم قوم، میرا دوست گوت۔ وہ بھی اسلام سے اتنا ہی متاثر ہے جتنا خود میں۔ وہ بھی مسلمان ہو جانا چاہتا ہے اور بغداد والوں کو یہ بتانے آیا ہے کہ ہم منگولوں میں اسلام بہت زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب سارے ہی منگول مسلمان ہو جائیں گے۔“

علیہ نے درداغ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا۔ ”اچھا ایک بات تو بتا۔“



سے متعلق سوال ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا کیونکہ اس کا جواب.....

گوت نے اس کی بات کاٹ دی، بولا۔ ”یہاں ہم دونوں کی ذات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہاں چند دنوں میں توئے اتنا اثر رسوخ پیدا کر لیا ہے میں تو حیران ہوں۔“ پھر گوت نے علیہ کے کمرے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”دوست درداغ! اس میں کون رہتا ہے؟ اس کھڑکی کے پیچھے۔ پائیں باغ سے ملحقہ عمارت میں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”گوت! ہم دونوں استاد شمس الدین کے مہمان ہیں۔ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا ہوگا۔ یہ جگہ مدرسہ مستنصریہ کی ہے اور یہ حصہ استاد شمس الدین کو ملا ہوا ہے چنانچہ اس عمارت میں استاد ہی کا کوئی عزیز رشتہ دار رہتا ہوگا۔“

گوت نے کہا۔ ”اس کا یہ مطلب ہوا کہ استاد شمس الدین سے تیری بھی رشتے داری ہوگئی ہے جیسی تو، تو اس عمارت میں بے تکلفی سے آتا جاتا رہتا ہے۔“

درداغ نے برہمی سے کہا۔ ”دیکھ گوت! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑ جائے۔ میں اپنے محسن کی شان میں تیری گستاخیاں مزید نہیں برداشت کر سکتا۔“

گوت نے بھی برہمی سے زور زور سے پاؤں مچنے، بولا۔ ”اور میں خود بھی تیری دوغلی اور دو رخا باتیں نہیں برداشت کر سکتا۔ ہم دونوں یہاں جس مقصد سے آئے ہیں، اسے پورا ہونا چاہیے۔ ہم نے بھی خان محترم ہلا کو خان کا نمک کھایا ہے۔ وہ ہمارا محسن ہے میں بھی اپنے محسن کی شان میں تیری گستاخیاں برداشت نہیں کر سکتا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”آخر تو چاہتا کیا ہے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”درداغ! مجھے نہیں معلوم کہ اس کھڑکی کے اس پار کون رہتا ہے لیکن اندازہ یہی بتاتا ہے کہ وہاں کوئی حسین لڑکی یا عورت رہتی ہوگی اگر میرا اندازہ درست ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا حصہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ لڑکی یا عورت ہم دونوں کی مشترکہ ہونا چاہیے۔“

درداغ گوت سے عاجز آچکا تھا، بولا۔ ”گوت! وہ لوگ مسلمان ہیں، یہاں اس طرح سوچنا درست نہیں ہے اور جو چیز میری نہ ہو، میں اس میں تیرا حصہ کس طرح مقرر کر سکتا ہوں۔“

گوت مسکرا رہا تھا، بولا۔ ”پھر ایسا کرو کہ تم بیچ سے

درداغ نے کہا۔ ”پوچھیے۔“

علیہ نے کہا۔ ”مگر ایک شرط ہے..... میرے سوال، میری بات کا جواب بھی کھرا اور سچا ہونا چاہیے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”وعدہ..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ہر بات کا سیدھا سچا جواب دوں گا۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”یہ منگول اسلام پر ایک دم کس طرح مائل ہو گئے؟ اور یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ منگولوں کی پوری قوم اسلام پر مائل ہے مگر اسلام قبول کرنے والوں میں صرف دو آدمی ہی نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہے؟“

درداغ گھبرا گیا، بولا۔ ”یہ آپ کا واہمہ ہے، ورنہ کئی اور آنے والے ہیں اور ایک دن آپ خود بھی دیکھ لیں گی کہ اسلام کا جادو کس طرح سرچڑھ کے بولتا ہے۔“

علیہ خوشی سے کھڑی ہوگئی، بولی۔ ”اگر تیری باتوں میں سچائی ہے، حقیقت ہے تو میں تیری قدر کروں گی۔“

درداغ نے کہا۔ ”اب میرے ساتھ گوت کی مصیبت ہوگئی ہے جب تک یہ یہاں میرے پاس موجود ہے، آپ سربراہے گا ہے بھی مجھے مخاطب نہ کیجئے گا۔“

علیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ سربراہے گا ہے ملاقات کیسی ہوتی ہے؟ شاید میری تیری ایسی کوئی ملاقات ایک بار بھی نہیں ہوئی۔“

درداغ بھی ہنسنے لگا، بولا۔ ”میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ میرا دوست گوت کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔“

علیہ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو تیرے دوست سے کیا غرض، اس کو میری طرف سے منع کر دینا کہ اگر کہیں آمنا سامنا بھی ہو جائے تو وہ مجھ سے مخاطب ہونے کی جسارت نہ کرے کیونکہ میں ہر شخص کو منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔“

درداغ وہاں کچھ دیر اور رکھا، علیہ نے کہا۔ ”میں گوت کی موجودگی میں کھڑکی کی طرف نہیں جاؤں گی، اس لیے تجھے جب بھی مجھ سے ملنا ہو، میرے پاس چلا آیا کر۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔“

علیہ کی باتوں کے آخری فقرے نے درداغ کا حوصلہ بڑھا دیا تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو خوش قسمتوں میں شمار کرنے لگا۔ جب وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو اس نے گوت کو باہر اپنے انتظار میں کھڑا دیکھا، بولا۔ ”درداغ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تم کہاں چلے گئے تھے؟“

درداغ نے ترشی سے جواب دیا۔ ”ہاں میں ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا، کہاں گیا تھا؟ یہ میری ذات



نقل جاؤ۔ میں اس لڑکی یا عورت سے خود رابطہ قائم کر لوں گا اور مجھے وہاں سے جو کچھ بھی ملے گا، میں اس میں تم کو بھی شریک کر لوں گا، نصفانصف، آدھا آدھا۔“

درداغ نے گوت سے کنارہ کشی اختیار کر لی، بولا۔  
”تیری سمجھ میں جو آئے کر۔ میں تو چلا۔ مجھ کو جو کچھ بھی کرنا ہے، میں تنہا کروں گا۔“

گوت نے دوڑ کر اسے روک لیا، بولا۔ ”کہاں چلے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ گے۔ میں تم کو جانے ہی کب دوں گا۔ بات معاملے کی کرو۔ معاملہ ملے کرو پھر جہاں چاہو چلے جاؤ۔“

درداغ اس معصیت سے عاجز آچکا تھا، اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہ ساری باتیں استاد شمس الدین کے گوش گزار کر دی جائیں۔ پھر یہ سوچ کر ہم گیا کہ اس طرح وہ خود بھی ذلیل اور رسوا ہو جائے گا اور جب ہلا کو خان کو ان دونوں کی بابت یہ سب معلوم ہوگا تو وہ ان دونوں کو روئے زمین پر کہیں بھی نہ چھوڑے گا۔

درداغ نے گوت سے درخواست کی، بولا۔ ”میرے دوست! میرے پیش نظر اس وقت خلیفہ سے ملاقات ہے۔ میں وہاں تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا، تو اتنی دیر میں یہ فیصلہ کس طرح کرے گا کہ وہ یعنی کھڑکی کے اس پار جو کچھ بھی ہے تیرا اس سے تعارف اور رابطہ ہونا چاہیے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”درداغ! میں جو کچھ بھی کہوں، اس پر غور کرنا، مطلب واضح ہو جائے گا۔ میں دشمن کے شہر میں مقیم ہوں، یہاں کی ہر چیز میری اپنی ہے۔ کم از کم میں خود تو اسی طرح سوچتا ہوں۔“

درداغ نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”جس طرح چاہو سوچو لیکن جب تک میں امیر المومنین سے مل کر واپس نہ آ جاؤں تو نہیں رہے گا۔“

گوت نے کہا۔ ”میں نے بات مان لی، جا امیر المومنین سے مل کر واپس آ جا۔“

درداغ نے دربار جانے کی تیاری کی، صاف لباس پہنا اور استاد شمس الدین کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

استاد شمس الدین نے درداغ کو ساتھ لیا اور خلیفہ کے قصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ استاد شمس الدین نے راستے میں درداغ کو سمجھایا۔ ”دیکھ امیر المومنین تجھ سے بہت سارے سوالات کریں گے، ان سارے سوالوں میں ایک ہی روح کا فرما ہوگی۔ امیر المومنین منگولوں کی طرف سے

بہت فکرمند اور خوفزدہ رہتے ہیں۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو جو کچھ ہلا کو خان اور منگولوں کی بابت جانتا ہے، سب کچھ امیر المومنین کو بتا دینا۔“

درداغ نے اس کا وعدہ کر لیا۔ ان دونوں خلیفہ قصر خلد میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ دونوں جب قصر خلد کے ابتدائی حصے میں داخل ہوئے تو انہیں روک لیا گیا۔ ان سے مختلف قسم کے سوالات کیے گئے۔ انہوں نے ہر سوال کا نہایت موزوں اور مدلل جواب دیا۔ خلیفہ کے حجاب نے ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد انہیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس وقت خلیفہ ترنم پیشہ خواتین میں گھبرا بیٹھا تھا۔ اس نے ان دونوں کو بھی اپنے جام کی گردش میں شریک کر لینا چاہا لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی خود کو اس سعادت سے بہرہ ور کرنے کی کوشش نہیں کی پھر خلیفہ نے درداغ کو دل میں اتر جانے والی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ”استاد شمس الدین! وہ منگول جس کا آپ نے ذکر کیا تھا کیا یہی نوجوان ہے؟“

استاد شمس الدین نے عرض کیا۔ ”جی بندہ پرور!“  
خلیفہ نے ”ہوں“ کہہ کر ایک بار پھر درداغ کو غور سے دیکھا، خلیفہ کی مغنیائیں اس منگول کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں گویا وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔ خلیفہ نے اشارہ کیا اور محفل راگ رنگ برخاست کر دی گئی۔ اب خلیفہ درداغ کی طرف متوجہ ہوا، پوچھا۔ ”جب تو ہلا کو خان کے لشکر سے جدا ہوا، ہلا کو خان کے کیا ارادے تھے؟“

درداغ نے اپنی نظریں نیچی کر رکھی تھیں، اس نے جواب دیا۔ ”ہلا کو کے ارادوں کا کسی کو بھی پتا نہیں چلتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اسلام سے بے حد متاثر ہے اور اپنے تایا زاد بھائی .... کی طرح وہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور اسی غرض سے وہ بغداد آنا چاہتا ہے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”مگر وہ اسلام قبول کرنے کے لیے بغداد کیوں آنا چاہتا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ ہلا کو خان نے ایک دن کسی مسلمان عالم سے پوچھا تھا کہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسلمان کون ہے؟ تو عالم نے جواب دیا کہ خلیفۃ المسلمین۔ پس اس کے بعد ہی ہلا کو خان نے بغداد آنے کا ارادہ کر لیا۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”اگر خدا نے ہلا کو خان کے دل میں دین اسلام کی شمع روشن کر دی ہے تو یہ ہم سب کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ میں تیرا ان باتوں کو کہ اگر ہلا کو خان مسلمان ہی



ہونا چاہتا ہے تو پھر اس نے ہمیں دھمکی آمیز خط کیوں لکھا ہے؟ اس نے اپنے خط میں بغداد کے دروازے کھول دینے کی درخواست نہیں کی، دھمکی دی ہے۔ آخر یہ کیوں؟ ایسا کیوں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس کا صحیح جواب تو ہلاکو خان ہی کے پاس ہوگا مگر میں یہ کہوں گا کہ خط میں دھمکی نہیں دی گئی ہوگی، درخواست کی گئی ہوگی لیکن امیر المومنین کو اس میں دھمکی کا شائبہ نظر آتا ہوگا۔“

خلیفہ نے استاد شمس الدین سے پوچھا۔ ”استاد محترم! آپ کا کیا خیال ہے؟“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے درداغ صحیح کہہ رہا ہے۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ ہلاکو خان کی بیوی دو قوز مسیحی ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ نے صحیح سنا ہے، دو قوز مسیحی ہے۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”پھر ہلاکو مسیحیت کی طرف کیوں نہیں راغب ہوا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! ہلاکو خان کے دل و دماغ پر غور نہیں، خود اس کی اپنی حکومت ہے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ دو قوز کے ساتھ اس کا اپنا چوہی چھیل بھی سفر کرتا رہتا ہے اور دو قوز فسطوری یادریوں اور عیسائیوں میں گھری رہتی ہے۔ کیا یہ سب بھی ہلاکو پر اثر انداز نہیں ہو رہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہلاکو کے لشکر میں مسلمان بھی بہ کثرت ہیں۔“

خلیفہ نے ذرا غور و فکر کے بعد ایک نیا سوال کر دیا۔ ”یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مسیحی اور ہلاکو کی بیوی دو قوز شب و روز اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ منگول عساکر کو یروشلم کی آزادی کے لیے کام میں لایا جائے۔ مسیحی ہر قیمت پر یروشلم کو ہمارے اقتدار سے نکالنا چاہتے ہیں۔ کیا ہلاکو خان دو قوز اور مسیحی آوازوں پر ہمیشہ اپنے کان بند کیے رہے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نے امیر المومنین کو بتا جو دیا کہ ہلاکو کے دل و دماغ آزاد ہیں۔“

خلیفہ لا جواب ہو چکا تھا۔ اسی وقت خلیفہ کو مطلع کیا گیا کہ وزیر ابن علقمی باریابی کے طالب ہیں۔ خلیفہ نے حاضری کی اجازت دے دی۔ وزیر نے اندر آتے ہی خلیفہ

کو بتا

کہ ہلاکو کے دل و دماغ آزاد ہیں۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”ابن علقمی اوہ کس قسم کی باتیں ہیں جو تو سب کے سامنے نہیں کر سکتا۔“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین نے تو

کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر استاد شمس الدین اور درداغ کی طرف دیکھا۔“

خلیفہ نے درداغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابن علقمی! یہ ہے وہ منگول جو مسلمان ہونے کے لیے طول

طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک آیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ منگولوں میں اسلام بہت زیادہ اثر انداز ہوتا جا رہا ہے۔“

یہاں تک کہ خود ہلاکو خان بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! یہ عاجز تو پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ہلاکو خان اور منگولوں سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے ان کے مقابلے کے لیے جتنی

فوج اکٹھا کر رکھی ہے، وہ بے جا اسراف ہے، ایک قسم کا۔ میری ناچیز رائے میں ہمیں اپنی فوج کو کم کر دینا چاہیے اور اس صورت میں جو بچت ہو، اسے منگولوں کی مہمان نوازی

اور تالیف قلب پر خرچ کر دینا چاہیے۔“

خلیفہ نے ابن علقمی کو اجازت دے دی۔ ”تو جتنی فوج کم کرنا چاہے، کم کر دے کیونکہ آج اس منگول نے یہ

یقین دلا دیا ہے کہ ہلاکو خان ہم پر فوج کشی نہیں کرنا چاہتا۔ ادھر سے اطمینان ہو جانے کے بعد فوج پر فضول خرچ کرنا

بے جا اسراف نہیں تو اور کیا ہے۔“

استاد شمس الدین نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین کے علم میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ گوت نامی ایک اور منگول بھی

میرے پاس آچکا ہے، وہ بھی مسلمان ہو جانا چاہتا ہے۔“

خلیفہ کے چہرے پر ہلاکت اور اطمینان نے ابن علقمی کو ہلاکت کر دیا، بولا۔ ”امیر المومنین کے حکم پر عمل کیا جائے گا۔“

خلیفہ نے ان دونوں کی خشک میوے سے تواضع کی اور انعام و اکرام سے نوازا۔ استاد شمس الدین کو ایک خلعت اور طیستان عطا کی۔ ان کے علاوہ ایک تھیلی دینار کی بھی عطا

کی۔ درداغ کو بھی ایک خلعت، دو تھیلیاں دینار کی اور ایک گھوڑا عطا ہوا۔

جب درداغ اور استاد شمس الدین واپس جانے لگے تو ابن علقمی ان دونوں کو کچھ دور چھوڑنے گیا۔ اس

وقت اس نے ان دونوں سے کہا۔ ”آپ دونوں قصر کے باہر میرا انتظار کر لیجیے گا، مجھے آپ دونوں سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”ابن علقمی اوہ کس قسم کی باتیں ہیں جو تو سب کے سامنے نہیں کر سکتا۔“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین نے تو



درداغ نے اصرار کیا۔ ”لیکن میرا وہی مقصد ہے جو بیان کیا ہے۔“  
ابن علقمی نے درداغ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”کیا یہ درست نہیں ہے کہ تجھ کو ہلاکو خان نے بطور خاص یہاں بھیجا ہے؟ ہلاکو چاہتا ہے کہ تم لوگ کسی طرح خلیفہ کو یہ یقین دلا دو کہ اس پر منگولوں کی طرف سے حملہ نہیں ہوگا اور یہ کہ منگولوں اور ہلاکو خان پر اسلام تیزی سے اثر انداز ہوتا جا رہا ہے۔“

اب درداغ چور بن چکا تھا، ابن علقمی نے کہا۔ ”تو سب کو بے وقوف بنا سکتا ہے لیکن مجھے نہیں۔ میں نے تجھ کو بھی پہچان لیا ہے اور تیرے ساتھی گوت کو بھی۔ اب بتا تو کیا چاہتا ہے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”میں اب کیا عرض کروں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں کہتا ہوں، وزیر اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔“

ابن علقمی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”تجھ کو بار بار یہی کہنا ہے کہ تجھے اسلام کی محبت و درواز علاقوں سے بچھین لائی ہے اور تجھ کو یہ بھی کہنا ہے کہ ہلاکو خان اور اس کی قوم مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ تجھ کو ہر شخص کے سوالات کا یہی جواب دینا ہے۔ سبھا میری بات یا نہیں؟“  
درداغ چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ابن علقمی کس قسم کی باتیں کر رہا ہے اور اس سے اس کا مقصد کیا ہے؟

ابن علقمی نے ایک بار پھر درداغ کو سمجھایا۔ ”پریشان نہ ہو میرے دوست! میں بھی ہلاکو خان کا دوست ہوں۔ جو ہلاکو خان کا دوست وہ میرا دوست اور جو میرا دوست وہ ہلاکو خان کا دوست۔“ پھر بطور خاص سرگوشی میں کہا۔ ”درداغ! ہلاکو خان نے تیری بابت مجھے مطلع کر دیا ہے۔ ہم پر کسی کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے اور خبردار جو آئندہ.....“  
درداغ روہانسا ہو گیا، بولا۔ ”جب آپ سب کچھ جانتے ہیں تو مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”صرف اس لیے کہ امیر المومنین اور اس کے سادہ لوح بھی خواہوں کو بے وقوف بنایا جائے۔“

کچھ دیر بعد ابن علقمی نے درداغ کو یہ کہہ کر استاد شمس الدین کے حوالے کر دیا۔ ”یہ شخص سچا ہے اور اس نے جو کچھ کہا، صد فیصد سچ ہے۔ اس پر یقین کر لینا چاہیے۔“  
استاد شمس الدین نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا وزیر

نہایت سادگی سے اس منگول کی باتوں پر یقین کر لیا لیکن میں اس سے جرح بحث کر کے یہ جاننا چاہوں گا کہ اس نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے اس میں سچائی کتنی اور جھوٹ کتنا ہے۔ اس کے بعد میں کسی نتیجے پر پہنچوں گا۔“  
خلیفہ ابن علقمی کی باتوں سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ”ابن علقمی کتنی عقل کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اس کو جو عزت اور مقام دے رکھا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ ابن علقمی اس کا مستحق ہے۔“

جب یہ دونوں شاہی قصر سے باہر نکلے تو ابن علقمی نے ان دونوں کو روک لیا۔ استاد شمس الدین کو خلیفہ یا اس کے وزیر نے آج تک نہیں روکا تھا۔ استاد شمس الدین کو وزیر کی یہ بات بہت بری لگی، پوچھا۔ ”وزیر محترم! میرا خیال ہے کہ اس شخص درداغ سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا، اب اس کو اور تنگ کرنا بری بات ہے۔“

ابن علقمی نے بے رخی سے کہا۔ ”آپ پڑھانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں لیکن میں خلافت عباسیہ کا ایک ذمے دار شخص ہوں۔ میں اس منگول سے تحفے میں چند ضروری سوال کروں گا، اس کے بعد میں یہ فیصلہ کروں گا کہ اس شخص کی باتوں پر یقین کیا جائے یا نہیں۔“

استاد شمس الدین وزیر کے ناخوش گوار تیور دیکھ کر بہم گئے۔ وہ سیدھے سادے مصلحت اندیش انسان تھے۔ انہیں اپنی ملازمت خطرے میں محسوس ہوئی، بڑی عاجزی سے کہا۔ ”وزیر محترم! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ شخص جو دروازے اسلام کی محبت میں بغداد چلا آیا ہے، خواجواہ کی پریشانی نہ اٹھائے۔ آپ اس سے سوالات کریں مگر زیادہ وقت نہ لیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

ابن علقمی نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”آپ کو کیا پتا کہ حکومت اور سیاست کیا ہوتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص ہلاکو خان کا جاسوس ہے اور یہاں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ جب تک میں خود مطمئن نہ ہو جاؤں، امیر المومنین کو کس طرح مطمئن کر سکتا ہوں؟“

استاد شمس الدین ڈر کر ایک طرف ہو گئے۔ ابن علقمی درداغ کو قصر کے ایک حصے میں لے گیا۔ یہاں تھلیہ میں ابن علقمی نے درداغ سے پوچھا۔ ”نو جوان منگول! سچ بتا تو بغداد کس مقصد سے آیا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں اپنا مقصد بیان کر چکا ہوں۔“  
ابن علقمی نے کہا۔ ”لیکن اگر میں یہ کہوں کہ تو اس مقصد سے نہیں آیا جو تو نے بیان کیا ہے، پھر؟“



درداغ نے جواب دیا۔ ”اب ایسی غلطی نہیں

ہوگی۔“

دکاندار نے کہا۔ ”میری ایک گزارش ہے کسی وقت فرصت ہو تو میری دکان پر تشریف لے آئیں یا پھر گھر پر آجائیں۔ وہیں عرض کروں گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں گھر پر آ جاؤں گا، کل یا

پرسوں شام کو۔“

دکاندار نے کہا۔ ”بڑی مہربانی ہوگی۔ پھر وہیں بات ہو جائے گی ہم دونوں کی۔“ جاتے جاتے وہ بولا۔ ”اور ہاں اپنے دوسرے ساتھی کو اگر اپنے ساتھ نہ لاؤ تو بہتر ہے، مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔“

گوت نے اس کی آواز سن لی، دور ہی سے بولا۔ ”میں اچھا نہیں ہوں یعنی تو اچھا ہے۔ میں اس کے ساتھ ضرور آؤں گا۔ یہ تنہا بھی نہیں آئے گا۔“

استاد شمس الدین نے دور سے دکاندار کو دیکھا تو اس کے پاس پہنچے اور پوچھا۔ ”خیریت تو ہے، اب کیسے آنا ہوا؟“

دکاندار نے اپنا رونا روایا۔ ”جناب! آپ کے مہمان

نے تو میرے کئے کرائے پر پانی ہی پھیر دیا۔ یہ

امیر المومنین سے مل بھی آیا اور میری سفارش نہیں کی۔ اب

آپ ہی بتائیں کہ کوئی کسی پر کس طرح اور کیوں احسان

کرے؟“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ خود

غور فرمائیں کہ درداغ اتنی معمولی سی سفارش اپنی اتنی اہم

ملاقات میں کیونکر کرتا۔“

دکاندار نے حیرت سے اپنی دونوں آنکھیں کھول

دیں، پوچھا۔ ”معمولی سی سفارش! یعنی یہ آپ کہہ کیا

رہے ہیں؟“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا

ہے درست کہا ہے۔ آپ کو اپنا مسئلہ خود سلجھانا چاہیے۔ اگر

اس کو امیر المومنین تک پہنچانا ہی ہے تو خود پہنچ جائے اس کو

لے کر۔“

دکاندار استاد شمس الدین سے ناراض ہو گیا، بولا۔

”تیری سمجھ میں میری باتیں نہیں آئیں گی۔ دیکھا جائے گا،

دیکھ لوں گا۔“

وہ پاؤں پختا ہوا چلا گیا۔ اس کی باتوں نے گوت کو

سب سے زیادہ محظوظ کیا، بولا۔ ”افسوس کہ میں یہاں

عارضی طور پر آیا ہوں، اگر کچھ اور رہنے کا ارادہ ہوتا تو اس

دکاندار سے لطف اٹھاتا۔“

نے اس کی سچائی کا امتحان لے لیا ہے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے اس کا امتحان

لے لیا ہے۔ یہ اپنے امتحان میں پورا اترتا ہے۔ بحمد اللہ خوب۔“

استاد شمس الدین درداغ کو اپنے ساتھ لے گئے اور

ابن علقمی خلیفہ کو سمجھانے چلا گیا۔

☆☆☆

درداغ اپنے کمرے میں پہنچا تو گوت کو سوتا ہوا پایا۔

درداغ کی طبیعت قابو میں نہیں تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس

سے نہ تو نوٹ تھا اور نہ ہی مطمئن۔ اس کو خلیفہ کی سادہ لوحی

اور استاد شمس الدین کے بھولپن پر رونا آ رہا تھا۔ کئی دن بعد

اس کے سننے میں آیا کہ ابن علقمی نے پچھتر فیصد فوج میں کمی

کر دی ہے۔

درداغ اور گوت نے استاد شمس الدین کی مہمان

نوازی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا لیکن درداغ نے استاد

شمس الدین کو سمجھایا کہ وہ گوت کو الگ کر دیں کیونکہ اگر

گوت اس گھر میں رہا تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور اٹھ کھڑا

ہوگا۔

اسی دوران میں دکاندار بھی آ گیا۔ اس کو معلوم ہو چکا

تھا کہ درداغ امیر المومنین سے ملاقات کر چکا ہے، اس نے

آتے ہی پوچھا۔ ”کیا تم نے امیر المومنین سے میری بابت

پوچھا تھا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں امیر المومنین

سے تیرے مسائل پر بات چیت نہیں کر سکا۔“

دکاندار نے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ ”احسان فراموش!

کیا یہ بدلہ دیا ہے تو نے میری رحم دلی، خوش اخلاقی اور انسانی

سلوک کا۔“

درداغ نے کہا۔ ”افسوس کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ

آپ اپنے سلوک اور احسان کا یوں چرچا کریں گے۔“

دکاندار نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اب ہوگا یہ کہ جب میں

دوبارہ امیر المومنین کے پاس جاؤں گا تو آپ کی سفارش

کر دوں گا۔“

دکاندار نے پوچھا۔ ”وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ

دوبارہ کب تک جانا ہوگا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں۔“

دکاندار کچھ دیر سوچتا رہا، پھر نہایت خوش اخلاقی سے

کہا۔ ”لیکن جناب! اب دوبارہ ملاقات کے موقع پر نہ

بھول جائیے گا۔“

اگست 2016ء



سپنس ڈائجسٹ



## گہری باتیں

☆ جب دوست ترقی کرے تو فخر سے کہو کہ وہ میرا دوست ہے اور جب دوست مشکل میں ہو تو فخر سے کہو کہ میں اس کا دوست ہوں۔

☆ اپنے دل کو ہرے بھرے درخت کے مانند رکھیں۔ امن سکون اور پیار کے پرندے خود بخود ہی اس پر اتر آئیں گے۔

☆ تم جب اولاد، رشتہ داروں اور دوستوں سے چڑنے لگو تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہے اور جب تم اپنے دل میں دشمنوں کے لیے رحم محسوس کرنے لگو تو جان لو کہ تمہارا خالق تم سے راضی ہے۔

☆ ہر ایک کی سنو اور ہر ایک سے سیکھو۔ کیونکہ ہر ایک سب کچھ نہیں جانتا لیکن ہر ایک کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔

☆ وہ رشتے اور تعلق کبھی نہیں ٹوٹتے جن کی بنیاد سچائی اور خلوص پر ہوتی ہے۔

☆ اگر فلاح چاہتے ہو تو لوگوں کے عیبوں سے اس طرح غافل ہو جاؤ جس طرح سوتے وقت تم دنیا سے غافل ہو جاتے ہو۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

## سنہری باتیں

☆ تحریر ایک خاموش زبان ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔

☆ جن لوگوں کے ذہن میں اچھے خیالات آباد ہوں۔ وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

☆ کسی کے اخلاق پر اعتماد نہ کرنا۔ جب تک اسے غصے کی حالت میں نہ دیکھ لو۔

☆ بہترین دعا الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔

☆ محبت بے شک اندھی ہے۔ اس کے باوجود اس کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔

☆ بوڑھے کی رائے جوان کی قوت سے بہتر ہے۔

☆ تم اپنا دل کسی کو دے سکتے ہو لیکن اس کی ملکیت سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

استاد شمس الدین نے دونوں کو سمجھایا کہ وہ بغداد میں کسی سے ربط ضبط نہ بڑھائیں کیونکہ یہ چھپھورے آدمی کسی وقت بھی ذلیل کر سکتے ہیں یا پھر نقصان پہنچا سکتے ہیں پھر استاد شمس الدین نے گوت کو اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس کو بھی ابن عسکری سے ملنا ہے کیونکہ وزیر کو اس وقت تک کسی پر اعتبار نہیں آئے گا جب تک کہ وہ خود سوال جواب کے بعد مطمئن نہ ہو جائے۔ بات معقول تھی، گوت اسی وقت وزیر کے گھر جانے پر آمادہ ہو گیا۔

استاد شمس الدین نے گوت کو اپنے ایک سمجھ دار شاگرد کے ساتھ ابن عسکری کے گھر روانہ کر دیا۔ دردراغ نے موقع پاتے ہی استاد شمس الدین کو سمجھانے کی کوشش کی، بولا۔ ”استاد محترم! آپ میری ایک بات مانیں، گوت کو یہاں میرے پاس نہ ٹھہرا لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہوگئی ہے؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، خاص بات ہی ہوگئی ہے، اسی لیے میں یہ درخواست کر رہا ہوں۔“

استاد شمس الدین بھی خاصے فکر مند تھے، بولے۔ ”دردراغ! معلوم نہیں کیوں، ادھر میں خود بھی خاصا فکر مند ہوتا جا رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے، کیا ہونے والا ہے پتا نہیں۔“

دردراغ نے کہا۔ ”خود میرے دل کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ آپ گوت کو کہیں اور پہنچا دیجیے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

استاد شمس الدین نے وعدہ کر لیا۔ ”اچھا اس کو آنے دو۔ اس کو کسی اور جگہ بھیج دوں گا۔“

استاد شمس الدین تو حیلے گئے، دردراغ کو علیہ کی یاد ستا رہی تھی۔ اس نے اس گھڑکی کی طرف بار بار دیکھا مگر علیہ نظر نہیں آئی۔ آخر وہ خود ٹھہلکا ہوا علیہ کے در پر پہنچ گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی، اندر سے ایک بڑی بی

نمودار ہوئیں۔ انہوں نے دردراغ کو پہچان لیا تھا۔ شاید انہیں اس بات کی پیشگی اجازت ملی ہوئی تھی کہ دردراغ آئے تو اسے مزید اجازت حاصل کیے بغیر ہی اندر بلا لیا جائے۔

بڑی بی اس کو اندر لے گئیں اور کمرے میں بٹھا کر علیہ کو مطلع کرنے چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد علیہ اس شان اور اس انداز سے اندر داخل ہوئی کہ وہ سر تا پا زرد پری بنی ہوئی تھی۔ زرد لباس، کمرے کے پردے زرد، پاؤں کی جوتی زرد، غرض ہر چیز زرد تھی۔ اس نے علیہ کو اور علیہ نے اس کو دیکھا،



دونوں مسکرائے۔ دردراغ نے کہا۔ ”علیہ! اپنا نہیں کیا ہونے والا ہے، میں آنے والے لمحات سے خوفزدہ ہو رہا ہوں۔“ علیہ نے پوچھا۔ ”مگر کیوں؟ میں کیوں پریشان نہیں ہوں۔“

دردراغ نے کہا۔ ”یہی سوال میں اپنے آپ سے کرتا رہتا ہوں کہ آخر جب کوئی اور پریشان نہیں ہے تو میں کیوں پریشان ہوں۔“

علیہ چپ ہو گئی، اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا ساری شرمساریاں علیہ ہی کے مقدر میں ڈال دی گئی ہوں۔

دردراغ نے پوچھا۔ ”اچھا علیہ یہ تو بتا کہ.....“ پھر کچھ احساس ہو گیا کہ اس کا طرزِ مخاطب معقول نہیں ہے، بولا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں میرے آنے جانے کی خبر استاد شمس الدین کو تو ہو ہی گئی ہے انہوں نے اس سلسلے میں آپ پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”میں اس سلسلے میں بڑی خوش قسمت ہوں، مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگی۔“ دردراغ نے ایک ٹھنڈی سانس لی، بولا۔ ”علیہ! میں اپنے انجام سے بہت خوفزدہ ہوں، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ میرا انجام کیا ہوگا؟“

علیہ نے شرما کر سوال کر دیا۔ ”کس کا انجام؟ یہی سوال تو میں تجھ سے کہنے والی تھی کہ ہم دونوں کا انجام کیا ہوگا؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”مجھے اپنا تو انجام نظر آ رہا ہے کہ ایک نہ ایک دن استاد شمس الدین ہاتھ میں ایک ڈنڈا لے کر آئیں گے اور مجھ کو حکم دیں گے کہ میں پھر کبھی علیہ کے پاس ہرگز نہ آؤں۔“

علیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”بالکل، میں نے اپنے انجام پر غور کیا تو اس میں جدائی یقینی نظر آئی۔“

دردراغ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”علیہ! میں نے بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ میں نے اپنا گھر چھوڑا، کنبہ چھوڑا، مذہب چھوڑا۔ ہلا کو خان کا لشکر اور اس کا ساتھ چھوڑا، ان ساری چیزوں کو چھوڑنے کے بعد میں نے آپ کو پایا تھا اور ایسا لگ رہا ہے کہ شاید ایک نہ ایک دن آپ کو بھی چھوڑنا پڑ جائے گا۔“

علیہ نے کہا۔ ”میں نے منگولوں کا بڑا نام سنا تھا اور میری یہ تمنا تھی کہ خدایا میری کسی منگول سے ملاقات کرادے، میری دعا قبول ہوئی اور میں نے تجھ کو پایا لیکن

میں یہ سوچ سوچ کر خوفزدہ ہوں کہ جب اس طرح کی قربتیں میسر آ جاتی ہیں تو قسمت روٹھ جاتی ہے اور انسانی قلب آہ و سوزاں کا مرکز بن کر رہ جاتا ہے۔“

دردراغ نے کہا۔ ”کیا اس کا کوئی حل نہیں نکل سکتا؟“ علیہ نے جواب دیا۔ ”میری عقل تو کام نہیں کر رہی۔“ دردراغ نے جواب دیا۔ ”میں ان ملاقاتوں کو اپنے لیے اپنی خوش قسمتی کی معراج تصور کرتا ہوں۔“

علیہ نے اچانک گوت کی بابت سوال کیا، پوچھا۔ ”وہ کہاں چلا گیا؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کا تو انتظام کر دیا ہے۔ اس وقت وہ وزیرِ ابنِ علی کے پاس گیا ہوا ہے۔“

علیہ نے کہا۔ ”دردراغ! اس میں وحشیوں جیسی سرکشی اور جسارت پائی جاتی ہے۔ جب تو استاد شمس الدین کے ساتھ قصرِ صدارت گیا ہوا تھا، وہ یہاں دروازے پر بڑی دیر تک دستک دیتا رہا۔ میری خادمہ کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آیا۔ وہ زور زور سے یہی کہہ رہا تھا کہ لڑکی باہر آ جاؤ۔ لڑکی دروازہ کھولو۔ یہ کیا بات ہے کہ دردراغ تجھ سے ملے، ملاقاتیں کرے اور میں محروم رہوں لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولنے دیا۔“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”کیا آپ نے اس واقعے کی خبر استاد شمس الدین کو دے دی تھی؟“ علیہ نے کہا۔ ”نہیں، محض اس خیال سے کہ اس میں تیرا نام بھی لیا جا رہا تھا۔“

دردراغ خاموش ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر گوت کا کیا علاج کیا جائے۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ علیہ کو اس کے فکر مند چہرے میں ہلاکی دکھائی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس چہرے کو اسی کیفیت میں رکھنا چاہتی تھی بولی۔ ”کچھ لوگ ایسے ہیں جو معصومیت اور دلکشی سے سیکر محروم ہوتے ہیں۔ معصومیت نہ تو ان کے اندر ہوتی ہے نہ باہر..... اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر اور باہر معصومیت ہی معصومیت ہوتی ہے۔ فکر مندی اور غصے میں ان کی معصومیت اور کھڑ جاتی ہے۔“

دردراغ نے پوچھا۔ ”مثلاً، یعنی؟“ علیہ نے جواب دیا۔ ”گوت میں معصومیت نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں اور ایک تو ہے کہ.....“

علیہ کہنے کو تو یہ بات تقریباً کہہ گئی تھی مگر فوراً ہی شرمندگی نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ دردراغ کے سامنے سے چلی گئی۔ دردراغ تیار رہ گیا۔ وہ دیر تک اس کی واپسی کا



منظر رہا لیکن جب وہ نہیں آئی تو اس نے سامنے سے گزرنے والی ایک خادمہ کو آواز دی اور اس سے کہا۔ ”علیہ سے کہو میں رکوں یا چلا جاؤں؟“

کچھ دیر بعد خادمہ یہ جواب لے کر آئی۔ ”ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے، وہ اس وقت نہیں مل سکیں گی۔“

درداغ کو شبہ گزرا کہ شاید اس کی کوئی بات علیہ کو ناگوار گزری ہے ورنہ وہ زندہ دل لڑکی یوں بیزاری سے اٹھ کر نہ چلی جاتی۔ وہ وہاں مزید نہیں ٹھہر سکا۔ جب وہ واپسی کے لیے باہر نکل رہا تھا، علیہ کی ایک خادمہ بھاگی بھاگی آئی اور درداغ سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ فرما رہی ہیں کہ کل ضرور آئیے گا۔“

درداغ چلا آیا۔ بے قراری میں کمی تو آگئی تھی مگر وہ دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ پھولوں کی روش پر چہل قدمی کرنے لگا۔ چہل قدمی کرتے کرتے اچانک اس کی نظر علیہ کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں علیہ کا چہرہ موجود تھا۔ درداغ اس چہرے کو ٹٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ دیر تک، اس وقت تک جب تک وہ چہرہ موجود اور نظر آتا رہا۔

☆☆☆

گوت اور درداغ میں علیہ نے سخت اختلافات پیدا کر دیے تھے۔ گوت برابر مصر تھا کہ اسے بھی علیہ سے ملنے کا موقع دیا جائے اور درداغ یہ کہتا تھا کہ اس کا علیہ پر کوئی اختیار نہیں۔ علیہ اگر گوت سے نہیں ملنا چاہتی تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے لیکن گوت ہر بات سر پھرے انداز میں سوچنے کا عادی تھا، بولا۔ ”میرے یہاں دوسروں کی مرضی نہیں چلتی، میں صرف اپنی مرضی دیکھتا ہوں۔“

درداغ نے عاجز آ کر پوچھا۔ ”گوت! ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

گوت نے ازراہ مذاق جواب دیا۔ ”علیہ سے عشق کرنے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں اور تم مذاق میں اڑا رہے ہو۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں بھی سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ تم اگر میری باتوں کو مذاق سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو، میں خود اس کو مذاق نہیں سمجھتا۔“

درداغ نے کہا۔ ”ہم جس مقصد سے یہاں آئے ہیں، اس کو تو بھولے جا رہے ہیں۔ بس فروعات اور غیر متعلق باتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔“

گوت نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”درداغ! تو غیر متعلق

باتوں میں الجھا ہوا ہے، میں نہیں..... میں ابن علقمی سے مل کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید تجھ کو عنقریب واپس بلا لیا جائے اور تیری جگہ کچھ اور لوگ بھیج دیے جائیں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”یہاں کوئی آئے کوئی جائے لیکن میں واپس نہیں جاؤں گا، یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔“

گوت نے چونک کر درداغ کو گھورا، پوچھا۔ ”تیرا ذاتی فیصلہ؟ یہ کیا چیز ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔ اب میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔“

گوت ہنسنے لگا۔ ”ہلا کو خان کے حکم اور مرضی کے سامنے بادشاہوں اور شہنشاہوں کے فیصلے اور مرضی کوئی حیثیت نہیں رکھتے، پھر تیری کیا مجال ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”بادشاہوں اور شہنشاہوں کو اپنے اقتدار اور اپنی حکومت کے چھن جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے وہ ہلا کو خان سے ڈرتے ہیں، خوفزدہ رہتے ہیں لیکن میں خالی ہاتھ خالی جیب انسان، میں اس سے کیوں ڈروں گا۔ میں اس سے نہیں ڈرتا۔“

گوت نے کہا۔ ”درداغ! شاید تیری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں ورنہ ہلا کو خان کی یوں تذکیل نہ کرتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں زندگی سے بیزار ہوں اور جو زندگی سے بیزار ہو جائے، اس کے لیے ہلا کو خان کی کوئی حیثیت نہیں۔“

گوت نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو سن لو کہ ہلا کو خان کے کچھ اور آدمی آچکے ہیں۔ ابن علقمی نے ان سے میری ملاقات کرا دی ہے لیکن اب وہ تجھ سے نہیں ملائے جائیں گے کیونکہ تو باغی ہو چکا ہے۔ میری ایک بات اور یاد رکھو۔“

درداغ کے چہرے پر پسینا نمودار ہو چکا تھا، پشمرده سی آواز میں پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”یہ کہ خبردار، اپنی زبان بند رکھنا۔ اس راز کو افشاء نہ کرنا اور موت سے ڈرتے رہنا کیونکہ ہلا کو خان اپنے منحرفین اور پھر جانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“

درداغ نے کہا۔ ”وہ جو چاہے کرے، رہی رازداری بات تو میں خاموش رہوں گا۔“

گوت نے کہا۔ ”اب تیرا کام ختم اور میرا کام شروع۔ کل تک تجھ کو استاد شمس الدین کا عطا کردہ یہ ٹھکانا چھوڑ دینا پڑے گا کیونکہ یہ ٹھکانا جس مقصد کے لیے تجھ کو دیا گیا تھا، وہ پورا نہیں ہو رہا ہے۔“

سپنس ڈائجسٹ اگست 2016ء



درداغ نے جواب دیا۔ ”یہ ٹھکانا مجھے استاد شمس الدین نے دے رکھا ہے اور وہی اس سے بے دخل کر سکتے ہیں۔“

گوت نے کہا۔ ”خیال تو تیرا درست ہے لیکن یہ غلط ہے کہ وہی تجھ کو بے دخل بھی کر سکتے ہیں۔ میں تجھ کو بے دخل کر سکتا ہوں، وزیر ابن علقمی تجھ کو بے دخل کر سکتے ہیں۔ تجھ کو بھی اور تیرے ساتھ استاد شمس الدین کو بھی۔“

درداغ نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ”تو انتظار کس بات کا؟ اگر ادوہم سب کو بے دخل۔“

گوت نے کہا۔ ”ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ یہ کام بھی اپنے وقت ہی پر ہوگا۔“

اس سب کلامی اور بد مزگی کے بعد کئی دن تک دونوں میں کشیدگی رہی۔ اس دوران ابن علقمی کے اشارے پر ان دونوں کو بغداد کے کئی ذمے دار لوگوں سے ملوایا گیا اور ان دونوں نے انہیں یہی یقین دلایا کہ منگولوں کی اکثریت اور خود ہلاکو خان اسلام کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ اس لیے بغداد والوں کو ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ ان ملاقاتوں اور مجلسوں میں گوت نے تو بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر درداغ کا لبہ دلچہ کمزور رہا۔ گوت کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

دکاندار نے ایک بار پھر ان دونوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ درداغ یوں ہی پریشان تھا۔ ان دونوں کو معاشی پریشانی نہیں تھی کیونکہ ہلاکو خان ان کی ضرورتیں پوری کر رہا تھا اور ہلاکو خان کا سب سے بڑا نمائندہ ابن علقمی مملکت اسلامیہ کا سب سے بڑا عہدیدار تھا۔

گوت کی سرکشی یہاں تک بڑھی کہ اس نے استاد شمس الدین سے درخواست کی کہ اس کو درداغ سے الگ کوئی مکان دلوایا جائے لیکن استاد شمس الدین میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کے لیے رہائش کا الگ الگ انتظام کرتے، انہوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ دونوں کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا، کر چکا ہوں۔ مزید کے لیے امیر المومنین سے درخواست کروں گا۔ جیسے ہی اس کا انتظام ہوا آپ دونوں کو ادھر منتقل کر دوں گا۔“

گوت نے کہا۔ ”لیکن اساد محترم! میں آپ ہی کے پاس اور ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ درداغ کو کہیں اور منتقل کر دیجیے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں یہیں رہوں گا۔ میں نے تجھ کو اپنے ساتھ رکھ کر بڑی غلطی کی۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کس نے کیا غلطی کی۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تو تجھ کو کہیں

اور ٹھکانا کر لیتا چاہیے اپنے لیے۔“

استاد شمس الدین نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”کیا تم دونوں مل جل کر نہیں رہ سکتے؟ اسلام وجہ اتحاد نہیں بن سکتا کیا؟ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہ بات افسوس ناک ہے کہ جب تک تم دونوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا، ایک دوسرے کے دوست تھے لیکن مسلمان ہوتے ہی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ آخر کیوں؟ کیا اسے بھی مسلمانوں کی بد قسمتی اور رکبت وادبار سے تعبیر کیا جائے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں نے ابھی تک اسلام کو باضابطہ قبول نہیں کیا ہے اور شاید یہی حال درداغ کا ہے۔ اس نے بھی باضابطہ اسلام نہیں قبول کیا۔ اگر اسلام قبول کیا ہوتا تو ہم نے اپنے نام بھی تبدیل کیے ہوتے۔“

استاد شمس الدین نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ابھی تک منگول بت پرست ہی ہو؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ بت پرست ہرگز نہیں کیونکہ ہمارے ہاں بت نہیں ہوتے۔ ہم جاودانی نیلے آسمان کو ماننے والے لوگ بت پرست کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ہم اگر خدا پرست نہیں ہیں تو بت پرست بھی نہیں ہیں۔“

استاد شمس الدین اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن شب کو وہ درداغ کو دجلہ کے کنارے لے گئے۔ یہ جگہ مدرسہ مستنصریہ کی پشت پر تھی۔ رات کے اندھیرے میں وہ دونوں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے پر بیٹھ گئے۔ استاد شمس الدین نے کہا۔ ”درداغ! اس وقت میں تجھ سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ امید ہے کہ تو مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھیے۔“

استاد شمس الدین کی آواز میں بڑا کرب تھا، پوچھا۔ ”گوت نے تم دونوں کے اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا اس سلسلے میں تو کیا کہتا ہے؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”یہ کہ تم دونوں نے ابھی تک باضابطہ اسلام کیوں قبول نہیں کیا؟ اور یہ کہ تم دونوں مسلمان ہونا بھی چاہتے ہو یا نہیں؟“

درداغ نے ایک سرد آہ بھری، جواب دیا۔ ”استاد محترم! آپ کے اس سوال کا جواب نہایت سنجیدہ ہے۔“



استاد نے تڑپ کر سوال کیا۔ ”یعنی؟ کیا تم دونوں مسلمان نہیں ہونا چاہتے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات بھی نہیں کیونکہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مگر گوت مسلمان نہیں ہونا چاہتا۔“

استاد اور زیادہ تڑپ گئے، پوچھا۔ ”وہ کیوں؟ میں تیری اس وضاحت کا مطلب نہیں سمجھا۔“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ اس کا مطلب بہ آسانی سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ میں جو کچھ بتاؤں گا آپ کے خواب و خیال میں بھی وہ باتیں نہیں ہوں گی۔“

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”درداغ! میں نے تیرے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ میں تجھ سے بھی یہ امید نہیں کرتا کہ میرا برا چاہے گا یا مجھ کو کس طرح شرمندہ کرے گا۔ یہ معاملہ کیا ہے تو صاف صاف مجھے بتادے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! افسوس کہ ہم دونوں اور ہمارے جیسے اور کئی ہلاکو خان کے ہراول دستے ہیں۔ ان دستوں کا کام یہ ہے کہ امیر المومنین، ان کے ذمے دار امراء اور بغداد والوں کو نشانہ بنائیں مدھوش کر دیں۔“

استاد نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان نہایت ذہین انسان ہے۔ اس کو مسلمانوں کی ذہنی حالت کا خوب اندازہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ منگولوں کے مسلمان ہو جانے سے بہت خوش ہوتے ہیں چنانچہ اس نے ہمیں اس پر آمادہ کیا کہ بغداد میں داخل ہو کر اپنے مسلمان ہو جانے کا ڈھونگ رکھیں۔ اس سے امیر المومنین، ان کے امراء اور عام مسلمان بہت خوش ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ہم بغداد میں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ منگولوں کو اسلام نے بہت متاثر کیا ہے اور ہلاکو خان امیر المومنین کے دست حق پرست پر مسلمان ہونا پسند کرتا ہے تو بغداد میں اس کی بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ یہ خوشیاں اور خوش فہمیاں ان کے حق میں نشہ ہیں اور اس وقت جب یہ بتایا جاتا ہے کہ ہلاکو خان اپنی بیٹی کی شادی امیر المومنین یا ان کے صاحبزادے ابو بکر سے کرنا چاہتا ہے تو اس نشے میں کچھ زیادہ ہی اثر اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔“

استاد شمس الدین کو اپنے پاؤں تلے کی زمین سرکتی یا ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ غصے اور کرب کی ملی جلی آواز میں پوچھا۔ ”یہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے کیا سچ ہے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”میں اتنا بڑا جھوٹ کس طرح بول سکتا ہوں؟“

استاد شمس الدین کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے درداغ! یہ میں نے کیا سنا؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں یہ ساری باتیں آپ کو ہرگز نہ بتاتا اگر میری طبیعت اسلام کی طرف مائل نہ ہوتی۔ میں واقعی مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں اس لیے میں آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میں نے اصل حقیقت بیان کر دی۔ آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔“

استاد نے درشت اور بے مروتی کا لہجہ اختیار کیا۔ ”میں اس پر کس طرح یقین کر لوں کہ یہ جو کچھ تو نے بتایا ہے، درست ہے، سچ ہے۔ کیا پتا اس میں بھی جھوٹ شامل ہو؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس وہ ذریعہ نہیں جس سے میں آپ کو یہ یقین دلا سکوں کہ میں نے آپ کو ابھی ابھی جو کچھ بتایا، اس کا ایک ایک حرف سچا ہے۔ اب میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ استاد محترم! میں نے پڑھا لکھا ہے، میں نے علم حاصل کیا ہے۔ میری فطرت میں جو درندگی، سفاکی، عیاری، مکاری اور فریب دہی تھی، اس پر علم کی دبیز تہ جم چکی ہے۔ اب میں اتنی بے باکی اور دلیری سے جھوٹ نہیں بول سکتا جتنی بے باکی اور دلیری سے میری قوم کے لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ آپ اس فریب دہی اور جھوٹ کی مجھے جو سزا چاہیں دے سکتے ہیں۔“

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہلاکو خان بغداد پر ضرور حملہ کرے گا۔“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، بغداد پر حملہ ضرور ہوگا۔ ہلاکو بغداد پر حملہ ضرور کرے گا۔“

استاد شمس الدین نے اپنا سر پکڑ لیا۔ دکھ ان کے ایک ایک انداز میں تھا، ایک ایک حرف اور ایک ایک بات میں تھا، بولے۔ ”وہ بغداد پر حملہ ضرور کرے گا اور یہاں امیر المومنین اور ابن علقمی نے پچھتر فیصد فوج بھی کم کر دی۔ ہمارا حشر کیا ہوگا، بغداد کا حشر کیا ہوگا؟“

درداغ نے سکوت اختیار کر لیا۔ اس کو حالات کی نزاکت اور خرابی کا پورا پورا احساس تھا۔ جو کچھ اور جس طرح ہو چکا تھا، اس کا درداغ کو بے حد افسوس تھا۔

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”اب میں کیا کروں؟ امیر المومنین کو اس سانحے کی کس طرح اطلاع دوں؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ کو امیر المومنین کے روبرو دوبارہ پیش کر دیجیے، میں جس طرح بن پڑے گا امیر المومنین کو بتا دوں گا۔“



استاد شمس الدین نے کہا۔ ”بس ایک صورت ہے۔ میں تجھ کو امیر المومنین کے پاس دوبارہ نہیں لے جاؤں گا کیونکہ ان پر ابن علقمی کا بڑا اثر ہے اور ابن علقمی ہلاکوخان سے ملا ہوا ہے۔“ درداغ نے کہا۔ ”افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب میں گوت سے کٹ جاؤں گا اور گوت سے کٹ جانے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہلاکوخان سے کٹ گیا اور وہ لوگ میرے جانی دشمن ہو جائیں گے۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”میری سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ شہزادہ ابوبکر سے ملاقات کروں اور اسے ساری تفصیل بتا کے اس سے مشورہ لوں کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں لیکن اب میں آپ کے پاس نہیں رہنا چاہتا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو میرے پاس میرے ساتھ ہی رہے گا۔ ہاں گوت آج سے وہاں تیرے ساتھ نہیں رہے گا۔“

درداغ نے کہا۔ ”لیکن گوت کو اتنی آسانی سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ابن علقمی اور ابن علقمی کی وجہ سے امیر المومنین اس کے ساتھ ہیں۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ ہم دونوں کو یعنی مجھ کو اور آپ کو..... دونوں کو نکلوا سکتا ہے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”ہاں، ایسا ممکن ہے۔ وہ ابن علقمی کی مدد سے مجھ کو مدرسے مستنصریہ سے نکلوا سکتا ہے لیکن اگر میں نے شہزادہ ابوبکر کو اعتماد میں لے لیا تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“

درداغ نے وجہ کی سطح پر ایک بھرے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اندھیری رات میں ستاروں کی روشنی کام کر رہی تھی اور بھرے پر چلنے والی شمعیں دور ہی سے ساحل کی طرف بڑھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے استاد شمس الدین کی توجہ بھرے کی طرف مبذول کرائی، اس نے کہا۔ ”استاد محترم! دیکھیے وہ بھر اپنی ہی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔“

استاد نے کہا۔ ”درداغ! بھاگ چل..... مجھے ہر طرف سے بے اعتمادی کی بو محسوس ہو رہی ہے۔“

وہ دونوں اٹھ کر وہاں سے اپنے گھر پہنچے۔ گوت درداغ کو دیکھتے ہی چیخا۔ ”درداغ! تو اپنا اعتبار کھوتا جا رہا ہے اس وقت تو کہاں سے آ رہا ہے؟“

درداغ نے بڑا بامعنی جواب دیا۔ ”گوت! میں کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

گوت چونک پڑا۔ ”یعنی، کیا مطلب؟ کیا تو استاد شمس الدین سے سچ بولنے کی کوشش کر رہا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میری کوشش تو یہی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

گوت نے تری اختیار کی۔ ”اگر تو نے ایسا کیا تو بہت برا ہوگا، اس میں ہم دونوں کا نقصان ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں کیا کروں، مجبور ہو گیا ہوں۔ تو نے جو روش اختیار کی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔“

گوت نے جواب میں کہا۔ ”دیکھ درداغ! میری بات مان، اگر تو نے یہ راز کھولا تو میں تجھے کو وزیر ابن علقمی سے کہہ کر یہاں سے نکلوا دوں گا۔ نہ صرف تجھے بلکہ استاد شمس الدین کو بھی مدرسے سے نکلوا دوں گا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں امیر المومنین سے ملنے والا ہوں۔ وزیر ابن علقمی خلیفہ سے بڑا تو نہیں ہے۔“

گوت نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر تو نے ایسا کیا بھی تو ہمارے پاس اس کا بھی ایک توڑ ہے۔ تم دونوں کو منہ کی کھانا پڑے گی۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو آزادی اور اجازت دے رہا ہوں کہ جو سمجھ میں آئے کر اور جو میری سمجھ میں آئے گا میں کر گزروں گا۔“

گوت نے گویا آخری بار وضاحت چاہی۔ ”تو تو ہلاکوخان کا راز امیر المومنین اور دوسرے امرے دربار کو بتا کر ہی دم لے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ میرا پختہ ارادہ ہے اور میں ایک بار جو ارادہ کر لیتا ہوں، اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔“

گوت نے آہستہ سے کہا۔ ”میں بھی خوب جانتا ہوں کہ سارا فتور اس لڑکی علیہ کا ہے۔ ہم دونوں کے اختلاف کا سبب علیہ ہے۔ میں صبح تک اس قصے کو ختم کر دوں گا۔ اس لڑکی کو حاصل کر لوں گا۔ اس کے بعد دیکھوں گا کہ تو استاد شمس الدین کا اور مسلمانوں کا کیا ساتھ دیتا ہے۔“

گوت اسی وقت وزیر ابن علقمی کی طرف روانہ ہو گیا۔

### تاریخ دولت فاطمیہ

تاریخ دولت فاطمیہ، رئیس احمد جعفری، تاریخ فاطمین مصر، ڈاکٹر زاہد علی، طبقات ناصری، منہاج سراج الفخوری، محمد علی ابن علی، نظام الملک طوسی، مولوی عبدالرزاق کانپوری، تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان

اگست 2016ء

60

سپینس ڈائجسٹ



تخلیق کوئی بھی ہوا احساس کے بغیر ادھوری ہے... اور محبت جیسا احساس اگر درد بن کر لہو میں گردش کرنے لگے تو مصنف ہوا مصور اپنے فن پاروں میں گویا جیتی جاگتی روح پہونک دیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی لکھاری تھا جسے قلم کی نوک پر احساسات سے کھیلنے کا فن آتا تھا مگر زندگی کے حوالے سے خالی پن کا احساس اور بے رونقی کا یہ ہمیشہ اس کے دل میں پھانس بن کر چبھتا رہا۔

لفظوں کی بھیڑ میں محبت کی چاشنی سے دور ایک مصنف کا احوال

## خالس پن

تنویر ریاض

پروفیسر چیڈوک کی خواہش تھی کہ ہم اسے ہال کہہ کر لکرا کریں۔ اس روز بھی وہ ہمیں اپنی کامیابی کا راز بتا رہا تھا۔ گو کہ وہ عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کی آواز میں غرور کی جھلک نمایاں تھی۔ کلاس میں موجود تمام طالب علم بالخصوص نئی آنے والی لڑکیاں بڑی توجہ اور انہماک سے اس کی تقریر سن رہی تھیں۔ وہ اپنے ڈیسک پر آگے کی طرف جھکا ہوا بڑے پرجوش انداز میں بول رہا تھا۔ اس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو چکی تھی اور بولتے وقت اس کی ٹھوڑی میں گڑھا پڑ جاتا تھا۔

”دنیا کا سارا عظیم ادب محبت کے بارے میں یا اس کے بغیر ہے۔“ اس کی یہ بات سب کے سر پر سے گزر گئی۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ناولوں میں محبت کی سچائی کے بارے میں لکھتا ہوں۔ اس کی تکلیف، بربادی اور اس کے ساتھ آنے والے خالی پن کو بیان کرتا

اگست 2016ء

سپنس ڈائجسٹ



ہوں۔ یہی میری طاقت ہے، یہی میرا تحفہ ہے۔“

لڑکیاں اس کی دولت اور امارت سے مرعوب تھیں۔

اس کے افسانے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ اس کے پینٹ ہاؤس اپارٹمنٹ کی بالکونی میں ہونے والی کاک ٹیل پارٹیاں، سیمپن میں اس کا بیج ہاؤس، فرامیسی خادمہ فی فی، شو فرقرار، ریڈ کارپٹ پر میسر، ٹیلی ویژن انٹرویو، یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کے خواب کے مانند ان کی نظروں میں سما یا ہوا تھا۔ ہال اپنے تین سب سے زیادہ فروخت ہونے والے ناولوں کا سودا ہالی وڈ کے پروڈیوسرز سے کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی لیے دوسرے پروفیسرز کی طرح اس کی راتیں بے خواب نہیں گزرتی تھیں اور نہ ہی اسے ریٹائرمنٹ کا خوف تھا، اس لیے اسے ہماری تربیت کرنے یا ہمارے ذہنوں کو کسی سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ ہمیں واپس کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن میں اس کی مہارت سے مرعوب ہو چکا تھا۔

میرے ساتھیوں میں جبری بھی تھا جو محض اس غرض سے اس کلاس میں آیا تھا کہ آسانی سے سی گریڈ حاصل کر سکے اور فٹ بال ٹیم میں اس کی جگہ برقرار رہے۔ اس نے ایک ناول شروع کر رکھا تھا، جس کی کہانی ایک ایسے باپ کے گرد گھومتی تھی جو اپنے بچے کو کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہوا کارن بیف کھا کر پالنا چاہتا تھا تاکہ بڑا ہو کر وہ ایک نامور اسکیننگ کا کھلاڑی بن سکے۔ اس نے ناول کا پہلا باب کلاس میں پڑھ کر سنایا تو ہال نے اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے جبری کی حساسیت کی تعریف کی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور لڑکیاں آہستہ آہستہ کھسر پھسر کرنے لگی تھیں۔

میں اس کلاس میں ابھی تک ناکام تھا، خود کسی سرگرمی میں حصہ لیتا اور نہ ہی اپنے ساتھی طالب علموں کے کام پر تنقید کرتا۔ کلاس میں ہونے والی مشقیں بھی کچھ متاثر کن نہ تھیں۔ میری تحریر میں جذباتی عنصر کی کمی تھی۔ ہال کا کہنا تھا کہ میں تاریک گوشوں کے بارے میں لکھتا ہوں اور ان میں وہ شاعرانہ گونج نہیں جو پڑھنے والے کے دل کو چھو لے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں آتش فشاں کرتا ہوں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے میری جنگ وجدل سے بھرپور اور پراسرار کہانیاں پسند نہیں تھیں۔ وہ چڑیلوں اور ڈراؤنے خوابوں پر لکھی گئی کہانیوں کو بھی مسترد کر دیتا تھا اور جب میں نے جرائم سے متعلق کہانیاں لکھیں جن میں بتایا گیا تھا

کہ کس طرح اچھے لوگ محض مقروض ہونے، اپنی کسی حماقت یا خوب صورت عورتوں کی وجہ سے جرم کی راہ پر چل پڑتے ہیں تو اس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ موڈ بیٹھا کرتی تھی۔ میں سیمسٹر کے آغاز سے ہی اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ پہلے دن کلاس میں آئی۔ اس نے ایک اچھٹی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنا مضمون پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ ابھی سے ہم دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس سارشتہ قائم ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس پر فریفتہ ہو چکا ہوں لیکن اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ پورا سیمسٹر یونہی گزر گیا۔ اس نے کبھی میری حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ میری زندگی کا بہترین ادب محبت کی عدم موجودگی کے بارے میں ہوگا۔

میرا پہلا سال یونہی گزر گیا اور میں کوئی کام مکمل نہ کر سکا۔ مجھے پارٹیوں اور دوستوں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کیمپس سے باہر ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہونا پڑ گیا۔ میری مالکن مسز فریڈی بہت ہی نرم دل اور مہربان عورت ہے وہ مجھے کیک اور بسکٹ بنا کر کھلاتی ہے اور اگر کبھی کرایہ دینے میں دیر ہو جائے تو تقاضا نہیں کرتی۔

میں اپنی تحریریں چونی کے رسالوں کو بھیجتا ہوں جنہیں ناقابل اشاعت قرار دے کر واپس کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات میرا میل باکس اس بری طرح بھر جاتا ہے کہ پوسٹ مین میرے مسودوں کے لفافوں کو ڈوری سے باندھ کر دروازے پر رکھ کر چلا جاتا ہے لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں اور اس یقین کے ساتھ لکھتا رہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن میری کوئی تحریر کسی نہ کسی بڑے رسالے میں جگہ حاصل کر سکے گی۔ میری بے خوابی بڑھتی جا رہی ہے لیکن اس کی بدولت مجھے مصروف رہنے کا بہانہ مل گیا ہے۔ میں نے لکھنے کے علاوہ جزوقتی کام بھی شروع کر دیا ہے۔ میں ایک باریبی کیوشاپ پر بیرا گیری کرتا ہوں اور کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو آرڈر پر اسٹینکس اور بیرر وغیرہ پہنچاتا ہوں۔ اس کے علاوہ ہفتے کے آخر میں ایک بار میں بھی باریٹنڈر کے فرائض انجام دیتا ہوں۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اس لیے یہاں کوئی بات چھی نہیں رہ سکتی۔ میں تقریباً ہر شام بیٹھ اور اس کے دوستوں کو مرکزی شاہراہ پر گھومتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے پہچانتی نہیں یا پھر یوں ظاہر کرتی ہے جیسے وہ مجھے جانتی نہیں۔ جب اس کے بلند و بانگ قہقہے فضا میں گونجتے ہیں تو لگتا ہے جیسے وہ



نے کئی بار میری کرسی کو بھی ٹھوکر ماری۔ وہ ہر شخص کو یہ سمجھاتا چاہ رہا تھا کہ موٹے لوگ بھی محبت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ انہیں بچوں کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ وہ صحیح وقت پر صحیح لفظ بول سکتے ہیں۔ کہانی پڑھتے پڑھتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں اسے تھپڑ مارتا چاہ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف کھینچ کر جھنجھوڑ کر پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اسے یہ درد کس نے دیا؟ اس نے اپنے گیتوں یا مٹیوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جو وہ بہت اچھا بچا کرتا تھا۔ نہ ہی اس نے یہ بتایا کہ کس طرح اس کی ماں ہولٹوں میں کھانا پکا کر چار پیسے کماتی تھی۔ اس کی بہن کیسے افغانستان میں ماری گئی۔ کس طرح اس کا باپ زہریلی خوراک کھا کر مر گیا تھا۔ کالج میں آنے کے بعد وہ یہ سب باتیں بھول گیا تھا۔ اپنے کلاس روم کے زرخے میں گھر کر اس کی شخصیت مسخ ہو چکی تھی اور بھول گیا تھا کہ وہ کون ہے۔ وہ تین سال پہلے میرے ہی کمرے میں رہا کرتا تھا لیکن اب بہت بدل گیا تھا۔

اب وہ اپنے مٹاپے کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ اسے رنج تھا کہ لڑکیاں مٹاپے کی وجہ سے اسے پسند نہیں کرتیں۔ اس کی آواز سپاٹ تھی۔ وہ محبت کا متلاشی تھا لیکن کوئی لڑکی اسے پسند نہ کرتی تھی۔ انہوں نے اس کے اندر خوف اور شک بھردیا تھا، اس کہانی کا انجام بھی بہت درد بھرا اور پُرسوز تھا۔

کلاس کی سبھی خوب صورت لڑکیاں اس دردناک انجام پر رونے لگیں، ہال دونوں ہاتھوں سے تالی بجانے لگا۔ جب یہ شور کم ہوا تو میں اپنی کرسی سے اٹھا اور ہماری نظریں چار ہوئیں۔ فیسکی فریڈ مسکرا رہا تھا اور میں سوچنے لگا کہ کیا وہ کبھی اپنی بہن کی قبر پر جائے گا۔

اس ہفتے میں نے روزانہ بیٹھ مور کو مختلف لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ سب ہمارے برگر کے شوقین تھے۔ میں گاڑی میں ہی ان کا آرڈر کروا رہا تھا اور ہر بار میری نظریں بیٹھ کے چہرے کا احاطہ کرنے لگتیں جو بڑے انہماک سے اپنے دوست کے ساتھ بڑی اداؤں سے پنجر سیٹ پر بیٹھی برگر اور ڈرنک سے دل بہلا رہی ہوتی۔ میں اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے دوست سے کہتا۔ ”ہماری برگر شاپ پر آنے کا شکریہ۔ امید ہے کہ تم جلد ہی دوبارہ یہاں آؤ گے۔“ اس کا دوست اور بیٹھ دونوں مجھے نظر انداز کر دیتے۔

میں اس کی کار کو پارکنگ لاٹ سے نکلتے اور بائیں جانب مڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کار کی عقبی بتیاں مجھ سے

مجھ پر ہنس رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کا بہت خیال رکھتا ہوں اور اسے پچھلی کا ایک کلڈاز یا وہ دے دیتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گلاس کو بھی مشروب سے لہالب بھر دیتا ہوں۔ وہ منہ پھیر کر ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہے جیسے مجھ سے نہیں بلکہ کسی اور سے مخاطب ہو۔

ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے ہال نے تجویز پیش کی کہ وہ ہمارے درمیان ایک مقابلہ کروانا چاہتا ہے۔ سیکسٹر کے اختتام تک جو بھی کہانی بہترین قرار پائی، اس کے لکھنے والے کو ہال کے تینوں ناولوں کی دستخط شدہ کاپیاں انعام میں دی جائیں گی۔ میرے کلاس فیلوز نے مسکراتے ہوئے اس تجویز کا خیر مقدم کیا وہ ہال سے اس طرح بات کرتے جیسے اس کی اولاد ہوں اور وہ بھی جواب میں ان کے ساتھ ایک باپ کی طرح ہی گفتگو کیا کرتا تھا۔

ان سب کے پاس اس کی کتابیں پہلے سے تھیں اور انہوں نے کلاس کے پہلے روز ہی اس کی میز کے گرد قطار میں کھڑے ہو کر ان ناولوں کی دستخط شدہ کاپیاں حاصل کر لی تھیں۔ وہ سب باری باری اس کے پاس آتے، وہ لڑکیوں کی کلائی تھامتا اور لڑکوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے تھپکی دیتا، میں اپنی نشست پر بیٹھایا کارروائی دیکھتا رہا۔ وہ سب باری باری اپنا نام بتا رہے تھے۔ ہال نے ایک مرتبہ وہ سارے نام دہرائے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔ ”اور تم کون ہو؟“

”اچھا سوال ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ کسی روز میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔“

☆☆☆

فیسکی فریڈ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ جب وہ اپنی کہانی پڑھ رہا ہو تو آگے بیٹھے ہوئے لوگ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت کریں۔ وہ میرے عقب میں کھڑا گلا صاف کر رہا تھا۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا جس کی وجہ سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہال نے اسے سمجھایا کہ وہ پرسکون ہو جائے اور آرام سے اپنی کہانی پڑھے۔ وہ اسے یقین دلایا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی کہانی سننے لگا۔ اس نے اپنے اونچے لہجے پر قابو پانے کے لیے کافی محنت کی تھی اور اب وہ نیویارک کا پیداگئی لگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کہانی پڑھتے وقت اپنی جگہ پر رقص کر رہا ہو اور اس کا تین سو پاؤنڈ وزنی جسم اپنی سیٹ پر جھول رہا ہو۔ اس کی ایڑیاں دائیں بائیں ہو رہی تھیں اور اس دوران اس



دور ہوتی جا رہی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کار میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اس کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے سرخ شعلے لپکتے محسوس ہوتے ہیں۔ میری نگاہ برابر والی عمارت کی کھڑکی میں جاتی ہے جہاں ایک عورت اپنے روتے ہوئے بچوں کو بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ میری طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے میں اس کا سارا درد سمیٹ لوں گا، میں بھی اسی انداز میں اس کی جانب دیکھتا ہوں۔ شاید ہمارا دکھ مشترک ہے۔ دونوں ہی محبت کو ترسے ہوئے ہیں۔

اگلے ہفتے بیٹھ نے اپنے خاندان کی کہانی لکھی۔ اس نے اپنی زندگی کی کہانی کو کسی ڈرامائی رنگ کے بغیر کاغذ پر منتقل کر دیا۔ جب وہ کہانی پڑھ رہی تھی تو مجھے اس کی آواز میں اعتماد کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ بہت سی باتیں دہرا رہی تھی۔ اس کے مکالمے غیر فطری تھے۔ وہ ان مکالموں کو ادا کرتے وقت آواز پر توجہ دینے کی کوشش کر رہی تھی خصوصاً جب اس نے اپنی ماں کے مکالمے بولے تو آواز کا مصنوعی پن سامنے آ گیا لیکن اس کی کہانی میں سچائی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے بارے میں بتایا جو پولیس میں تھا اور تیس سال کی ملازمت کے بعد اب ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کو آئے دن مجرموں اور سماج دشمن عناصر کے خلاف لڑنا پڑتا تھا جس کا بوجھ اٹھانا اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا اس کا ایک بھائی بھی پولیس آفیسر تھا۔ اس کے ان دونوں کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے۔ وہ دونوں بہت زیادہ ڈرنک کرتے تھے اور اس کے والدین کے درمیان ہمیشہ جھگڑا چلتا تھا۔ عام طور پر اس کے بوڑھے باپ کو بھی پسائی اختیار کرنا پڑتی اور وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنا کوئی کارنامہ بیان کرنا شروع کر دیتا۔ اس کا بھائی اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا اور بیٹھ کا تین سالہ بھتیجا سوچ رہا تھا کہ اب اس کا باپ گھر کیوں نہیں آتا۔

کہانی پڑھنے کے دوران کئی بار اس کی آواز بھرا گئی۔ ہال نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ پرسکون ہو کر کہانی پڑھے۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں معذرت کی اور گلا صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کی جانب سرکنا شروع کیا لیکن ہال مجھ سے پہلے ہی اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے بیٹھ کا بازو پکڑا اور اسے گلے لگالیا۔ وہ اس کے گلے سے لٹک کر رونے لگی اور وہ اسے پچکارے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے

ماٹھے پر بوسہ دے دیا۔ میرے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، میرے حلق سے ایک خاموش چیخ برآمد ہوئی اور ذہن کے تاریک گوشوں میں گم ہو گئی۔

ہال ہم سے کہتا۔ ”تمہیں اپنی سوچ کو تلاش کرنا چاہیے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کام کتنا مسر ہے۔ وہ ناپائیدار اور شرمیلی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے بلائے پر چھپ جائے اور جب تم ناامید ہو جاؤ تو اچانک ہی تمہیں حیران کر دے لیکن یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے دریافت کرو۔“

میں اپنے خیالوں میں بسنے والی لڑکی کے بارے میں سوچتا تھا۔ وہ لڑکی جس پر میں پہلی بار فریفتہ ہوا تھا۔ شاید پہلی جماعت میں ساتھ پڑھنے والی وہ لڑکی جو میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھی اور جس کا نام اور چہرہ بھی میں بھول چکا ہوں۔ لکھنے کی مشق میرے اندر سرایت کر چکی ہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ میرے خیالوں میں رہنے والی جو کوئی بھی ہے وہ اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ میں یہ تصور کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ شوق، تخلیق اور کامیابی کے نام پر وہ کس قسم کی قربانی چاہتی ہے۔ ہال نے اپنی سوچ کو ایک نام دے رکھا ہے۔ وہ اسے پنڈورا کہہ کر بلاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ”پنڈورا کسی مرد سے محبت نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ مجھ سے بھی نہیں لیکن وہ جانتی ہے کہ میں کون ہوں۔“

کیا بکواس ہے۔ میں نے سوچا اور یہ نام چرایا۔ پنڈورا..... تم میری سوچ ہو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں لیکن جانتی ہو کہ میں کون ہوں۔

☆☆☆

مسز فریڈی نے مجھے بلا کر کہا کہ گھر کے عقبی حصے کی باڑ... مرجھا گئی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس جھاڑ جھنکار کو صاف کر کے اسے نئے سرے سے ترتیب دیا جائے۔ وہ اتنی استطاعت نہیں رکھتی کہ کسی باہر کے آدمی کو بلا کر اس سے یہ کام کروایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسے میری مدد درکار ہے۔ اس نے مجھے مختلف اوزار دیے اور بتایا کہ کس طرح درختوں کو کاٹنا اور لکڑی کا ڈھیر لگانا ہے، اس کے بعد مجھے زمین کھود کر اس کی سطح کو ہموار کرنا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق مجھے یہ کام چار سے چھ ہفتوں میں مکمل کر لینا چاہیے تھا اور جس دن میں نے پہلا درخت گرا دیا تو وہ مجھے ایک عمدہ



کبھی اس پر غور نہیں کیا ہوگا کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ تمہیں ایک زمانہ جانتا ہے لیکن تمہیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔“

”مجھے پروا ہے اور میں جو کچھ کرتا ہوں، اس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔“

ممکن ہے کہ یہ سچ ہو۔ ممکن ہے کہ میں بھی اسی کی طرح لوگوں کی پروا کرتا ہوں۔ میں واپس کاؤنٹر پر آیا۔ ایک تھیلے میں کچھ تازہ برگر اور فرائی فش ڈالی اور اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ”ہماری برگر شاپ پر آنے کا شکریہ۔ امید ہے کہ تم جلد ہی دوبارہ آؤ گے۔“

☆☆☆

میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ مسز فریڈی کے صحن کی صفائی بھی کر رہا تھا۔ روزانہ نٹوں کے حساب سے مٹی اور کچرا اٹھاتا۔ اس مشقت کے باوجود نیند نہیں آتی تھی اور نصف شب کے بعد جاگنا میرا مقدر بن گیا تھا۔ میں نے اس شب بیداری کا فائدہ اٹھانے کے لیے سیکورٹی گارڈ کی ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے چھوٹے سے قصبے میں اس طرح کی ملازمت دستیاب نہ تھی۔ چنانچہ جب مجھے نیند نہ آتی تو میں باہر سڑک پر نکل جاتا اور اپنے علاقے میں یونہی بلا مقصد گھومتا رہتا۔ پروفیسر چیڈوک کے گھر کے آگے سے بھی گزر ہوتا۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کے سامنے والے پورچ کو دیکھتا رہتا۔ میں ہال کو اپنے گھر کے روشن کمروں میں گھومتے ہوئے دیکھتا۔ اس کے گھر کی کھڑکیاں اور شیشے بے داغ تھے اور ان پر مٹی یا گندگی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی خادمہ روزانہ ان کھڑکیوں کو صابن ملے پانی سے صاف کیا کرتی تھی۔

ہال کے دو گھر مین بن اور لاس اینجلس میں تھے۔ اس کے علاوہ ساحل پر ایک کیمپن بھی اس کی ملکیت تھا لیکن وہ سال کا بیشتر حصہ۔۔۔ ہمارے چھوٹے سے قصبے میں گزارتا تھا تا کہ اپنے علم سے یہاں کے طالب علموں کو فیض یاب کر سکے۔ اس رات بھی میرا اتفاقاً وہاں سے گزر ہوا لیکن نہ جانے کیوں آگے جانے کے بجائے اسی درخت کے نیچے رک گیا۔ میں سردرات میں ایک مجسمے کے مانند ساکت کھڑا ہوا تھا۔ کمپیوٹر پر بیٹھنا یا ٹیلی فون سننا اور ٹی وی دیکھنا، ہال کے معمولات میں شامل تھا۔ اس وقت بھی وہ کوئی ٹی وی ڈی دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ اس کی اپنی ہی کوئی فلم ہے۔ اس نے نہ صرف ان فلموں کے لیے پس پردہ کنٹری کی کھی بلکہ ان میں مختصر رول بھی کیے تھے۔

سی پیٹری بنا کر کھلانے کی۔ مسز فریڈی کا کہا ہوا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ لہذا میں نے دوسرے دن سے ہی کام شروع کر دیا۔

میں کبھی بھی برگر ہاؤس کے فرنٹ کاؤنٹر پر نہیں بیٹھتا لیکن اس رات کسی وجہ سے ایسا کرنا پڑ گیا اور اسی روز فریڈی بھی وہاں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں چھپنے کی کوشش کرتا، اس نے مجھے دیکھ لیا حالانکہ ہم دونوں کے درمیان یہ آنکھ مچولی گزشتہ تین برس سے جاری تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی متعدد بار وہاں آچکا تھا لیکن میں اسے دیکھ کر ہمیشہ ادھر ادھر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”تم مجھے ایک منٹ دے سکتے ہو۔“

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس وقت کاؤنٹر پر کوئی گاہک نہیں تھا، میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، کیوں نہیں۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

”دیکھ نہیں رہے، کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ اُلجھتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟“

میں جانتا تھا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے لیکن میں نے انجان بننے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم اپنے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو؟“ وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں شہر کے مختلف حصوں میں اس نوعیت کے کام کرتے دیکھا ہے۔ تم دن بے دن دبلے ہوتے جا رہے ہو اور تمہاری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ آخری بار کب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا یا آخری بار کب تم پوری نیند سوئے تھے؟“

میں اس سے بھی زیادہ اچھے سوالات کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی ایک سوال داغ دیا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب تم بینجو کیوں نہیں بجاتے؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بینجو نہیں بجاتا جبکہ ہمیں الگ ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔“

”اور اس تین سال کے عرصے میں تمہارا لہجہ بھی بدل گیا ہے، کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں اور پھر چہرہ ساٹ ہو گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا تھا لیکن میں پہلے بول پڑا۔ ”تم نے



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                    |                  |                  |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد   | صائمہ اکرام        | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد         | نبیلہ عزیز       | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر       | فائزہ افتخار     | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض        | نبیلہ ابرار      | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار       | آمنہ ریاض        | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل            | عنیزہ سید        | مُستنصر حُسین    |
| رضیہ بٹ       | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد  | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | اُمِ مریم          | نایاب جیلانی     | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ وہ اسے گھر کے اندر لے گیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

دوسرے دن بیتھ کلاس میں نہیں آئی۔ میں نے دیکھا کہ ہال کے گال پر ایک ہلکی سی خراش تھی اور چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ ساری رات نہیں سو سکا ہے۔ یہ ہمارا آخری سال تھا اور بیتھ پورے ہفتے کلاس سے غائب رہی جبکہ ان دنوں کلاس میں کافی کام ہو رہا تھا، ہم اپنے اپنے پروجیکٹس مکمل کر رہے تھے اور ہمارے درمیان مقابلے بھی جاری تھے۔ جوڈی نے اپنے باپ کے بارے میں مضمون لکھا۔ میٹ نے اپنی ماں کو کہانی کا کردار بنایا۔ جارجی کو خلا اور سیاروں سے دلچسپی تھی۔ اس نے اپنے مضمون میں مختلف سیاروں کے بارے میں بتایا۔ اسی طرح کلاس کا ہر لڑکا اور لڑکی کسی نہ کسی موضوع پر لکھ رہے تھے۔ ہال ہر کہانی کے بارے میں تبادلہ خیال کرتا اور بتاتا کہ یہ فکشن ہے یا نہیں۔ اس نے سب لوگوں کی تحریریں سننے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

”تم نے اس مقابلے کے لیے کچھ لکھا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ تھوڑا سا حیران ہوا، اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں میرے لیے نفرت اور حقارت کی جھلک واضح تھی۔ میں اس کے خیال میں ایک نالائق طالب علم تھا جس سے کسی قسم کی کارکردگی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے بھی ان باتوں کی پروا نہیں کی۔ اس لیے اس روز بھی اس کی طنزیہ مسکراہٹ اور نفرت آمیز نگاہوں کو برداشت کر گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ کلاس میں دوسرے طالب علم بھی میرے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کے باوجود میری کوشش ہوتی تھی کہ اپنی دلکشی برقرار رکھوں گوکہ اس سے مجھے کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ ہال نے ہاتھ پھیلائے اور میں نے اپنی کہانی اسے پکڑادی۔ وہ اس کے صفحات پلٹنے لگا۔ وہ ایک کٹا پھٹا مسودہ تھا جسے میں نے کمپیوٹر پر نہیں بلکہ اپنے پرانے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا تھا جس کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ اگر زور سے کی پر انگلی مار دو تو کاغذ میں سوراخ ہو جاتا تھا۔ اس مسودے کے تمام صفحات اسی طرح کے سوراخوں سے بھرے ہوئے تھے۔

”یہ تو بہت چھوٹا ہے۔“

”ہاں کیونکہ یہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔“

”پھر تم نے اسے جمع کیوں کرایا؟“

میرا وجود تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ میرے ذہن میں خیالات کی آندھی چل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کاغذ کے بجائے دماغ کی دیواروں پر کچھ لکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مسز فریڈی کے عقی صحن کا دوسرا درخت کب گرے گا اور کب وہ مجھے پیسٹری بنا کر کھلائے گی۔

دوبچے کے قریب بیتھ گلی کے کونے سے نمودار ہوئی اور سیدھی ہال کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو باڑ کے پیچھے چھپا لیا۔ بیتھ نے بہت ہی خوب صورت سلور کلر کا لباس پہن رکھا تھا۔ میری انگلیوں میں جلن ہونے لگی۔ یہ جلن نہیں بلکہ بیتھ کو چھونے کی بے تانی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ انگلیاں صرف ٹائپ رائٹر کے ٹی بورڈ کو ہی چھو سکتی تھیں۔ بیتھ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی ہال کے گھر کے مرکزی دروازے تک گئی اور آہستہ سے اس پر دستک دی پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بچھ کر دروازے پر کئے برسنا شروع کر دیے۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ مسل کر اپنے سینے کے گرد لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اب اس کا رخ سڑک کی جانب تھا۔ شاید وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

ہال دروازے پر آیا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں فوراً سمجھ گیا کہ اسے بیتھ کا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے سرگوشی میں سوال کیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ بیتھ کو دیکھ کر اسے خوشی نہ ہوئی ہو؟“ وہ کچھ بے چین اور ناراض سا نظر آ رہا تھا۔ ان کے درمیان ہلکی سی جھڑپ ہوئی۔ ہال نے اسے اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہا بلکہ ڈیوڑھی میں ہی کھڑے کھڑے اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے بازو سینے پر باندھ لیے تھے اور بار بار اپنا سر ہلا رہا تھا۔ بیتھ نے بھی اپنا سر ہلایا اور اس کے بعد ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا۔ بے اختیار میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور رک گیا۔ میں اس کے لیے یہی کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل میں میرے لیے کوئی چاہت نہ تھی۔ میری محبت ایک طرف تھی۔ مجبوراً مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ ہال نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ ہال نے بھی اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر نظریں جمادیں پھر نہ جانے کیا کہا کہ وہ نرم پڑ گئی۔ ہال نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور وہ اس کے سینے



ہوگا۔ وہ اس وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اس کی میز کی اوپر والی دراز کھلی ہوئی نظر آئی اور میں سوچنے لگا کہ وہاں کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے۔ خط کا لفافہ کھولنے والی چھری، چوہے مار دوایا اعشاریہ تین دو کار یو الوور..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں ایک چیک بک کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ ہال نے ایک چیک کے عوض کئی مشکلات سے جان چھڑائی ہے۔ وہ لوگوں کو خریدنے اور ان کا منہ بند کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے چند لمحے میرے بولنے کا انتظار کیا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ میں اس سلسلے میں کہاں تک جاسکتا ہوں۔ میں نے بھی اپنے ہونٹ سختی سے بچھ لیے۔ مجھے اس کے گھر کی تیل بجنے اور ہال کا انکار میں سر ہلاتے رہنا یاد آ گیا۔ کس طرح ہال نے بیٹھ کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ میں اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسی شخص نے بیٹھ کو چھپا رکھا ہے یا پھر قتل کر دیا ہے۔

اس نے شکستہ آواز میں پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“  
”جہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں کچھ چاہتا ہوں۔“  
”اس دنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ چاہتا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس کا سینہ خواہشات سے خالی ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تم ایک مصنف ہو۔ اپنی فراست کو کام میں لا کر اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

ہال اپنی میز کی طرف بڑھا اور جونہی اس نے دراز کھولی تو میرا سینہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اب وہ پستول نکال کر مجھ پر فائر جھونک دے گا لیکن ہتھیار کے بجائے اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک پتلی سی گڈی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پانچ سو ڈالرز ہوں گے۔ اس کے لیے یہ ایک چھوٹی سی رقم تھی۔ اس نے وہ گڈی میری طرف پھینک دی لیکن میں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہماری نظریں ایک بار پھر چار ہوئیں۔ ہم ایک دوسرے کو خونخوار انداز میں گھور رہے تھے۔ مجھے اس کی آنکھوں سے شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ غالباً ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی۔

میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ البتہ اسے تھوڑی بہت تکلیف ضرور پہنچا سکتا تھا اور یہ حرکت میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ جب میں نے کلاس روم میں اپنی کہانی ختم کی تو محسوس کیا کہ کچھ نئی لڑکیاں اسے پہلے جیسی عقیدت اور محبت کے ساتھ نہیں دیکھ

”تم اسے ایک خاص نمونے کے طور پر دیکھ سکتے ہو۔“  
اس نے اپنا سر میری طرف گھمایا اور مجھے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے کی نرمی رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایسے تاثرات نے لے لی تھی جن سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ وہ گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے بولا۔ ”بہت خوب، تم اسے پڑھنا شروع کرو۔“

عام طور پر دوسرے طالب علم اپنی نشست پر کھڑے ہو کر اور ہال کی طرف منہ کر کے پڑھنا شروع کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس میں چلتا ہوا سامنے کی طرف گیا اور اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میرے چہرے کا رخ کلاس کی طرف اور پشت ہال کی طرف تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

”پروفیسر فریڈرک چاہتا ہے کہ ہم اسے ”بل“ کہہ کر پکاریں اور ہمیں بتاتا رہتا ہے کہ وہ اتنا عقل مند کیوں ہے۔ ایسا کہتے ہوئے اس کی آواز میں غرور جھلکنے لگتا ہے گو کہ اپنے طور پر وہ عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کلاس میں موجود طالب علم بالخصوص نئی آنے والی لڑکیاں بڑی توجہ اور انہماک سے اس کی تقریر سنتی ہیں.....“

جتنی دیر تک میں مسودہ پڑھتا رہا۔ پوری کلاس دم سادھے خاموش بیٹھی رہی۔ وہ سب ہال کا رد عمل جاننا چاہ رہے تھے لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ البتہ وہاں زردی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”دفتری اوقات میں کمرے میں آ کر مجھ سے ملو۔“  
”بہت بہتر۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

وہ کلاس ختم ہونے کے بعد آدھ گھنٹے اپنے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے اسے راہداری سے گزرتے دیکھا اور اس کے پیچھے ہولیا لیکن جب میں اس کے دفتر کے دروازے پر پہنچا تو وہ بند ہو چکا تھا۔ گویا وہ چاہتا تھا کہ میں دستک دے کر اندر جاؤں۔ اسے قدم قدم پر چھوٹی چھوٹی فتوحات کی ضرورت تھی۔ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔ اگر وہ مجھے جھکا نا چاہ رہا تھا تو میرے پاس بھی اس کا توڑ موجود تھا۔ لہذا میں دستک دے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور دماغ میں طرح طرح کے خیالات سراٹھانے لگے۔ غالباً وہ مجھے ڈرانے دھمکانے یا کسی اور مکمل سزا کے بارے میں سوچ رہا



رہی تھیں بلکہ ان کے انداز میں ایک طرح کی گستاخی نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنی عظمت کا جو پناہ تعمیر کیا تھا، میں نے اس میں سے ایک اینٹ نکال دی تھی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ انواہیں اور شکوک و شبہات کسی بھی انسان کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ہال یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر دراز کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”تمہیں کتنی رقم چاہیے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس اس سے بہتر تجویز ہے۔“

”مثلاً۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”میرے استاد ہونے کی حیثیت سے تم مجھے اپنے ایجنٹ اور ہالی وڈ کے کچھ لوگوں سے متعارف کروادو۔“

میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے وہ مسودہ نکالا جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اسے پکڑا دیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ اس نے مسودہ پڑھنا شروع کیا۔ پہلا جملہ، پہلا پیرا، پھر پہلا صفحہ۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری جو بتدریج گہری ہوتی چلی گئی پھر اس نے ہنسنا شروع کیا اور اچانک ہی زوردار قہقہے لگانے لگا۔ میں سمجھ گیا، وہ خوفزدہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوفزدہ شخص نہیں دیکھا کیونکہ جو کچھ اس نے کیا یا تھا، وہ اس سے چھٹنے والا تھا اور مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

”مبارک ہو۔“ وہ کھیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم جیت گئے۔“

دوسرے دن پوری کلاس کے سامنے ہال نے مجھے اپنی تین دستخط شدہ کتابیں، فلم کا نکتہ اور ایک انتہائی خوب صورت چھپا ہوا سرٹیفکیٹ پیش کیا جس میں مجھے پہلے سالانہ مقابلے کا فاتح قرار دیا گیا تھا۔ میرے کلاس فیلوز یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ غالباً انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ مقابلہ جیت سکتا ہوں پھر انہوں نے اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے بے دلی سے تالیاں بجانا شروع کر دیں البتہ فریڈی میرے پاس آیا اور میرے گلے لگ گیا۔ جیری نے رونا شروع کر دیا۔ باقی لوگوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ کسی کو بھی یہ کامیابی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے تعظیماً جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا اور ایک مختصر تقریر کی اور ہال کے ساتھ ساتھ ان کا بھی شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے مجھے اس کامیابی کے لیے تحریک ملی۔ وہ سب

پتھر کے جُت بنے میری تقریر سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ مجھ جیسا نکم طالب علم یہ مقابلہ کیسے جیت سکتا ہے۔

ہال کی سفارش نے فوراً ہی کام دکھا دیا۔ اسی روز سہ پہر میں اس کے ایجنٹ کا فون آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے میرا ناول پسند آیا، اس میں جذباتی صداۓ بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ بہت تیز اور پھرتیلا ثابت ہوا اور ہفتے کے اختتام تک اس نے میرے تین پبلشر سے معاہدے کروا دیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑے فلم اسٹوڈیو کے ساتھ فلم کی بات بھی مکمل ہو گئی۔ ہال کا ایجنٹ اب میرا ایجنٹ بن گیا تھا۔ وہ مجھے بے بی کہہ کر بلاتا اور ہمیشہ پیسوں کی بات کیا کرتا تھا۔ اب مجھے ہال کی کامیابی کا راز معلوم ہوا۔ وہ سب اس ایجنٹ کی وجہ سے تھی۔ وہ ہر بار فون کر کے یہی کہتا۔ ”بے بی! اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنا ہے۔“ اس نے معاوضے کی جو رقم مجھے بتائی، وہ میرے تصور سے کہیں زیادہ تھی۔ میں نے ٹیلی فون اپنے سینے سے لگالیا اور دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرنے لگا مگر وہاں کچھ نہیں تھا اور صرف ایجنٹ کی مہین آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”بے بی، بے بی۔“ میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا شکریہ پندورا!“

اگلے روز میں بیٹھ کے گھر مورہاؤس کی جانب چل پڑا۔ مجھے اس کے والدین کے کرب کا اندازہ تھا، میں نے پوری کی سیڑھیاں چڑھیں اور دروازے پر دستک دے کر انتظار کرنے لگا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ دستک دی اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے اس کا باپ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے غصے اور دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونٹوں پر ایک ہی صدا مچل رہی تھی۔ ”بیٹھ کا کچھ پتا چلا؟“ ظاہر ہے اسے یہی سوال کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس کی بیٹی گزشتہ دو ہفتوں سے لاپتا تھی۔

”کس لیے آئے ہو؟“ اس نے بلند آواز سے پوچھا جس میں ہلکا سا ارتعاش نمایاں تھا۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا صرف اسے اپنی کہانی پکڑا دی۔ اس پر میرا نام نہیں لکھا ہوا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے اپنی زندگی کی کمائی اسے دے رہا ہوں۔ وہ اس کہانی کے کرداروں کو پہچان لے گا۔ اس کی ساری زندگی ہر شخص اور ہر بات پر شبہ کرنے میں گزری ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس کہانی کو میرے منہ پر دے مارے گا لیکن میری آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس نے تیوری چڑھائی اور میری کہانی کا پہلا جملہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کی



بیوی بھی برابر میں آکر کھڑی ہو گئی اور اپنا سر میری جانب گھما دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے رو رہا ہوں لیکن اس کا یقین اس وقت آیا جب آنسوؤں نے میرے چہرے کے شیشوں کو دھندلا دیا۔ میں وہاں سے چلنے لگا تو بیٹھ کے باپ نے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی لیکن میں نہیں رکا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بنگلی سڑک کی جانب چلنے لگا۔

چھ دن بعد ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھتے ہوئے مجھے ہال کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس دن کے مقابلے میں خاصا پرسکون لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے غصے پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ شریف کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جس نے اس کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بیٹھ کے سیل فون کے بل سے تمام تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں اور پولیس والوں نے وہ تمام پیغامات پڑھ لیے جو بیٹھ نے ہال کو بھیجے تھے۔ ان کے ذریعے بیٹھ اور ہال کے تعلق کی تمام تفصیل معلوم ہو گئی تھی۔ بیٹھ جاننا چاہتی تھی کہ ہال اس سے کب شادی کرے گا اور ان کے ہونے والے بچے کا کیا نام رکھا جائے گا۔

میں باقاعدگی سے خبریں دیکھ رہا تھا۔ اس دوران ہال کا چہرہ کئی بار ٹی وی پر نظر آیا۔ وہ تھوڑا سا پریشان دکھائی دے رہا تھا جس سے اس کے چہرے کی وحشت میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ بہت مضبوط تھا۔ اس نے اپنے اوپر لگائے جانے والے ہر الزام کو مسترد کر دیا اور کہا کہ وہ بیٹھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آخری بار صبح کے وقت اس کے پاس آئی تھی اور دو گھنٹے بعد چلی گئی تھی۔ اس بات کو ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ ہال نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے بیٹھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

پولیس نے اس پر جو الزامات عائد کیے، ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ان دونوں کے درمیان استاد اور شاگرد کے رشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور بیٹھ کو شکایت تھی کہ ہال اس کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کر رہا ہے۔ وہ یہی شکایت لے کر اس کے پاس گئی تھی اور ہال کے کہنے کے مطابق دو گھنٹے بعد وہاں سے چلی گئی تھی بیٹھ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور اپنے ہر عمل و فعل کے لیے خود مختار تھی۔ اگر ہال نے اس کے ساتھ تعلقات قائم کیے تو یہ بھی کوئی جرم نہیں تھا۔ اگر اس نے بیٹھ سے شادی نہیں کی تو یہ بھی کوئی جرم نہیں تھا اور اگر اس نے بیٹھ کے ہونے والے بچے کو اپنا نام دینے سے انکار کیا تب بھی اس پر کوئی فرد جرم عائد نہیں کی جاسکتی تھی۔ پولیس یہ ثابت کرنے

میں ناکام رہی تھی کہ بیٹھ کی پراسرار گمشدگی میں ہال کا کوئی کردار تھا۔ اس لیے اسے زیادہ عرصہ قید میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ہال نے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور وہ اپنے مضبوط دلائل کے ساتھ میدان میں موجود تھے۔ پولیس کو شبہ تھا کہ ہال منشیات کے دھندے میں بھی ملوث ہے اور وہ اس کے گھر کی تلاشی لیتا چاہ رہی تھی لیکن ہال کے وکیل بڑے چوکنا تھے۔ انہوں نے پولیس کی ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا، ہال پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تھا لہذا اسے رہا کر دیا گیا۔ البتہ اس کے لیے اس کالج میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس الزام کے بعد وہ کسی کو اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ گو پولیس اسے مجرم ثابت نہ کر سکی لیکن سب لوگوں کو یقین تھا کہ بیٹھ کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔ ہال کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کسی دوسری یونیورسٹی یا کالج میں ملازمت اختیار کر سکتا تھا۔ البتہ یہ کوئی نہ جان سکا کہ بیٹھ کہاں چلی گئی۔

اب میں اس حیثیت میں ہوں کہ ایک بہتر اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کر سکوں لیکن میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں نہیں رہ کر انتظار کرنا چاہتا ہوں۔ اسی کمرے کے تاریک گوشے میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر مسز فریڈی کے تاریک کمن میں جھانکتا رہتا ہوں۔ اس کے کمن کا کام جاری ہے۔ باڑ تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور زمین کو بھی ہموار کیا جا چکا ہے۔

ہال کا کیریئر اب بھی آگے بڑھ رہا ہے لیکن پہلے والی بات نہیں رہی۔ میں نے اس کے قلعے میں کئی جگہ شکاف ڈال دیے ہیں۔ ایجنٹ مجھ سے جلد از جلد ایک نئی کتاب کا تقاضا کر رہا ہے۔ میں پسینے میں شرابور ٹائپ رائٹر پر جھکا اپنی تخلیق کی دیوی کو آواز دے رہا ہوں جو مجھے لکھنے کی تحریک دیتی ہے۔ وہ کبھی چھپتی ہے، کبھی شرماتی ہے اور کبھی غیر متوقع طور پر آکر مجھے حیران کر دیتی ہے۔

پنڈورا تاریکی میں میرے ساتھ انتظار کرتی ہے۔ میں ایک تباہ حال شخص ہوں اور جانتا ہوں کہ میری عظیم تخلیقات عورت کی محبت کے بغیر ہیں۔ میں کبھی اسے نہیں بھلا سکتا اور نہ ہی اسے چھوڑ سکتا ہوں، جانتا ہوں وہ ہمیشہ میرے خیالوں میں آتی رہے گی۔ مجھ سے نفرت کرتی رہے گی۔ میری تباہ سردراتوں کو اپنے تصوراتی وجود سے حرارت بخشنے گی۔ وہ مجھے بہت یاد آتی ہے۔

میں اپنی کہانیوں میں محبت کی سچائی، اس کے درد، تنہائی اور اس کے ساتھ آنے والے خالی پن کے بارے میں لکھتا ہوں اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔





# Downloaded From Paksociety.com

قسط: 12

## نیش محل

اسماء توری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رپ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے متدمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس و لچپ داستان

اگست 2016ء

70

سپنس ڈائجسٹ







## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جو لیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلانی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کو لیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شاہجی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جو لیٹ کی طرف چھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کا نگرانی سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جو لیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جو لیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جو لیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شاہجی کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جو لیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جو زین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جو زف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جو لیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جو لیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جو لیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جو لیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان چلے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جو زف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جو لیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جو زین نے اس کے لیے ایک صندوق میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جو لیٹ صندوق کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جو زین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جو زین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنرس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جو زین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھائیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھائیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھائیہ کی بیٹی بھلا سے ہوتی ہے جو بیوہ ہے۔ بھلا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، وہ شوٹنگ کی غرض سے شملہ جاتی ہے اور فاروق سے ملنے بھائیہ کی رہائش گاہ پہنچتی ہے۔ تاہم بھلا اسے فاروق سے ملنے نہیں دیتی اور دل میں رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے مگر فاروق چاند بانو سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ادھر ربن دادا جو لیٹ کی بربادی کے ذمے دار شخص کی کھوج میں رہتا ہے۔ تاہم جو لیٹ اسے کچھ نہیں بتاتی۔ ربن دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ ثریا بانو کے پیچھے مجودا دانامی غنڈا لگا ہوتا ہے جسے ربن دادا پہلے ہی سبق سکھا چکا ہوتا ہے۔ مجودا دانامی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کے ذریعے ربن کے ایک آدمی کو قتل کر دیتا ہے تاہم ربن کے آدمی ایک مکان پر دھاوا بول کر وہاں تہلکہ مچا دیتے ہیں اور انہیں اب مجو کی تلاش ہوتی ہے۔ ربن جو لیٹ سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جو لیٹ کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ فاروق بھائیہ کی رہائش گاہ سے چھپل قدمی کے لیے جنگل کی طرف نکلتا ہے اور اسے وہاں بھلا ایک غنڈا صورت شخص کے ساتھ نظر آتی ہے جو اس سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کو تشدد کا نشانہ بنانے کے ذمے دار ولیم کو اغوا لیتا ہے اور اب ولیم اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بن رہا ہوتا ہے۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”کون ہے تم اور ہم سے تمہارا کیا دشمنی ہے؟“  
”تم گورے تو سنا ہے نسلوں کا حساب کتاب رکھ کر چلتے ہو اور برسوں پہلے قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کر لیتے ہو پھر  
لئے لکھے آدمی نے لرزیدہ لہجے میں ربن سے پوچھا۔

اگست 2016ء



سسپنس ڈائجسٹ





ہوا تب بھی اس کے لہجے میں سانپ پھنکار رہے تھے۔  
 ”لک دادا..... تمہارا بوائے ہمارے ساتھ مس بی ہو  
 کیا تھا اس لیے ہم نے اسے اریٹ کروایا تھا۔ تم اپنے لائر  
 کے ساتھ جا کر اسے پولیس کسٹڈی سے نکال لیا تھا تو وہ بات  
 ادھر ہی فنش ہو گیا تھا۔ اب تم کیوں اس بات کو اور چھیڑتا  
 ہے۔“ ولیم کی سٹی کم تھی۔ الٹا لٹکے ہوئے اسے بولنے میں بھی  
 مشکل پیش آرہی تھی لیکن رہن کے تیور دیکھ کر وہ اپنے دفاع  
 میں بولنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

”بات ایسے ختم نہیں ہوتی سفید چوہے۔ بات اس  
 وقت ختم ہوگی جب اپن تیرے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا  
 جو اس روز تھانے میں اپنے بچے کے ساتھ ہوا تھا۔“ رہن  
 نے خونخوار لہجے میں اسے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے اس  
 کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ تہ خانے کی محدود فضا میں ولیم کی  
 چیخیں گونجنے لگیں۔ ان چیخوں کے باہر نکلنے کے لیے وہاں  
 کوئی روزن موجود نہیں تھا اس لیے ولیم کے لیے کوئی مدد  
 آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

”آج رات گیارہ بجے حویلی کے پائیں باغ میں ہم  
 سے ملاقات کریں۔“ انگریزی زبان میں بے حد باریک  
 لکھائی میں لکھے اس جملے کے آخر میں نواب زادہ اسد اللہ کا  
 نام تحریر تھا۔ یہ جملہ عالیہ کی نوٹ بک پر تحریر تھا۔ عالیہ نے  
 نوٹ بک گزشتہ روز دیے گئے ہوم ورک کو چیک کروانے  
 کے لیے اس کے حوالے کی تھی۔ عالیہ کے بنائے جملوں کو  
 چیک کرتی ہوئی جو زفین نے سب سے آخر میں درج یہ جملہ  
 پڑھا تو بری طرح چونک گئی اور چور نظروں سے عالیہ کی  
 طرف دیکھا۔ عالیہ ابھی انگریزی سیکھنے کے بالکل ابتدائی  
 مراحل میں تھی اور پہلے چھوٹے اور سادہ جملے لکھتا اور بولنا  
 سیکھ رہی تھی اس لیے اس بات کا تو امکان نہیں تھا کہ وہ اسد  
 اللہ کے تحریر کیے گئے اس جملے کو سمجھ سکی ہو۔ جملے لکھا بھی کچھ  
 اس انداز میں تھا کہ کسی نوآموز کے لیے اسے پڑھنا دشوار  
 ثابت ہوتا پھر بھی اسے عالیہ سے عجیب سی جھجک محسوس ہو  
 رہی تھی۔ وہ تو یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتی تھی کہ اسد اللہ نے یہ  
 جملہ اس کی نوٹ بک پر لکھا کیونکر ہوگا۔

”آج صبح جب ہم آپ کے دیے ان جملوں کو بنانے  
 کی مشق کر رہے تھے، اسد بھائی جان ہمارے کمرے میں  
 تشریف لے آئے۔ انہوں نے ہم سے ہماری نوٹ بک  
 لے کر دیکھی اور بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے آپ کی ٹیچر تو  
 آپ کو بہت عمدہ پڑھا رہی ہیں اور کچھ دنوں میں ہی آپ

تیرے کو اتنی جلدی کیسے بھول گیا کہ تو نے کس سے دشمنی پالی  
 تھی۔ ایسے چھت سے الٹا لٹکنے کے بعد تو تیرے کو خود ہی یاد  
 آ جانا چاہیے تھا۔ تو کیا سمجھ رہا تھا کہ تو اپنے شہزادے کو تھانے  
 میں الٹا لٹکوا کر اس کا حلیہ بگاڑ دے گا اور اپن تیرے کو چھوڑ  
 دے گا۔ تجھے اس کو لگے ایک ایک زخم کا بیاج کے ساتھ  
 حساب دینا ہوگا سفید چڑی والے سور۔ سرکاری دفتروں  
 میں تیری افسری کا زور چلتا ہوگا لیکن ادھر کا افسر اپن ہے۔  
 اپن رہن دادا.....“

”رہن دادا..... اوہ آئی سی۔“ الٹا لٹکا آدمی جو دراصل  
 انگریز افسر ولیم تھا، اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ یقیناً اسے یاد آ گیا تھا  
 کہ اس نے فاروق کو کس طرح کے سلوک کا نشانہ بنایا تھا۔  
 فاروق کا جرم صرف اتنا تھا کہ زمر دبائی کے کوٹھے پر وہ عین  
 اس وقت چاند بانو کے ساتھ موجود تھا جب انگریز افسر ولیم،  
 مجود دادا کے ساتھ چاند بانو کا مجرا دیکھنے کی خواہش لیے وہاں  
 پہنچا تھا۔ چاند بانو نے اس روز بخشتگی ہی زمر دبائی کو آگاہ کر دیا  
 تھا کہ وہ فاروق کی موجودگی میں محفل آرائی نہیں کرے گی  
 لیکن مجود دادا اور ولیم کے لیے اس کا انکار قابل قبول نہیں ہوا  
 اور انہوں نے کوٹھے پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ پھر جب انہوں  
 نے چاند بانو کے انکار کی وجہ کے طور پر فاروق کو دیکھا تو مجو  
 دادا خصوصاً آپے سے باہر ہو گیا۔ اس وقت اگر فاروق ولیم کو  
 یرغمال بنا کر زمر دبائی کے کوٹھے سے نہ نکل جاتا تو مجود دادا اور  
 اس کے ساتھی مل کر اس کی ٹکا بونی کر دیتے۔ بخشتا بہر حال  
 ولیم نے بھی نہیں تھا اور اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھا کر فاروق  
 کو تھانے میں الٹا لٹکوا کر تشدد کا نشانہ بنوایا تھا۔ سر کی وہ تازک  
 چوٹ جس کا علاج اب بھی جاری تھا اسی تھا نہ یا تراکی نشانی  
 تھی۔ اس واقعے کے فوراً بعد اگر ولیم اپنے خاندان کے ساتھ  
 انگلستان نہ چلا گیا ہوتا تو رہن فوراً حساب بے باق کر دیتا  
 لیکن بھولا وہ بہر حال نہیں تھا اور اس کے آدمی مسلسل ٹوہ میں  
 لگے رہے تھے کہ ولیم کب ہندوستان واپس آتا ہے۔ واپسی  
 کے بعد اس کی نگرانی شروع کروادی گئی تھی اور آج صبح جب  
 ولیم صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکلا تو رہن کے آدمیوں نے  
 اسے اغوا کر لیا۔ بے ہوشی کی حالت میں پوری میں بند ولیم  
 کب اس تاریک تہ خانے میں لایا گیا، کسی کو کانوں کان خبر  
 نہیں ہو سکی اور اب وہ چھت سے الٹا لٹکا رہن کے رحم و کرم پر  
 تھا اور رہن کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس پر قطعی رحم نہیں  
 کرنے والا۔

”یاد آگئی نا تیرے کو اپنے سے دشمنی۔ اب بول تو  
 تیار ہے اپنے کو حساب دینے کے لیے۔“ وہ ولیم سے مخاطب



نے کافی سیکھ لیا ہے۔ لائیے ہم آپ کی منچر کی اس کارکردگی پر ان کی تعریف تحریر کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اسد بھائی جان نے کیا لکھا ہے؟“ عالیہ کے پُراشتیاق لہجے میں ادا کیے الفاظ نے اسے اس کے سوال کا جواب دے دیا اور وہ خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”اصل کمال آپ کی محنت اور شوق کا ہے نواب زادی صاحبہ..... آپ کے بھائی جان نے مجھے کریڈٹ دے دیا، بہر حال آپ میری طرف سے انہیں ٹھینکس کہہ دیجیے گا۔“ بولتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں نواب زادہ اسد اللہ کے تحریر کردہ جملے پر قلم سے آدھی ترچھی لکیریں منبھینتی جارہی تھی۔ حویلی میں انگریزی زبان سے گنتی کے چند لوگ ہی آشنا تھے اور ان کی عالیہ کی نوٹ بک تک رسائی کا بظاہر کوئی امکان بھی نہیں تھا لیکن اتفاقی حادثات کا امکان تو اپنی جگہ رہتا ہے، اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ احتیاطاً اس تحریر کو تلف کر دیا جائے۔ عالیہ نے اس کی اس حرکت کو نوٹ بھی کیا تو زبان سے کچھ نہیں بولی اور اس مکالمے کے بعد معمول کے مطابق پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جوزفین نے اپنی الجھن کا اظہار عالیہ کے سامنے نہیں ہونے دیا البتہ خود اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد بھی الجھنی رہی۔ اظہار و محبت کے بعد سے اسد اللہ نے لائبریری میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق لائبریری جاتی تو کان اسد اللہ کے قدموں کی آہٹ پر ہی مرکوز رہتے لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا اور آج یہ پیغام مل گیا تھا۔

اصلاً اسے اس پیغام کو بڑھ کر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ الجھ گئی تھی۔ اسے اسد اللہ کی طرف سے چوری چھپے کی ملاقاتوں کا مطالبہ کرنے کی امید نہیں تھی اور ان کی طرف سے ایسا تقاضا ہوا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی سبب تھا۔ وہ ان کی اس خواہش کو رد نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اس نے زندگی میں پہلی بار سکھ اور آسودگی کے دن دیکھے تھے اور اسے اندازہ تھا کہ یہاں کے نازک مزاج کمین ذرا سی غلطی پر اسے حویلی بدر بھی کر سکتے ہیں لیکن ہر ڈر اور مصلحت پر محبت کی بے اختیاری ہمیشہ حاوی رہی ہے۔ جوزفین کے ساتھ بھی یہی ہوا اور وہ اسد اللہ کے دیے ہوئے وقت پر اس سے ملاقات کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات کے اس پہر حویلی میں سناٹے کا راج تھا۔ حویلی کے کمین اپنے آرام دہ بستروں پر پُر سکون نیند سوئے ہوئے تھے۔ صرف وہ تھی جو اسد اللہ کی پکار پر بے قرار ہو کر دبے

قدموں پاہر کی طرف جارہی تھی۔ نیم تاریک راہداریوں سے گزرتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہر قدم پر یوں لگتا تھا کہ ابھی کسی سے سامنا ہو جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ بہ خیریت پائیں باغ میں پہنچ گئی۔ یہاں روشنی اور بھی کم تھی اور دین میں خوش نما منظر پیش کرنے والے باغ کے درخت اور پتے ہیبت ناک سایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں کسی نے اس کے شانے پر پیچھے سے ہاتھ رکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

”یہ ہم ہیں جوزفین۔ ڈریے نہیں۔“ اسد اللہ کی سرگوشی بالکل بروقت تھی پھر بھی اسے خود کو سنبھالنے میں چند لمحے لگے۔ بے حد رفتار سے بھاگتے دل اور اٹھل پٹھل سانسوں کے قابو میں آنے کے بعد ہی وہ اپنے قریب کھڑے اسد اللہ کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو سکی۔ روشنی کم ہونے کے باوجود اس کا چاند کی طرح چمکتا چہرہ نمایاں تھا۔

”ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کو یہاں اس وقت آنے کی زحمت دی۔“ اس کا ہاتھ تھام کر ایک گوشے میں موجود کنگی بیچ تک لے جاتے ہوئے اسد اللہ نے معذرت کا اظہار کیا۔

”اور میں حیران ہوں کہ آپ کو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ جوزفین نے فوراً ہی اپنی الجھن کو سوال کی صورت پیش کر دیا۔

”ہم نے کوشش کی تھی کہ خود کو قابو میں رکھ سکیں اور آپ کو کسی الجھن میں نہ ڈالیں لیکن دل کی بے تابی نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم یہ جسارت کر گزریں۔ ہمارے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ مزید آپ سے ملاقات کیے بغیر رہ سکیں۔“ نواب زادہ کی ٹھنڈی سانس بھر کر کہی گئی اس بات نے اسے چونکا دیا۔

”میں کچھ سمجھی نہیں نواب زادہ صاحب۔ کیا کوئی پرابلم ہے؟ آپ کچھ دن سے لائبریری نہیں آرہے تھے تو میں سمجھی کہ کہیں بڑی ہوں گے۔ میں نے بیچ اور ڈنر کی ٹائمنگ میں بھی آپ کو زنان خانے کی طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“ اس نے پریشانی سے استفسار کیا۔ اسد اللہ سے ملاقات نہ ہونے پر بے چینی تو اسے بھی تھی لیکن اس نے خود کو یہ سوچ کر تسلی دے لی تھی کہ اسد اللہ اتنی بڑی جاگیر کی دیکھ بھال میں باپ اور بڑے بھائی کا ہاتھ بٹاتے ہیں، یقیناً اسی سلسلے میں کوئی مصروفیت ہوگی لیکن یہاں تو کچھ اور آثار نظر آرہے تھے۔ اسد اللہ کے جواب نے اس کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ اسد اللہ نے اپنی والدہ نواب بیگم سے ہونے والی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے اسے بتایا کہ ان کے



رکھوا دیا ہے۔ آئی ہوپ کہ آپ کا سفر اچھا گزرے گا اور آپ کسی شے کی کمی محسوس نہیں کریں گے۔“ فاروق، کیتھرائن اور گولو کے ساتھ ناشتے میں مصروف تھا جب بملانے آکر اسے اطلاع دی۔ دھاری دار چست جرسی اور کھلے پانچوں والی پینٹ میں بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے آج پھر وہ بہت کم عمر اور نوجوان لڑکی کا تاثر دے رہی تھی۔ یہ اس کا کمال تھا کہ جب چاہتی تو عمر کالج گرل کے روپ میں ڈھل جاتی اور جب چاہتی حلیے کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ بھرپور پرجوش عورت نظر آنے لگتی اور ان دونوں ہی روپ میں وہ اچھی لگتی تھی، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔

”شکریہ..... لیکن آپ نے بے کار ہی اتنا تکلف کر دیا۔ کھانے وغیرہ کے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ ہم چند ہی گڑھ پہنچ کر آرام سے ہوٹل میں بھی کھا سکتے تھے۔“ فاروق نے اسے جواب دیا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی اجنبیت کی رقم تھی جسے بملانے فوراً محسوس کر لیا اور آہستہ سے بولی۔

”لگتا ہے آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔ سفر پر جاتے ہوئے من میں ناراضی لے کر جانا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کہیں تو میں ایک بار پھر اس بات کے لیے آپ سے سوری کر لیتی ہوں جس کا آپ نے بُرا مانا ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بھلا آپ سے ناراض ہو کر کیا کروں گا۔ ہم یہاں اتفاقاً ملے ہیں اور دوبارہ یہ اتفاق ہو، ضروری نہیں۔ سمجھتی واپس جا کر میں اپنی دنیا میں نکلن ہو جاؤں گا اور آپ اپنی مصروفیات میں گم ہو جائیں گی پھر بھلا ایسی باتوں کا کیا فائدہ۔“ فاروق اخلاقیات کے تقاضے ضرور نبھا رہا تھا لیکن لہجے کی اجنبیت بدستور برقرار تھی۔

”مجھے پورا دشواں ہے کہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے اور یہی ایک دوسرے کو بھولنے کی بات تو، میں تو آپ کو ہرگز نہیں بھولوں گی چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جاؤں۔“ بملانے کے لہجے میں کچھ خاص جذبات بول رہے تھے لیکن فاروق نے توجہ نہ دینا ہی مناسب سمجھا اور خاموشی اختیار کر لی۔ اسے اب بملانے کی پراسرار شخصیت سے الجھن ہونے لگی تھی۔ ایک طرف وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب عورت تھی تو دوسری طرف مغرور اور ضدی بھی۔ فاروق اس انکشاف کو بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس نے اپنے اس شوہر کو جس سے اس نے اپنے باپ کی مخالفت مول لے کر شادی کی تھی، کرائے کے قافلے کے ذریعے قتل کروا دیا تھا۔ وہ ایسی انتہا پسند عورت سے دور رہنا ہی مناسب سمجھتا تھا اس لیے

معمولی میل جول کو بھی حویلی کے کچھ مکین مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کی والدہ کو خدشہ ہے کہ اگر بات بڑے نواب صاحب تک پہنچی تو انجام ان کی عسرت جہاں سے شادی بھی ہو سکتا ہے اور وہ اس عبرت ناک انجام سے بچنے کے لیے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فی الحال انہیں احتیاط سے کام لینا ہوگا اور کھلے بندو ملقات سے مکمل گریز کرنا ہوگا۔

”اور یہ خفیہ ملاقات..... اگر کسی کو اس کا علم ہو گیا تو شک یقین میں بھی بدل سکتا ہے۔“ جوزفین نے سب کچھ سننے کے بعد لرزیدہ لہجے میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ اسے احساس تھا کہ اس سارے معاملے میں سب سے کمزور فریق وہی ہے اس لیے سب سے پہلے بجلی اسی پر گرے گی۔ ملازمت سے برطرفی تو شاید معمولی سزا ہوتی۔ اس کے ساتھ جانے کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ اونچی دیواروں کے پیچھے ہونے والے پھیانک جرائم کی کچھ کہانیاں تو اس کے کانوں نے بھی سن رکھی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ طبقاتی فرق نے ہمیشہ محبت کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں اور یہاں تو مذہب بھی جدا جدا تھے۔

”ہمارے خیال میں اگر ہم دونوں احتیاط سے کام لیں تو ایسا نہیں ہوگا۔ سب سے زیادہ احتیاط تو یہی کرنی ہوگی کہ کسی کو اپنا راز دار نہ بنایا جائے۔ حویلی کی کس ملازمت کی حقیقی وفاداری کس کے ساتھ ہے، اس بارے میں ہم بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپس میں رابطے کے لیے کسی تیسرے فرد کا سہارا نہ لیا جائے اور جیسے آج ہم نے ایک سبیل نکالی ہے، اسی طرح آئندہ بھی ایسی ہی کوئی ترکیب استعمال کی جائے کیونکہ یہ طے ہے کہ ملاقات کے بغیر نواب کی طور نہیں رہا جاسکتا۔“ نواب زادہ اسد اللہ کا لہجہ خمار آلود ہونے لگا اور وہ دھیمی آواز میں اسے اپنے دل کی بے تابی سے آگاہ کرنے لگا۔ یہ الفاظ اور یہ انداز اس نے بھی لائبریری میں ہونے والی ملاقاتوں میں اختیار نہیں کیا تھا۔ شاید یہ خطرہ رہتا ہوگا کہ آتی جاتی کسی ملازمت یا حویلی کے کسی مکین کو سن گن نہ مل جائے۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ لائبریری میں کتابوں کی موجودگی میں ہونے والی ملاقات اور رات کی تنہائی میں ہونے والی اس ملاقات میں فرق بھی بہت تھا۔ خود جوزفین پرفسوں ساٹاری ہونے لگا اور وہ سارے اندیشوں اور خطرات کو پس پشت ڈال کر اسد اللہ کی پیار بھری سرگوشیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

”ڈرائیور اور گاڑی دونوں ریڈی ہیں۔ کرشن نے کھانے کا ٹفن، واٹر کولر اور چائے کا تھر ماس بھی گاڑی میں



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

**All Done**

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow



اپنے رویے میں خاصی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔

”میرے خیال میں اب ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ڈاکٹر کے دیئے ہوئے ٹائم سے لیٹ ہو جائیں۔ کیوں کہتے تھے..... اب چلنا چاہیے نا؟“ بھلا کو نظر انداز کر کے وہ کیتھرائن سے مخاطب ہوا۔ وہ اپنا ناشتا تقریباً ختم کر چکی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ خود کو ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مکمل لائق ظاہر کرے اس لیے فاروق کے اچانک مخاطب کرنے پر تھوڑی سی شپٹا گئی لیکن پھر خود کو سنبھال کر بولی۔

”ناشتے کے بعد میں ایک بار پھر آپ کا چیک اپ کر لوں تو پھر چلتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ناشتا کر چکا ہوں۔ تم فارغ ہو جاؤ تو میرے کمرے میں آ جانا۔“ فاروق کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا اور بھلا کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ کیتھرائن بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ فاروق کا چیک اپ کرنے کے بعد اسے مکمل فٹ قرار دیتے ہوئے اس نے سفر کے آغاز کا سگنل دے دیا تو وہ لوگ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پیچھے بھلا پر کیا گزری، فاروق نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی عورت جو اس سے وابستہ افراد کی عزت نہیں کرتی تھی اس رویے پر کیسا محسوس کرتی ہے، اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ خود کو ریلیکس رکھنے کے لیے وہ سیٹ کی پشت گاہ سے سرٹکا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ شملہ سے چند ہی گڑھ جانے والے گھن چکر راستے پر خود کو چکرانے سے بچائے رکھنے کے لیے یہ ایک اچھی ترکیب تھی۔ گولو اور کیتھرائن کو بھی اس نے ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ گولو کو تو وہ یہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ آتے ہوئے بھی اس کی بہت بری حالت ہو گئی تھی لیکن گولو نہیں مانا۔ وہ تکلیف اٹھا سکتا تھا لیکن فاروق سے الگ رہنا اسے منظور نہیں تھا۔ مجبوراً فاروق اسے بھی ساتھ لے جا رہا تھا۔ راستے بھر کیتھرائن اور گولو آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ فاروق آنکھیں موندے ان کی ساری باتیں سن رہا تھا لیکن اس نے خود اس گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ایک طرف وہ اپنے آج کے چیک اپ اور بمبئی واپسی کے حوالے سے متشکر تھا تو دوسری طرف اسے کمو کے قتل اور اڈے کی صورت حال کے حوالے سے بھی تشویش تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہاں بہت کچھ ہوا ہوگا اور اس تک بس مختصر خبریں ہی پہنچی ہیں۔ اسے جولیٹ کو دیکھنے اور اس کا احوال جاننے کی بھی بے چینی تھی اور وہ بھلا کی پراسرار شخصیت کے تانے بانے میں بھی الجھا

ہوا تھا۔ اس کا دماغ چک پھیریاں کھاتے ہوئے کبھی ایک موضوع پر سوچتا تو کبھی دوسرے موضوع پر..... پورے راستے میں وہ دو چار بار ہی کیتھرائن اور گولو سے مخاطب ہوا۔ ایک آدھ بار گولو کو راستے کی خوفناکی سے تسلی دینے کے لیے اور یا پھر کیتھرائن کے خود کو چائے وغیرہ پیش کرنے پر۔ ”فاروق بھائی، آپ نے تو اپن کو بور کر دیا۔ کچھ بولتے ہی نہیں۔“ آخر کار گولو نے شکوہ کر ہی دیا۔

”بور ہونے کی کیا بات ہے۔ میری جگہ کیتھرائن ہے تو تم سے باتیں کرنے کے لیے۔“ فاروق اس کے شکوے پر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا اور نرمی سے بولا۔

”سسر کی بات الگ ہے اور آپ کی الگ۔ آپ ایسے چپ بیٹھے ہو تو اپن کو لگ رہا ہے کہ اپنے سے ناراض ہو۔“ گولو نے اپنی فطری سادگی سے اپنی دلی کیفیت کو بیان کیا تو فاروق ہنس پڑا اور بولا۔

”گولو بادشاہ! تمس کی ہمت ہے کہ تم سے ناراض ہو سکے۔ تم اپنے بابا کے لاڈ لے ہو اور اس سے شکایت کر دی تو وہ میری نکلاں لے لے گا۔“ فاروق کا اشارہ رہن کی طرف تھا۔

”لاڈ لے تو آپ بھی ہو بابا کے اور بابا مجھ سے زیادہ آپ کی بات مانتے ہیں۔“

”نہیں، تمہاری بات کی زیادہ اہمیت ہے۔“ فاروق نے اس کی مخالفت کی۔

”نہیں، آپ زیادہ اہم ہو۔“ گولو نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور دونوں ایک دوسرے کو شد و مد سے یقین دلانے لگے کہ کس کی اہمیت زیادہ ہے۔ کیتھرائن بیٹھی غیر جانبداری سے مسکراتی رہی۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ ایسے میں سنائی دینے والی ایک زوردار آواز نے سب کو بری طرح چونکا دیا۔ ڈرائیور نے بھی ایرجنسی میں بریک لگائے۔

”کیا ہوا ہے؟“ فاروق نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔ ”ایکسیڈنٹ۔“ ڈرائیور نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ فاروق بھی فوراً حرکت میں آ گیا۔ وہ اور ڈرائیور تقریباً ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں ایک کارسٹوک سے اتر کر الٹ گئی تھی اور اندر موجود سوار یوں کی چیخیں اور آہیں سنائی دے رہی تھیں۔ ”ہمیں ان کی مدد کرنی ہوگی۔“ فاروق نے کہا اور الٹی ہوئی کار کی طرف بھاگا۔ ڈرائیور نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انہیں قریب پہنچ کر علم ہو گیا کہ گاڑی کی پچھلی نشستوں



نے کوئی غلطی کر دی تھی یا گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔“ کسی کو بھی بطور خاص مخاطب کیے بغیر فاروق نے اس صورت حال پر تبصرہ کیا تو گاڑی چلاتا ڈرائیور چونکا اور مپر تھکر لہجے میں بولا۔

”نہیں، یہ ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی غلطی سے نہیں ہوا۔ میں نے دیکھا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک بڑی گاڑی نے ان کی کار کو سائڈ ماری تھی اور کار کے لڑھک کر سڑک سے اتر جانے کے بعد تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس گاڑی والے نے جان بوجھ کر ان لوگوں کی کار کو ٹکرا ماری تھی؟“ ڈرائیور کی بات پر فاروق کے کان کھڑے ہوئے۔

”مجھے ایسا ہی لگتا ہے کیونکہ وہاں سڑک اچھی خاصی چوڑی تھی اور وہ گاڑی والا چاہتا تو آرام سے اپنی گاڑی نکال کر لے جاسکتا تھا۔ پھر سائڈ ٹکرنے کے بعد وہ ان کی ہیلپ کے لیے رکا بھی نہیں اور بھاگ گیا تو اس سے تو یہی لگتا ہے کہ اس نے جان کر سائڈ ماری تھی۔“ ڈرائیور نے اپنا تجزیہ پیش کیا تو فاروق بھی سوچ میں پڑ گیا اور بہت سے شکوک و شبہات اس کے دل میں جاگ اٹھے۔ اسے جنگل میں ہونے والی بملا اور کنیش کی ملاقات یاد آئی۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے سے اسے علم ہوا تھا کہ بملا نے کنیش کے ذریعے اپنے شوہر کو قتل کروایا تھا اور اب وہ کسی اور کی جان کے درپے تھی۔ کس کے؟ یہ فاروق کو پتا نہیں چل سکا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ بملا کا نیا شکار چاند بانو تھی۔ بملا چاند بانو کے حسن سے خوف زدہ تھی اور اسے اپنے اور فاروق کے درمیان رکاوٹ تصور کرتے ہوئے اس سے حسد میں بھی مبتلا تھی اس لیے بہت ممکن تھا کہ اس نے اپنی راہ کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی ہو۔

معاملہ جو بھی تھا فی الحال تو اسے زمر دبائی اور چاند بانو کو اسپتال پہنچانے کی جلدی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی مزید تیز چلانے کی ہدایت کی اور کیتھرائن سے انگریزی میں ان دونوں کا حال دریافت کیا۔ کیتھرائن نے پرتشویش لہجے میں اسے زمر دبائی کے بارے میں آگاہ کیا۔ چاند بانو بھی بہت اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے زخموں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی اور وہ نڈھال سی ہو کر بند آنکھوں کے ساتھ ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن ایسی حالت میں بھی نہیں تھی کہ کسی سے بات کر سکے۔ یہاں تک کہ اس نے فاروق کی موجودگی کا بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اپنے حواس گم کر چکی تھی

پر دو خواتین موجود ہیں اور آگے ڈرائیور ہے۔ چیخنے اور گراہنے کی آوازیں خواتین ہی کی تھیں جبکہ ڈرائیور کی طرف بالکل خاموشی تھی۔ انہوں نے کار کے دروازے کھولنے کی کوشش کی۔ آگے کے دونوں دروازے جام ہو چکے تھے۔ پچھلی طرف سے صرف ایک دروازہ کھل سکا۔ اس کھلے دروازے سے انہوں نے اندر موجود خواتین کو کھینچ کر باہر نکالا۔ خواتین کی شکلیں دیکھنے پر فاروق بری طرح چونک گیا۔ وہ زمر دبائی اور چاند بانو تھیں اور دونوں ہی اچھی خاصی زخمی دکھائی دے رہی تھیں۔ چاند بانو کے چہرے کا بایاں حصہ بری طرح متاثر ہوا تھا اور ٹوٹنے والے شیشے کی کرچیاں رخسار میں دھنس گئی تھیں جبکہ زمر دبائی کی کپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں کراہ رہی تھی۔ چاند بانو بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن سخت دہشت کا شکار تھی اور اچھی تک اس کے ہونٹوں سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

”ڈرائیور تو مر گیا ہے۔“ خواتین کو باہر نکالنے کے بعد اگلی نشست پر موجود ڈرائیور کی طرف بڑھنے والے فاروق کے ڈرائیور نے اطلاع دی تو فاروق چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور خود زخمی ڈرائیور کی نبض چیک کی۔ نبض خاموش تھی۔ دیگر علامات زندگی چیک کرنے پر بھی یہی نتیجہ نکلا کہ وہ بے چارہ زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ شاید ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں کوئی ایسی شدید اندرونی ضرب لگی تھی کہ وہ فوری طور پر مر گیا تھا۔

”مرنے والے کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن ان زخمی خواتین کو ہمیں فوراً اسپتال پہنچانا ہوگا۔“ فاروق نے فوری طور پر فیصلہ سنایا تو ڈرائیور نے بھی اس کی تائید کی۔ اس دوران میں گولو اور کیتھرائن بھی گاڑی سے نکل کر ان تک پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں کی مدد سے زمر دبائی اور چاند بانو کو انہوں نے اپنی گاڑی میں منتقل کیا۔ کیتھرائن کے پاس اس کی میڈیکل کٹ تھی۔ وہ چلتی گاڑی میں ہی ان دونوں کو طبی امداد دینے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ زمر دبائی کی حالت زیادہ نازک ہے جبکہ چاند بانو بظاہر زیادہ زخمی نظر آنے کے باوجود اتنی خراب حالت میں نہیں تھی۔ کم از کم اس کی جان کو فوری خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ قدرے پرسکون بھی ہو گئی تھی اور چیخیں مارنے کے بجائے ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ زمر دبائی نے البتہ کراہنا بھی بند کر دیا تھا۔

”اس جگہ پر سڑک اتنی خطرناک تو نہیں ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان لوگوں کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ لگتا ہے ڈرائیور



اور صدمے کی کیفیت میں تھی۔ اللہ اللہ کر کے راستہ ختم ہوا اور وہ لوگ اسپتال پہنچے۔ دونوں زخمی خواتین کو فوری طور پر اسپتال کے عملے نے طبی امداد دینی شروع کر دی۔ وہ لوگ وینٹک روم میں ہی موجود رہے۔

”آپ کے چیک اپ کا وقت ہو گیا ہے فاروق بھائی۔“ کچھ دیر بعد کیتھرائن نے فاروق کو اطلاع دی۔ ”رہنے دو کیتھرائن! چیک اپ پھر کبھی ہو سکتا ہے۔ ابھی میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔“ فاروق نے اسے جواب دیا۔ اس وقت اسے خود سے زیادہ زمر دبا کی اور چاند بانو کی فکر تھی اور اس فکر میں وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ آج ہونے والے چیک اپ پر ہی اس کی بمبئی واپسی کا انحصار ہے۔ ڈرائیور کو اس نے اسپتال پہنچتے ہی پولیس اسٹیشن روانہ کر دیا تھا۔ وہ وہاں سڑک کے قریب مر جانے والے ڈرائیور کی لاش کار میں چھوڑ کر آئے تھے۔ پولیس کو اس بارے میں اطلاع دینی ضروری تھی۔ اس کام کے بعد ڈرائیور ان کا سامان ہوٹل میں پہنچا تا جہاں انہوں نے پہلے ہی کمروں کی بکنگ کروائی ہوئی تھی۔

”تم اور گولو چاہو تو ہوٹل چلے جاؤ۔ وہاں تم لوگ آرام بھی کر سکتے ہو۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے کیتھرائن سے کہا۔

”ابن ادھر ہی ٹھیک ہے۔ آپ کے ساتھ ہی ہوٹل چلے گا۔“ کیتھرائن سے پہلے گولو نے جھٹ جواب دیا جس پر فاروق ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔ یہ اتنی بہت ساری محبتیں کبھی کبھی اسے بوجھل کر دیا کرتی تھیں اور وہ اپنے آپ کو جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس وقت چاند بانو کی بے لوث محبت نے اسے باندھ دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ چاند بانو پر جو مشکل آئی ہے، اس کا سبب وہ خود بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے میں بھلا وہ اسپتال سے کیسے ہٹ سکتا تھا؟ کافی دیر کے انتظار کے بعد ایک نرس وہاں آئی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا درج تھا کہ وہ سب چونک اٹھے۔

”کیا بات ہے سسر! ہمارے مریضوں کی حالت کیسی ہے؟“ سب سے پہلے فاروق نے سوال کیا۔

”آئی ایم سوری سر۔ میرے پاس آپ کے لیے کوئی گڈ نیوز نہیں ہے۔“ نرس نے کہا اور پھر دھیمی آواز میں بتانے لگی۔ ”مس چاند بانو کے چہرے پر آنے والا زخم نازک ہے۔ شیشے کے بے شمار ٹکڑے جلد کے اندر تک دھنس گئے ہیں اور انہیں نکالنے کے لیے ابھی تک ڈاکٹر ز آپریشن تھیمز میں بڑی ہیں لیکن ڈاکٹر ز کا خیال ہے کہ ان کی جان کو

کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ نرس اتنا کہہ کر ذرا سار کی ”اور زمر دبا کی.....؟“ فاروق نے اس کی جھجک کو محسوس کر کے بے تابی سے پوچھا۔

”آئی ایم سوری۔ وہ ایکسپائر ہو چکی ہیں، ان کے سر پر لگنے والی چوٹ جان لیوا ثابت ہوئی۔ انٹرئل بلیڈنگ بہت زیادہ ہو گئی تھی اور برین کو بھی نقصان پہنچا تھا اس لیے ڈاکٹر ز اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں نہیں بچا سکے۔“ نرس نے اس بار پروفیشنل لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے اسے اطلاع دی اور مزید بولی۔

”آپ ایڈمن آفیسر سے مل کر ڈیڈ باڈی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سسر!“ فاروق نے آہستہ سے جواب دیا اور سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمر دبا کی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن انسانیت کے رشتے سے اسے اس بھرپور غورت کے مرنے کا دکھ تھا۔ اس دکھ میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی موت کی وجہ خود اس کی اپنی ذات بھی ہے۔ اگر اس حادثے کے پیچھے بھلا کا ہاتھ تھا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ بھلا نے حسد اور جلن کے باعث چاند بانو کو ٹھکانے لگوانے کی کوشش کی تھی اور زمر دبا کی بھی آگئی تھی۔

”بی بیو فاروق بھائی۔ زیادہ ٹینشن لینے سے آپ کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔“ وہ سر تھامے یہ سب سوچ رہا تھا کہ کیتھرائن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا۔ اس کی خواہش پر اب وہ اسے مستحق فاروق بھائی کہہ کر ہی بکارتی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ میرے لیے پریشان مت ہو اور یہاں بیٹھو۔ میں ڈرائیمن آفیسر سے مل کر آتا ہوں۔“ فاروق نے خود کو سنبھالا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ ایڈمن آفیسر سے ملاقات سے فارغ ہو کر دوبارہ ان کے درمیان موجود تھا۔

”کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“ کیتھرائن نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر پوچھا۔ ”وہ زمر دبا کی کی ڈیڈ باڈی میرے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ میرا بائی جی سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں بتا۔“ اس نے بتایا پھر بولا۔ ”میں بمبئی میں دادا سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہی بالا خانے والوں کو یہاں بھجوا سکتا ہے۔ چاند بانو ہوش میں ہوتی تو ہمیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکنا نہیں اور اس کے بعد کا خاصا وقت ان ہی معاملات کو



بہانے کے لیے نہ تو وہ نواب زادہ موجود تھا جو کبھی زمر و بانی پر مر مٹا تھا اور اپنا سب کچھ اس پر لٹا دینے کو تیار تھا اور نہ ہی چاند بانو ہی ہوش میں تھی کہ اپنی اس ماں کو رخصت کر پاتی جو کبھی اسے بیٹی کہہ کر نہیں پکار سکتی تھی۔

چاند بانو کی حالت خطرے سے باہر ہونے کے باوجود ڈاکٹر ز زیادہ تر اسے مسکن دواؤں کے زیر اثر ہی رکھ رہے تھے۔ اس طرح وہ اسے تکلیف اور صدمے سے محفوظ رکھنے کے لیے کر رہے تھے۔ چاند بانو کے جسم کے کئی حصوں میں چوٹیں آئی تھیں لیکن سب سے خراب حال چہرے کا تھا۔ ڈاکٹر ز نے بڑی جانفشانی سے اس کے رخسار میں چھبے شیشے کے ٹکڑوں کو نکال کر مرہم پٹی تو کر دی تھی لیکن وہ اسے اس کا اصل چہرہ واپس کرنے سے قاصر تھے۔ وہ جو چاند بانو کہلاتی تھی اور چاند سے بھی زیادہ بے داغ حسن کی مالک تھی، اس کے حسن کو گہن لگ گیا تھا۔ فاروق کو اس کے اس نقصان کا بڑا صدمہ تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ چاند بانو کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اس کے نقصان کے لیے خود کو ذمے دار سمجھتے ہوئے وہ اس سے سامنا کرنے میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا لیکن جب کا جل نے اسے چاند بانو کا پیغام دیا تو اسے اس کے سامنے جانا ہی پڑا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھی اور فاروق اس کے چہرے کے دونوں رخ دیکھ سکتا تھا۔ دایاں رخ اب بھی تابناک اور دلکش تھا لیکن بائیں رخ کی بربادی نے ساری خوب صورتی کو نگل لیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے دروازے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ فاروق نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں سرخی ہے۔ وہی سرخی جو شدت گریہ کی گواہ ہوتی ہے۔ جانے وہ اپنے کس نقصان پر زیادہ روئی تھی..... ماں کے چھن جانے پر یا حسن کو کھو دینے پر؟ فاروق اس کے بستر کے پائنتی یونہی نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہم اتنے بھیا تک لگ رہے ہیں کہ آپ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہے؟“ چاند بانو کی پُرسوز آواز نے اس کے دل کو مڑپا دیا اور وہ چند قدم کا درمیانی فاصلہ طے کر کے تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔

”ایسا سوچے گا بھی نہیں۔ آپ میرے لیے اب بھی وہی چاند بانو ہیں جسے میں نے پہلی بار نانا کے پاڑے پر دیکھا تھا اور حیران رہ گیا تھا کہ خدا کسی کو اتنا بھی نوازتا ہے۔“

”پر اب تو ہم وہ چاند بانو نہیں رہے ہیں۔ اب تو ہمارا حسن داغ دار ہو گیا ہے۔“

”ظاہری حسن کی کیا اوقات ہے۔ اصل خوب صورتی

نمٹاتے ہوئے گزرا۔ وکیل اشوک پنن کے ذریعے رہن سے رابطہ کرنے اور سارے انتظامات کرنے میں کافی دیر لگی تھی۔ رہن نے شملہ میں مقیم فلم یونٹ سے بھی رابطہ کر کے اس حادثے کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ صورت حال واضح تھی کہ آج کی تاریخ میں کوئی چند ہی گڑھ پہنچ کر لاش وصول نہیں کر سکتا چنانچہ کیتھرائٹ نے پُر زور اصرار کر کے فاروق کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دونوں باری باری اسپتال میں رکھیں گے۔ فاروق کو اس کی یہ تجویز قبول کرنی پڑی اور وہ گولو کو اپنے ساتھ لے کر اسپتال سے ہوٹل روانہ ہو گیا۔ اس کی روانگی تک چاند بانو کا آپریشن مکمل ہو چکا تھا لیکن تکلیف کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے غنودگی میں رکھا گیا تھا۔ تقریباً دو دن اسی طرح گزرے۔ شملہ میں مقیم ہدایت کار ائیل کمار چند ہی گڑھ آیا تھا اور چاند بانو کا زخمی چہرہ دیکھ کر اس فکر میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اب وہ اس کی فلم میں ہیروئن کا کردار کیسے ادا کرے گی؟ اسی کے ذریعے انہیں علم ہوا تھا کہ حادثے والے دن کسی تکنیکی مسئلے کی وجہ سے شوٹنگ کینسل کر دی گئی تھی اور زمر و بانی چند ہی گڑھ گھومنے اور خریداری کرنے کے شوق میں چاند بانو کو اپنے ہمراہ لے کر نکلی تھی۔ ان کے اس پروگرام کا سب ہی کو علم تھا اس لیے باہر کے کسی بندے کا اس بات سے واقف ہونا ناممکن نہیں تھا۔

ائیل کمار چند گھنٹوں بعد ہی اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کی آمد کے اگلے دن بمبئی سے کا جل، چاند بانو کا خاص ملازم اور اڈے کا ایک آدمی چند ہی گڑھ پہنچے۔ اڈے سے آنے والا آدمی وجہ تھا۔ فاروق اس سے وہاں کا حال احوال لیتا رہا۔ اس نے رہن کی ہدایت کے مطابق اسے بس وہی کچھ بتایا جو اب تک رہن کی زبانی وہ فون پر سنتا رہا تھا۔ بہت زیادہ کریدنے کی فاروق کے پاس بھی مہلت نہیں تھی۔ اسے زمر و بانی کی لاش کے حصول میں کا جل اور اس کے ساتھ آئے ملازم کی مدد کرنا تھی۔ یہ مرحلہ بھی آخر کار نمٹ ہی گیا۔ سرد خانے میں رکھی لاش کو بمبئی لے جانے کے مشکل مرحلے سے گزرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا گیا کہ یہیں چند ہی گڑھ میں زمر و بانی کی تدفین کر دی جائے۔ کوٹھے کی لڑکیوں کے علاوہ بھلا وہاں بمبئی میں زمر و بانی کا تھا بھی کون جس کے لیے اتنی پریشانی اٹھائی جاتی۔ چنانچہ وہ زمر و بانی جو ماضی میں یقیناً بے شمار دلوں کی دھڑکن رہی تھی، چار افراد کی موجودگی میں نہایت خاموشی سے سپرد خاک کر دی گئی۔ اس موقع پر آنسو



”بالکل دیکھا تھا۔ عجیب بد تہذیب آدمی تھا۔ ہمارے شملہ سے روانہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہم نے اسے دیکھا تھا۔ شکل سے ہی غنڈا لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے سیٹی بجائی تھی اور آنکھ بھی ماری تھی لیکن پھر وہ ہماری گاڑی سے دور رہا تو ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دوبارہ ہم نے اسے ایکسیڈنٹ سے ذرا پہلے دیکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ دوبارہ ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے گا لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ ہماری گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا اور گاڑی سڑک سے اتر کر الٹ گئی۔ اس کے بعد تو ہم دہشت سے اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے تھے۔ آپ کی زبانی سنی تفصیلات سے بعد میں کاجل نے ہمیں آگاہ کیا۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری زندگی بچانے کے لیے اتنی زحمت کی۔“

”زحمت کیسی۔ یہ تو میرا فرض تھا چاند بانو۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ بالکی جی کی زندگی نہیں بچائی جاسکی۔“ اس نے پورے خلوص دل سے کہا۔

”جب اس دنیا میں کسی کی سانسیں پوری ہو جائیں تو بچانے والوں کی ساری تدبیریں بے کار چلی جاتی ہیں۔ وہ بھی چلی گئیں اور شاید یہ اچھا ہی ہو اور نہ ہمارا یہ روپ انہیں ہم سے زیادہ دکھی کرتا۔ انہوں نے ماں سے زیادہ ہمیں نایکا بن کر پالا تھا اور ایک نایکا کے لیے گہنائے ہوئے حسن کو دیکھنے سے بڑھ کر کوئی صدمہ نہیں ہوتا۔“ اس کے حزن پہ لہجے میں ڈھیروں محرومیاں اور دکھ بول رہے تھے۔ باپ تو ان کی دنیا کی لڑکیوں کو یوں بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا لیکن ماں کے پاس رہ کر ماں سے محروم رہنے کا غم یقیناً گہرا تھا۔ بہت سوں کی طرح اسے بھی علم تھا کہ وہ زمر دبائی کی بیٹی ہے لیکن کیا تھا کہ زمر دبائی خود اپنی زبان سے یہ حقیقت تسلیم کر کے اسے خوشی دے دیتی۔ فاروق اس کی کیفیت محسوس کر سکتا تھا لیکن کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ بولا نہیں جاسکتا، سو وہ بھی لب بست رہا اور قدرے توقف کے بعد چاند بانو سے پوچھا۔

”اس بد معاش کا حلیہ بتا سکتی ہیں آپ ہمیں؟“ جواب میں چاند بانو نے جو حلیہ بیان کیا، وہ کنش سے بہت قریب تھا۔ فاروق اپنی مٹھیاں پیچ کر رہ گیا۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس روز اس نے بملا اور کنش کے درمیان ہونے والی جو گفتگو سنی تھی، اس میں چاند بانو کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ابھی اللہ کو چاند بانو کی زندگی منظور تھی سو ایک ایسے راستے پر جہاں سے بہت کم گاڑیاں

تو انسان کی روح کی ہوتی ہے اور آپ کی روح آج بھی خوب صورت ہے۔“ فاروق نے اسے جواب دیا تو وہ اداسی سے مسکرا دی اور بولی۔

”ہم جس بازار کے پاس ہیں، وہاں ظاہری خوبصورتی پر ہی سارا کاروبار زندگی چلتا ہے۔ روح کیا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے، یہ جاننے کی تو کسی کو فرصت ہی نہیں ہوتی۔ بہر حال ہم نے قدرت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہمیں اپنے نقصان پر دکھ نہیں ہوا۔ آج صبح ہم آئینہ دیکھ کر سخت صدمے کا شکار ہو گئے تھے اور اتنے دکھی تھے کہ زمر دبائی کی موت کے غم سے بھی زیادہ اپنی بد صورتی کا غم کھائے جا رہا تھا لیکن پھر ہمیں خیال آیا کہ وہ اوپر والا تو بہت رحیم و غفور ہے۔ وہ بھلا ہمارے ساتھ زیادتی کیونکر کر سکتا ہے۔ اس نے تو ایک طرح سے ہمارے ساتھ بھلا ہی کیا ہے۔ آپ سے ملنے کے بعد ہماری دلی خواہش تھی کہ اب کوئی دوسری نظر ہمیں نہ دیکھے۔ ہم نہ تو محفل آرائی کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی فلموں میں کام کرنے میں ہماری خوشی تھی۔ اب موجودہ حالات میں ہم دونوں ہی باتوں سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ہمارے دل کو اطمینان ہو گیا ہے کہ آپ ہمیں دیکھیں نہ دیکھیں اب کوئی دوسرا ہماری طرف نہیں دیکھے گا۔“ چاند بانو کی محبت نے ہمیشہ اسے حیران کیا تھا۔ وہ اس کی محبت کی شدت پر دنگ رہ جاتا تھا۔ اب بھی وہ جس زاویے سے سوچ رہی تھی، وہ انوکھا تھا لیکن اسی زاویہ خیال نے ہی اسے بکھرنے سے بچالیا تھا۔ اس کی باتیں سن کر فاروق کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

”آپ کس جہاں کی لڑکی ہیں چاند بانو! اس طرح سے کب کوئی اس دنیا میں کسی کو چاہتا ہے۔ آپ کی چاہت نے تو میرے رویوں کو مقرر کر ڈالا ہے۔“ بے فکر رہے۔ ہم اس قرض کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔“ چاند بانو اپنی ٹھنکتی ہوئی آواز میں کہہ کر مسکرائی تو فاروق کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ کی شوخی آج اس کے چہرے پر رنگ نہیں بکھیر رہی تھی بلکہ وہ عجیب بھیاں تک اور خوف ناک لگ رہا تھا۔

”ایکسیڈنٹ کے بارے میں آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ کیسے ہوا؟ آپ نے اس گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھا تھا جس نے آپ کی گاڑی کو ٹکرا ماری؟“ وہ یکدم ہی موضوع گفتگو بدل کر اس سے پوچھنے لگا حالانکہ ابھی تو اس نے چاند بانو سے زمر دبائی کی تعزیت بھی نہیں کی تھی۔



گزرتی ہیں، وہ لوگ عین حادثے کے وقت ہرگز بھی نہ پہنچ پاتے۔ بہر حال اس بات سے ہلا کو معافی نہیں مل سکتی تھی اور فاروق منتظر تھا کہ اس سے حساب لے سکے۔

☆☆☆

گورے افسر ولیم کا اغوا اور پھر نیم جاں حالت میں ایک اسپتال کے سامنے پایا جانا معمولی واقعات نہیں تھے۔ ڈاکٹرز کی جدوجہد نے ولیم کی زندگی تو بچا لی تھی لیکن دماغی حالت معمول پر نہیں تھی۔ سر پر لگائی جانے والی ضربوں نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ خود پر بیتی کو سنانا تو دور کی بات، وہ اپنا آپ بھی بھول گیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے۔ اس کی بہن کی بہن کی باتیں اور حرکتیں اسے نیم یا گل ثابت کر رہی تھیں اور ڈاکٹرز یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگر اس کی ایسی حالت رہی تو اسے جسمانی طور پر صحت مند ہو جانے کے بعد دماغی امراض کے اسپتال میں منتقل کر دیا جائے۔ ولیم کی اس حالت کی خبر اوپر تک گئی تھی۔ اگر پہلے والے حالات ہوتے تو اپنے ایک افسر کی اس حالت پر انگریز سرکار پورے ہندوستان کو تہس نہس کر ڈالتی لیکن آج کل ہندوستان میں ان کے لیے حالات سخت مخدوش تھے۔ ہندوستان میں ان کی حکمرانی کی بساط لپیٹی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ احتجاج، جلے جلوسوں اور ہنگامہ آرائی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک طرف ہندوستان کے باسی انگریز حکمرانوں سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے تو دوسری طرف مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے علیحدہ وطن کے مطالبے نے شدت پکڑ لی تھی اور رد عمل میں ہندوؤں کی جارحانہ کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بلوا، دنگ، فساد سب ہی کچھ جاری تھا اور حکومت کو حالات پر قابو پانے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

ربن کی نظریں ان سارے حالات کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور اسے یقین تھا کہ ان حالات میں انگریز حکومت اپنے ایک معمولی افسر کی خاطر حرکت میں آنا پسند نہیں کرے گی۔ یوں بھی اس کے ساتھیوں نے سارا کام اتنی صفائی سے کیا تھا کہ کہیں ان کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ فاروق کی واپسی سے قبل یہ کام نمٹانے کے بعد ربن اب جولیٹ والا معاملہ نمٹانے کے لیے تیار تھا۔ اپنی اب تک کی کوشش کے نتیجے میں اس کے سامنے دلدار آغا کا نام آچکا تھا۔ اس نے آغا کے متعلق جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق وہ ایک عیاش طبع شخص تھا اور شراب و شباب

دونوں ہی کا بے حد شوقین تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں ربن اسے جولیٹ کا مجرم سمجھ لینے میں حق بجانب تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی کہ سب سے پہلے اس ڈرائیور کو تلاش کریں جو جولیٹ کے لیے تحائف وغیرہ لے کر آیا کرتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ آغا پنجاب سے اپنے ساتھ ڈرائیور لانے کے بجائے سسرالی ملازمین سے استفادہ کرتا رہا ہوگا اس لیے پہلے موتی والا خاندان کے ملازمین میں اسے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور اس کے آدمی ڈرائیور کو تلاش کر کے اس کے سامنے لے آئے۔

”نام کیا ہے رے تیرا بچہ؟“ ربن نے سر سے پیر تک اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”ککشن دادا..... اپن کوکشن کہتے ہیں۔ اپنے سے کیا گلتی (غلطی) ہوگئی مائی باپ، جو تمہارے آدمی یوں اپنے کو اٹھا کر لے آئے۔“ ڈرائیور کی اس کے سامنے کھلی بن گئی تھی۔ خود کو بمبئی کے ایک دادا کے سامنے پا کر وہ سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

”پچھلے دنوں تیرا اپنے علاقے میں بہت آنا جانا لگا ہوا تھا۔ کس چکر میں تو اپنے محلے میں آتا تھا، جلدی بک درنہ ابھی تیری زبان گدی سے پکڑ کر کھینچ لوں گا۔“ ربن نے اپنے لب و لہجے سے اسے اور بھی خوف زدہ کیا۔

”اپن اپنی ڈیوٹی کرنے آتا تھا دادا۔ ماں کی سوگند اپن نے کبھی ادھر ادھر آنکھ بھی نہیں اٹھا کر دیکھا۔ جس کام سے آتا تھا کر کے سیدھا واپس لوٹ جاتا تھا۔“ ربن کے سوال کا جواب دینے سے زیادہ اس کا سارا زور اپنی صفائی پیش کرنے پر تھا۔ شاید اسے لگ رہا تھا کہ وہ انجانے میں کوئی غلطی کر بیٹھا ہے جس کی جواب دہی کے لیے اسے یہاں بلوایا گیا ہے۔

”کیا ڈیوٹی کرنے کو تو ادھری آتا تھا اپنے کو صاف بول۔“ ربن زور سے دباڑا تو وہ دہل کر رہ گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”اپنے سے کوئی گلتی ہوگئی ہے تو اپنے کو شام کر دو۔ اپن صرف نوکریات ہے۔ ادھر سے صاحب لوگ مس جولیٹ کو جو پھول اور گفٹ بھجواتا تھا، اپن دینے آتا تھا۔ اپن کا اس لغزے میں کوئی دوش نہیں تھا۔ اپن صرف اپنی ڈیوٹی کرتا تھا۔“ ڈرائیور کو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے اصل میں کیا جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس لیے اب اس سلسلے میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنے لگا۔

”تمہارا صاحب کون ہے؟“ ربن نے اس سے دریافت کیا۔



جولیت کے اغوا کے معاملے کو خفیہ رکھنے کے لیے اتنی احتیاط کی تھی کہ سسرالی گاڑی اور ملازمین دونوں سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ بڑے تعلقات والا آدمی تھا۔ کہیں اور سے گاڑی اور بندے حاصل کر لینا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے اسے یقین ہوگا کہ اس تک کوئی رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ جولیت جیسی غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے ویسے بھی کون اتنی زحمت کرتا۔ ولد ار آغا نے احتیاط کی بھی ہوگی تو اپنی بیوی اور سرسرایوں کی نظر سے محفوظ رہنے کے لیے لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے بہت غلط جگہ ہاتھ ڈالا ہے اور ربن اب اس کی گردن تاپنے کے لیے پہنچے ہی والا ہے۔

”ابھی تیرے کہے کو سچ مان کر اپن تیرے کو جانے کی اجازت دیتا ہے، پر ادھر ہوئی بات کی کہیں بھاپ بھی نکالی تو اپن تیرے کو زمین میں گاڑ دے گا۔ سمجھ گیا نا؟..... چل پھوٹ ادھر سے۔“ لکشمی سے وہ جو جانا چاہتا تھا جان چکا تھا چنانچہ اسے دھمکا کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اور زبان بندی کا یقین دلاتا ہوا وہاں سے کھسک لیا۔

”اب کیا کرنے کا ہے دادا؟“ لکشمی کے جانے کے بعد رامو نے پُر تشویش لہجے میں ربن سے دریافت کیا۔ ساری گفتگو کے دوران وہ وہیں موجود تھا لیکن دخل اندازی کو غیر ضروری جانتے ہوئے خاموش رہا تھا۔

”وہی جو کرنا چاہیے۔ وہ جولی کا عاشق ابھی چنڈی گڑھ میں بیٹھا ہے۔ جازنی دن نہیں لگیں گے اسے بمبئی واپس آنے میں۔ چاند بانو اور زمر دبائی والا لفظ نہیں ہوتا تو وہ اب تک ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کروا کر بمبئی کے لیے نکل چکا ہوتا۔ اس لفظ سے کہہ جانے اپنے کو تھوڑی سی مہلت اور مل گئی ہے۔ اپن اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو شہزادے کے سامنے نظر جھک جائے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے دادا پر معاملہ بہت بڑے جاگیردار اور سیاست دان کا ہے پھر وہ ہے بھی پنجاب کا..... ادھر بمبئی کی بات ہوتی تو اپنے لیے آسان ہوتا، پر پنجاب جا کر کچھ کرنے میں گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ ادھر اپنی دوستی یاری بھی تو نہیں ہے۔“ رامو بدستور تشویش کا شکار تھا۔ ایک طرح سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ بمبئی اور آس پاس کے شہروں میں تو پھر بھی ان کا زور تھا۔ یہاں تک کہ وہ کلکتہ بیاہ کر گئی تریا بانو کی وہاں اپنی دوستی کی بنیاد پر اس کی دیکھ بھال کر دار ہے تھے اور وہاں کے اڈے والوں نے نظر رکھی ہوئی تھی کہ مجو دادا یا

”سیٹھ موتی والا اور کون؟ تمہارا آدمی اپنے کو ادھر ہی سے تو اٹھا کر لایا ہے۔“

”تو کیا سیٹھ موتی والا جولیت کو پھول اور تحفے بھجواتا تھا؟“ ربن اس کے جواب پر چونکا۔

”نہیں نہیں..... وہ تو سیکریٹری صاحب اپنے کو ادھر بھیجتا تھا۔“ ڈرائیور نے زور زور سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کی تردید کی۔

”کون سیکریٹری؟“ ربن نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے نرمی سے دریافت کیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈرائیور اس کے سامنے بوکھلاہٹ کا شکار ہے اس لیے ڈھنگ سے جواب نہیں دے پا رہا۔

”سیٹھ کے جنوائی ولد ار آغا کا سیکریٹری۔ وہ اپنے کو ادھر چیزیں دے کر بھیجتا تھا کہ مس جولیت کو بولنا آغا صاحب نے بھجوا یا ہے، پر پہلی بار کے بعد مس صاحبہ نے کبھی کوئی چیز نہیں لیا۔ وہ بہت غصہ کرتی تھی اور چیزیں اٹھا کر پھینک بھی دیتی تھی۔“ اب وہ بالکل صحیح ٹریک پر چل رہا تھا اور وہ معلومات فراہم کر رہا تھا جو ربن کے اب تک کے اندازے کی تصدیق کر رہی تھیں۔

”ادھر سے لڑکی کو اٹھوا کر کدھر رکھوایا تھا تمہارے سیٹھ کا جنوائی؟“

”کیا بولا دادا! اپن سمجھا نہیں۔“ ڈرائیور کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کیوں اپن فارسی میں پوچھا ہے کیا؟ ادھر اپنے محلے سے لونڈیا اٹھوائی تھی تیرے مالگوں نے۔ تو ان کے لیے ڈرائیوری کرتا ہے، تیرے کو کیسے خبر نہیں ہے؟“ ربن نے اٹلے ہاتھ کا تھپڑ اتنی زور سے اس کے منہ پر رسید کیا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔

”ماں کی سوگند اپن بالکل سچ بولتا ہے دادا! اپن کو یہ اغوا اغوا کے لفظ سے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اپن بس اتنا ہی کیا، جتنا ابھی تم کو بولا۔“ ڈرائیور نے ہونٹ سے بہتا خون ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے روہانسی آواز میں جواب دیا۔ ربن جیسا زیرک انسان اس کے لہجے کی سچائی کو پرکھ سکتا تھا پھر بھی لہجے میں سختی سمو کر غصے سے بولا۔

”تیرے سیٹھ کے پاس جو نیلی موٹر ہے، اسے تو نہیں چلاتا تو کون حرام کا جتا چلاتا ہے؟“

”نہیں دادا! تم کو کوئی گھٹی (غلطی) لگی ہے۔ اپنے سیٹھ کے پاس کوئی نیلی موٹر نہیں ہے۔“

ڈرائیور کے جواب سے واضح ہو گیا کہ ولد ار آغا نے



اس کے ساتھ ٹریا بانو کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں لیکن پنجاب کے کسی علاقے میں ان کے لیے کافی مشکل ہو جاتی مگر ربن اس سب کو کہاں خاطر میں لانے والا تھا۔ بگڑ کر بولا۔

”تیرا ان ساری باتوں سے مطلب کیا ہے؟ کیا تو اپنے کوڈر رانے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اپن مجرم کا نام سامنے آجائے پر بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے۔“

”نہیں دادا! اپن کا یہ مطلب نہیں ہے، بس اپن تو یہ بولتا ہے کہ تھوڑا سنبھل کر چلنا ہوگا۔“ رامو اس کا موڈ سمجھ کر جلدی سے صفائی دینے لگا۔

”جب ہاتھ پیر چلائیں گے تو دیکھ لیں گے کدھر کیسے چلنا ہے۔ ابھی تو اپنے کو زیادہ نصیحت مت کر، اپن کا مغز گرم ہو رہا ہے۔“ ربن کے اس جواب پر رامو نے خاموشی اختیار کر لی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے ربن کو ٹوک کر غلطی کی ہے۔ ربن فاروق کے معاملے میں جذباتی تھا اور اس کی خاطر کسی بھی خطرے کو خاطر میں نہیں لاسکتا تھا۔

”چلم تازہ کر دے جو..... بالکل مزہ نہیں دے رہی۔“ ماحول تبدیل کرنے کے لیے اس نے جو کو آواز لگائی۔ جو فوراً ہی حاضر ہو گیا۔ اصل میں وہ پہلے ہی اس طرف آ رہا تھا۔

”باہر تھانے سے سپاہی آیا ہے دادا۔ بولتا ہے بڑی خبر لایا ہے۔“ اس نے پہلے پیغام دیا اور پھر حقے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اندر بلا لے اسے۔“ رامو نے ربن کے چہرے پر آمادگی دیکھتے ہوئے اجازت دی تو جو حقے سمیت باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے تھانے سے آیا سپاہی ان کے روبرو تھا۔

”کیا خبر لایا ہے سنتری بادشاہ؟“ رامو نے ہی اس سے دریافت کیا۔

”بہت بڑی خبر ہے دادا! سنتے ہی میں نے ادھر دوڑ لگائی ہے۔ سے بہت کم ہے، کب کیا ہو جائے نہیں معلوم۔“

”ڈھنگ سے کچھ بتائے گا بھی یا پھیلیاں ہی بکھواتا رہے گا۔“ سپاہی کے انداز سے ظاہر ہو گیا تھا کہ حقیقتاً وہ کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے چنانچہ رامو نے بے چین ہو کر اسے ڈپٹا۔

”آپ نے گورے افسر ولیم کے بارے میں تو سنا ہوگا دادا۔ اسے کسی نے اغوا کر لیا تھا اور پھر بعد میں وہ زخمی حالت میں ملا تو اس کی کھوپڑی ہی الٹ گئی تھی۔ ڈاکٹروں اور پولیس نے بہت زور مارا کہ وہ اپنی ایسی حالت بنانے والوں کا نام بتادے پر وہ نہ بتا سکا۔ اب ایک مخبر نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو خبر دی ہے کہ ادھر والوں کا ولیم سے کوئی پھنڈا

چل رہا تھا۔ اس نے کسی بات پر غصے میں آ کر ربن دادا کے چہیتے فاروق استاد کو تھانے میں لٹا لٹکا کر خوب ٹھکانی لگوائی تھی۔ خبر دینے والے کا خیال ہے کہ ربن دادا نے اپنے چہیتے فاروق کا بدلہ لینے کے لیے ولیم صاحب کا یہ چال کیا ہے۔ ادھر ربن دادا کو اریسٹ کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے میں سیدھا ادھر دوڑا آیا۔“ سپاہی بولتے ہوئے بار بار ربن کو چورنگا ہوں سے دیکھتا جا رہا تھا چونکہ ابھی تک ربن نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی، اس لیے سپاہی کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے براہ راست مخاطب ہو۔ وہ رامو ہی سے مخاطب تھا۔ اس کی دی اطلاع نے رامو کے چہرے کی رنگت بدل دی تھی لیکن ربن ہنوز اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

”خبر سچی ہے نایا تو انٹ کی شفٹ سن کر دوڑا آیا ہے؟“ رامو کو اور کچھ نہیں سوچا تھا تو سپاہی پر ہی الٹ پڑا۔

”بالکل سچی خبر ہے مائی باپ۔ کسی بھی سے پولیس پارٹی ادھر چھا پامارنے کو پہنچ جائے گی۔ آپ مجھے شکر دو اور یہاں سے جانے کی اجازت دو۔ اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔“ سپاہی نے گھگھیا کر بولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رامو کے سامنے جوڑ دیے۔

”اسے جانے دے رامو! ربن نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے رامو کو اشارہ بھی دیا تو اس نے اپنے بٹوے میں سے چند بڑے نوٹ نکال کر سپاہی کو تھمائے اور اس کے روانہ ہوتے ہی خود ربن کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا سوچتے ہو دادا۔ ادھر سے نکلنے کی کرو۔ گورے افسر کا معاملہ ہے۔ پولیس آئی تو خالی ہاتھ نہیں جائے گی۔“

”اپن بھی یہ بات جانتا ہے، اسی واسطے ٹک کر بیٹھا ہے۔ ابھی اپن ادھر سے غائب ہو گیا تو وہ سالے ادھر جو ہاتھ لگا، اسے ہی اٹھا کر لے جائیں گے۔ اپن اپنے پر آئی دوسرے پر نہیں ڈال سکتے۔“ ربن نے گھبر لہجے میں اسے جواب دیا۔ اتنی دیر میں وہ بہت کچھ حساب کتاب لگا چکا تھا، اسے یقین تھا کہ پولیس کو خبری کرنے والا مجبوراً خود یا اس کا کوئی گرگا ہوگا کیونکہ وہی لوگ تھے جو جانتے تھے کہ ولیم نے فاروق کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور ربن اس سلوک کا بدلہ لینے کے لیے کیا کر سکتا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو دادا۔ کیا تم گرفتاری دینے کو تیار ہو؟“ رامو کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہاں رہے۔ کچھ دن ادھری حوالات میں بیٹھ کر مفت کی کھا پی لیں گے۔ ادھر تو سرسے ہر وقت دس لغو رہتے ہیں۔“ ربن کا انداز بے نیازانہ تھا۔



جاری کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اس نے دوسرا حکم علاقے میں ادھر ادھر پہرا دیتے اپنے آدمیوں کے لیے جاری کیا تھا۔ ان سب کو ہدایت جاری کی گئی تھی کہ پولیس والوں کے سامنے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی قسم کی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر خاموشی سے اپنی جگہ دبک جائیں۔ اسے وکیل اشوک کے یہاں تک پہنچنے کی مہلت درکار تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس دوران پولیس والے اندھی کارروائی نہ کر سکیں۔ مانی کا اسے پتا تھا کہ وہ بھی بندگی کی دیوار پھاندا کر یہاں سے نکلا ہوگا اور دوسری طرف موجود گلیوں کے جال سے گزر کر جلد اشوک بچن تک پہنچ جائے گا۔ اشوک کے پاس موٹر کار تھی، وہ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کر کے فوری طور پر اپنی موٹر میں روانہ ہوتا تو چند منٹوں میں یہاں پہنچ جاتا۔ اتنی دیر میں وہ تدریس سے پولیس والوں کا اڈے پر استقبال کر کے انہیں الجھائے رکھ سکتا تھا۔ اس موقع پر اشتعال کے بجائے دھیمے پن سے پیش آنے کی پالیسی ہی پولیس والوں کے رویے میں نرمی لاسکتی تھی اور رہن کی سنگت میں بہت سے گر سیکھ لینے والا رامو پوری طرح سے ان سے نمٹنے کو تیار تھا۔

☆☆☆

”یوں چھپ چھپ کر کب تک ملتے رہیں گے نواب زادہ صاحب! مجھے آپ سے اس طرح ملنا اچھا نہیں لگتا۔ میں نے اپنی لائف میں کبھی کوئی کام چوری چھپے نہیں کیا۔ کبھی ایسا ناظم ہی نہیں آیا۔ بہت سیدھی سادی اور صاف لائف تھی میری۔ پڑھائی، گھر کے کاموں میں مام کی ہیلپ کرنا اور جوزف..... بس ان تین چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا میری لائف میں۔ میں اپنے سارے دکھ سکھ جوزف سے شیئر کر لیتی تھی اور ریلیکس ہو جاتی تھی لیکن آپ کے اور اپنے ریلیکس کے بارے میں، میں اسے بھی کچھ نہیں بتا پائی۔ کیسے بتاؤں؟ وہ کہے گا جوزف میں تم تو کبھی ایسی لڑکی نہیں تھیں جو چوری چوری کسی مرد سے ملتی ہے۔ تم تو محلے کی سب سے ڈیسنٹ اور سو بر لڑکی تھیں پھر میں اسے کیا جواب دوں گی کہ جوزف کو (Love) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان رائٹ اور رائٹ کو چھوڑ کر بس اپنے لور (Lover) کی بات مانتا چلا جاتا ہے۔“ نواب زادہ اسد اللہ سے جوزفین کی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ کسی بھی طرح اسے ملاقات کا وقت اور جگہ بتا دیتا تھا اور جوزفین کچھ دھاگے سے بندھی ٹھیک وقت پر اس جگہ پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ ہر بار ہی اسے بہت ڈر لگتا تھا اور دل بری طرح دھڑکتا رہتا تھا کہ کہیں کسی کو

”نہیں دادا! یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمہیں لمبے چکر میں ڈال دیں گے اور ادھر بہت کام تمہیں ہی کرنے ہیں۔ ابھی تو تم پنجاب جا کر آغا سے حساب کرنے کی بات کر رہے تھے۔ تم حوالات میں جا بیٹھے تو یہ کام کون کرے گا؟“ رامو نے اس کی کمزوری پر ہاتھ رکھا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے رے، پر ادھر کا کیا ہوگا۔ سالے پولیس والے تو جس کو من کرے گا، اٹھا کر لے جائیں گے۔“ رہن تشویش کا شکار تھا۔

”اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ اپن ابھی آدمی بھیج کر وکیل صاحب کو بلو الیتا ہے۔ وکیل انگریزی قانون کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ پولیس والوں کو بتا دے گا کہ ایک کی جگہ دوسرے آدمی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ انگریزی قانون میں تو گرفتاری کے لیے کاغذ بھی چاہیے ہوتا ہے۔ پولیس والے لائے بھی تو تمہارے نام کا کاغذ لائیں گے اور بنا کاغذ کے وکیل کسی دوسرے کو لے جانے نہیں دے گا۔ اپنا وکیل کیسا ہوشیار آدمی ہے، تمہیں بھی اس کی خبر ہے۔“ رامو ایسے وہی اس کا نائب نہیں تھا۔ اسے رہن کو رام کرنے کے بہت گر آتے تھے۔ رہن کو اس کی باتوں نے متاثر کیا اور بالآخر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اسی پل مانی نامی ایک لڑکا گھبرایا ہوا پھولی سانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ وہ لڑکا علاقے کے داخلی راستے پر پھرے داری پر مامور تھا۔

”پولیس کی گاڑی اس طرف آرہی ہے۔ پیچھے ایک تانگا بھی دیکھا ہے۔“ اس کی دی اطلاع سنسنی خیز تھی۔ گاڑی اور تانگے دونوں میں سوار ہو کر پولیس والوں کے یہاں پہنچنے کا مطلب تھا کہ وہ خاصی تعداد میں ہیں اور اڈے اور اس کے اطراف کے علاقے کو گھیرے میں لے کر کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوگا کہ یہاں پہلے ہی خبر پہنچ چکی ہے اس لیے وہ اطمینان اور ست روی سے آرہے تھے۔

”تم نکلو دادا..... اور مانی تو جا کر وکیل بابو کو بلا لا۔“ رامو نے پہلے رہن اور پھر اطلاع لے کر آنے والے لڑکے سے کہا۔ رہن نے بھی مزید تاخیر نہیں کی اور کمان سے نکلے تیر کی طرح اڈے سے نکلا۔ اس کا رخ گلی کے باہر کے بجائے اندر کی طرف تھا۔ سامنے سے جانے میں پولیس والوں کے ہاتھ آنے کا خطرہ تھا۔ پیچھے سے وہ بندگی کے سرے پر موجود دیوار پھاندا کر آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ پیچھے کا اسے معلوم تھا کہ رامو اچھی طرح سب انتظام سنبھال لے گا اور تھا بھی ایسا ہی۔ اس کے نکلنے ہی رامو نے ہدایات



سامنے آپ سے شادی کی خواہش ظاہر نہیں کر سکتے۔ اگر عالیہ، اختر سے منسوب نہ ہوتیں تو بھی اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن ہم ڈرتے ہیں کہ ہماری غفلت عالیہ کی برسوں سے طے نسبت ٹوٹنے کا سبب نہ بن جائے۔ امی جان نے بھی اسی وجہ سے ہمیں احتیاط کرنے کی ہدایت کی ہے اور وہ خود شد و مد سے اس بات کی خواہش مند ہیں کہ عشرت جہاں کی نسبت کہیں طے پا جائے۔ آپ دعا کریں کہ انہیں اپنے اس مقصد میں جلد کامیابی حاصل ہو جائے اور ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے۔“

اسد اللہ اس کے سامنے اپنی وہی مجبوریاں دہرا رہا تھا جن کا اس سے پہلے بھی بہت بار اظہار کر چکا تھا۔ جوزفین نے اس بار اس پر مزید دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے خیال آگیا تھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں اسد اللہ پر دباؤ ڈال رہی ہے اور انہیں بار بار ان کی مجبوری دہرانے پر مجبور کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی بڑی خوبی سے موضوع گفتگو بدل گئی اور چند لمحوں میں ہی وہاں کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ اب وہاں نہ تو ایک فریق کے دوسروں کا بوجھل پن تھا اور نہ ہی دوسرے فریق کی وضاحتوں کی دھند۔ کچھ تھا تو بس دو محبت کرنے والے اور ان کی محبت کی وہ بے قراری و بے چینی جو ایک دوسرے میں گم ہو کر ہی قرار پاتی ہے۔ انہیں بھی بہت دیر تک ہوش نہیں رہا کہ ان دونوں کے سوا بھی اس کائنات میں کچھ ہے۔ بہت دیر گزرنے کے بعد جب رات اپنے آخری مراحل میں تھی، جوزفین کو ہی خیال آیا۔

”اب مجھے چلنا چاہیے نواب زادہ صاحب! کچھ دیر بعد صبح کی روشنی نمودار ہو جائے گی اور ملازما نہیں جاگنا شروع ہو جائیں گی۔ مجھے کسی کے جاگنے سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ جانا چاہیے۔“ وہ قدرے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تو اسد اللہ کو بھی ہوش آیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جوزفین کو واپس چلے جانے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔ جوزفین زنا نہ حصے میں جانے والا زینہ دے قدموں اتر کر نیچے پہنچی تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ نیم روشن برآمدے میں اکاٹیکم بالکل سامنے کھڑی تھیں اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اسے مسلسل گھورے جا رہی تھیں۔

”آپ..... آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں اکاٹیکم؟“ اپنے خشک لبوں کو زبان سے تر کر کے بوکھلائی ہوئی جوزفین نے ان سے دریافت کیا۔

”یہ سوال تو ہمیں آپ سے کرنا چاہیے کہ آپ رات

خبر نہ ہو جائے۔ آج بھی وہ بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی چھت پر بنے اس کمرے میں پہنچی تھی جہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا اور کبھی کبھار اسد اللہ ہی دن کے اوقات میں وہاں جا بیٹھتا تھا۔ اس کی اس عادت کے باعث کمرے کی باقاعدگی سے صفائی کی جاتی تھی اور کرا آراستہ و پیراستہ تھا۔ چھت پر جانے کے لیے مردانہ و زنانہ دونوں حصوں میں الگ الگ زینے تھے اس لیے ان کی خفیہ ملاقات کے لیے یہ کمراسب سے آئیڈیل جگہ قرار پائی تھی لیکن بہر حال یہ واحد جگہ نہیں تھی۔ وہ دونوں احتیاطاً جگہ بدل بدل کر ملتے تھے اور اتنی بڑی حویلی میں انہیں کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی جاتی تھی لیکن جوزفین ایک طرف لڑکی ہونے کی وجہ سے اور دوسری طرف اپنی کم حیثیتی کے باعث اس صورت حال پر زیادہ خوف زدہ رہتی تھی اسی لیے آج اسد اللہ کے سامنے اپنے خوف اور ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار کر رہی تھی۔

”ہم ان سب باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جوزفین! ہمیں احساس ہے کہ یہ پروجیکشن آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہے لیکن دوسری طرف ہم مجبور بھی ہیں کہ آپ سے ملے بغیر رہ نہیں پاتے۔ جودن آپ سے ملے بغیر گزرتا ہے، یوں لگتا ہے کہ اس دن ہم سانس ہی نہیں لے پارہے۔ عجب جان کنی سی طاری ہوتی محسوس ہوتی ہے ہمیں اپنے اوپر..... لیکن آپ کو یہ ملاقاتیں اتنی ہی ناگوار خاطر ہیں تو ہم آپ کی خاطر خود پر یہ جبر بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کہتی ہیں تو اب ہم آپ کو ملاقات کے لیے فورس نہیں کریں گے اور ہم پر جو گزری خود ہی سہہ لیں گے۔“

نواب زادہ اسد اللہ نے اس کی باتوں کو بہت سنجیدگی سے سنا اور اپنی لاچاری و مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بالآخر فیصلہ سنا دیا لیکن اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے یہ فیصلہ نہایت مجبوری میں اور صرف جوزفین کی خاطر کیا ہے اور جوزفین بھی وہی عام سی عورت تھی جو محبت میں اپنا سب کچھ لٹا دینا گوارا کر لیتی ہے لیکن محبوب کی پیشانی کا ایک بل نہیں سہہ پاتی۔ چنانچہ تڑپ کر بولی۔

”میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا ہے کہ مجھ سے نہ ملا کریں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے لیے یہ بہت تکلیف دہ ہے۔ میں خود بھی آپ سے ملے بغیر سکون سے نہیں رہ پاتی لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر کسی کو علم ہو گیا تو طوفان آجائے گا اور ہم دونوں ہی اپنا اپنا مقام کھو بیٹھیں گے۔“

”ہم خود بھی اس بات کو سمجھتے ہیں لیکن عشرت جہاں کی نسبت ملے ہو جانے تک مجبور ہیں کہ حویلی میں کسی کے



# کیا آپ شوگر سے مستقل نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوا لیں۔

**المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ**  
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

**0300-6526061**

**0301-6690383**

فون اوقات

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

کے اس پہر اپنے کمرے کے بجائے اوپر چھت پر کیا کر رہی تھیں؟ یہ وقت تو آرام کا ہے۔“ اکا بیگم کی دھیمی آواز میں بھی رعب و دبدبہ تھا۔ انہیں حویلی کی ملازماؤں میں جو ممتاز حیثیت حاصل تھی، اس کا انہیں پوری طرح احساس تھا اور وہ اپنی برتری کا اظہار اپنے انداز گفتگو کے علاوہ بھی ایک ایک ادا سے کرتی نظر آتی تھیں۔

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو ایسے ہی ہوا خوری کے لیے چھت پر چلی گئی تھی۔“ اس نے فوری طور پر سوچنے والا بہانہ تراشا۔

”نیند نہیں آرہی تھی تو سروری سے کہتیں۔ وہ آپ کے سر میں اتنی زبردست مالش کرتی کہ آپ کو خود بخود ہی نیند آ جاتی۔“

”میں نے اتنی رات کو اس کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ اکا بیگم کو جواب دیتے ہوئے اس کی ہتھیلیاں پیسنے لگی تھیں۔

”اتنی رات کو اپنے کمرے سے باہر نکلنا بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ کی اپنی ذات شکوک کی زد میں آ سکتی ہے۔ آپ یہاں اجنبی ہیں، بہتر ہے احتیاط سے کام لیں۔“ اسے ساٹ لہجے میں نصیحت کر کے اکا بیگم راستے سے ہٹ گئیں لیکن اس کے اپنے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہاں سے اپنے کمرے تک کا راستہ اس نے کیسے طے کیا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

”بڑی دیر لگا دی رے رامو۔ این کب سے ادھر تیری راہ دیکھتا ہے۔“ رامو کی صورت دیکھتے ہی ربن نے اس سے شکوہ کیا۔

”بس دادا، پولیس والوں سے جان چھڑانے میں ہی اتنا سے لگ گیا۔ سالے جان کو ہی آگئے تھے۔ وکیل بابو نیم پر نہیں پہنچتا تو بڑی مشکل ہو جاتی اپنے کو۔ وہ..... کا بچا انسپکٹر وکرم بھی آنکھیں مٹھے پر رکھ کر آیا تھا۔ سالے کو یاد ہی نہیں تھا کہ ادھر اڑے سے اس کا حقہ پانی چل رہا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا..... کی اولاد۔“ رامو نے انسپکٹر وکرم کے لیے بے دریغ گالیوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے تاخیر سے پہنچنے کا سبب بتایا۔ وہ اس وقت اپنے اس ٹھکانے پر تھے جہاں اچھو نام کا بے آسرا بوڑھا ربن کی مہربانی سے اپنا بڑھا پاسکون سے گزار رہا تھا۔

”گوروں کے آگے سب کی میا مری ہے رے۔ وہ حرام کا جنا و کرم بھلا کیا بیچتا ہے۔ تو اپنے کو بتا سب خیر تو رہی



پولیس والوں کی خوب خبر لی۔ ویسے تو اپنے وکیل بابو بھی کم نہیں ہیں، پر ہو سکتا تھا کہ گورے افسروں کا حکم پورا کرنے کے واسطے پولیس والے تھوڑی اڑی کرنے کی کوشش کرتے پر ولایت سے آئے انگریز افسر کے سامنے تو سالوں کو منہ کی کھا کر جانا پڑی۔“ رامو نے اختصار سے ساری کھانا سنا ڈالی۔ وہ پولیس والوں کے ناکام واپس جانے پر خاصا مسرور نظر آ رہا تھا لیکن سب سن کر بھی ربن کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی اور وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پولیس والوں کے نامراد جانے پر خوش نہ ہو رامو۔ یہ حرام کے جنے بڑے کیلئے ہوتے ہیں۔ ابھی سامنے سے کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکے تو بعد کو خاموشی سے کبھی بھی کہیں سے بھی کسی کو اٹھا لے جائیں گے۔ تو اڈے کے سارے آدمیوں کو بول دے کہ جازنی ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب اڈے کے پاس ہی رہیں اور ٹولیاں بنا کر رہیں تاکہ کوئی آسانی سے گھیر نہ سکے۔ اپنے کو آغا سے حساب کے لیے ادھر سے نکل کر جانے کا نہیں ہوتا تو اپن کبھی اپنے آدمیوں کو خطرے میں نہیں ڈالتا اور خود پولیس سے نمٹتا، پر ابھی مجبوری ہے۔ اپن کو آغا کی گردن ناپنے کا جلدی ہے۔“ ربن نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔

”تم فکر نہ کرو دادا..... ابھی اپن ایک دم ہوشیار ہی ہے۔ پولیس والوں کی جاتی (ذات) کا اپنے کو بھی پتا ہے۔ سالے منہ کی کھا کر جانے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑے ہیں۔ اڈے کے آس پاس ہی منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ اپن ادھر کے لیے نکلا تو بھی ایک سادہ والا اپنے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے جل دے کر اپن ادھر آیا ہے۔“ رامو کی وی اطلاع سے ظاہر تھا کہ پولیس والے شدت سے ربن کے متلاشی ہیں اور اس بار اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس صورت حال نے ربن کی تشویش میں اضافہ کر دیا اور اسے اندازہ ہوا کہ اس کا بمبئی سے باہر نکلنا بھی اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ پولیس کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر بھی منڈلا رہی ہو اور اسے دیکھتے ہی چھاپ لے۔

”تو ادھر فاروق کو تار ڈلوادے کہ ابھی آنے کی جلدی نہ کرے۔ ادھر تھوڑا حالات ٹھیک ہو جائیں تو پھر اسے واپس بلوالیں گے۔ ادھر آ کر کہاں خوار ہوتا پھرے گا۔ اچھا ہے وہیں آرام سے رہے۔“

”ٹھیک ہے دادا، اپن تار ڈلوادے گا پر ادھر فاروق استاد کا کچھ پتا نہیں ہے کہ رکنے کو راضی ہو یا نہ

نا۔ پولیس والے کسی لونڈے کو اپنے ساتھ تو نہیں لے گئے؟“ انسپکٹر وکرم کے بدلے رویتے پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے آدمیوں کے بارے میں دریافت کیا۔

”ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔ وکیل بابو کے آنے سے پہلے پولیس اڈے پر پہنچ چکی تھی۔ اپن نے خود دروازہ کھلوا کر پولیس والوں کو اڈے کے اندر بلوایا۔ آتے ہی سالے تمہارا پوچھتے تھے۔ اپن بولا کہ دادا اڈے پر نہیں ہے اور کدھری گیا ہے یہ اس کے سوا بھگوان ہی جانے۔ اپنے میں سے تو کسی میں دم نہیں ہے کہ اس سے اس کے آنے جانے کا حساب مانگ سکے کہ کدھری جاتا ہے اور کب واپس آئے گا۔ اپنا جواب سن کر سالے نوں نوں کرنے لگے۔ اپن کو دھمکی دیے کہ اگر دادا کا پتا نہیں دیا تو تیرے کو تھکڑی لگا کر لے جائیں گے۔ اپن بولا کہ لے چلو اپنے کو چلنے سے انکار نہیں۔ وہ وکرم..... بولا کہ اپنے پاس پکی اطلاع ہے کہ دادا ادھر اڈے پر ہی ہے۔ تو شرافت سے اسے ہمارے سامنے پیش کر دے۔ اپن بولا ابھی تھوڑے ٹیم پہلے دادا ادھر تھا پر اب نہیں ہے۔ تم لوگ چاہو تو پورے اڈے کی تلاشی لے لو۔ سالے سب ادھر سے ادھر دندناتے لگے۔ تمہاری تلاش میں الماریاں اور صندوق تک کھول کر دیکھ ڈالے۔ فرش پر سے دریاں اور چاندنیاں اٹھا کر خفیہ تہ خانے کا راستہ ڈھونڈتے رہے۔ ان کا بس چلتا تو اڈے کی ساری ایتھیں اور فرش اکھاڑ ڈالتے پر اچھی رہی کہ اتنی دیر میں ہی مانی وکیل بابو کے ساتھ پہنچ گیا۔ قسمت سے وکیل بابو کی جو روکا بھائی ولایت سے آیا ہوا تھا۔ وہ اسے بھی اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے آئے۔ وکیل بابو آتے ہی پولیس والوں پر چڑھ دوڑے کہ کیسے بغیر وارنٹ کے انہوں نے کسی کی چار دیواری میں پاؤں دھرے۔ انسپکٹر وکرم اور اس کے ساتھ آئے دوسرے افسر نے بڑا زور مارا کہ تمہیں ولیم کی حالت کا ذمے دار ٹھہرا کر گرفتاری کے لیے آنے کا کارن بتا سکیں پر وکیل بابو نے ایک نہیں سنی۔ بولے تم ربن دادا پر جو الزام لگاتے ہو پہلے اس کا ثبوت لاؤ اور ساتھ میں اس کی گرفتاری کا وارنٹ بھی پھر کوئی بات کرنا اور اس سے بھی یاد رکھنا کہ الزام دادا پر ہے تو صرف دادا کی ہی بات کرنا، ادھر کسی اور کو تنگ کرنے یا تھانے لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی اسے۔ سالہ وکرم اور اس کے ساتھ آیا بندہ بڑے شہنائے۔ بولے مجرم تک پہنچنے کے لیے اس کے ساتھیوں سے تفتیش تو کرنی ہوگی۔ وکیل بابو نے کہا کہ ضرور کرو، پر پہلے قانونی کارروائی پوری کر رکھنا۔ اس کے سالے نے بھی



ہو۔ اسے ادھر لوٹنے کی بہت بے چینی ہے۔“ رامو بے یقینی کا شکار تھا۔

”تو تارڈ لواد تے آگے جو ہوگا دیکھ لیں گے۔“ ربن نے اسے جواب دیا۔

”تمہارا کب ادھر سے نکلنے کا ارادہ ہے؟ ٹکٹ وکٹ کا بندوبست کرنا ہے تو بولو۔“ رامو نے اس کے آگے کے پروگرام سے آگاہی چاہی۔

”وہ سب اپن خود دیکھ لے گا۔ ادھر اچھو کے پاس جو لونڈا ہے ٹکٹ تو وہ بھی لادے گا۔ تو اب ادھر مت آنا۔ پولیس والوں کو کوئی موقع دینا ٹھیک نہیں ہے۔ تو اپنی جگہ پر ٹنگ کر بیٹھ۔ اپنے پیچھے تجھے ہی دونوں اڈوں کی نگرانی کرنی ہے اور ہاں دیکھ ذرا ایک کام کرنا۔ ذرا دھول بیٹھ جائے تو اس حرام کے جنے و کرم کو اٹھوا لیتا۔ اپن کو لگتا ہے مجودا دایا اس کے کسی بندے سے اس کا جوڑ ملا ہوا ہے۔ اس تک جو خبریں پہنچ رہی ہیں، ان کو پہنچانے والا مجو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اپن مجو کو بہت چھوٹ دے دے ہیں۔ تو اس پلیس و کرم کے حلق میں ہاتھ ڈال کر اس سے اگلوانا کہ مجو کس بل میں گھس کر بیٹھا ہوا ہے۔ اب مجو کا کہانی بھی جلدی ختم کر دینے کا ہے۔“ اس کا دماغ ہر طرف دوڑ رہا تھا اور وہ اسی حوالے سے رامو کو ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ اس کی اور رامو کی ملاقات کا مقصد بھی یہی تھا۔ رامو کو علم تھا کہ ربن اڈے سے نکل کر سیدھا اسی ٹھکانے پر آیا ہوگا جب ہی آئندہ کے لیے ہدایات لینے یہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ وہاں سے رخصت ہوا تو ربن نے ملازم لڑکے کو ٹکٹ اور کچھ دیگر سامان کی خریداری کے لیے بھیج دیا۔ لڑکا ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کی مطلوبہ اشیاء لے کر پہنچ گیا۔ ربن نے سب چیزیں دیکھ کر اپنا اطمینان کیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ جلد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ علی الصباح اسے سفر کے لیے نکلنا تھا۔ ملازم نے اس کی ہدایت پر صبح صبح روانہ ہونے والی ٹرین میں اس کے لیے بٹنگ کروائی تھی۔ صبح جب وہ اچھو کے ساتھ ناشتا کر کے وہاں سے نکلا تو بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ بدھ بھکشوؤں کے مخصوص لباس میں، ماتھے پر لکیریں کھینچے ٹرین میں سوار ہوتے بوڑھے کو دیکھ کر کون سوچ سکتا تھا کہ وہ بمبئی کا مشہور دادا ربن ہے۔ وہ پولیس والوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے جل دے کر بڑی صفائی سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

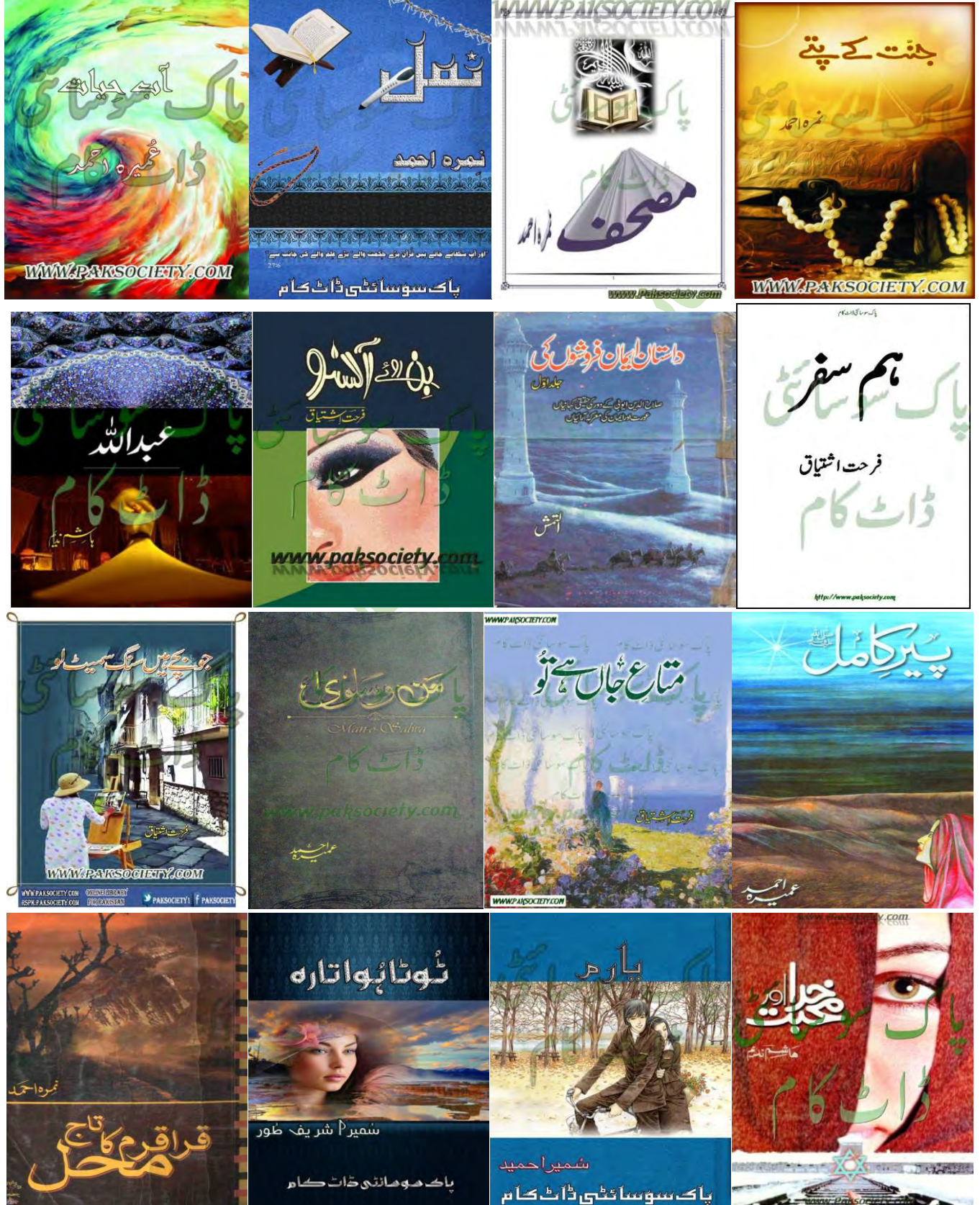
اپنے گلے میں موجود طلائی زنجیر میں پروئے خوب صورت لاکٹ کود کھتے ہوئے جوزفین کی آنکھوں میں انوکھی

چمک تھی اور اس چمک کے آگے لاکٹ میں جڑے ہیرے کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ محبت کے تجربے سے گزرتی وہ آج کل خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں غربت و افلاس اور شدید جدوجہد دیکھی تھی۔ اس کے طبقے کے لوگوں کو زندگی سے اپنا نا تا جوڑے رکھنے کے لیے بڑا کٹھ اٹھانا پڑتا تھا۔ ایسے میں نواب سلیم اللہ کی یہ حویلی تو اس کے لیے کوئی ونڈر لینڈ ثابت ہو رہی تھی۔ قیمتی لباس، ایک وقت میں میز پر سببے انواع و اقسام کے کھانے، مہر قش کرا..... یہ سب اسے پہلے کب میسر آیا تھا۔ نواب سلیم اللہ سے ملنے والی تنخواہ تو خرچ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی اور ساری ضروریات ایسے ہی پوری ہو جاتی تھیں۔ اس قدر آسودگی میں نواب زادہ اسد اللہ کی محبت بھی مل گئی تو وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کرنے لگی۔ خوش قسمتی کے اس احساس میں ڈوبی وہ غریب محلے سے آئی لڑکی بھلا محلاتی سازشوں سے کہاں واقف تھی۔ ہاں اس رات اکا بیگم سے اچانک سامنا ہو جانے پر کچھ خوف زدہ ضرور ہو گئی تھی لیکن بعد میں اسد اللہ کے دلاسوں نے اسے سنبھال لیا اور وہ اسد اللہ کی اس بات سے متفق ہو گئی کہ اکا بیگم سے وہ سامنا محض اتفاق تھا ورنہ اگر ان پر حقیقت کھل گئی ہوتی تو حویلی میں ایک طوفان آ جاتا۔

خاموشی کو امن سمجھنے والوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے بہت بڑا طوفان چھپا ہوا ہے اور کوئی ہے جو بہت خاموشی سے ان کی محبت پر شب خون مارنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اپنے تئیں وہ بہت احتیاط سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے لیکن نہیں جانتے تھے کہ کچھ خفیہ نگاہیں مسلسل ان کی نگرانی کر رہی ہیں۔ کل شب بھی انہوں نے ایسی ہی ایک ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں اسد اللہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ جاگیر کا انتظام دیکھنے کے لیے کچھ دنوں کے لیے اپنی زمینوں پر جا رہا ہے اس لیے کچھ عرصہ اسے جدائی برداشت کرنی ہوگی۔ محبت میں جدائی سہنا سب سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے لیکن بہر حال دنیا کا کاروبار بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ناچار انہیں ایک دوسرے سے رخصت لینی پڑی۔ اسد اللہ کے پیچھے جوزفین کا سارا دن اپنے معمول کے مطابق گزرا لیکن وہ ایک کمی محسوس کرتی رہی اور اب شب ب سری کے لیے بستر پر لیٹی اس کی دی نشانی سے ہی دل کو بہلا رہی تھی۔ یہ لاکٹ بے شک بہت قیمتی تھا لیکن جوزفین کے لیے اس کی اصل اہمیت اس لیے تھی کہ اسد اللہ نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے یہ لاکٹ پہنایا تھا۔ وہ اس



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





لاکٹ پر اسد اللہ کے بس کو محسوس کر سکتی تھی اور بے جان و بے ہوش تھی اسد اللہ کی محبت کی حرارت اور خوشبو کو پاسکتی تھی۔ گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ سے کھیلنے ہوئے اس کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرا رہے تھے۔ دروازے پر دی جانے والی دستک نے اسے اپنے خیالوں سے باہر نکالا۔

”آ جاؤ۔“ اس نے جلدی سے لاکٹ کو گریبان کے اندر چھپایا اور دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔ حسب توقع سروری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دھلے ہوئے استری شدہ کپڑوں کا بندل تھا۔

”معاف کیجیے گا مس صاحبہ، آپ کی نیند خراب ہوئی۔ میں بس آپ کے یہ جوڑے رکھنے کو آئی تھی۔ اکائیگم نے مجھے باورچی خانے کا کام سمیٹنے پر لگا دیے تھے۔ اس واسطے تھوڑی دیر ہو گئی۔“ الماری کھول کر کپڑے اندر رکھتی ہوئی سروری کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

”کوئی بات نہیں سروری۔ میں ابھی سوئی نہیں تھی اس لیے میری نیند بھی خراب نہیں ہوئی۔ تم شرمندہ نہ ہو۔“ جوزفین نے نرمی سے اس سے کہا تو وہ پلٹ کر بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو سروری؟“ جوزفین کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔

”آپ بہت اچھے ہیں مس صاحبہ۔“ سروری نے بڑی بے ساختگی سے اس کی تعریف کی۔

”اچھی تو تم بھی بہت ہو۔ میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔ سچ تمہاری وجہ سے مجھے بہت آرام ہے۔“ جوزفین نے مسکراتے ہوئے پوری سچائی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ”سروری کہاں کی اچھی بری ہے۔ سروری تو بس حکم کی غلام ہے۔ جو حکم ملے میرے کو پورا کرنا پڑتا۔ میرے کو میری غلطیوں کے لیے مجبور سمجھ کر معافی دے دینا۔ آپ مجھے معاف کر دیں گے نا مس صاحبہ؟“ اس کا لہجہ اب بھی عجیب و غریب تھا لیکن جوزفین سمجھ نہیں سکی اور ہنس کر بولی۔

”کیا بات ہے سروری، آج بڑے عجیب موڈ میں ہو..... کہیں اکائیگم سے زیادہ ہی ڈانٹ تو نہیں پڑ گئی؟“ جواب میں سروری زبان سے کچھ نہ بولی اور سر کو زور سے نفی میں جنبش دے کر وہاں سے جانے لگی۔

”بات سنو سروری! اگر ہانسمے کا کوئی چورن وغیرہ ہو تو مجھے دے دو۔ رات کے کھانے کے بعد سے طبیعت کچھ بے چین ہے شاید کھانا زیادہ ہی ہوی تھا۔“ اس نے جاتی ہوئی سروری کو آواز دے کر اس سے کہا تو وہ سر کو ہلکی سی جنبش

دے کر باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی اسے چورن کی ایک ڈبیہ دے گئی۔ جوزفین نے ڈبیہ میں موجود چورن کی تھوڑی سی مقدار پھاکی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ گزشتہ ہفتہ اسد اللہ سے ملاقات کے لیے جانے کے باعث وہ بہت کم نیند لے سکی تھی اور آج دوپہر میں بھی آرام کرنے کے بجائے کتب خانے میں وقت گزارا تھا اس لیے اصولاً آج اسے جلد نیند آ جانی چاہیے تھی لیکن نیند اس سے روٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف دل و دماغ پر اسد اللہ کی یاد نے یلغار کر رکھی تھی تو دوسری طرف طبیعت کا بھاری پن بھی بے چین کر رہا تھا۔ عجیب متکی کی سی کیفیت تھی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے تھوڑا سا چورن اور پھانکا اور کمرے میں ادھر سے ادھر ٹپکتے لگی۔ آخر کار اسے اپنی طبیعت میں تھوڑی بہتری محسوس ہوئی اور وہ دوبارہ سونے کے لیے بستر پر آ گئی۔ اس بار تھوڑی سی کوشش پر ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ اتنی گہری نیند سوئی کہ صبح معمول کے مطابق وقت پر نہیں جاگ سکی۔ اپنے دیر سے اٹھنے پر وہ ہڑبڑا سی گئی اور سر ہانے لگی گھنٹی بج کر سروری کو کمرے میں بلایا۔

”تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں سروری..... اتنی دیر ہو گئی۔ بچے پڑھنے کے لیے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کتنا برا لگے گا میرا اتنی لیٹ انہیں پڑھانے کے لیے جانا۔ آپا بیگم الگ ناراض ہوں گی۔ انہوں نے پہلے دن ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں پر ہر کام کے اوقات مقرر ہیں اور مجھے بھی اس پابندی پر عمل کرنا ہوگا۔“ سروری کو اس کی کوتاہی پر ڈانٹتی وہ خاصی پریشان ہو رہی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہو مس صاحبہ۔ میں اکائیگم کو صبح اچ بتا دی تھی کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور انہوں نے آپا بیگم سے آپ کی چھٹی کے لیے بات کر لیے تھے۔ اس واسطے اچ میں آپ کو آرام سے سوتے رہنے دی۔ آپ بولو آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ناشتے میں آپ کیا کھائیں گے؟“ اس کی پریشانی کے جواب میں سروری نے کمال اطمینان سے اسے تسلی دی تو اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے گہری سانس لیتے ہوئے بیڈ کراؤن سے اپنا سر ٹکا لیا۔ طبیعت کا پوچھل پن اب بھی برقرار تھا اور وہ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے سستی سے بولی۔

”ناشتے دانستے کو رہنے دو۔ میں پہلے نہاؤں گی تاکہ طبیعت فریش ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں غسل خانہ تیار کر دیتی ہوں۔“ سروری نے حکم کی تعمیل کی اور الماری سے کپڑے وغیرہ



اسے منہ چڑا رہی تھی۔

”کھولے اس پوٹلی کو۔“ آپا بیگم نے جلائی لہجے میں حکم دیا تو اکا بیگم نے پوٹلی کے منہ پر بندھی ریشمی ڈوری کی گرہ کھول کر اسے بستر پر الٹ دیا۔ گئی قیمتی زیورات نکل کر بستر پر بکھر گئے۔ جوزفین نے حیرت سے ان زیورات کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ صاحب زادی عالیہ کے زیورات ہیں۔ کل شام ہی جب وہ حسب معمول عالیہ کو پڑھانے اس کے کمرے میں گئی تھی تو عالیہ اپنے سامنے یہ زیورات بکھرائے بیٹھی تھی۔ اس نے زیورات جوزفین کو دکھاتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کی والدہ نواب بیگم نے اسے اس کی شادی پر دینے کے لیے یہ زیورات بنوائے ہیں۔ جوزفین نے دل کھول کر ان خوب صورت و قیمتی زیورات کی تعریف کی تھی۔ تعریف سن کر عالیہ خوش ہو گئی تھی اور پھر ان زیورات کو سمیٹ کر اس کے سامنے ہی الماری میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد حسب معمول جوزفین نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ دوران پڑھائی عالیہ اپنی والدہ کے بلا دے پر کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر بھی گئی تھی اور شاید یہیں سے جوزفین کے لیے شک کی بنیاد پڑی تھی۔

”اب آنکھیں بھاڑے کیا دیکھ رہی ہو۔ صاحب زادی عالیہ نے سادگی میں تمہیں اپنے اتنے قیمتی زیورات دکھائے تو تمہاری نیت خراب ہو گئی اور موقع پاتے ہی تم نے انہیں چرا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اگر عالیہ کو بروقت زیورات کی چوری کا علم نہ ہو جاتا تو یقیناً تم کسی بہانے سے انہیں لے کر یہاں سے فرار ہو جاتیں۔“ آپا بیگم اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہی تھیں۔ طبیعت کی خرابی کے باعث وہ پہلے ہی نڈھال تھی، اتنے بڑے الزام کو سن کر اس کا سر اور بھی بری طرح چکرانے لگا۔

”میں نے یہ جیولری چوری نہیں کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے میری الماری میں آ گئی۔“ کمزور آواز میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس کی نظر سروری پر پڑی۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے نظریں چرا لیں۔ یکدم ہی جوزفین پر بہت کچھ منکشف ہو گیا۔ رات سروری کا اس کے کپڑے لا کر رکھنا اور خود کو مجبور ظاہر کرتے ہوئے بلا وجہ ہی معافی طلب کرنا، بے معنی نہیں تھا۔ اس حویلی میں اس کے خلاف باقاعدہ ایک سازش تیار کی گئی تھی اور شاید اس سازش میں حویلی کی ساری کرتادھرتا خواتین شامل تھیں۔ سازش کی وجہ وہ خود بھی جانتی تھی۔ اس نے اس اونچی حویلی میں رہنے والے نواب زادے سے محبت کی بھی اور یہاں بسنے کے

نکا لنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جوزفین کو غسل خانہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ جوزفین نہا کر نکلی تو سروری تازہ پھلوں کے رس کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ جوزفین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گلاس لبوں سے لگایا۔ ابھی اس نے مشکل سے آدھا گلاس ہی پیا ہوگا کہ اس کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں آپا بیگم، عالیہ اور نواب بیگم موجود تھیں۔ ساتھ ہی سروری اور اکا بیگم بھی سودبانہ انداز میں نظر آرہی تھیں۔ اس پوری فوج کو دیکھ کر اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا اور وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”آپ لوگ یہاں..... کوئی کام تھا تو مجھے بلوایا ہوتا۔“ حیران پریشان وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

”نگو بی بی۔ تم جیسے فنکاراں تو قدر کرنے کے لائق ہوتے ہیں اس لیے ہم تمہیں زحمت نہیں دیے اور خود یہاں چلے آئے تاکہ تمہیں تمہاری فنکاری کی داد دے سکیں۔“ آپا بیگم کے لہجے میں سانس کی سی پھینکا رہی البتہ ان کے ساتھ آئی دیگر خواتین لب بستہ کھڑی ہوئی تھیں۔

”جج..... جی۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی۔“ جوزفین مزید بوکھلاہٹ کا شکار ہوئی۔

”ابھی سب سمجھ آ جائے گی۔ اکا بیگم اور سروری آپ دونوں کمرے کی تلاشی لیجیے۔“ اسے کڑوے لہجے میں جواب دیتے ہوئے آپا بیگم نے اپنی ملازماؤں کو حکم سنایا۔ اس حکم پر دونوں فوراً حرکت میں آئیں اور کمرے کی ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

”پلیز مجھے بتائیں تو کہ یہ سب کیا ہے اور آپ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں؟“ اس اٹھانچ پر جوزفین نے ہراساں ہو کر ڈھائی دی۔

”صاحب زادی عالیہ کے وہ زیورات تلاش کر رہے ہیں جو رات تم نے بہت چالاکی سے چرا لیے تھے اور اب شاید یہاں سے فرار کی ترتیبیں سوچ رہی تھیں۔“ آپا بیگم نے کاٹ دار لہجے میں اسے جواب دیا تو اس کا بدن سنسناتا اٹھا اور وہ چیخ کر بولی۔

”آپ مجھ پر غلط الزام لگا رہی ہیں۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے۔“

”اچھا تو پھر وہ کیا ہے؟“ آپا بیگم نے طنز سے اشارہ کیا۔ اس نے ان کے اشارے کی سمت دیکھا۔ اکا بیگم الماری سے تہ کیے ہوئے کپڑے نکال کر ان کی تہ کھول رہی تھیں اور ایک دوپٹے میں لپٹی سرخ چمکی پوٹلی سامنے آ کر



خواب دیکھنے لگی تھی۔ حویلی والوں کے لیے وہ نخل میں ناٹ کے بیوند کے مانند بھی چٹانچہ انہوں نے اسے حویلی بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ موقع چٹا گیا تھا جب صاحب زادہ اسد اللہ حویلی میں موجود نہیں تھا۔ صورت حال کو سمجھ کر اس کے ہاتھ پاؤں اور بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اس انجام سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی تدبیر نہیں تھی۔

”سروری.....“ اس کے لرزاں وجود پر ایک قہر بھری نظر ڈالتے ہوئے آپا بیگم نے ملازمہ کو پکارا اور پھر حکم صادر کیا۔ ”اس لڑکی کا سارا سامان باندھ کر اس کے حوالے کرو اور اسے حویلی کے دروازے سے باہر چھوڑ آؤ۔ اس حویلی میں کسی چور کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ بے رحمی سے حکم صادر کرنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں اور گردن اکڑائے یاہر نکل گئیں۔ جوزفین کے اندراب اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے چٹانچہ بستر کے کنارے پر تنک گئی اور رحم طلب نظروں سے عالیہ اور نواب بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ عالیہ تو نظر جھرا کر فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئی لیکن نواب بیگم اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

”ہمیں افسوس ہے لیکن ہم آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی اور فوراً اس حویلی سے جانا ہوگا۔ یہاں آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ نواب بیگم کے ادا کیے جملے معنی خیز تھے۔ شاید وہ اسے بتا رہی تھیں کہ اسد اللہ سے محبت کرنے کے جرم کو معاف نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے اس حویلی میں جگہ مل سکتی ہے۔ جوزفین کا دل چاہا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر ان سب کی سازش کو بے نقاب کرے اور اعلان کر دے کہ اسد اللہ کے واپس آنے تک وہ یہاں سے نہیں جائے گی لیکن نواب بیگم کے اگلے جملوں نے اسے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دینے پر مجبور کر دیا، وہ کہہ رہی تھیں۔

”آپا بیگم تو آپ کو چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دینے کی خواہش مند تھیں لیکن ہمیں آپ کی کم عمری پر ترس آگیا اور ہم نے یہ مشکل انہیں اس بات پر راضی کیا کہ آپ کو محض ملازمت سے برخاست کر دینے پر اکتفا کر لیا جائے۔ اس سے پہلے کہ ان کا مزاج مزید برہم ہو اور وہ دوبارہ اپنا فیصلہ بدل لیں، بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔“ اسے مشورہ دینے کے بعد انہوں نے بھی کرا چھوڑ دیا۔ اس عرصے میں سروری خاموشی سے اس کا سامان باندھتی

رہی تھی اور ایک بیگم کھڑی نگرانی کر رہی تھیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس سلوک پر جوزفین کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن کسی سے کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس سازش کے اہم مہرے سروری سے بھی کوئی شکایت نہیں کی اور اسے اپنا سامان باندھتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”چلیں مس صاحبہ! میں آپ کو حویلی کے بیرونی دروازے پر چھوڑ آتی ہوں۔“ سامان باندھ چکنے کے بعد سروری نے اس سے دھیمی آواز میں کہا تو وہ کسی معمول کی طرح کھڑی ہو گئی اور سروری کے ساتھ چل پڑی۔ زنان خانے سے حویلی کا بیرونی پھانک خاصے فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ جب وہ اس حویلی میں داخل ہوئی تھی تو ایک شاندار گاڑی میں سوار تھی اور اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ خود نواب زادہ اسد اللہ نے سنبھال رکھی تھی۔ چند ماہ قبل ملنے والی اتنی عزت کے بعد وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس حویلی سے یوں نکالی جائے گی کہ اس پر چوری جیسے قبیح فعل کا الزام ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ الزام محبت کا تاوان ہے اور اس نے یہ تاوان بغیر کسی احتجاج کے بہت خاموشی سے ادا کر دیا تھا اور اب یہ دیکھنے کی منتظر تھی کہ نواب زادہ اسد اللہ محبت کے امتحان سے کیسے گزرتے ہیں۔ اگر وہ سچے تھے تو انہیں یقین ہونا چاہیے تھا کہ جوزفین پر لگا الزام جھوٹا ہے۔ اس یقین کی صورت میں ہی وہ ہر مشکل سے گزر کر اس تک پہنچ سکتے تھے۔

”آپ بولیں مس صاحبہ تو آپ کو تا نگے میں اسٹیشن تک چھڑوا دوں۔“ سروری کی آواز نے اسے خیالات کے جھوم سے نکالا۔

”اسٹیشن..... اسٹیشن پر کیوں؟“ اس نے حیرت سے ایسے پوچھا جیسے سروری نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔ ”آپ کو بمبئی واپس جانا ہوگا اور ادھر جانے کو ریل گاڑی تو اسٹیشن سے ہی ملیں گی نا.....!“ اس کی حیرت پر سروری نے کچھ حیرانی سے وضاحت کی۔

”بمبئی واپس جانا ہوگا..... نہیں، میں نواب زادہ اسد اللہ سے ملے بغیر بمبئی واپس نہیں جاؤں گی۔ میں بمبئی حیدرآباد میں رہوں گی۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے ساتھ ہی اسے وہ مشفق خاتون صبیحہ بیگم یاد آئیں جو حیدرآباد آتے ہوئے اس کی ہم سفر تھیں اور جنہوں نے بڑے خلوص سے اسے پیشکش کی تھی کہ اگر اسے نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت نہ ملے تو وہ نواب فراست بیگ کی کوٹھی پر چلی آئے۔ صبیحہ بیگم نواب



کر دیا تھا اور ساتھ ہی چنڈی گڑھ کے اڈے پر بھی کہہ آیا تھا کہ ان لوگوں کی خبر گیری کرتے رہیں۔

چنڈی گڑھ کے اڈے والوں سے شملہ جاتے وقت ان لوگوں کا اچھا یا رانہ ہو گیا تھا اور وہ پہلے ہی دیدہ و دل فرس راہ کیے بیٹھے تھے کہ واپسی میں وہ لوگ یہاں آئیں گے تو ان کی مہمان داری کریں گے۔ مہمان بننے سے تو فاروق نے وقت کی قلت کے باعث معذرت کر لی البتہ منو پہلوان کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ بمبئی چل سکتا ہے۔ منو پہلوان جو پہلے ہی سے بمبئی دیکھنے کا خواہش مند تھا فوراً راضی ہو گیا اور اپنے چاچا سے اجازت لے کر سامان باندھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ریل گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار اب وہ چاروں بمبئی کی سمت سفر کر رہے تھے۔ منو پہلوان اس سفر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گولو اور کیہترائیں بھی اس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے لیکن فاروق پر خاموشی طاری تھی۔ اس کا دماغ چاند بانو کے لیے سلگ رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ اس کا انتقام لیے بغیر سکون نہیں پاسکے گا۔ اس کا دل تو یہ چاہتا تھا کہ یہاں سے سیدھا بملا گئے پاس پہنچے اور اس سے حساب کتاب کرے لیکن پھر اس نے سوچا کہ بملا سے حساب کتاب کرنے سے قبل کنیش کی گردن تاپی جائے اور اس سے ساری سچائی اگلا کر پہلے اپنے شکوک اور اندازوں کی تصدیق کر لی جائے تو پھر مح ثبوت بملا سے حساب کرے گا۔ کنیش تک پہنچنے کے لیے اس کا بمبئی پہنچنا ضروری تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اپنے تئیں ”کام“ نمٹا لینے والا کنیش واپس شملہ جانے کے بجائے سیدھا بمبئی پہنچے گا۔ بمبئی بھائیہ سیٹھ کا ٹھکانا تھا اور کنیش بھائیہ سیٹھ کے لیے ہی کام کرتا تھا۔

”فاروق بھرا! آؤ کچھ روٹی فکر کر لو۔“ کھڑکی کے قریب بیٹھا وہ آسمان کے آنچل پر نکلے ستاروں کو بونہی خالی نظروں سے دیکھتا۔ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ پہلوان کی آواز نے اسے چونکا یا۔

”تسی تو لگدا اے ساڈے نال ہو ہی نہیں۔ کدھر کھوئے ہوئے ہو؟“ منو پہلوان نے اپنی پتھر جڑی انگوٹھیوں سے بھرے ہاتھ کو لہراتے ہوئے اس سے شکوہ کیا۔ اپنے بھاری جے پر ریشمی زمین لباس چڑھائے وہ اس سفر کے دوران خاصا خوش نظر آ رہا تھا اور اس کی یہ معصومانہ خوشی دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چنڈی گڑھ کے اڈے کی گدی پر بیٹھنے والا وہ دادا ہے جس کا زور پورے شہر میں چلتا ہے۔ اصل میں موہن داس عرف منو ابھی اتنا زیادہ تجربہ کار

بیگ کی حویلی میں برسوں سے ملازم تھی اور ملازمین میں ان کی جو عزت اور مقام تھا، اس کی بنیاد پر انہیں یقین تھا کہ ان کی سفارش پر جوزفین کو نواب فراست بیگ کے ہاں کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور مل جائے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسد اللہ کی واپسی تک وہ صبیحہ بیگم کے پاس جا کر رہ لے گی۔

”آپ کیا بول رہے ہیں مس صاحبہ! میرے کو بالکل سمجھ نہیں آرہی۔ کیا ریلوے اسٹیشن نہیں جانے کا ہے؟“ اس کی بڑبڑاہٹ سے اندازہ لگاتے ہوئے سروری نے پوچھا۔ ”تھینک یو سروری! مجھے تمہاری خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے جہاں جانا ہوگا، خود چلی جاؤں گی۔“ اس نے سروری کے ہاتھ میں موجود بیگ جھپٹا اور قدرے تلخ لہجے میں کہہ کر باقی رہ جانے والا چند قدم کا فاصلہ طے کر کے حویلی کے پھانک سے باہر نکل گئی۔ اس کے اس عمل پر سروری جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی جبکہ جوزفین باہر نکل کر پیدل ہی ایک سمت چل پڑی تھی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے سواری مل گئی۔ صبیحہ بیگم کا دیا ہوا پتا اس کے پاس محفوظ تھا لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور کوچوان کو نواب فراست بیگ کا نام بتا دینا ہی کافی ثابت ہوا۔ فراست بیگ کی حویلی میں صبیحہ بیگم نے خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بڑی محبت سے گلے لگایا۔ وہ جواب تک کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھی، ان کی محبت بھری ہانہوں کے حصار میں آتے ہی سارے حوصلے چھوڑ بیٹھی اور کسی بھر بھری دیوار کی طرح ڈھتی چلی گئی۔

☆☆☆

ربن نے تو احتیاط کے پیش نظر رامو کو ہدایت کر دی تھی کہ فاروق کو واپس نہ آنے کا تاریخ دے لیکن فاروق تار کے پہنچنے سے قبل ہی واپسی کے لیے چل پڑا تھا۔ چاند بانو پر کیے گئے قاتلانہ حملے نے اس کے دل و دماغ میں آگ سی لگا دی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سازش کے ذمے داروں کو ان کے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہیں لے گا۔ اس فیصلے کو کر چکنے کے بعد اس نے شملہ جا کر اپنا سامان لینا تک گوارا نہیں کیا تھا اور چنڈی گڑھ سے ہی واپسی کی ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔ شملہ سے سامان لانے کی ذمے داری اس نے اڈے سے آنے والے دونوں افراد کو سونپ دی تھی اور خود گولو اور کیہترائیں کے ساتھ عازم سفر ہوا تھا۔ چاند بانو کی طرف سے اسے یوں فکر نہیں تھی کہ اب اس کے پاس کا جل اور ملازم خاص موجود تھا۔ وہ دونوں اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکتے تھے۔ رقم کا بندوبست اس نے



کر لیا۔ وہ ماجد علی تھا۔ اس شخص سے ان کی چندی گڑھ جاتے ہوئے ریل میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بمبئی سے شکنتلا نامی ایک نو عمر امیر زادی کو ورغلا کر اس کے قیمتی زیورات سمیت اسے چندی گڑھ لے جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چندی گڑھ پہنچ کر شکنتلا کے زیورات ہتھیا لے گا اور اسے کسی کے ہاتھ بیچ دے گا لیکن ربن کے درمیان میں پڑنے سے وہ اپنے اس ارادے میں ناکام رہا۔ بعد میں اس نے چندی گڑھ میں بھی شکنتلا کو تنگ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی تھی اور اسے منو پہلوان اور اس کے چاچا کپل داس نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے تھانے میں بند کر دیا تھا۔ وہاں سے یہ شخص شاید کسی طرح ساز باز کر کے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا، فاروق وغیرہ کو اس نے چندی گڑھ میں دیکھا ہوگا تو اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہوگی اور اس آگ کو بجھانے کے لیے ہی اس وقت وہ فاروق پر حملہ آور ہوا تھا۔

فاروق نے اس کے پہلے حملے سے بچ جانے کے بعد نہایت چابکدستی سے اپنی جیب میں ہمد وقت پڑا رہنے والا چاقو باہر نکال لیا تھا لیکن چاقو نکال لینے کے باوجود اس نے ماجد علی پر اس کا استعمال نہیں کیا۔ اس کی تیز نگاہوں نے ماجد علی کے چاقو تھامنے کے انداز کو دیکھ کر بھانپ لیا تھا کہ اس شخص کو چاقو سنبھالنے کا ہنر نہیں آتا اور نہ ہی وہ اس کی چاقو زنی کے آگے ٹھہر سکتا ہے۔ ایسے اناڑی پر اپنے چاقو کا استعمال کرنے کے بجائے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے یونہی قابو کیا جائے۔ اس نے ماجد علی کے دوسرے وار سے قبل ہی تیزی سے اپنی لات چلائی جس کے نتیجے میں وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا لیکن گرنے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری اور نیچے پڑے پڑے ہی ہاتھ میں موجود چاقو فاروق کو کھینچ مارا۔ فاروق نے بروقت جھکائی دے کر خود کو اس کے وار سے بچایا۔ چاقو آواز کے ساتھ نیچے گرا۔ فاروق کو اندازہ تھا کہ شور کی آواز سوتے ہوئے مسافروں کو جگا دے گی۔ اس نے اپنا نکالا ہوا چاقو واپس جیب میں ڈال لیا۔ یوں بھی ماجد علی اب نہ تھا اور وہ اس سے ہتھیار کے بغیر بھی نمٹ سکتا تھا۔ چاقو رکھ کر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ماجد علی کو اپنے گھونٹوں کی زد پر رکھ لیا۔ اپنے بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بھی دو چار لٹے سیدھے ہاتھ چلائے اور ساتھ ساتھ بلند آواز میں دھمکیاں بھی دیتا رہا۔ اس کی دھمکیوں میں جان سے مار دوں گا اور چھوڑوں گا نہیں تجھے..... جیسے جملے واضح تھے۔ اس کی

نہیں تھا اور اس کے پیچھے اس کے چچا کپل داس کا دماغ چلتا تھا۔ کپل داس بھتیجے کی پشت پر تھا اور اسے اس کی طاقت اور پھرتی کا درست طور پر استعمال کرنا سکھاتا رہتا تھا۔

”میں یہیں ہوں پار۔ بس زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے اور سفر میں خاموشی سے باہر کا نظارہ کرنا اچھا لگتا ہے اس لیے تم ایسا محسوس کر رہے ہو۔“ فاروق نے اس کی دل جوئی کے لیے وضاحت کی۔

”کوئی گل نہیں جیسی تہاڑی خوشی دیے رہو، پر کچھ کھانا پینا تو کر لو۔ خالی پیٹ تو کچھ وی چنگا نہیں لگدا ہے۔“ منو بشارت سے ہنسا اور ایک بار پھر اسے کھانے کی دعوت دی تو اس نے انکار نہیں کیا اور ان تینوں کے قریب آ بیٹھا۔ اس گفتگو کے دوران کیتھرائن دسترخوان لگا چکی تھی۔ وہ معاملہ فہم لڑکی تھی اور فاروق کے مزاج کو کافی حد تک سمجھ چکی تھی اس لیے اسے غیر ضروری طور پر ڈسٹرب کرنے سے گریز کرتی تھی۔ اب بھی اس نے نہایت خاموشی سے کھانا لگایا تھا۔ فاروق کھانا کھانے بیٹھا تو اسے بے ساختہ ہی بمبئی سے اپنا روانہ ہونا یاد آیا۔ اس روز چاند بانو بطور خاص اسے رخصت کرنے اسٹیشن پر آئی تھی اور اس کے بازو پر امام ضامن باندھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ انواع و اقسام کے کھانوں سے بھرا تو شے دان بھی لے کر آئی تھی اور دوران سفر ان کھانوں کی لذت نے خوب لطف دیا تھا۔ اب وہ واپس بمبئی جا رہا تھا تو بھی وقت رخصت چاند بانو سے مل کر آیا تھا لیکن اس حال میں کہ وہ بے چاری اسپتال کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کاش اس نے بھی کوئی امام ضامن چاند بانو کے بازو پر باندھا ہوتا۔

بہت حسرت سے سوچتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کا ساتھ دینے کے لیے کھانا زہر مار کرنے لگا۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر جا بیٹھا۔ باہر اندھیرے میں دیکھنے کو کیا دھرا تھا۔ سارے مناظر تو اس کے اپنے ذہن میں جھے ہوئے تھے۔ وہ ادھر ادھر کی سیکڑوں باتیں بیک وقت سوچتا رہا۔ اس کے ساتھی بھی کچھ دیر بعد اپنے اپنے مشاغل ترک کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اسے کافی دیر بعد بیت الخلا جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اپنی جگہ سے اٹھا۔ باہر قدم رکھتے ہی اسے اپنے پیچھے ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بہت تیزی سے پلٹا اور یہ پھرتی ہی اس کے کام آگئی ورنہ چمکتا ہوا چاقو کا پھل اس کی پشت میں اتر چکا ہوتا۔ جس جگہ وہ موجود تھا وہاں روشنی بہت کم تھی پھر بھی اس نے حملہ آور کو شناخت



مسلل تواضع کے دوران فاروق نے اپنے ارد گرد لوگوں کی آوازوں کو سنا اور اپنے ہاتھوں کی رفتار دہیسی کر لی۔

”چھڈنا نہیں..... کو۔ بھر کس نکال دو..... کا۔“ اسے اپنی پشت پر منو پہلوان کی جوش بھری آواز سب سے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی جو بڑے فرائے سے ماجد علی کے لیے اعلیٰ پائے کی گالیوں کا استعمال کر رہا تھا۔

”اسٹاپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔“ سب آوازوں کے بیچ سنائی دینے والی یہ آواز ریلوے گارڈ کی تھی۔ فاروق نے اس آواز کو سن کر اپنے ہاتھ روک لیے اور پیچھے ہٹ گیا۔ مقابلے کی ناکام کوشش کرنے والا ماجد علی بھی فوراً فرش پر ڈھے گیا۔

”یہ کیا ہو رہا تھا مسٹر..... یہ کیسا ہنگامہ تھا؟“ گارڈ نے قریب آ کر سخت لہجے میں فاروق سے دریافت کیا۔

”اس شخص نے چاقو سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ شاید کوئی اچکا ہے جو مسافروں کو لوٹنے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گیا ہے۔“ فاروق نے مہذب لب و لہجے میں گارڈ کی بات کا جواب دیا۔ ردعمل میں ماجد علی اسے تنگی گالیاں دینے لگا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اس شخص پر کوئی جنون سا طاری ہے۔ اس کے انداز و اطوار سے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک اسکول ٹیچر ہے۔ اصل میں ایک طرف وہ شکنتلا کے باپ سے اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی رقم کے حصول کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ربن اینڈ کمپنی کی مداخلت سے اس کے دونوں ہی مقاصد پورے نہیں ہو سکے اور الٹا اسے حوالات کی ہوا کھانی پڑی اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہی بدکا ہوا تھا۔

”آپ لوگ اپنے ٹکٹ چیک کروائیں۔“ گارڈ نے بیک وقت فاروق اور ماجد علی کو حکم دیا۔ گولو نے فوراً ٹکٹ لا کر پیش کر دیے۔ وہ فرسٹ کلاس کے مسافر تھے۔ گارڈ نے اپنے ہاتھ میں موجود تیز روشنی والی ٹارچ کی روشنی میں ان کے ٹکٹوں کا جائزہ لیا اور ماجد علی سے ایک بار پھر ٹکٹ دکھانے کا تقاضا کیا۔ وہ ٹکٹ پیش نہیں کر سکا۔ شاید اس کی ٹکٹ خریدنے کی استعداد ہی نہیں تھی۔ اس کا حال بھی خاصا ایتھر نظر آ رہا تھا۔ ملگجی لباس، بڑھی ہوئی شیو، سنولائی ہوئی رنگت، وہ کہیں سے بھی تو خوش شکل ماجد علی دکھائی نہ دیتا تھا۔ حالانکہ پہلی بار ملاقات ہونے پر وہ انہیں خاصا خوش رو اور نفاست پسند نوجوان دکھائی دیتا تھا۔

”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ ماجد علی کے ٹکٹ پیش نہ کرنے پر گارڈ نے اس سے سخت لہجے میں کہا۔ وہ

فاروق کو کینہ تو زلفروں سے دیکھتا ہوا اس حکم پر کھڑا ہو گیا اور قدم آگے بڑھائے لیکن پھر اس نے ایک ایسی غیر متوقع حرکت کی کہ اس کی امید فاروق تو کیا، کسی کو بھی نہیں تھی۔ اس نے یکدم ہی فاروق کو زوردار دھکا دیا اور پھر اس سے چمٹ کر رہ گیا۔ ایک تو اس کی حرکت غیر متوقع تھی، دوسرے وہ جنون کی سی کیفیت میں تھا اور اس کیفیت میں آدمی کی طاقت عام حالات کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ فاروق اس کے ساتھ لڑھکتا ہوا چلتی ہوئی ریل گاڑی کے کھلے دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس صورت حال پر کئی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ماجد علی کے ارادے صاف ظاہر تھے۔ وہ فاروق کو چلتی ہوئی ریل گاڑی سے نیچے دھکیل دینا چاہتا تھا۔ فاروق نے بھی اس بات کو بھانپ لیا اور دروازے کی چوکھٹ میں پاؤں اڑا کر خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے کے ساتھ بری طرح چمٹے ہوئے ماجد علی کو اپنے سے الگ کرنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اسے اس کام میں اس لیے بھی مشکل پیش آرہی تھی کہ ماجد علی صرف اسے دھکیل ہی نہیں رہا تھا بلکہ جنگلی جانور کی طرح بے دریغ دانتوں کا استعمال کرتے ہوئے جگہ جگہ کاٹتا بھی جا رہا تھا۔ فاروق کا ایک ہاتھ اس کی گرفت میں تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے دفاع کی کوشش کر رہا تھا۔ چلتی ٹرین کے کھلے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ جدوجہد کرنا آسان نہیں تھا۔ فاروق نے ماجد علی کی وحشت کو قابو میں کرنے کے لیے اس کے سر کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے کر جھنکا دیا لیکن اس میں تو کسی جن کی روح سنائی ہوئی تھی۔ جواب میں وہ درندے کی طرح غرایا اور اپنی گرفت میں موجود فاروق کی کلائی کو بھینچوڑ کر رکھ دیا۔ فاروق نے بلبل کر اس کو ایک اور زوردار جھنکا دیا اور یہ وہ پل تھا جب ان دونوں ہی کا توازن بری طرح بگڑ گیا۔ فاروق کا دروازے کے فریم میں پھنسا پاؤں اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اسے لگا کہ وہ اڑ کر ٹرین سے باہر جا گرے گا لیکن اللہ کی مہربانی سے دروازے کا ہینڈل بروقت اس کے ہاتھ کی گرفت میں آ گیا اور وہ خود کو گرنے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا، البتہ ماجد علی ایسا نہیں کر سکا اور ایک وحشیانہ سی چیخ کے ساتھ اڑتا ہوا کھلے دروازے سے باہر نکلا۔ فاروق نے بے ساختہ ہی اپنے دوسرے ہاتھ سے اسے تھام کر گرنے سے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ جس تیزی سے باہر نکلا تھا، وہ رفتار فاروق کی کوشش کو ناکام بنا گئی اور ماجد علی کے لباس کا کوئی حصہ ذرا کی ذرا اس کے ہاتھ کی گرفت میں آ کر فوراً ہی چھوٹ گیا۔ اس کوشش میں



نت نئے کرداروں کو الفاظ کے حسین  
تالاب میں ڈھالتی پُراثر اور  
حساس تحریروں کی حنائی

ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی

مایہ ناز مصنفہ محترمہ

# رفعت سراج

کے متیق و مسلم کا ایک اور شاہکار ناول

عظیم شاعر مرزا اسد اللہ غالب

کی لازوال شاعری کے ایک

قطعے سے مستعار لیا عنوان

..... یہ

کہاں بچیں

کہ دل ہے

انشاء اللہ شمارہ اگست 2016ء پاکیزہ کے

صفحات کی زینت بنے جا رہا ہے

دروازے کا ہینڈل تھا مے فاروق کو بھی ایک زوردار جھٹکا لگا  
اور یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنا توازن کھو کر خود بھی نیچے  
جا گرے گا لیکن اس نے ہینڈل پر سے اپنی گرفت ڈھیلی  
نہیں ہونے دی اور ایک بار پھر دروازے کی چوکھٹ میں  
پاؤں لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس موقع پر عالم اضطراب  
میں آگے بڑھ کر آجانے والے منونے اسے سہارا دیا تو وہ  
دروازے سے ہٹ کر اندر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی  
وقت آہستہ ہو جانے والی ریل گاڑی بھی رک گئی۔

اصل میں گارڈ نے ماجد علی کو فاروق کو باہر دھکیلتے دیکھ  
کر زنجیر کھینچ دی تھی۔ برق رفتاری سے چلتی ٹرین کو رکنے میں  
کچھ وقت لگتا ہے اور یہ چند سیکنڈ ہی ماجد علی کی زندگی کا فیصلہ  
کر گئے تھے۔ ٹرین رکتے ہی فاروق، گارڈ اور منوسبت کئی  
افراد نے نیچے چھلانگ لگائی۔ گارڈ کے پاس تیز روشنی والی  
ٹارچ تھی۔ اس کی راہنمائی میں سب بد نصیب ماجد علی کی  
کھوج میں نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں زیادہ وقت کا سامنا  
نہیں کرنا پڑا۔ اندیشوں کے عین مطابق انہیں ماجد علی کا  
دریدہ جسم پٹری پر پڑا مل گیا۔ وہ بہت بری طرح کچلا گیا تھا  
اور ناک نقشہ مٹ جانے کے علاوہ اس کے کئی اعضا بھی الگ  
ہو گئے تھے۔ دیکھنے والوں کو اس لرزہ خیز منظر پر اپنی آنکھیں  
بند کر لینی پڑیں۔ دو چار کی تو سسکاریاں بھی نکل گئیں۔

اب وہاں صرف ان کے ڈبے کے مسافر نہیں تھے  
بلکہ زنجیر کھینچے جانے پر صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے  
آنے والے عملے کے افراد اور آوازوں پر دوسرے ڈبے  
سے برآمد ہونے والے پُر تجسس مسافر بھی شامل ہو گئے  
تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیرانہ انسانی آوازوں سے بھر  
گیا۔ ہر کوئی حقیقت حال جاننے کی کوشش کرتا ہوا اپنے  
اپنے طور پر تبصرے بھی کر رہا تھا۔ ساری صورت حال کے  
چشم دید گواہ ریلوے گارڈ نے ایک طرف لے جا کر عملے  
کے افراد کو مختصر صورت حال سے آگاہ کیا اور اس کے بعد وہ  
لوگ اپنی کارروائی نمٹانے لگے۔ مسافروں کو واپس ان کے  
ڈبوں میں بھیجا گیا۔ فاروق اور اس کے ساتھی بھی اپنی جگہ  
پر واپس بھیج دیے گئے اور ان کی نگرانی کے لیے ایک گارڈ  
بھی مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاید انہوں نے ماجد علی کے  
دریدہ جسم کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا ہوگا لیکن اس کارروائی کو  
دیکھنے کے لیے کسی مسافر کو باہر رکنے کی اجازت نہیں دی گئی  
تھی۔ انتظار کا بوجھل مرحلہ بھی بالآخر گزر رہی گیا اور دیرانے  
میں کھڑی ریل گاڑی ایک بار پھر حرکت میں آگئی۔ اس  
دوران میں کیتھرائن نے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ



واپس لوٹ گئی تھی۔ انہوں نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ جب تک چاہے یہاں اطمینان سے رہ سکتی ہے۔ وہ اپنے طور پر معلوم کرواتی رہیں گی کہ اسد اللہ جاگیر سے واپس لوٹ کر آگئے ہیں یا نہیں۔

حقیقتاً صبیحہ بیگم نے اسے بے حد سہارا دیا تھا اور وہ پورے آرام سے ان کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی لیکن اس کی طبیعت کا اضطراب اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ بار بار اپنی بے عزتی کو یاد کر کے آنکھیں بھر آتی تھیں۔ مستقبل کے خدشات بھی اپنی جگہ تھے۔ وہ سارا دن یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہتی تھی۔ صبیحہ بیگم حویلی کے باورچی خانے میں بننے والے بہترین کھانے خوان میں سجا کر اس کے سامنے لا کر رکھتیں لیکن اس سے کچھ کھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ سینے پر جیسے کوئی بوجھ سا دھرا رہتا تھا۔ وہ بہت مشکل سے ہی چند لقمے زہر مار کر پاتی تھی۔ اس وقت بھی صبیحہ بیگم اسے کھانے کا خوان دے کر زنان خانے سے آنے والے پیغام پر بڑی بیگم صاحبہ کی خدمت میں گئی ہوئی تھیں۔ بڑے سے خوان میں خاص ترکیب سے سکھائے گئے گوشت کے تلے ہوئے لمبے اور پتلے پارچے، بگھارے بیٹکن، گوشت، لوکی اور دال سے تیار کردہ دالچہ، بگھارے چاول اور لوکی کا حلوا موجود تھا۔

جوزفین کا حیدر آباد آمد کے بعد ان کھانوں سے تعارف ہوا تھا اور اس نے انہیں اتنا لذیذ پایا تھا کہ شوق میں خود کئی چیزیں پکانا سیکھ لی تھیں۔ اس کے دل میں بڑا ارمان تھا کہ اسد اللہ سے شادی کے بعد وہ خود اپنے ہاتھوں سے یہ کھانے تیار کر کے انہیں کھلائے گی۔ بے شک حویلی میں بے شمار ملازما ہیں لیکن ایک محبت کرنے والی و فادار بیوی کے ہاتھ سے پکا ہوا کھانے میں اسد اللہ کو جو لطف آتا، اس کا تو کسی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر ہونا تھا یا نہیں، اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی میں ہوتا ابھی تو اس کا یہ حال تھا کہ اپنی پسند کی ساری نعمتیں سامنے ہونے کے باوجود کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جو باسی روٹی کے ساتھ بغیر بگھاری دال بھی رغبت سے کھا لیتی تھی، پھر تکلف کھانے کی طرف بھی راغب نہیں ہو پارہی تھی حالانکہ اشتہا بڑھانے کے لیے اس کھانے کے ساتھ طرح طرح کے اچار، چٹنیاں اور سلاد بھی خوان میں سجے ہوئے تھے۔ اسے صبیحہ بیگم کی میزبانی اور خلوص کا خیال نہ ہوتا تو اس خوان کو یوں ہی واپس لوٹا دیتی۔ اب بھی کافی دیر خوان سامنے رکھے ایسے ہی بیٹھی رہی پھر خیال آیا کہ

فاروق کی مرہم پٹی کر ڈالی تھی۔ جہاں جہاں ماجد علی نے کاٹا تھا، وہاں جراثیم کش دوا لگانے کے ساتھ اس نے فاروق کو ایک گولی بھی کھانے کے لیے دی تھی۔ پیش آنے والے حادثے نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا لیکن زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ تندہی سے اپنی ڈیوٹی پوری کرتی رہی تھی۔ ہر اس سا گولو فاروق کے ساتھ جڑ کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ منو پہلوان کا بھی چپکنا بند ہو چکا تھا۔ ماجد علی کی ہولناک موت نے ان سب کو ہی اپنی اپنی جگہ متاثر کیا تھا۔

”قانونی کارروائی کے لیے آپ کو آنے والے اسٹیشن پر اترنا ہوگا مسٹر فاروق! آپ کے ساتھی چاہیں تو اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔“ گاڑی چلتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ عملے کے افراد میں سے آکر ایک شخص نے انہیں آگاہ کیا۔ فاروق اس حکم پر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ صورت حال کے مطابق یہ حکم غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ جانے اس پر بمبئی کے راستے کیوں بند ہیں۔ وہ جتنا بمبئی واپس جانے کے لیے تڑپ رہا تھا، رکاوٹیں تھیں کہ کھڑی ہی ہوتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

نواب فراست بیگ کی حویلی میں صبیحہ بیگم کا سروٹ کو اثر اس کے لیے آج کل جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ صبیحہ بیگم اس کی بالکل ایسی خاطر مدارت کر رہی تھیں جیسی اپنی بیٹی رئیسہ کی میکے آمد پر کرتی تھیں۔ ان کی محبت اور خلوص نے جوزفین کو یہ حوصلہ دیا تھا کہ اس نے اپنے سارے حالات بلا کم و کاست انہیں کہہ سنائے تھے۔ سب سن کر انہوں نے یہی رائے دی تھی کہ یقیناً نواب سلیم اللہ کی حویلی کی کرتا دھرتا خواتین کو اس کی اور اسد اللہ کی محبت کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے نہایت چالاکی سے سازش کا جال بچھا کر اسے حویلی سے نکالنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ انہوں نے جوزفین کو دبے لفظوں میں اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا تھا کہ اگر وہ خود کو کسی طرح چوری کے الزام سے بری کر دانے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو اس کا اسد اللہ کی زندگی میں شامل ہونا کارِ محال ہوگا۔ اسد اللہ کو بے پناہ خاندانی دباؤ کے سامنے اس سے دست بردار ہونا ہی پڑے گا لیکن جوزفین کو اسد اللہ کی محبت پر اعتبار تھا۔ ہر محبت کرنے والے کی طرح وہ یقین رکھتی تھی کہ اسد اللہ پوری دنیا کو چھوڑ سکتا ہے لیکن اسے نہیں۔ صبیحہ نے بھی سوچا کہ چلوڑ کی قسمت آزمائے تاکہ آئندہ کبھی اسے کوئی بچھتاوا نہ ہو اور یہ حسرت نہ رہ جائے کہ وہ نواب زادہ اسد اللہ کی محبت کو آزمائے بغیر ہی



صبیحہ بیگم بڑی بیگم صاحبہ کی خدمت سے واپس لوٹیں گی تو سب کچھ یونہی دیکھ کر ناراض ہوں گی، چنانچہ دل پر جبر کرتے ہوئے ایک پلیٹ میں اپنے لیے تھوڑا سا کھانا نکالا اور منہ میں لقمہ رکھا۔ پہلے دو لقموں کو وہ کسی نہ کسی طرح حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب بھی ہو گئی لیکن تیسرے لقمے پر اسے بہت زور کی ابکائی آئی اور ابکائیاں لیتے ہوئے وہ پیٹ پکڑ کر دہری ہو گئی۔

”اوئی ماں۔ یہ کیا ہو گیا تمہارے کو۔ اچانک طبیعت کیوں خراب ہو گئی؟“ صبیحہ جو اسی وقت اندر آئی تھیں، گھبرا کر اس کی طرف لپکیں اور ہولے ہولے اس کی پیٹھ سے ہلانے لگیں لیکن اس کی ابکائیوں کا سلسلہ نہ تھا اور وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ معدے میں موجود خوراک کی قلیل مقدار کو الٹ کر واپس آنے میں اس کی طبیعت نڈھال ہو گئی اور وہ پینا پینا ہوتی زرد چہرے کے ساتھ بستر پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔ صبیحہ بیگم آنکھوں میں تشویش اور فکر سموئے اسے دیکھتی رہیں اور پھر نزدیک آ کر فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔

”کیا ہو گیا بیٹا.....؟ طبیعت خراب تھی تو میرے کو بولتے۔ میں حکیم صاحب سے تمہارے کو دوا منگوا کر دے دیتی۔“

”آپ فکر مت کریں خالہ جان۔ میری طبیعت ٹھیک ہے بس کچھ دنوں سے ذرا بوجھل پن ہے اور کھانا کھانے کا دل نہیں چاہتا۔ اب بھی زبردستی کھانے کی کوشش کی تو الٹی آ گئی۔“ جوزفین نے نجیف آواز میں اپنے تئیں انہیں تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے ماتھے پر فکر مندی سے کچھ اور لکیریں پڑ گئیں۔ انہوں نے جوزفین کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے اس کی کیفیت کے بارے میں چند ایک سوالات مزید کیے اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بولیں۔

”میرے کو بدگمانی ہوئی ہے تو اللہ مجھے معاف کرے پر آثار سے لگتا ہے کہ جوانی کے جذبات میں تم اور نواب زادہ صاحب حد سے گزر گئے اور اب اس کا نتیجہ سامنے آنے کو ہے۔“

صبیحہ بیگم کی بات کے جواب میں جوزفین زبان سے کچھ نہ کہہ سکی اور نظریں جھکا لیں۔ اس کی یہ جھکی نظریں ہی جواب تھیں۔ اس خاموش اعتراف پر صبیحہ بیگم کے چہرے پر بیک وقت رنج اور غصے کے تاثرات ابھرے تاہم انہوں نے زبان سے کوئی سخت بات نہیں نکالی اور افسوس سے بولیں۔ ”تم اپنی نادانی میں خود کو بڑی مصیبت میں پھنسا لیے۔ ان حالات میں تو تمہارا نواب زادہ صاحب سے ملنا

اور ضروری ہو گیا ہے، پر ان کے گھر والے تمہارے کو ڈھیل دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے تمہارے پر حیدر آباد کی زمین تنگ کرنے کا پورا انتظام کر کے بیٹھے ہیں۔ تمہارے کو معلوم ہے ابھی بڑی بیگم صاحبہ مجھے کیوں بلائے تھے۔ انہوں تمہارے بارے میں بات کرنے کو بلائے تھے۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی سے کوئی آکر ان کو بتا کو گیا کہ تمہارے کو وہاں سے چوری کے الزام میں نکالے ہیں اور ادھر کوئی تمہارے کو اپنے کئے رکھتا ہے تو اپنی ذمہ داری پر رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ کل کلاں کو تم ادھر بھی چوری چکاری کر لیں اور بعد میں یہاں والے شکایت کا دفتر کھولیں کہ نواب صاحب کی حویلی سے کسی نے ہوشیار راج نہیں کیا تھا۔ بیگم صاحبہ مجھے صاف بولے کہ صبیحہ تمہاری یہاں بڑی عزت ہے۔ اس لڑکی کو یہاں رکھ کر تم اپنی عزت گنوا نے کا انتظام کیوں کرتے ہیں۔ اس کو یہاں سے چلتا کرو۔ اب تم بولو کہ اس حکم کے بعد میں تمہارے کو کیسے ادھر رکھ سکتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں بیٹی پر میری بھی مجبوری ہے۔ برسوں نواب فراسٹ بیگ کا نمک کھایا ہے۔ بیگم صاحبہ کا حکم نہ مان کر اس عمر میں اپنے دامن پر داغ نہیں لگا سکتی۔ رنے کو ٹھکانے کا مسئلہ نہیں۔ داماد نیک ہے، میں ریسہ بانو کے گھر میں بھی جا کر پڑ سکتی ہوں پر اول تو داماد کے گھر رہنا اچھا نہیں لگتا، دوسرے حویلی سے اپنی وفاداری نبھانا چاہتی ہوں۔ تمہارے واسطے میں اتنا

اج کر سکتی ہوں کہ تمہارے بھینٹی واپس جانے کا بندوبست کر دوں اور جب نواب زادہ اسد اللہ واپس آئیں تو انہیں تمہارے حالات سے آگاہ کر دوں بلکہ تم ایسا کرنا کہ ان کے نام سے چٹھی لکھ کر مجھے دے جانا۔ میں وہ چٹھی ان کے حوالے کر دوں گی۔“ صبیحہ بیگم نے ایک ہی سانس میں بیگم فراسٹ بیگ کا حکم، اپنی مجبوری اور مسئلے کا ممکنہ حل اسے بتا ڈالا۔ جوزفین توجہ سے ان کی ایک ایک بات سنتی رہی۔ کم عمری کے باوجود وہ خاصی باشعور تھی اور صبیحہ بیگم کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی چنانچہ اس عارضی ٹھکانے کے چھن جانے کا سن کر بھی حواس باختہ نہیں ہوئی اور محل سے بولی۔

”میں آپ کی سب باتیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں خالہ جان۔ اب میں خود بھی یہاں رہ کر آپ کے لیے مسئلہ بننا پسند نہیں کروں گی۔ آپ میرے بھینٹی واپس جانے کا انتظام کریں اتنی دیر میں، میں نواب زادہ صاحب کے نام خط لکھتی ہوں۔“

”جیتی رہو بیٹی۔ اللہ مشکلوں کو آسان کرے۔ میری کسی بات سے دل دکھا ہو تو معافی دے دینا۔“ صبیحہ بیگم



اسے گلے لگا کر کہتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔

”معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ شرمندہ تو میں ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔ آپ کی محبت اور خلوص کو تو میں ساری زندگی یاد رکھوں گی۔ اپنی مام کی ڈتھ کے بعد میں نے آپ میں ان کے جیسی خوشبو نفل کی ہے۔“ جوزفین ان کے دونوں ہاتھ تھام کر رو پڑی۔ صبیحہ بیگم نے بھی جذباتی ہو کر اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

☆☆☆

فاروق وغیرہ کو جس جگہ ضروری کارروائی کے لیے ریل سے اتارا گیا، وہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ اس اسٹیشن پر ریل تقریباً آٹھ دس منٹ رکی تھی۔ زیادہ پرجوم اسٹیشن نہیں تھا لیکن صاف ستھرا اور مختلف اسٹالوں سے سجا ہوا تھا۔ یہاں اتر کر کئی مسافروں نے اپنی ضرورت کی اشیا خریدی تھیں۔ فاروق اور اس کے ساتھیوں کو بھی اجازت مل گئی تھی کہ وہ کچھ کھانا پینا چاہیں تو کھا سکتے ہیں البتہ ایک پولیس اہلکار ان کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ فاروق نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ گولو اور منواس کے اشارے پر کھانے پینے کا سامان خریدنے لگے۔ خود وہ ایک انگریزی اخبار خرید لایا۔ ویننگ روم میں بیٹھ کر ان لوگوں نے پیٹ پوجا کی اور ساتھ ہی فاروق اخبار بینی بھی کرتا رہا۔ اخبار کا ٹکریسی نظریات کا حامی معلوم ہوتا تھا اس لیے اس میں چھپنے والا ادارہ اور خبریں ہندو برادری کے نظریات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ ادارے میں ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کے لیے بہت سخت زبان استعمال کی گئی تھی اور ان نا انصافیوں کو خاطر میں لائے بغیر جن کے باعث مسلمان علیحدہ وطن کا مطالبہ کر رہے تھے، مسلمانوں کو غدار قرار دیا گیا تھا۔ خبروں سے فاروق کو یہ بھی علم ہوا کہ دو دن قبل وہاں کانگریس کا ایک جلسہ بھی منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں جس قسم کی تقریریں کی گئی تھیں، اس کا بھی اخبار کے طرز تحریر سے اندازہ ہو رہا تھا۔ فاروق جس ماحول میں رہ رہا تھا، وہاں اس قسم کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی جاتی تھی لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور انسان ہونے کی حیثیت سے ان حالات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اس کا شعور گواہی دے رہا تھا کہ تاریخ کا کوئی بڑا واقعہ ظہور پزیر ہونے کو ہے حالات جس رخ پر جا رہے تھے، ان سے ہر شخص ہی متاثر ہوتا، چاہے وہ ان سارے معاملات میں ملوث ہوتا یا خود کو لائق رکھتا۔

ملکی حالات پر دل میں فکر مند ہوتا ہوا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب کھانے سے فارغ ہو چکے

تھے۔ اس نے بھی جلدی جلدی اپنی چائے ختم کی پھر وہ اپنے ساتھ موجود پولیس اہلکار کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ مقامی تھانے میں ان سب کے بیانات ریکارڈ کیے گئے۔ ڈیوٹی افسر نے فاروق سے بہت سے سوالات کیے۔ اس کے سوالات میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ وہ باغی ہیں ماجد علی اور اس کے درمیان کسی قسم کے تعلق کے بارے میں کھوج لگا سکے لیکن فاروق اسے ابتدائی بیان پر قائم رہا اور ماجد علی سے مکمل نا آشنائی ظاہر کرتے ہوئے اسے ایسا لئیرا قرار دیا جو دھوکے سے اسے لوٹنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کے بیان کی تائید و تصدیق کی۔ ماجد علی سے شناسائی ظاہر کرنے میں الجھنوں میں اضافہ ہو جاتا۔ ابھی تو گواہان اس بات کی تصدیق کر سکتے تھے کہ ماجد علی اپنے ہی جنون میں اتفاقاً چلتی گاڑی سے نیچے گر گیا۔ کسی قسم کی شناسائی کے اظہار کی صورت میں پولیس اس اتفاقی حادثے کو قتل قرار دینے پر اپنا زور لگا دیتی۔ الزام سے تو خیر وہ بچ ہی نکلے لیکن وقت خراب ہوتا۔ ویسے ہی ریلوے انتظامیہ نے انہیں یہاں اتار کر ایک طرح سے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ کہیں بھاگے نہیں جا رہے تھے۔ بمبئی پہنچ کر بھی یہ سارا قضیہ چھیڑا جاسکتا تھا لیکن شاید ایک آدمی کی جان چلے جانے پر وہ لوگ حواس باختہ ہو گئے تھے اور پہلے قریبی اسٹیشن پر ہی اپنی جان چھڑا لینی مناسب سمجھی تھی۔

ماجد علی کی موت نے خود فاروق کے اعصاب کو بھی متاثر کیا تھا اس لیے وہ بھی کوئی اعتراض کیے بغیر اس اجنبی جگہ پر اترنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ضابطے کی کارروائی نمٹانے اور ان کے رہائشی پتے نوٹ کر لینے کے بعد انہیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انہوں نے معلومات حاصل کر کے ایک مسافر ہوٹل کا رخ کیا۔ بمبئی جانے کے لیے اب انہیں کل ہی ٹرین ملتی۔ تھانے میں انہیں یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ کل انہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ ڈیوٹی افسر سے ہونے والی فاروق کی گفتگو نے ان کی الجھن کو بڑھنے نہیں دیا تھا۔ وہ فاروق کے انداز گفتگو اور انگریزی دانی سے متاثر ہوا تھا، اسی وجہ سے اس کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آیا تھا اور اس کے رویے سے بھی یہ ظاہر تھا کہ اس نے ان لوگوں کو یہاں اتارے جانے کو ایک غیر ضروری فعل سمجھا تھا۔ انسان کے ساتھ دنیا میں کئی بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جب وہ اپنے ساتھ ہونے والے عمل کو غیر ضروری خیال کرتا ہے لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان غیر ضروری افعال



ایک مرد کی غصے میں بھری لیکن دلی ہوئی آواز سنائی دی تو اس بار انہیں اندازہ ہو گیا کہ آوازیں اسی گھر سے آرہی ہیں جس کے سامنے وہ رکے ہوئے ہیں۔ کان لگا کر سننے پر انہیں چند مزید ایسی آوازیں بھی سنائی دیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دو تین افراد آپس میں جھگڑ رہے ہیں لیکن وہ منہ سے کوئی آواز نہیں نکال رہے تھے۔

”اکبر کو جانے دو باپو۔ میں تمہاری بنتی کرتی ہوں۔“ لڑکی کی منت بھری رندھی ہوئی آواز میں کہا گیا فقرہ سن کر وہ لوگ مزید چونک گئے۔ شاید لڑکی کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹ گیا تھا اور اب وہ چیخنے کے بجائے منت سماجت کر رہی تھی۔

”دور ہو جا تو میری نظروں کے سامنے سے۔ اس مسئلے سے عشق لڑا کر تو نے سارا دھرم بھڑٹ کر ڈالا ہے۔ تیرے کارن میری برادری میں ناک کٹی تو تیرا کھون (خون) کڑا لوں گا۔“ غصے کے باوجود مرد نے اپنی آواز کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیا تھا اگر وہ اس مکان کے بالکل سامنے نہ کھڑے ہوتے تو انہیں یہ سب سنائی بھی نہ دیتا۔

”میری جان لے لو پر اسے چھوڑ دو۔ دیکھو اسے خود بھی تمہاری عجت (عزت) کی کتنی چنٹا ہے۔ اتنی مار کھا رہا ہے پر منہ سے ایک آواز (آواز) نہیں نکال رہا۔“ لڑکی گویا بلبل رہی تھی۔

”تو اس کا منہ بند کرتی ہے یا نہیں سر سوتی! اب یہ بولی تو میں اسے ہمیشہ کے لیے کھاموش (خاموش) کر ڈالوں گا۔“ مرد کی غراہٹ میں سفاکیت تھی۔ فاروق بے ساختہ ہی لکڑی کی اس کھڑکی کی طرف بڑھا جس کے پٹ تو بند تھے لیکن درمیان میں موجود درختوں سے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ اندر جھانکنے پر صورت حال زیادہ واضح ہو گئی۔ کمرے میں جلتی لائٹن کی روشنی میں اس نے ایک درمیانی عمر کی عورت کو نو عمر سی قبول صورت لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔

”بھگوان کے لیے چپ کر جا پارو، کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے۔“ عورت زبان سے بھی لڑکی کو خاموش رہنے کی نصیحت کر رہی تھی لیکن فاروق کی توجہ ان ماں بیٹی پر سے ہٹ چکی تھی اور وہ کمرے کے بائیں جانب کے منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تقریباً پارو کا ہی ہم عمر ایک نوجوان لڑکا تھا جو پیٹھ کے بل فرش پر لیٹا ہوا تھا اور کم و بیش اسی کی عمر کے دو لڑکے ہاتھوں میں ڈنڈے سنبھالے بلا تکلف اس پر برسائے میں لگے ہوئے تھے۔ زمین پر گرا لڑکا اپنے ہاتھوں اور پیروں پر ان کے دار سنبھال رہا تھا اور

کے ذریعے ہی قدرت کوئی اہم کام سرانجام دلوانا چاہتی ہے۔ ان کا یہاں رکنا بھی کچھ ایسا ہی ثابت ہوا۔ ہوٹل پہنچ کر پہلے تو انہوں نے نہادھو کر اپنے لباس تبدیل کیے پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اتفاقاً ہی سہی، وہ اس انجان علاقے میں اتر گئے تھے اور اب انہیں یہاں کل تک کا وقت بھی گزارنا تھا تو بہتر تھا کہ کوفت کے عالم میں ہوٹل میں پڑے رہنے کے بجائے ذرا یہاں گھوم پھر کر ہی دیکھ لیا جائے۔

بمبئی جیسے بڑے شہر کے باسیوں کے لیے یہ جگہ بہت چھوٹی تھی لیکن صاف ستھری اور سادگی سے بھرپور ہونے کی وجہ سے انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ لوگوں کے لباس اور بول چال سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہاں ہندو اور مسلم آبادی ملی جلی ہے۔ گھومنے پھرنے کے دوران میں انہیں لوگوں سے گفتگو کرنے اور ان کی آپس کی بات چیت سننے کا موقع بھی ملا اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ فضا میں تناؤ کی سی کیفیت ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کھنچاؤ سا موجود ہے۔ یقیناً یہ دو دن پہلے ہونے والے جلسے اور آزادی کی تحریک کے اثرات تھے۔ ان حالات میں وہ ہندو، مسلمان اور عیسائی یکجا ہو کر گھومتے شاید ان لوگوں کو عجیب لگ رہے ہوں لیکن انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی۔ ان کے درمیان ہر شے سے بڑھ کر ان کے باہمی خلوص اور محبت کا رشتہ تھا۔ ملکی حالات پر افسوس کرتے ہوئے انہوں نے رات کا کھانا ایک ڈھابے پر کھایا اور پیدل ہی اپنے رہائشی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ چھوٹا علاقہ تھا، کوئی بمبئی نہیں جہاں راتیں بھی جاگتی ہیں اس لیے واپسی میں انہیں زیادہ تر راستے خالی اور سناٹا ملے۔ البتہ رہائشی علاقوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے مردوں کو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں جاگتے ہوئے ضرور پایا۔ ان کا انداز پہرا دینے والا تھا اور ایسا یقیناً حالات کی وجہ سے تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے بلوؤں کی خبریں سننے میں آرہی تھیں۔ اختلافات نفرت کا روپ دھار چکے تھے اور یہ نفرت خون بہانے پر اتر آئی تھی۔ اس ساری صورت حال پر افسوس کرتے ہوئے وہ لوگ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک نسوانی چیخ سن کر رک گئے۔ چیخ کھٹی کھٹی سی تھی لیکن اس میں ایک تڑپ سی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ کوئی چیخنے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بلند ہونے سے روک رہا ہو۔

”چیر کر رکھ دو سالے کو۔ جندہ (زندہ) نہ جانے پائے ایہاں (یہاں) سے۔“



”میں خدائی فوجدار ہوں اور کہیں بھی کسی پر ظلم ہوتے دیکھ کر بیچ میں کودے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ فاروق نے ادھیڑ عمر آدمی کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا تو، تو اس لفنگے کا یار ہے اور اس کی مدد کے لیے آیا ہے۔ رام، شام بیٹے پہلے اس کی ہڈیاں توڑ دیا پھر اکبر کا حساب کرتے ہیں۔“ وہ آدمی اپنے گھر میں کھڑا تھا اور اس کے دونوں جوان بیٹے ہاتھوں میں ڈنڈے تھامے اس کے ساتھ موجود تھے۔ ایسے میں اس نے خالی ہاتھ آنے والے فاروق سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اطمینان سے بیٹوں کو حکم دیا لیکن یہ حکم دیتے ہوئے بھی اس کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ فاروق اس کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ چوری چھپے ملنے آئے ہوئے بیٹی کے عاشق کو سبق تو سکھانا چاہتا تھا لیکن اسے اس بات کی بھی فکر تھی کہ آس پاس والوں کو خبر نہ ہو اور اس کی عزت سلامت رہے۔ خود فاروق کی بھی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن وہ اکبر نامی اس نوجوان لڑکے سے بھی ہمدردی محسوس کر رہا تھا جو یقیناً دیدار یار کے لیے آگ کے دریا میں کود گیا تھا۔ رام اور شام نامی وہ لڑکے اکبر کو جس بے دردی سے مار رہے تھے، اس سے تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ رات کی تاریکی میں اکبر کو خاموشی سے قتل کر کے کہیں گاڑ دیا جاتا تو اس کے پچھلوں کو کانٹوں کاں خبر نہیں ہوتی۔ اکبر کی تنہائی اور بے بسی نے اسے اس کی مدد پر مجبور کیا تھا اور وہ پرانے پھلے میں ٹانگ اڑانے کے لیے یہاں موجود تھا۔

رام اور شام نے باپ کا حکم پاتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ وہ دو مختلف سمتوں سے اس پر حملہ آور ہوئے تھے لیکن فاروق بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ربن کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے ناصرب لڑکوں کا وارو کا بلکہ دائیں جانب سے آنے والے کی کلائی تھام کر اس زور سے موڑی کہ وہ کراہ کر رہ گیا اور اس کے ہاتھ سے ڈنڈا نکل گیا۔ وہ ڈنڈا فاروق نے جھپٹ لیا اور بائیں طرف سے دوبارہ حملہ آور ہوتے لڑکے کے ڈنڈے پر ضرب لگائی۔ لڑکے نے ڈنڈا ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن اس کا رخ ضرور بدل گیا۔ فاروق نے اسے موقع دیے بغیر دوسری ضرب اس کے کولہے پر لگائی۔ ضرب لگاتے ہوئے اس نے خیال رکھا تھا کہ اس کی شدت زیادہ نہ ہو، اس کے باوجود لڑکا بلبلاتا رہ گیا۔ بھائی کو مار کھاتا دیکھ کر پہلے ہی اپنا ڈنڈا گنوا دینے والا جوش میں آ گیا اور پیچھے سے آکر فاروق کے ساتھ چٹ گیا۔ فاروق

صاف لگتا تھا کہ بہت تکلیف میں ہے لیکن تکلیف کے باوجود اس کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکل رہی تھی۔ لڑکے کے کمال ضبط نے فاروق کو متاثر کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا چنانچہ اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹا اور گولو کو مخاطب کر کے بولا۔

”تم کیتھرائن کو لے کر ہوٹل پہنچو۔ میں اور موہن تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“

”لیکن فاروق بھائی.....“ گولو نے اعتراض کرنے کی کوشش کی جسے فاروق نے ناکام بنا دیا اور زبان سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر اسے ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اب گولو کے پاس مزید وہاں رکے رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کیتھرائن کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”ہمیں لڑکے کی مدد کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ لوگ اسے جان سے مار دیں گے۔“ کھڑکی سے ذرا دور بیٹھ کر اس نے سرگوشی میں منو سے کہا تو اس نے تقبیبی انداز میں سر ہلادیا..... فاروق نے پہلے کھڑکی کی چوکھٹ پر اور پھر جھجے پر پیر جمائے اور اگلی چھلانگ میں چھت پر پہنچ گیا۔ منو ذرا بھاری تن و توش کا مالک تھا لیکن وہ بھی اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے مکان کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس سے نیچے جانے کے لیے لکڑی کا زینہ بھی موجود تھا۔ وہ دونوں احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے نیچے پہنچ گئے اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں سارا ڈراما جاری تھا۔ اصل میں وہ مکان کا پچھلا کمرہ تھا اور وہ لوگ درحقیقت مکان کے سامنے سے نہیں بلکہ اس کی پشت والی گلی سے گزرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مکان اچھا خاصا بڑا تھا اور کھلے صحن کی دوسری طرف مکان کے سامنے کے رخ پر بھی کمرے وغیرہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ فاروق نے منو کو اپنے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ اس کی اچانک آمد نے کمرے میں موجود تمام نفوس کو بری طرح چونکا دیا۔ ڈنڈے برساتے لڑکوں کے ہاتھ بھی حیرت سے رک گئے۔

”کون ہو تم؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں گھسنے کی؟“ سب سے پہلے اسی آدمی نے غصے سے پوچھا جو پارو نامی لڑکی سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ ڈنڈے برساتے لڑکوں کو بھی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کے سر کے بال درمیان سے اڑ چکے تھے اور اطراف میں بالوں کی جھالری لٹک رہی تھی۔



میری مجبوری بن چکی تھی۔“

”اس ناس مٹے کو کھود (خود) اپنی جندگی (زندگی) کی چٹا نہیں ہے تو کوئی اس کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ کتنا سمجھا یا تھا اسے کہ پارو کو بھول جائے پر اس نے پارو کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ادھر یہ حال ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک دیش میں رہنے کو راجی (راضی) نہیں ہیں اور یہ چلا ہے کہ برہمن کی لڑکی سے عشق لڑانے۔ ابھی تم نے بچالیا ہے پر کب تلک بچے گا۔ پارو کے چٹا جی کبھی اس کی جان لے کر چھوڑیں گے۔“ عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تنہا سے لہجے میں کہا تو فاروق جو اب اس کو محض تنہی جنبش دے کر رہ گیا۔ کچھ بولنے کے لیے تو تھا ہی نہیں اس کے پاس۔

”ہم اب چلتے ہیں۔“ اس نے ذرا کی ذرا لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ منو اور اکبر اس کے ساتھ تھے۔ اس بار انہوں نے گھر کا سامنے والا دروازہ استعمال کیا۔ پارو ماں کو وہیں چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

”اپنا خیال رکھنا اکبر۔“ جانے کس فکر میں اس نے اکبر سے یہ جملہ کہا۔

”میری فکر نہ کر پارو۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اکبر نے ہر عاشق صادق کی طرح اپنی تکلیف کو چھپاتے ہوئے اسے تسلی دی اور فاروق کے اشارے پر اس کے پیچھے لپکا۔ پیچھے پارو نے آہستہ سے دروازہ بند کر لیا۔

”کیا ارادہ ہے نو جوان۔ کہو تو تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دیتے ہیں۔“ باہر نکل کر فاروق نے اس سے دریافت کیا۔

”میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔“ اکبر نے جواب دیا۔ یقیناً اسے اپنے ان اجنبی ہمدردوں کے بارے میں تجسس تھا اور وہ یہ تجسس دور کرنے کے لیے ہی ان کے ساتھ جاتا چاہتا تھا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ فاروق نے اس کے فیصلے سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

”آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ منو کے سہارے سے چلتے ہوئے اس نے اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کی۔

”ہم مسافر ہیں۔ بمبئی جا رہے تھے کہ راستے میں مجبوراً یہاں اترنا پڑا۔ سوچا آئے ہیں تو یہاں کی سیر کر لی جائے۔ ابھی گھوم گھام کر واپس اپنے ہوٹل جا رہے تھے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے اندر کی سچویشن کا انداز ہوا اور تمہارے لیے ہمدردی محسوس کر کے تمہاری مدد کرنے پہنچ

نے اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی پیچھے لے جا کر اس کی پسلیوں پر ضرب لگائی تو وہ ڈکرا کر پیچھے گرا۔ بیٹوں کی درگت بننے دیکھ کر آدمی خود بھی درمیان میں کود پڑا لیکن اس موقع پر منو نے کمرے میں انٹری دی اور اگلے ایک آدھ منٹ میں وہاں کوئی ان سے مقابلہ کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ پارو نامی لڑکی اور اس کی ماں سرسوتی اس صورت حال پر حیران پریشان ایک دوسرے سے چٹی سسکیاں لیتی رہیں جبکہ مار گھاگھا کر ادھ موا ہو جانے والا اکبر بھی ایک کونے میں سمٹا آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہا۔ سب کچھ اتنی تیزی اور خاموشی سے ہوا تھا کہ عورتیں تک اپنی فطرت کے مطابق چیخ و پکار نہیں مچا سکی تھیں۔

”تم لوگ کون ہو بھائی؟“ آخر اکبر نے ہی ہمت کی اور سر اسیمہ لہجے میں فاروق اور منو سے بیک وقت دریافت کیا۔ اس کی حیرانی اور سراسیمگی فطری تھی۔ یقیناً اس کا زندگی میں پہلی بار ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جنہوں نے اتنی قلیل مدت میں تین افراد کو لمبا لٹا دیا تھا، وہ بھی ایسی تکنیک سے کہ ان تینوں میں سے نہ تو کوئی زخمی ہوا تھا اور نہ ہی کسی کی آواز نکلی تھی۔ اصل میں فاروق نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے ربن کے سکھائے چند ایسے داؤ استعمال کیے تھے کہ جسم کے مخصوص حصوں پر لگنے والی مخصوص انداز کی ضربوں نے انہیں فوری طور پر بے ہوش کر دیا تھا۔ امید تھی کہ دو سے تین گھنٹوں کے اندر وہ تینوں بے آسانی ہوش میں آجائیں گے۔

”ہمارے بارے میں سوال جواب بعد میں کر لیتا پہلے یہاں سے نکلو۔ جان بچانے کا یہ جو موقع ملا ہے، اسے ضائع کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ فاروق نے ڈپٹے کے انداز میں کہا تو وہ گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کی حرکت کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ منو نے از خود آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا جبکہ فاروق دونوں خواتین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئی تھیں اور اپنے گھر کے مردوں کے قریب میٹھی انہیں ہلا جلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ شاید انہیں لگ رہا تھا کہ ان تینوں کے ساتھ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ فاروق بڑی عمر کی خاتون سے مخاطب ہوا اور نرمی سے بولا۔

”پریشان مت ہوں خالہ جی! یہ لوگ صرف بے ہوش ہیں اور تھوڑی دیر میں خود ہوش میں آجائیں گے۔ آپ لوگوں کو جو تکلیف پہنچی، اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں لیکن اس لڑکے کی جان بچانے کے لیے یہ سب کرنا



گئے۔“ فاروق نے اس کی بات کا جواب دیا۔

”بڑے نیک دل لوگ ہیں آپ۔ ورنہ یہاں تو خون کے رشتے کسی کو مصیبت میں دیکھ کر مدد کے لیے نہیں آتے، لٹا منہ موڑ لیتے ہیں۔“ اکبر نے دکھی سے لہجے میں کہا تو فاروق کو محسوس ہوا کہ اس کے اندر کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ اس نے تسلی دینے کے انداز میں اس کے شانے کو تھپکا اور بولا۔

”یہ دنیا اتنی بھی بری نہیں ہے دوست۔ یہاں دونوں طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ بس یہ قسمت کی بات ہے کہ کس کا واسطہ کس سے پڑتا ہے۔ تم اگر چاہو تو ہمیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتا سکتے ہو۔ ہم سے جس حد تک ہو سکا، تمہاری مدد ضرور کریں گے۔“

”بہت شکریہ بھائی جان لیکن آپ نے ابھی تک مجھے اپنا نام تو بتایا نہیں۔“ اکبر نے مہذب لہجے میں کہا۔ اپنے انداز گفتگو سے وہ پڑھا لکھا اور اچھے خاندان کا فرد لگتا تھا۔

”میرا نام فاروق ہے اور یہ میرے دوست موہن داس ہیں۔ انہیں ہم پیار سے منو بھی کہتے ہیں۔ میرے دو ساتھی ہوٹل میں بھی ہیں۔ ان سے وہاں پہنچ کر تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ باقی کی بات چیت بھی ہم وہیں چل کر کر لیں گے۔ ہوٹل آنے ہی والا ہے۔“ فاروق نے اس سے کہا تو اس نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔ اب اس نے خود کو منو کی گرفت سے بھی آزاد کروا لیا تھا اور بغیر سہارے کے چل رہا تھا۔ یقیناً چلتے رہنے سے اس کا خون رواں ہو گیا تھا اور اب وہ چلنے میں پہلے جیسی تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کی حالت مناسب نہیں تھی۔ گریبان پھٹ گیا تھا اور ایک دو جگہ خون کے دھبے بھی تھے، اس لیے پارو کے گھر سے نکلتے ہی منو نے اپنی چادر اسے اڑھا دی تھی۔ راستے میں پہرا دینے والوں سے بھی واسطہ پڑنے کا امکان تھا اس لیے ضروری تھا کہ اکبر کا حلیہ مشکوک نظر نہ آئے۔ یہ تو فاروق اور منو نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ پہرا دینے والے خاموشی سے پہرا دے رہے ہیں اور راہ چلتے کسی فرد سے کوئی تعرض نہیں کر رہے۔ اصل میں یہ پہرے داری محض اپنی حفاظت کی غرض سے تھی اور خوف زدہ لوگوں کو فکر بھی کہ کہیں سے ان پر حملہ نہ ہو جائے۔ حملے جتھوں کی صورت میں کیے جا رہے تھے اس لیے لاکڑ کا آدمیوں سے کسی کو کوئی خوف تھا بھی نہیں۔

وہ لوگ ہوٹل پہنچے تو گولو اور کیتھرائن نے سکون کا سانس لیا۔ فاروق کی ہدایت پر کیتھرائن نے اکبر کا معائنہ

کیا۔ ڈنڈوں کی ضربات نے اس کے سارے جسم خصوصاً ہاتھ پیروں پر نیل ڈال دیے تھے۔ کہیں کہیں سوجن بھی آنا شروع ہو گئی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اس کی کوئی ہڈی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ ایک آدھ جگہ سے کھال پھٹنے سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔ کیتھرائن نے جبے ہوئے خون کو صاف کر کے مرہم وغیرہ لگایا اور ساتھ ہی درد رفع کرنے والی گولیاں بھی کھانے کو دیں۔ گولو ہوٹل کے باورچی خانے تک جا کر ایک گلاس ہلدی ملا نیم گرم دودھ اور چائے بنا کر لے آیا تھا۔ اس وقت ہوٹل کا باورچی خانہ بند ہو جاتا تھا لیکن ایک بیرے نے بھاری ٹپ کی پیشکش پر یہ فرمائش پوری کر دی تھی۔

”ہاں تو میاں اکبر..... سناؤ اپنی داستان۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔“ اکبر کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور ان کے پاس گرما گرم چائے کی پیالیاں آئیں تو فاروق نے ہلکے پھلکے لہجے میں اکبر سے فرمائش کی۔ وہ بھی تیار ہی بیٹھا تھا کہ کوئی ہمدرد ملے اور اپنی داستان سنائے چنانچہ فوراً ہی شروع ہو گیا۔

”میں ان لوگوں میں سے ہوں جو پیدا ہی ذرا سخت قسمت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میری زندگی کا پہلا المیہ میرے والد اور والدہ کی شادی تھا۔ والد کی حسن پرست فطرت نے والدہ کو بطور شریک حیات پسند نہیں کیا اور وہ میری پیدائش کے بہ مشکل چھ ماہ بعد تک ہی انہیں برداشت کر سکے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ اس وقت تک میرے دادا حیات تھے اور دادا کی موجودگی میں والد کی ہمت نہیں تھی کہ ان کے دوست کی بیٹی کو گھر بدر کر سکیں۔ دادا انہیں رہے تو انہوں نے خود مختاری کا فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے ناپسندیدہ بیوی سے جان چھڑائی اور طلاق کے دو ماہ بعد ہی دوسری شادی بھی کر لی۔ والدہ میرے ساتھ اپنے میکے میں بھائی کے در پر رہنے پر مجبور ہو گئیں۔ وہاں ہم ماں بیٹے کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو مجبور اور ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میری دل گرفتہ والدہ اس صورت حال کو زیادہ طویل عرصے برداشت نہیں کر سکیں اور جب میں صرف سات سال کا تھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ماموں اور ممانی نے چاہا کہ مجھے میرے والد کے پاس بھجوا دیا جائے لیکن اس عرصے میں میرے والد کی تین مزید اولادیں ہو چکی تھیں اور انہیں میری قطعی ضرورت نہیں تھی چنانچہ انہوں نے میرا ماہانہ خرچہ دینے کے وعدے کے ساتھ ماموں کو مجھے اپنے گھر میں ہی رکھنے پر راضی کر لیا۔ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ وعدہ کس حد تک



”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں فاروق بھائی لیکن میں کیا کرتا۔ پارو کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی اتنی بے قراری ہوتی تھی کہ میں یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا، پر یقین جانے کتنی کی ان چند ملاقاتوں میں، میں نے رات کی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر کبھی اسے چھونے کی کوشش تک نہیں کی۔ مجھے اس کی عزت کا کتنا خیال ہے اس چیز کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ جب اس کے بھائی مجھے بے دردی سے مار رہے تھے تو میں نے اپنے ہونٹوں سے ایک چیخ تک بلند نہیں ہونے دی کہ کہیں آواز سن کر کوئی محلے دار وہاں نہ آجائے اور پارو کی بدنامی ہو۔“ اکبر نے اپنی صفائی پیش کی۔

”میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ پارو سے خفیہ ملاقاتیں تمہاری غلطی ہے۔ تمہاری پارو سے محبت پر میں اعتراض نہیں کروں گا کہ یہ انسان کے اختیار سے باہر کی بات ہے۔ دل کس پر آجائے کچھ معلوم نہیں ہوتا لیکن باقی معاملات میں خود کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ تم یہی سوچو کہ تمہاری اس محبت کا کوئی خوش کن انجام نہیں ہو سکتا۔ نہ پارو کے گھر والے اسے اجازت دیں گے کہ وہ ایک مسلمان سے شادی کر لے اور نہ ہی تمہیں تمہارا مذہب ایک ہندو لڑکی سے شادی کی اجازت دیتا ہے تو پھر معاملات کو اس حد تک آگے لے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بے اختیار میں ایک غیر مذہب کی لڑکی سے محبت ہو گئی ٹھیک ہے لیکن باقی تو تمہیں خود پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ تمہارے پاس تو اپنا گھر تک نہیں ہے، خود ماموں کے گھر میں رہتے ہو۔ اگر کسی طرح لڑکی کو بھگا کر بھی لے آئے تو اسے رکھو گے کہاں؟“ فاروق اسے تلخ حقائق کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

”ان ساری باتوں کے بارے میں، میں نے بھی سوچا تھا بھائی جان اور پارو کو بھی احساس دلایا تھا۔ وہ بولی کہ میں تمہاری خاطر مسلمان ہو جاؤں گی۔ پھر تم مجھے یہاں سے لے چلنا۔ ہم دونوں کہیں اور کسی دوسرے شہر میں جا کر رہ لیں گے۔ مجھے پارو کی یہ تجویز اچھی لگی۔ آج کل میں پیسے جوڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ تھوڑی رقم جمع ہو جائے گی تو میں اور پارو یہ شہر چھوڑ دیں گے۔“ اکبر نے اسے اپنے مستقبل کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

”آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد تو تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا۔ پارو کے باپ بھائی سب تمہیں جانتے ہوں گے۔ آج ہم تمہیں وہاں سے بچا کر لے آئے ہیں۔ وہ لوگ پھر کسی اور دن موقع دیکھ کر تمہیں گھر لیں گے۔ آج کے بعد

نبھایا کیونکہ ماموں آئے دن مجھے یہ طعنے دیتے رہتے تھے کہ میرا باپ وعدے کے باوجود میرا خرچہ پابندی سے نہیں بھجوا رہا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ والد کے وعدے کے بعد ہی سے مجھے تعلیم کے لیے اسکول بھیجا جانے لگا تھا اور والد کی زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میرے والد نے اپنا وعدہ نبھایا ہوگا، ورنہ ماموں اپنے ذاتی خرچے پر ہرگز مجھے تعلیم نہیں دلاتے، جیسا کہ والد کے انتقال کے بعد ہوا کہ میں اپنی خواہش کے باوجود آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکا اور ماموں نے مجھے اپنے ایک دوست کی دکان پر بٹھا دیا۔ دکان کریمانے کی تھی اور مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پارو تو بھی اپنے گھر کا سودا لینے کبھی اکیلی اور کبھی اپنی ماں کے ساتھ آتی تھی، بس وہیں سے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کی شمع روشن ہوئی اور ہم مذہب کا فرق بھول کر ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ کسی طرح پارو کی ماں پر یہ بات کھل گئی اور اس نے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ میں بڑی مشکل سے پارو کی ایک سیٹلی کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو سکا اور کبھی کبھار رات میں چھپ چھپا کر اس کے گھر اس سے ملنے چلنے لگا۔ جس رات مجھے جانا ہوتا تھا، پارو کی سیٹلی سے اسے پیغام بھیج دیتا تھا اور وہ میرے لیے پچھلی طرف کا دروازہ کھلا رکھتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن پارو کے باپ کی آنکھ کھل گئی اور پھر آگے جو کچھ ہوا، وہ سب تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی تھا۔“ اکبر نے ایک سانس میں ہی اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔ جسے سن کر فاروق کے ماتھے پر ذرا سی شکنیں پڑیں پھر وہ محل سے بولا۔

”دیکھو اکبر..... سب باتیں اپنی جگہ لیکن یہ جو تمہارا پارو والا سلسلہ ہے، اسے میں آگ سے کھیلنے کے مترادف قرار دوں گا۔ مذہب کا فرق بہت بڑی بات ہوتی ہے جسے نظر انداز کرنا دونوں فریقین کے لیے ممکن نہیں ہوتا پھر آج کل تو فضا بھی ایسی ہو گئی ہے کہ ہندو ویسے ہی مسلمانوں کی جان کے درپے ہو رہے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج ہم دخل اندازی نہ کرتے تو پارو کے گھر والے تمہیں قتل کر کے چپکے سے تمہاری لاش ٹھکانے لگا دیتے۔ مذہب کا فرق نہ بھی ہوتا تو کسی لڑکی سے یوں رات کی تاریکی میں اس سے ملنے کے لیے جانا کوئی مناسب عمل نہیں ہے۔ یہ تو لڑکی کو بدنام کرنے والی بات ہے اور جسے چاہا جائے اس کی عزت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔“



بتانے لگا کہ ماموں کے گھر سے اپنے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لے آیا ہے۔ ماموں نے خود اسے اپنے گھر سے دفعتاً ہونے کا حکم سنایا تھا کیونکہ پاروتی کے باپ بھائی اسے تلاش کرتے ہوئے ماموں کے گھر پہنچ گئے تھے اور انہیں بہت دھمکیاں دی تھیں۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ اکبر جہاں بھی دکھائی دیا، اسے جان سے مار دیں گے۔ اکبر چھپ چھپا کر وہاں سے نکلا تھا کہ کہیں راستے میں کسی جگہ ان لوگوں سے مدد بھیڑ نہ ہو جائے۔ لڑائی جھگڑے سے ڈرنے کی بات نہیں تھی لیکن جب وہ شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا تو اچھا تھا کہ یہ وقت سکون سے گزر جائے۔ وہ پاروتی کی سیلی کو اس تک اپنا پیغام پہنچانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا اور اب یہ پاروتی پر تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن تک کس طرح آتی ہے۔ ساری بات سن کر فاروق نے اسے دلاسا دیا اور ہدایت کی کہ اب وہ ہوٹل سے باہر نہ نکلے۔ اکبر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا لیکن سارا وقت مضطرب رہا۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فاروق اور اس کے ساتھیوں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ فاروق اور منو تھانے جا کر باقی کی کارروائی نمٹا آئے اور دوپہر کے کھانے کے بعد اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پہنچ کر تو اکبر کا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا اور وہ بے قراری سے پاروتی کی راہ ٹکنے لگا لیکن اس کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کی مطلوبہ گاڑی پلیٹ فارم پر آرکی۔ فاروق کے ساتھیوں نے سامان اندر رکھوایا اور ماسوائے فاروق کے وہ سب اندر بھی جا بیٹھے۔

”وہ آئی کیوں نہیں۔ اس کے بغیر میں کیسے یہاں سے جاسکتا ہوں۔“ اکبر دیوانہ وار ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ اسی وقت گاڑی نے وسل دی۔ فاروق نے اکبر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جواب میں اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اسی دم چادر میں لپٹی ایک لڑکی تیزی سے اکبر کی طرف بڑھی۔ اکبر بھی اسے دیکھ کر بے قراری سے چند قدم آگے بڑھا لیکن فاروق کی نظریں ان دونوں کے بجائے پیچھے دکھائی دیتے پاروتی کے باپ اور بھائیوں پر تھیں۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور  
محبت کی فریب کاریوں کا مزید  
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

تمہارا اس شہر میں رہنا خود تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ فاروق نے اسے خطرے سے آگاہ کیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں فوری طور پر شہر کیسے چھوڑوں؟“ اکبر پریشان نظر آنے لگا۔

”اگر رقم کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میری طرف سے اتنا انتظام ہو جائے گا کہ سفر کے علاوہ کچھ عرصہ کسی دوسری جگہ قیام کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ آگے تو تم جوان آدمی ہو اپنے لیے کچھ نہ کچھ کر ہی لو گے۔“ فاروق نے اس کم عمر نو جوان کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

”آپ کا بہت شکریہ بھائی جان۔“ اس کی پیشکش پر اکبر کھل اٹھا۔ ”لیکن میں نے پاروتی کے ساتھ اس جگہ کو چھوڑنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ میں اسے چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاسکتا۔“

”اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہو تو کیسے لے جاؤ گے۔ کیا اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے؟“ فاروق نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں کوشش کروں تو اس کی سیلی کے ذریعے رابطہ ہو سکتا ہے۔“ اکبر کے انداز میں دبا دبا جوش تھا۔ ظاہر ہے وہ پہلے ہی پاروتی کے ساتھ یہ شہر چھوڑنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اب ایک سنبل پیدا ہوئی تو اس کو تو خوش ہونا ہی تھا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کل دوپہر تک یہاں ہیں۔ اس دوران میں اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔“ فاروق نے اسے اپنا فیصلہ سنادیا۔ یہ اس کا جولیٹ کے ہجر میں تڑپنے والا دل تھا جس نے اسے اس فیصلے پر آمادہ کیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ دو چاہنے والوں کو ملانے کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو ضرور کرے گا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی جان۔ آپ کے اس احسان کے بدلے میں ساری زندگی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔“ اکبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مجھے کسی کو غلام بنانے کا کوئی شوق نہیں۔ تم خوش رہو، میرے لیے یہی کافی ہوگا۔“ فاروق نے اس کے شانے کو دھیرے سے تھپکا۔ اس کے بعد وہ سب سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ ٹھکنے نے سب کو فوراً ہی سلا دیا البتہ اکبر کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ صبح وہ ناشتا کیے بغیر ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ واپس آیا تو کچھ خوش اور کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک گٹھڑی بھی تھی۔ فاروق کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ





# Downloaded From Paksociety.com

## وصیت

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

خونی رشتے بے شک ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں مگر... اس کے باوجود سب کی بنیادی حقوق جدا جدا ہوتے ہیں جن کی ادائیگی یا وصولیابی میں کسی کو رکاوٹ ڈالنے کا کوئی اختیار نہیں ہے مگر جب... انہی رشتوں سے ایک دوسرے کو بلیک میل کرنے کی نوبت آجائے تو ہر رشتے پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یہی حال ان باپ اور بیٹے کا تھا جن کے درمیان صرف حقوق کی جنگ تھی... جس کا اختتام گھمنڈ کے ٹوٹ جانے پر ہوا۔ اس ایک وصیت نے جانے کتنے لوگوں کو نصیحت کر دی کہ حق تلفی کتنی بڑی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

دل کے ٹکڑے کرنے والے کے ہاتھوں دل کے

ٹکڑے کی پامالی کا نوحہ

کی دھن ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتی تھی۔ وہ پینتالیس، پچاس کے پیٹے میں بڑی بااثر اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ البتہ کنپٹیوں پر سرمی مال سفیدی اٹھ آئی تھی۔

”نٹارٹرڈرز“ کا دفتر شارع فیصل پر واقع ایک کثیر المنزلہ کمرشل بلڈنگ کے تین فلورز پر محیط تھا۔ نثار احمد خان جو اس فرم کے روحِ رواں تھے، ایک ٹھیٹ کاروباری شخص تھے۔ ایک اور ایک دو کے بجائے ”گیارہ“ کرنے

اگست 2016ء

107

سپینس ڈائجسٹ



www.paksociety.com

شخص پر بری طرح طیش آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے آج انہیں اپنی پریشانی اٹھانی پڑ رہی تھی۔ اس شخص کا چہرہ چشم تصور میں ابھرتے ہی نثار احمد کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اور دانت بچختے چلے گئے۔ وہ شخص ان کے گودام کا انچارج قادر بخش تھا۔

نثار احمد کو اب بچھتا ہوا ہوا ہوا تھا کہ کاش وہ اس ماہ آستین کو اپنے ہاں گودام میں کیپرنہ رکھتے پھر اچانک انہیں اپنے بیٹے پر بھی غصہ آنے لگتا۔ تب جھنجلاہٹ میں خود کلامی کے انداز میں زیر لب بڑبڑاتے۔

”اس میں بھلا قادر بخش کا کیا دوش۔ ایسی گندی کھیاں تو شکر پر منڈلاتی ہی ہیں۔ انسان میں خود عقل ہونی چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟“

انہوں نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے رابطہ کیا۔  
”شبانہ..... مشتاق صاحب کو ذرا بھیجیو میرے پاس۔“  
”جی بہتر سرا!“ سیکریٹری شبانہ کی مترنم و مؤدبانہ آواز ابھری۔

اس کے بعد نثار احمد نے ایک جانب رکھے نفیس قسم کے سنگار بکس سے ایک فرنیچر سنگار نکالا اور اس کا کونا توڑ کر طلا کی میوزیکل لائٹ سے اسے سلگایا اور پھر ایک گہرا کش لے کر دھواں اگلنے ہوئے لچھے رار مرغولوں پر اپنی نظریں جمادیں۔  
ذرا دیر بعد تقریباً چالیس سالہ مشتاق احمد ان کے کمرے میں سامنے کی کرسی پر موجود تھا۔ وہ جنرل منیجر تھا۔ چہرے مہرے سے خاصا جہاندیدہ اور زمانہ شناس نظر آتا تھا۔ اس نے کتھی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

”جی سرا!“ اس نے باس کے گہمیر چہرے پر اپنی منتظر نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے ہولے سے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”تم نے اس کام کا کیا کیا؟“ نثار احمد نے ایک گہرا کش لیتے ہوئے اپنے منیجر سے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔  
”سرا! میں نے بات کر لی ہے۔ بس وہ آتا ہی ہوگا۔“  
پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”مگر سرا! میرا مطلب ہے کہ آپ اس سے بات نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔“

”نہیں..... مجھے ہی اس کہینے آدمی سے بات کرنی پڑے گی۔“

”ویسے سر میرا خیال ہے کہ وہ ایک گھٹیا اور نیچ انسان ہے۔ میں ہی اس سے بات کر لوں تو اچھا ہے۔ آپ نے مجھے ساری بات سمجھا تو دی ہے۔“ منیجر نے کسی خیال کے تحت کہا۔  
کیونکہ نثار احمد کے چہرے پر کھنڈی ہوئی نفرت مزید گہری

وہ اندرون سندھ کے بااثر وڈیروں کی رائس اور فلور ملوں سے اناج کی خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ ان میں چھوٹے زمینداروں کی ملوں کا بھی اناج شامل ہوتا تھا۔ جو بڑے ہیوی ٹرالرز اور ٹرکوں میں آیا کرتا تھا۔ ان کے دفتر کا پورا گراؤنڈ فلور گودام کے لیے مخصوص تھا جبکہ فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر ان کا عملہ کام کرتا تھا۔ فرسٹ فلور پر ان کا ایک بڑا شاندار آفس تھا۔ ایسا ہی ایک شاندار آفس سیکنڈ فلور پر بھی تھا جو ان کے اکلوتے بیٹے افتخار احمد کا تھا۔ افتخار ایک ہونہار، ذہین اور خوب روٹو جوان تھا مگر اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ اپنے باپ سے کاروبار کی سوجھ بوجھ ضروری تھی مگر ان کی طرح اس نے اپنے اعصاب پر دولت جمع کرنے کا جنون سوار نہیں ہونے دیا تھا۔

یوں تو نثار احمد کو اپنے بیٹے افتخار سے کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ ان کے بیٹے نے حسب منشاء صرف ان کا کاروبار سنبھال رکھا تھا بلکہ ان کے شایان شان کاروبار کو وسعت دینے میں بھی کوشاں تھا لیکن پچھلے چند روز سے دونوں باپ بیٹے کے درمیان ایک غیر محسوس خلیج پیدا ہونے لگی تھی۔ نثار احمد بنیادی طور پر حاکمانہ مزاج کے مالک اور انا پرست تھے اور معیار زندگی کے بارے میں ان کے کچھ اصول تھے۔ ان سے انحراف کرنے والے کو وہ ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، چاہے وہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا دونوں باپ بیٹے کے درمیان پیدا ہونے والی غیر محسوس خلیج کی بھی ایک یہی وجہ تھی۔ باپ کے سخت اور کڑے اصول بیٹے سے متصادم ہونے لگے تھے۔

نثار احمد نے اس سلسلے میں اگرچہ بیٹے سے بحث کرنے یا الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس کا حل انہوں نے اور ہی سوچ رکھا تھا۔ ان کے بیٹے سے ایک غلطی ہو گئی تھی جو بیٹے کے نزدیک غلطی نہ تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے شاندار آفس میں بڑی سی ساگوان کی میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھے از حد پریشان اور متشکر نظر آ رہے تھے۔ ان کے سامنے چار پانچ کرسیاں رکھی تھیں اور ایک گوشے میں انتہائی قیمتی صوفہ سیٹ اور درمیان میں شیٹے کے ٹاپ والی میز موجود تھی۔ وسیع و عریض آفس کے پہلو میں ایک اور بھی کمرہ تھا جو گیسٹ روم کے طور پر کبھی کبھار ہی مستعمل ہوتا تھا۔

نثار احمد کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکائے چھت کو گھور رہے تھے۔ وہ واقعی پریشان تھے اور ان کی پریشانی کی واحد وجہ ان کا بیٹا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظروں کے سامنے ایک اور چہرہ بھی گردش کر رہا تھا اور انہیں اس



میں مصروف تھا۔ اس نے سفید رنگ کی کھڑکھڑاتی ہوئی اجلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ قادر بخش تھا مکھاں کا شوہر اور طوبی کا باپ۔ انداز میں خاصا بے لگراپن تھا۔ اسی دوران میں کسی کام سے جب اس کی بیوی مکھاں اندر کمرے میں آئی تو فوراً آئینے سے ہٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”اری..... پتا ہے آج مجھے سیٹھ ثار احمد نے بلایا ہے اپنے آفس میں!“

اس کی بیوی مکھاں جس کے چہرے پر اڑھدھکن کے آثار تھے، یکدم جیسے خوش ہو کر بولی۔ ”اچھا! کیا وہ اب تجھے دوبارہ نوکری پر رکھنے والے ہیں؟“

”اوں..... ہونہہ..... سارا مزہ کر کر کر دیا۔“ قادر بخش منہ بسور کر بولا۔ ”اری..... اب اس پھٹ چری نوکری میں کیا رکھا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ سیٹھ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ وہ مجھے ایک بڑی رقم دینے والا ہے۔ پر میں سوچ رہا ہوں کہ اس موٹے مرنے سے وہ موٹی رقم لوں یا پھر اس سے سونے کی انڈے دینے والی مرغی لینے کے لیے بہ صبر رہوں۔ تو بھی کبھی کوئی مشورہ دے دیا کر۔“ وہ حریصانہ لہجے میں اپنے بدہیت ابلے ہوئے دیدے گھما کر مکاری سے بولا۔

مکھاں اپنے شوہر کے عجیب سے لہجے پر ابھی ہوئی نگاہوں سے اسے تنکے لگی جبکہ قادر بخش نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور جیب سے سستے برانڈ کا ایک سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس سے سگریٹ نکالا اور اپنے کالے موٹے ہونٹوں میں دبایا۔ پھر ماچس نکال کر دیا سلائی دکھائی اور ایک گہرا کش لے کر بڑی خوش فکری کے ساتھ دھواں فضا میں اگل دیا۔

مکھاں کے چہرے پر تلخی کی ایک غیر محسوس شکن ابھری۔ جیسے وہ اپنے شوہر کی اصل بات کا مطلب سمجھ چکی ہو۔ لہذا وہ خاموشی سے سر جھٹک کر کچھ کہے بنا کمرے سے نکل گئی۔ قادر بخش بڑے مزے سے سگریٹ منہ میں دبائے کش لگاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے جب صحن سے گزرنے لگا تو ایک لمحے کو رک کر اس نے برتن دھوئی ہوئی اپنی بیٹی طوبی کی طرف دیکھا۔ پھر قدرے چپک کر اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے بولا۔

”طوبی بیٹی..... آج میں بڑا خوش ہوں۔ بول تیرے لیے آج بازار سے کیا لے کر آؤں؟“

طوبی نے خاموش نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا پھر ساٹ لہجے میں بولی۔ ”نہیں ابا..... میں نے کچھ نہیں منگوانا، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

”ارے واہ۔ یہ کیا بات ہوئی بیٹی! آج مجھے بہت

ہوئی تھی۔ انہوں نے خفیف سا آگے جھک کر سگار کی راکھ سنگ مرمر کی ایٹھ ٹرے میں جھاڑی اور پھر تلخ لہجے میں بولے۔ ”بات مجھے ہی کرنی پڑے گی۔ وہ ایک انتہائی لالچی اور کمینہ فطرت شخص ہے مگر ایک بات کا خیال رکھنا مشتاق.....“

”جی سر!“ مشتاق فوراً مستعدی سے بولا۔

”اس کمینے کو افکار سے ہرگز نہ ملنے دینا۔“

”جی بہتر سر! میں ابھی ریسپشن پر ایک آدمی مقرر کیے دیتا ہوں۔ وہ قادر بخش کو دیکھتے ہی سیدھا اسے میرے کمرے میں لے آئے گا اور پھر میں آپ کو مطلع کر کے اس کو ادھر لے آؤں گا۔“

”نہیں، مجھے مطلع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اسے اپنے ساتھ فوراً ہی ادھر لے آنا۔“ ثار احمد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر جب مشتاق ان سے اجازت لے کر اپنی کرسی سے اٹھنے لگا تو اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر ہولے سے باس سے مخاطب ہو کر بولا۔

”سر! اگر قادر بخش پھر بھی نہ مانا تو.....“

اپنے جی ایم کی بات ثار احمد کو کڑوی ضرور لگی تھی مگر مشتاق ان کا ایک با اعتماد اور قابل ملازم تھا۔ وہ بعض سنجیدہ معاملات میں اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مشتاق کو کسی بھی حساس معاملے پر بلا روک ٹوک اپنی رائے کا اظہار کرنے کی کھلی آزادی تھی۔

”پھر کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔“ چند ثانیے کی خاموشی کے بعد ثار احمد نے اپنے سر کو پُر خیال انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا اور مشتاق اپنے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ دو تنگ و تاریک کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ کہنہ سالی کے سبب شکستہ صحن کی چار دیواری کا پلاستر کہیں کہیں سے اکھڑ چکا تھا۔ صبح کی خوشگوار دھوپ صحن میں پھیلنے لگی تھی۔ ایک کونے میں لگے میونسپلٹی کے تنکے کے گرد زمین پر ایک بائیس، تیس سالہ دہلی پتلی لڑکی برتن دھو رہی تھی۔ وہ سانولے رنگ کی مگر ایک پُرکشش اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی۔ وہ لڑکی جس کا نام طوبی تھا ایک چوکی پر بیٹھی دیکھی مانجھ رہی تھی۔ وہاں نزدیک ہی ایک غسل خانہ تھا۔ جدھر اس کی ماں مکھاں کپڑے دھو رہی تھی۔ دن کے دس بجے کا وقت تھا۔ اندر کمرے میں ایک چالیس، پینتالیس سالہ خاصا فرہبی مائل شخص دیوار پر نصب ایک چھوٹے سے آئینے کے سامنے کھڑا سیٹی پر دھن بجاتے ہوئے جھک کر کڑکا کرنے



”مگر..... امی!..... ابا جو کر رہے ہیں وہ درست

نہیں۔ ابا کی ان حرکتوں سے مجھے شرم آتی ہے اور میں خود کو اپنی ہی نگاہوں میں بہت چھوٹا محسوس کرنے لگتی ہوں۔“

”چل چھوڑ بیٹی! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تو اپنے اوپر

اتنا بوجھ نہ لے۔ موسیٰ آئی تھی خالہ نذیرن کے کپڑوں

کا پوچھنے..... سی دیے ہوں تو مجھے دیے دینا۔ میں خود دے

آؤں گی جا کر۔“ ماں نے کہا۔ طوبی نے خاموشی سے

اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

طوبی نے بی اے کیا تھا۔ اس کی ماں سلائی کڑھائی

کرتی تھی۔ یہی ہنر اس نے اپنی بیٹی طوبی کو بھی منتقل کیا تھا۔

اب وہ بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ باپ کو نوکری سے

نکالے جانے کے بعد طوبی نے ماں کے ساتھ باقاعدہ محلے

والوں کے کپڑے سلائی کرنے کا کام سنبھال لیا تھا۔ موسیٰ

ایک پچاس سالہ خاتون تھی۔ وہی اکثر و بیشتر محلے کے

گھروں سے بغیر سیلے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر سٹنے کے لیے

کپڑے یہاں لاتی تھی اور ماں بیٹی سے اپنا ”کیشن“ کھرا

کرتی تھی۔

پچھلے کچھ روز سے طوبی ذہنی پریشانی کا شکار تھی۔ اس

پر مسترا..... باپ کی مشکوک سرگرمیوں نے اسے اور بھی

پریشان کر رکھا تھا۔ اپنے باپ قادر بخش کی لالچی اور

حریصانہ طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ وہ یہ بھی اچھی

طرح جانتی تھی کہ آج سیٹھ صاحب نے اسے کیوں اپنے

پاس بلایا تھا اور اس کے باپ کو روپے ملنے کی کیوں اتنی

مسرت ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج دفتر آتے آتے افتخار کو دیر ہو گئی تھی، اس کی وجہ

یہ تھی کہ گھر سے نکلنے وقت حسب معمول اس کی والدہ نے

نصیحت سے نوازا تھا۔ شاید بیگم ثناء کو بھی دونوں باپ بیٹوں

کے درمیان رفتہ رفتہ حائل ہونے والی خلیج کے مزید کشادہ

ہونے اور کسی بھی وقت بد مزگی کا ادراک ہونے لگا تھا۔ اس

لیے انہوں نے افتخار احمد کو نصیحت سے نوازتے ہوئے کچھ

زیادہ ہی وقت لے لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب افتخار احمد اپنے

آفس پہنچا تو اس کے ذہن میں والدہ کے نظر آمیز جلوں کی

گردان ہو رہی تھی۔

”انی بیٹے! اپنے ڈیڈی کے ساتھ الجھنے کی کوشش

مت کرنا۔ میں انہیں جانتی ہوں وہ غصے کے کتنے تیز ہیں۔

کوئی بھی انتہائی فیصلہ کرنے کے عادی بھی۔“

افتخار کو ماں کی بات میں گہری تشویش محسوس ہوئی

سے روپے ملنے والے ہیں۔ میں تیرے لیے کچھ نہ کچھ

توضیر لے کر آؤں گا۔“

قادر بخش خوشی سے پھولے نہیں سار ہا تھا پھر جیسے خود

ہی فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اچھا..... تیرے لیے کوئی اچھا

ساسوٹ لیتا آؤں گا۔“

یہ کہہ کر جب وہ جانے لگا تو طوبی نے اچانک باپ کو

پکارا۔ ”ابا۔“

قادر بخش کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدم

یکدم رک گئے۔ وہ بیٹی کی طرف مڑا۔ طوبی کے لیچ چہرے

پر ناگواری کھنڈ آئی تھی۔ وہ باپ سے بولی۔ ”ابا! یہ تو

بتاؤ..... یہ اتنے روپے تمہیں کہاں سے ملنے والے ہیں؟“

قادر بخش بیٹی کی بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرایا

پھر اکڑ کر بولا۔ ”بس! ملنے والے ہیں کہیں سے۔ تجھے آم

کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔“

”اماں بتا رہی تھیں کہ آپ کو سیٹھ صاحب نے بلوایا

ہے آج اپنے دفتر۔“

بیٹی کی یہ بات سن کر قادر بخش ذرا چونکا پھر مختصر

بولا۔ ”ہاں۔“

”ابا..... سیٹھ صاحب نے آپ کو وہاں کیوں بلوایا

ہے؟ انہوں نے تو آپ کو نوکری سے بڑا بے عزت کر کے

نکالا تھا۔“ طوبی نے دانستہ لفظ ”بے عزت“ پر زور دیتے

ہوئے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے اندر کی کسی تلخی کو

چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ قادر بخش کے حلق میں بیٹی کے

جواب پر کڑواہٹ سے اتر آئی پھر وہ جیسے جان چھڑانے

والے انداز میں زچ ہو کر بولا۔

”اب مجھے کیا پتا۔ جاؤں گا تو پتا چلے گا کیوں بلوایا

ہے مجھے۔“

”مجھے معلوم ہے ابا!..... اور آپ بھی یہ بات اچھی

طرح جانتے ہیں کہ سیٹھ صاحب نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔“

طوبی نے باپ کی طرف دیکھ کر اچانک سرد لہجے میں کہا۔

قادر بخش کے چہرے کی ساری شادمانی یکلخت

بھاپ بن کر اڑ گئی۔ سرد خشونت بھری نظروں سے بیٹی کو

گھورتے ہوئے جھنجھلا کر بولا۔ ”جانتی ہو تو پھر..... میں کیا

کروں..... کم بخت سارا مزہ کر کر کر کے رکھ دیا۔“

پھر وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس

کے باہر جاتے ہی کھانا جو قریب ہی صحن میں موجود تھی، بیٹی

سے بولی۔ ”بیٹی! اپنے باپ سے مت الجھا کر۔ اس کی

آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔“



تھی۔ تاہم جواباً اس کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ عود آئی تھی پھر اس نے پھیکے پن سے کہا۔ ”مام! اگر ڈیڈ کو آپ جانتی ہیں کہ وہ غصے کے کس قدر تیز اور انتہائی فیصلے کرنے کے کس قدر عادی ہیں تو یقیناً میرے بارے میں بھی انہیں معلوم ہوگا کہ مجھ پر ان کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ میں بھی ان کا بیٹا.....“

”تم کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا تمہارے ڈیڈ نے تمہیں اپنے فیصلے سے باز رکھنے کے لیے مجھے ”فیڈ“ کیا ہے؟“ بیگم ثار احمد کے لہجے میں متا بھر اور دھما۔

ایک ٹائیپ کے لیے افتخار کا دل تو ضرور پسچا مگر وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ پھر بڑے رसान کے ساتھ مسکرا کر بولا۔ ”اوہو۔ آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے مام۔ مجھے آپ کے دکھ کا پوری طرح اندازہ ہے۔ آپ..... آپ..... شوہر اور بیٹے کے درمیان ”سینڈ وچ“ بن کر رہ گئی ہیں لیکن مام.....“ افتخار قدرے توقف کے بعد گہری سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ ڈیڈ مجھے کمیش کرانا چاہتے ہیں۔ انہیں میرے جذبات، احساسات کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ اسے بھی وہ صرف ”بزنس گڈز“ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور میں ایسا بھی نہیں ہونے دوں گا۔ اس لیے کہ میں قیدی نہیں ہوں اور نہ ہی ان کا سب آرڈینیٹ..... مام! آئی ایم ہنر چائلڈ..... اے سن..... انہیں میری درخواست پہنچا دیں کہ کاروبار کو آفس تک ہی محدود رکھیں ویسٹ اسٹ۔“

وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھیں روئی روئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ بیگم ثار کے سفید چہرے پر آنسو اُٹ آئے..... وہ ایک چالیس سالہ پُر وقار خاتون تھیں۔ رنگت صاف اور اجلی تھی۔ ان کے نقشِ مونے مگر جاذبِ نظر تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ واقعی مجازی خدا اور بیٹے کے درمیان جاری سرد جنگ میں پس کر رہ گئی تھیں۔

افتخار اپنے آفس میں آ کر ریوایونگ چیئر پر گر سا گیا۔ ابھی اسے بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

”یس۔“

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ ایک دہلی پتلی قبول صورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔ ”السلام علیکم سر!“ یہ نوشین تھی اس کی سیکرٹری۔

”وعلیکم السلام، کیا حالات ہیں؟“ سلام کا جواب دیتے ہوئے افتخار نے نوشین کے چہرے پر نظر ڈالی۔

## غور طلب

☆ مقدر ایک اہل حقیقت ہے، اس سے منحرف ہو جانے سے مقدر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔

☆ زندگی ایک خوش رنگ تیلی کے مانند ہے جو اکثر کانٹوں میں الجھ جاتی ہے۔

☆ بہت سارے ایسے دکھ جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اکثر ہمارے اپنوں کے دیے ہوتے ہیں، جن سے نانا توڑنا ناممکن ہوتا ہے۔

☆ اپنوں کی غلطی کو معاف کر دینے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

☆ جو لوگ معمولی بات پر روٹھ جاتے ہیں۔ ان سے دوستی رکھنے سے بہتر ہے کہ کسی بچے سے دوستی کر لی جائے۔

☆ قرض سے بچیں کہ یہ دن کی ذلت اور رات کا غم ہے۔

☆ مصیبت سے مت گھبراؤ کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

☆ روشنی کرنا چاہتے ہو تو سنو، دیے کی تیل میں تیل جلتا ہے۔

☆ مشکلات انسان کی روح کی آزمائش ہیں۔

☆ کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری مایوسی ہے۔

☆ جب زندگی گزر رہی ہوتی ہے تو ہم اس کی طرف نہیں دیکھتے اور جب گزر جاتی ہے تو پھر اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ رینگنے کی ساری زندگی سے صرف ایک لمحہ پرواز کا بہتر ہے۔ اگر روٹی عقل سے حاصل ہوئی تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔

☆ ایک پیسا ایک لاکھ نہیں ہوتا مگر ایک لاکھ میں سے ایک پیسا نکال دیں تو وہ ایک لاکھ نہیں رہتا۔

☆ پاگل اور عقل مند دونوں بے ضرر ہوتے ہیں۔ صرف نیم پاگل اور نیم عقل مند خطرناک ہوتے ہیں۔

☆ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

☆

☆

☆

☆



ہی لمحے اس نے اپنی اضطراری کیفیت پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔

”سر! میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گی۔“

آ..... آپ کا کام ہو جائے، بس یہی میرا انعام ہے۔“

افتخار نے یہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نوشین کی ذہانت کا وہ معترف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی سیکریٹری نوشین اپنی قطری ذہانت اور ہوشیاری کے بل بوتے پر اس کا یہ کام بڑی کامیابی سے کر دے گی۔ البتہ اس کی گھبراہٹ اور قدرے مضطربانہ انداز سے افتخار نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اسے شاید باس اور بگ باس کے درمیان پسے میں ذرا تردد ہو رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد افتخار نے ہولے سے مسکرا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ سیکریٹری کے جانے کے بعد افتخار نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔

چند ثانیے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق رہا پھر اچانک ایک خیال سے اس نے دوبارہ انٹرکام پر اپنی سیکریٹری نوشین سے رابطہ کیا۔

”جی سر!“ دوسری طرف سے نوشین کی کھٹکتی ہوئی آواز ابھری۔

”دیکھو نوشین! اگر تم قادر بخش کو میرے پاس لانے میں ناکام ہو جاتی ہو تو پھر تمہیں فوری طور پر ایک دوسرا کام کرنا ہوگا۔“

”جی سر! میں سن رہی ہوں۔“

”تم ایسا کرنا جب قادر بخش ڈیڈ سے مل کر جانے لگے تو تم اسے میرے پاس لے آنا۔“ افتخار نے اسے نئی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

نوشین نے نہایت مستعدی کے ساتھ اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”جی بہتر سر! میرا خیال ہے یہ کام تو میں یہ آسانی انجام دے ہی لوں گی۔ تاہم میری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ.....“

”اوکے، اوکے!“ افتخار نے قدرے بیزارگی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے پر اب گمبھیرتا چھا رہی تھی جس میں ابجھن کے ساتھ پریشانی کا عنصر بھی غالب تھا۔ اس نے کرسی کے پٹے پر اپنا سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں تو اس کے ذہن کی اسکرین روشن ہوئی جہاں ایک دلکش چہرہ رقصاں تھا۔

☆.....☆.....☆

دفعۃً سامنے دھڑے بزر کی کھٹی بجی۔ ثار احمد جو اس

”سر! آپ کی طبیعت.....“

”نوشین!“ افتخار نے اس کی بات کاٹی۔ اس کا انداز

تنبیہی تھا جسے سمجھتے ہوئے نوشین جلدی سے بولی۔

”جی جی سر! سوری..... وہ..... قادر بخش کو آج آفس

بلا یا ہے باس نے.....“ اس اطلاع پر افتخار کو ایک جھٹکا سا لگا اور حلق میں کڑواہٹ سی اترنے لگی پھر وہ چند ثانیے خاموشی کے بعد بولا۔

”مس نوشین..... تم قادر بخش کو ڈیڈ کے کمرے تک نہ جانے دینا بلکہ اسے میرے پاس سیدھا لے آنا۔“ اس کی بات سن کر نوشین کے چہرے پر ابجھن سی طاری ہو گئی۔

”خاموش کیوں ہوئیں تم؟“ خاموشی کے طویل وقفے کو جلد پانٹنے کی خاطر افتخار نے اپنی سیکریٹری کی طرف دیکھا۔ جواباً نوشین گوگو کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔

”جی سر! وہ دراصل.....“ اس نے جلدی سے بولنے کی کوشش کرنی چاہی مگر الفاظ حلق میں ایک سے گئے۔

افتخار اس کے چہرے کی طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے مس نوشین کوئی مسئلہ ہے؟“

”یس سر! بات یہ ہے کہ قادر بخش نامی شخص کو سب سے پہلے آپ کے ڈیڈ کے کمرے میں حاضر خدمت کرنے کی سختی سے تاکید پہلے ہی کر دی گئی ہے۔“ بالآخر نوشین نے اصل بات بتادی۔ اس کی بات پر افتخار چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے جیسے اپنے اندر کا غبار نکالا مگر اب اس کی کشادہ پیشانی پر ابجھن زدہ شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ خاصی دیر تک وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظر بس گاڑے کسی خیال میں کھویا رہا۔ پھر اس کے بعد اس نے نوشین کے چہرے کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”مس نوشین! کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟“

”یس سر! آپ حکم کریں۔“ نوشین نے تھوک نگلتے ہوئے جیسے بہ دقت تمام کہا۔ شاید اس نے افتخار کے مخصوص اندازِ مخاطب سے اندازہ لگانے کی سعی کی تھی کہ وہ اس سے کیا ”کام“ لیتا چاہتا ہے۔

”دیکھو! تم کسی طرح قادر بخش کو ڈیڈ کے پاس جانے سے پہلے یہاں میرے پاس لے آؤ۔“ افتخار نے کہا۔ ”تمہارا یہ کام دفتری فرائض سے ہٹ کر سہی لیکن تمہیں اس کام کا انعام دیا جائے گا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی۔ نوشین اب کچھ زیادہ ہی نروس ہو گئی تھی مگر دوسرے



وقت بے چینی سے کسی کے منظر تھے قدرے چوک کر انہوں نے  
اپیکر آن کیا۔

”سر..... لاڑکانہ سے وڈیرے بابل خان کا فون  
ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ دوسری طرف  
سیکرٹری شبانہ کی مترنم آواز گونجی۔  
”بات کراؤ۔“ ثناء احمد نے سمجھیر لہجے میں کہا پھر  
انہوں نے قریب رکھے ہوئے کارڈ لیس سیٹ سے ریسیور  
اٹھا کر کان سے لگایا۔  
”ہالو بابا۔ سیٹھ صاحب! بابل خان بولتا پڑا ہے.....  
ادھر لاڑکانہ سے۔“

اس طرف سے بھاری بھرکم لہجے والی گونج دار آواز ابھری۔  
”ہاں سائیں! حکم کریں، ثناء احمد بات کر رہا  
ہوں۔“ ثناء احمد نے کاروباری خوش خلقی کا مظاہرہ کیا۔  
”اڑے بابا حکم کیا کرتا ہے۔ ہمارا ایک آدمی آ رہا  
ہے، ہیمنٹ کی کیا پوزیشن ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ  
ایک ٹرک کے بجائے دونوں ٹرکوں کی یکمشت ہیمنٹ  
کر دیں تو وڈی مہربانی ہوگی۔ اچانک روپوں کی ضرورت  
پڑ گئی ہے۔ آگے جیسے تمہاری مرضی بابا۔“ لہجے کے اختتام پر  
روایتی رعونت کا غصہ غالب تھا۔

”ارے نہیں..... نہیں..... بابل سائیں آپ کا حکم  
سر آنکھوں پر..... میرا اصول ہے کہ ہم کاروبار سے زیادہ  
تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ کام  
ہو جائے گا۔“ ثناء احمد نے نہ چاہتے ہوئے بھی خوش مزاجی کا  
مظاہرہ کیا۔

”وڈی مہربانی بابا!..... کبھی آؤ نا..... آپڑاں گوشہ  
گھمائیں آپ کو..... آج کل ٹکور اور بھٹ تیتروں کا موسم  
ہے۔ کوئی شکار دکار ہی ہو جائے بابا۔“ وڈیرے بابل نے  
کھرکھراتی آواز میں خوشی کا اظہار کیا۔

”ہاں..... سائیں..... ضرور..... ضرور۔ آپ کی  
مہمان نوازی کے تو ہم دل سے قائل ہیں۔ میں ابھی آپ  
کا کام کیے دیتا ہوں۔“ جواباً سیٹھ ثناء نے گویا جان  
چھڑاتے ہوئے کہا اور پھر چند اختتامی کلمات کے تبادلے  
کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

ان کی توجہ اس وقت پوری طرح قادر بخش والے  
معاملے پر مرکوز تھی۔ وہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار  
کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس دوران کوئی کاروباری ملاقات بھی  
انہیں گراں گزر رہی تھی۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ  
وہ ایک کمتر درجے کے تھیں کو اتنی اہمیت دینے پر مجبور تھے۔

## سنہری باتیں

☆ لوگوں کے لیے آپ تب تک اچھے ہیں، جب  
تک آپ ان کی امید کو پورا کریں اور سبھی لوگ تب تک اچھے  
ہیں جب تک آپ ان سے کوئی امید نہ رکھیں۔  
☆ انسان کے کردار کی دو ہی منزلیں ہیں، دل میں  
اتر جانا یا دل سے اتر جانا۔

☆ دنیا کو جیتنا چاہتے ہو تو آواز میں نرمی پیدا کرو،  
کسی کو پانے کی تمنائے مت کرو بلکہ اس قابل ہو جاؤ کہ لوگ  
آپ کو پانے کی تمنائے کریں۔

☆ آپ زندگی کو ہر معنوں میں جیت سکتے ہیں،  
بشرطیکہ آپ دو چیزوں سے بچیں۔ ایک یہ کہ آپ اپنے آپ  
کا موازنہ دوسروں سے نہ کریں، دوسرے، دوسروں سے کسی  
قسم کی توقعات وابستہ نہ کریں۔

☆ اگر آپ اپنی مسکراہٹ استعمال نہیں کر رہے  
ہیں، تو پھر آپ کی مثال اس شخص کی ہے جس کے بینک میں  
ملین ڈالرز ہیں مگر اس کے پاس کوئی چیک بک نہیں ہے۔  
☆ اچھا دوست جتنا بھی برا بن جائے۔ اس سے کبھی  
دوستی مت توڑنا کیونکہ پانی چاہے جتنا بھی گندا ہو جائے آگ  
بجھانے کے کام آتا ہے۔

## مسکراہٹیں

☆ ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ دو چیزیں صرف  
واقفیت والوں کو ملتی ہیں۔ (1) سوسے کے ساتھ زیادہ چینی  
(2) گول گپوں کے ساتھ دوسری بار کھٹا پانی۔

☆ ایک آدمی بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک تصویر اسے  
بہت پسند آئی۔ تصویر کسی بہادر سپاہی کی نظر آرہی تھی۔ اس نے  
دکاندار سے پوچھا۔ ”کتنے کی ہے؟“ دکاندار نے جواب دیا۔

”پچاس روپے کی“ اس آدمی کے پاس اڑتالیس  
روپے تھے وہ واپس چلا گیا اور دوسرے دن پچاس روپے  
لے کر پھر دکان پر پہنچا تو دیکھا وہ تصویر بک چکی ہے۔ ایک روز  
وہ اپنے دوست کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہی تصویر ہال میں  
ٹنگی ہے، اس نے دوست سے پوچھا۔

”یہ تصویر کس کی ہے؟“ دوست نے کہا۔ ”ہمارے  
دادا کی ہے۔“ اس پر اس آدمی نے کہا۔  
”دو روپے کم پڑ گئے تھے۔ ورنہ آج یہ ہمارے  
دادا ہوتے۔“

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم



آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی بے حیثیت لوگ کس قدر اچانک اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے دانت پیس کر سوچا۔ یہ سب ان کے ناخلف بیٹے افتخار کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ غصے سے تلملانے لگے۔ ادھر انتظار تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تاہم انہوں نے انتظار کے ان جان لیوا لحاظ کو پاٹنے کے لیے اکاؤنٹ جو ادھر سے انٹرکام پر رابطہ کیا اور اسے ڈیرے بابل خان کے نام بچپن لاکھ کا ”کراس ڈرافٹ“ بنانے کی ہدایت کی پھر مشتاق سے بات کی۔ ”کیا ہوا، یہ مردود بھی تک نہیں آیا؟“ ان کے لہجے سے اضطراب آمیز پریشانی مترشح تھی۔

”سر! میں اس کا منتظر ہوں..... جیسے ہی آئے گا میں.....“ مشتاق کی آواز درمیان میں گھٹ گئی کیونکہ دوسرے ہی لمحے سیٹھ ٹار نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ”گودام نمبر دو کی کیا پوزیشن ہے؟ مال نکل رہا ہے..... یا اتنا ہی ہے؟“

مشتاق احمد..... ٹارڈریڈرز کا ایک زیرک جی ایم اور سیٹھ ٹار احمد کا قابل اعتماد آدمی تھا۔ اسے باس کی مضطربانہ پریشانی کا احساس تھا۔ اس لیے جلدی سے بولا۔ ”سر! مال نکل رہا ہے..... مگر ہم اگلے چھ ماہ تک نیا مال بھرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”یار! ابھی ابھی ڈیرے بابل خان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا، دوڑکوں کی یکمشت سیمینٹ کر دو اور مال بھی ذرا جلدی اٹھانے کی کوشش کرو۔ کیا کریں بات ماننا ہی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی کاروبار میں اصول سے ہٹ کر بھی تو سوچنا پڑتا ہے۔“ سیٹھ ٹار کا ٹکدراب کچھ کم ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! میں پھر مال جلد نکالنے کی کوشش کرتا ہوں..... اور..... سر ایک منٹ.....“ معا مشتاق کی چونکتی ہوئی آواز ابھری..... سیٹھ ٹار ذرا ٹھٹکے۔ پھر دوسرے ہی لمحے مشتاق نے جوشیلی آواز میں انہیں مطلع کیا۔ ”سر! وہ مردود آ گیا ہے۔“

”لے آؤ..... لے آؤ..... اسے فوراً میرے پاس۔“ اس اطلاع پر سیٹھ ٹار احمد کے منہ سے بے ربط انداز میں الفاظ برآمد ہوئے۔ تاہم انہوں نے قریب رکھے کالج کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر حلق تر کیا پھر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

تھوڑی دیر گزری تھی، مشتاق، قادر بخش کو لے کر اندر داخل ہوا۔ قادر بخش مکارانہ انداز میں دانت نکالتا ہوا میز کے قریب آیا۔ سیٹھ ٹار کی طرف دیکھ کر جھٹ سے سلام

کرتے ہوئے مکارانہ فردوسی سے بولا۔ ”سلام سیٹھ صاحب!..... یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس خادم کو یاد کیا۔ کیا میں بیٹھ جاؤں؟“ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ڈھٹائی سے اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

سیٹھ ٹار گویا دانتوں تلے اپنا غصہ دبائے اس کی طرف گھورے جارہے تھے پھر جیسے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قادر بخش کی طرف دیکھ کر انتہائی نخوت سے بولے۔

”تمہیں میں نے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ کھڑے ہو جاؤ اور اپنی اوقات میں رہو سمجھے۔“ قادر بخش یکدم بدکا اور کھڑا ہو گیا۔ مشتاق پریشان سا ہو گیا اسے شاید دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر خبیث قادر بخش اپنی بات پر اڑ گیا تو اچھی خاصی بدمزگی ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ سیٹھ صاحب کے غصے سے واقف تھا۔ ادھر سیٹھ ٹار قادر بخش کو ایک لمحے کے لیے بھی وہاں برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکال کر قادر بخش کی طرف اچھالا جسے اس نے یوں پھرتی سے جھپٹ لیا جیسے اگر وہ چھوٹ گیا تو گویا قیامت ہی آجائے گی۔ اس نے حریصانہ نظروں سے لفافے کو کھول کر اس میں موجود رقم کا اندازہ لگایا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی مطلوبہ رقم نہیں ہے، پھر اس سے پہلے کہ وہ سیٹھ سے کچھ کہتا اسے سیٹھ ٹار کی زہر آلود آواز سنائی دی۔

”یہ نوٹ لو اور دفع ہو جاؤ..... اور تین دنوں کے اندر اندر اپنی بیٹی طوطی کی شادی کا انتظام کرو، سمجھے..... جاؤ اب.....“ قادر بخش کے بشرے پر اب اچانک ناگواری کے تاثرات ابھر آئے تھے اور پھر جیسے وہ اپنی اوقات دکھاتے ہوئے بولا۔

”سیٹھ صاحب! ذرا آرام سے..... یہ ضرور ہے کہ میں آپ کا ملازم رہ چکا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھ سے اس لہجے میں بات کریں۔“

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ سیٹھ ٹار کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ادھر مشتاق کو صاف نظر آنے لگا کہ اب یہاں کافی ہنگامہ ہونے والا ہے مگر وہ دوسرے ہی لمحے حیرت زدہ رہ گیا جب خلاف توقع سیٹھ ٹار احمد نے اپنی غیظ آلود کیفیت پر قابو پاتے ہوئے معتدل لہجے میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا..... اچھا..... ٹھیک ہے کوئی بات کہنی ہے اور؟“

سیٹھ ٹار کا لہجہ نرم پڑتے ہی قادر بخش کی باچھیں پھر مکارانہ انداز میں پھیل گئیں۔ نوٹوں کی گڈی والا لفافہ اس



پھر مدخلت کرتے ہوئے قادر بخش سے فی الحال پیچھا چھڑانا مناسب سمجھا اور کہا۔

”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے قادر بخش! تم ابھی جاؤ۔ ہم دو ایک روز میں سوچ کر تمہیں بتا دیں گے۔ تم ایسا کرنا پرسوں ٹھیک اسی وقت آ جانا۔ چلو اب جاؤ۔“ اس کی یہ بات سن کر قادر بخش کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی پھر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

”اسے اب ختم کروانا ہی پڑے گا۔ یہ گلے کو آنے لگا ہے اب۔“ قادر بخش کے کمرے سے نکلتے ہی سیٹھ ٹار نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے پھنکار کر کہا۔

”ارے سیٹھ صاحب! چھوڑیں..... کیوں آپ اپنی ساکھ خراب کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مطلوبہ رقم اس کے منہ پر مار ہی دیں تو بہتر ہے۔“ مشتاق احمد نے معاملہ فہمی سے کہا۔ ”اب دیکھیں نا سیٹھ صاحب! اس دو ٹکے کے آدمی کے پیچھے آپ کو کس قدر پریشانی کا سامنا ہو رہا ہے۔ آپ کا روباری مینٹنگز میں بھی پارٹنرز سے صحیح طرح ڈیل نہیں کر پارے ہیں۔ کئی بڑی بڑی ڈیلیں آپ کے ہاتھ سے نکل چکی ہیں۔ کل پھر آپ کی ایک پارٹی سے اہم مینٹنگ ہے۔“ مشتاق نے کاروباری اعداد و شمار کی زبان میں سیٹھ صاحب کو سمجھایا تو وہ بے اختیار ایک طویل سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

نوشین کی اولین کوشش یہی تھی کہ وہ قادر بخش کو پاس کے کمرے میں جانے سے قبل ہی افتخار کے پاس لے جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ قادر بخش کے ساتھ مشتاق تھا۔ تاہم وہ تاک میں رہی اور جیسے ہی قادر بخش واپس جانے لگا، اس نے لپک کر اس کے قریب جا کر ہلکی سی سرگوشی میں کچھ کہا۔ قادر بخش کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سینڈ فلور پر واقع سیٹھ ٹار احمد کے بیٹے افتخار احمد کے شاہانہ آفس روم میں موجود تھا۔ اس نے بلا کم و کاست اپنے اور سیٹھ ٹار کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔

”ہوں.....“ افتخار احمد نے قادر بخش کی بات غور سے سننے کے بعد پُر خیال انداز میں ہرکاری بھری۔ تاہم اس کی تیز نظریں اپنے سامنے کرسی پر براجمان قادر بخش کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ افتخار احمد کو بھی قادر بخش سے اتنی ہی سخت نفرت تھی جتنی کہ اس کے باپ سیٹھ ٹار کو تھی مگر کسی اہم وجہ کے باعث افتخار اسے ”برداشت“ کرنے پر مجبور تھا۔

نے بے پروائی سے تھام رکھا تھا۔

”سیٹھ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آج کل بھلا ان تھوڑے سے روپوں میں کون اپنی بیٹی کو عزت سے بیاہ سکتا ہے۔“

سیٹھ ٹار نے پھر غصے سے دانت پیسے..... مگر مصلحتاً خود پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے بولے۔ ”پورے پانچ لاکھ روپے ہیں، تمہاری اوقات سے بھی کئی گنا زیادہ..... اور کیا چاہیے تمہیں؟“

”سیٹھ صاحب..... بات صرف میری بیٹی کی شادی کی تو نہیں ہے نا۔ آپ کے بیٹے کا بھی تو معاملہ ہے۔ اس حساب سے تو آپ نے اس معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی بہت ہی کم قیمت لگائی ہے۔ میری بیٹی کو نہیں، اپنے بیٹے کو ہی دیکھ لیں۔“

”بکواس بند کرو..... اپنی۔“ سیٹھ ٹار غصے میں دھاڑے۔ ”اپنی گندی زبان سے میرے بیٹے کا نام مت لو۔ وہ اٹنول ہے، بکاؤ مال صرف تم لوگ ہوتے ہو۔ آخر آگئے نا اپنی بیٹی کی قیمت لگانے۔“

”سیٹھ صاحب..... آپ بھول رہے ہیں، میں نے اپنی بیٹی کی قیمت نہیں لگائی، آپ نے اپنے بیٹے کی قیمت لگائی ہے..... وہ بھی بہت کم..... یہ پکڑیں اپنے روپے۔“ قادر بخش کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے رقم کا لفافہ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ سیٹھ ٹار کے سامنے اس کی بڑی سے میز پر اچھال دیا۔ ادھر مشتاق کی حالت تپلی ہونے لگی وہ جانتا تھا کہ قادر بخش کے اس طرح ناراض ہو کر چلے جانے سے سیٹھ صاحب پھر کرب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

جب قادر بخش نوٹوں کا لفافہ پھینک کر واپس جانے لگا تو مشتاق احمد نے فوراً اسے روکتے ہوئے معاملہ فہمی سے کہا۔ ”قادر بخش! تمہیں ایسا رویہ زیب نہیں دیتا۔ آخر کو سیٹھ صاحب تمہارے پاس رہ چکے ہیں، ان کی بات مان لو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“

”آں..... نہیں..... فیجر صاحب، صرف میرا فائدہ نہیں، سیٹھ صاحب کا بھی فائدہ ہے۔“ جواباً قادر بخش نے مکاری سے کہا۔

”بولو..... کتنے پیسے اور چاہئیں تمہیں؟“ بالآخر سیٹھ ٹار نے اپنی اہلیتی کھولتی کیفیت پر بہ وقت تمام قابو پاتے ہوئے قادر بخش سے پوچھا۔

”صرف دس لاکھ۔“ قادر بخش نے بڑے آرام سے کہا۔ سیٹھ ٹار کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جواب دیتے، جنرل فیجر مشتاق نے



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                    |                  |                  |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد   | صائمہ اکرام        | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد         | نبیلہ عزیز       | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر       | فائزہ افتخار     | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض        | نبیلہ ابرار جہ   | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار       | آمنہ ریاض        | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل            | عنیزہ سید        | مُستنصر حُسین    |
| رضیہ بٹ       | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد  | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | اُمِ مریم          | نایاب جیلانی     | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



”اچھا تو ڈیڈ نے تمہیں اس کام کے پانچ لاکھ روپے کی آفر کی تھی۔“ چند ثانیے خاموشی کے بعد افتخار نے قادر بخش سے کہا۔ ”اور اگر یہ کام نہ کرنے کے میں تمہیں دس لاکھ دوں تو!“

”اوجی..... دس کی تو میں نے ڈیمانڈ کی تھی آپ کے ڈیڈ سے..... ان کی پانچ لاکھ والی آفر کو تو میں ٹھکرا چکا ہوں۔“ وہ شاطرانہ انداز میں مکاری سے بولا۔ ”اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگلی ملاقات میں وہ مجھے دس لاکھ دے دیں گے۔“ ”پندرہ لاکھ۔“ افتخار نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔

”اوہ..... پھر مجھے اور کیا چاہیے۔ سودا پکا۔“ قادر بخش یکدم خوشی سے پھول گیا۔ حرص و طمع کی چمک سے اس کا مکر وہ چہرہ مزید بدہیت نظر آنے لگا تھا۔

”کل تم میرے پاس آ جانا..... مگر اپنا خلیہ بدل کر تاکہ کوئی تمہیں پہچانے نہیں۔“ افتخار احمد نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ قادر بخش خوشی خوشی لوٹ آیا۔

وہ مکاری اور ہوشیاری کے ساتھ دونوں مال دار باپ بیٹے کو ”ڈبل کر اس“ کرنے میں مصروف تھا۔ درحقیقت اس کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ بیک وقت دونوں باپ بیٹے سے رقم کھینچ لے۔

جب وہ ”ٹارٹریڈرز“ کے دفتر سے نکل کر باہر آیا تو بے حد مسرور تھا۔

☆.....☆.....☆

آج صبح سے ہی دھوپ کی حدت نسبتاً کم اور موسم خوشگوار تھا۔ ایک معروف چوراہے کے ایک اچھے ریسٹوران کے میبل کیبن میں وہ دونوں موجود تھے۔ ان دونوں کے آگے چائے کے خالی برتن دھرے تھے۔ بسکٹ وغیرہ کی پلیٹیں جوں کی توں تھیں۔ ان دونوں نے انہیں ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ دونوں کے چہروں پر کبھی تاثیرات تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کے بعد اب اس پر بہ زبان نموشی اپنے اپنے تئیں غور کر رہے تھے۔ یہ دونوں افتخار اور طوطی تھے۔

ایک دوسرے کی دھڑکن تھے دونوں..... ان کے طبقاتی تفاوت کے باوجود محبت کا بیج کب پھوٹا اور کب دلوں کو تسخیر کرتا ہوا تناؤ درخت بنا، اس کی تیز رفتاری کا دونوں کو اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ کب بے نشان مسافروں کو منزل نصیب ہوئی۔ کب خوابوں کو تعبیریں نصیب ہوئیں اور کب دلوں کا دینا ناگزیر ٹھہرا۔ اس کا انہیں پتا ہی نہ چلا۔

محض ایک لمحاتی اور اتفاقی ملاقات، بلکہ آمنا سامنا ہونے پر وہ دونوں آنکھوں کے راستے ایک دوسرے کے حریم دل میں جا گزریں ہو گئے تھے۔ پیاسی نگاہوں کو نخل امید میسر آنے لگا تو دونوں نے پُر غرور انداز میں سوچا تھا اور دل کو تا ویلیں دے ڈالیں کہ قربتیں، نزدیکیاں..... لہجوں یا صدیوں کی کب محتاج ہوتی ہیں؟ بعض مرتبہ دو دل برسوں تک ساتھ رہتے ہوئے بھی آپس کے فاصلے گھٹانے کی تگ و دو میں عمر گزار دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کم عرصے میں یہ دونوں یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب قادر بخش ٹارٹریڈرز میں نیا نیا گوڈاؤن کبیر بھرتی ہوا تھا۔ طوطی چند ایک بار اپنے باپ قادر بخش کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ ان دنوں اس نے بی اے فائنل کا امتحان دیا تھا مگر افتخار اور طوطی کا باقاعدہ آمنا سامنا اس وقت ہوا جب طوطی ایک ریسپشنسٹ کی پوسٹ کے لیے انٹرویو دیئے آئی تھی۔ یہ انٹرویو بہ ذاتِ خود افتخار نے لیا تھا۔

یوں تو اور بھی لڑکیاں انٹرویو کے لیے آئی تھیں مگر طوطی میں جانے کیا بات تھی کہ افتخار کا دل اسے دیکھ کر بے اختیار اس کی تمنا کرنے لگا۔ وہ اسے ذہین اور سمجھدار لڑکی محسوس ہوئی تھی۔ اگرچہ قادر بخش نے افتخار احمد کے یہ گوش گزار کر دیا تھا کہ طوطی اس کی بیٹی ہے لیکن انٹرویو کے دوران طوطی نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ قادر بخش کی بیٹی ہے۔

افتخار نے سب سے آخر میں اس سے پوچھا تھا۔ ”مس طوطی! ایک آخری بات بتائیں کہ یہ جاب آپ خالصتاً اپنی مرضی کے تحت کرنا چاہتی ہیں یا آپ کے والد قادر بخش جو ہمارے ہی دفتر میں کام کرتے ہیں، اس میں ان کی مرضی کا زیادہ دخل ہے؟“ یہ کہتے ہوئے افتخار نے بغور طوطی کے لیچ چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

اس نے محسوس کیا کہ طوطی کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ تاہم وہ دھیرے سے نظریں قدرے جھکا کر بولی۔ ”جی سر! اس میں میری مرضی کا بھی ایک حد تک دخل ہے۔ ویسے سر! ایک گزارش ہے میری آپ سے۔“

”جی بولیں؟“ افتخار کے لہجے میں پورا خلوص اور آنکھوں میں اشتیاق جھلک رہا تھا۔

”سر! مجھے خوشی ہوگی کہ میرا انٹرویو غیر جانبدارانہ اور عام کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے لیا جائے۔ دراصل میں ابو کی سفارش لے کر کسی اور اپنے سے زیادہ قابل امید وار کا حق نہیں



دھونی چاہی۔ اگرچہ اس کے انداز میں یہ حقیقت بھی مضمر تھی کہ وہ اس طرح حساب برابر کر کے طوبی کی ذہنی کوفت کو دور کرنا چاہتا تھا۔

”مجھے میں نہیں آتا۔ ابو نے تمہارے ڈیڈ سے بھی پیسے لے لیے اور تم سے بھی، آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟“ طوبی کے لہجے میں خفت پوشیدہ تھی۔

”ڈیڈ کر اس!“ افتخار نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ زیر لب کہا تو طوبی قدرے چونک کر اس کا بڑبڑاہٹا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”ہاں طوبی!“ افتخار نے اس کے مہینچ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈ نے تمہارے ابو کو رقم اس لیے دی کہ وہ تمہاری شادی جلد سے جلد کسی اور جگہ طے کر دیں۔ اس طرح وہ اپنی راہ کا کاٹنا ہٹانا چاہ رہے تھے تاکہ میں تمہیں اپنانے کی ضد چھوڑ دوں لیکن تمہارے ابو قادر بخش نے یہ ساری بات میرے گوش گزار کر دی۔ محض اس لیے کہ وہ قیمت بڑھانا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے ڈیڈ کی طرح یہ چال چلنا پڑی اور میں تمہارے ابو کو ڈیڈ کی آفر سے بڑی رقم دینے پر مجبور ہو گیا۔“ افتخار نے اپنی بات مکمل کی۔

”اف میرے خدایا.....! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی باپ اتنا بھی پستیوں میں گر سکتا ہے۔“ طوبی احساسِ ندامت کے بعد اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ افتخار اس کی خفت آمیز ہیبت کڈانی پر بولا۔

”او کم آن..... طوبی! ٹیک اٹ ایزی..... بھول جاؤ ساری خرافات کو۔ اب آگے کی سوچو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے طوبی کے گم صم اور متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔

طوبی بولی۔ ”انی! کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ..... تمہارے ڈیڈ ہماری شادی سے خوش ہو جاتے۔ کیا تم نے انہیں کبھی منانے کی کوشش نہیں کی؟“

”کیسی باتیں کرتی ہو طوبی! تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کس کس طریقے سے ڈیڈ کو نہیں منایا مگر وہ ضد کے پکے ہیں، میں بھی آخر ان کا ہی بیٹا ہوں۔ میں بھی تم سے شادی کر کے رہوں گا۔ بس ہم نے جو فیصلہ کر لیا ہے، اس پر ہمیں کل ہی فوراً عمل کرنا ہوگا۔“

افتخار اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے عزم عیاں تھا۔ جیسے وہ اس معاملے پر مزید سوچ بچار کرنا ہی نہ چاہتا ہو۔

”میرا خیال ہے افتخار پھر ہمیں کم از کم..... میرا مطلب

مارنا چاہتی۔ درنہ یہ بات میرے ضمیر پر بوجھ رہے گی۔“ اس نے اتنا کہہ کر اپنی پلکیں جھکا دیں اور افتخار کو یوں لگا جیسے ہر سو شام کی کجلاہٹ پھیل گئی ہو۔ مخمور و مدہوش کر دینے والی کجلاہٹ۔

افتخار اس کی بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ چکا تھا اور اسے اس کی یہ خود داری اور صاف گوئی اچھی لگی تھی۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ طوبی خالصتاً اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اس جاب کی متمنی تھی۔ افتخار کو اس کی یہ ادا بھائی۔ پھر اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ واقعی غیر جانبدار انٹرویو کے بعد طوبی کے بجائے کسی دوسری لڑکی کو ایڈمٹ کر دیا۔ جو نہ صرف تعلیمی قابلیت میں طوبی سے بہتر تھی بلکہ اسے دو سالہ تجربہ بھی تھا۔ نیز چھوٹی موٹی ڈرافٹنگ اور ٹائپنگ بھی کر لیتی تھی لیکن سب سے بڑھ کر افتخار احمد نے اس میں ایک اہم بات محسوس کی کہ وہ لڑکی واقعی ضرورت مند تھی۔ ایک بوڑھی ماں اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ بھی تھا اس کے نازک کاندھوں پر۔

طوبی کو انٹرویو میں کامیاب نہ ہونے کا ذرا بھی ملال نہ تھا بلکہ خوشی تھی کہ افتخار نے اس کی ”خواہش“ کا احترام کیا تھا۔ اگرچہ بعد میں اس کے باپ قادر بخش نے سیٹھ نثار احمد سے اپنی بیٹی طوبی کی سفارش کروانے کی کوشش بھی کی تھی مگر افتخار نہیں مانا تھا۔

مگر..... طوبی نہیں جانتی تھی کہ وہ جاب کے لیے اس انٹرویو میں توفیق ہو گئی ہے مگر دل کے ایک خاموش مگر محسوس کرنے والے انٹرویو میں ”پاس“ ہو گئی تھی۔

اس عجیب موثر برآمناسا مانا ہونے کے بعد افتخار اور طوبی کے درمیان کسی نہ کسی بہانے پہلے اکا دکا اور پھر متواتر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ دونوں میں امید کی بلیں پروان چڑھنے لگی تھیں اور پھر یہ دونوں قریب آتے چلے گئے تھے۔ آج یہ دونوں ریسٹوران میں بیٹھے ایک پیچیدہ مسئلے پر غور و فکر کرنے کے بعد جیسے اپنی زندگی کے کسی اہم فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔

”افتخار! ابو کی اچھی حرکتوں کی وجہ سے مجھے جس ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔“ ایک طویل خاموشی کے بعد طوبی نے افتخار سے کہا۔ اس کے لہجے میں حد درجہ ندامت پنہاں تھی۔

”کم و بیش..... میرا بھی یہی حال ہے۔ ڈیڈ نے جس انداز میں تمہارے ابو کو خریدنے کی کوشش کی وہ میرے لیے بھی باعثِ شرم ہے۔“ افتخار نے بھی اپنے اندر کی کدورت



تھے۔ انہیں گویا آسمان ٹوٹنے کا قیامت انگیز احساس ہو چلا تھا۔

”اور..... میں تمہاری نافرمانی پر تمہیں اپنی منقولہ وغیرہ منقولہ جانداد سے بھی.....“

”نہیں..... نہیں..... خدا کے لیے..... یہ ظلم نہ کرو نار میرے بیٹے پر“ بالآخر بیگم نار شدت غم سے پھٹ پڑیں۔

”تم چپ رہو بیگم! شکر کرو کہ بیٹے کی نافرمانی کا ذمہ دار میں نہیں نہیں سمجھ رہا..... ورنہ.....“

سیٹھ نار نے قریب کھڑی اپنی بیگم کی طرف گھورتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

ان کے خطرناک تیوروں کا اندازہ کر کے بیگم نار نے سکتے ہوئے آنچل میں اپنا منہ چھپالیا۔ ادھر سیٹھ نار کا پورا وجود غیظ و غضب کے مارے کانپ رہا تھا۔ وہ بدستور

زہریلی نظروں سے بیٹے کی طرف گھور رہے تھے۔ وہ پھر بیٹے کو مخاطب کر کے گمبیر لہجے میں گرجے۔ ”مسٹر افتخار احمد!“

اب تم اپنی بیوی کو لے کر میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کہ یہ معاملہ میری برداشت سے باہر ہو جائے۔“

افتخار نے ایک نگاہ اپنی سسکتی ہوئی ماں کی طرف دیکھا پھر خاموشی کے ساتھ طوبی کا ہاتھ پکڑا اور باپ کی

عالیشان کوٹھی سے باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی زہر خند مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔

وہ دونوں اب بلند و بالا عمارتوں والی کوٹھیوں کے درمیان بنی پختہ سڑک پر کھڑے تھے۔

”افتخار! اب..... اب کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟“ طوبی نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں اپنے محبوب شوہر

افتخار احمد سے کہا۔

”میرے ہوتے ہوئے تم کیوں فکر کرتی ہو طوبی؟“

افتخار نے اسے بڑی ملائمت کے ساتھ تسلی دی۔

”گلستان جوہر میں میرا ایک دو کمروں والا فلیٹ ہے۔ ادھر ہی چلتے ہیں۔ میں ٹیکسی دیکھتا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

گلستان جوہر میں واقع ایک عمارت میں دو بیڈروم کا بڑا خوبصورت فلیٹ تھا اور سارا فرش لکڑی کا بھی..... طوبی کو یہ فلیٹ

بہت اچھا لگا۔ یوں تو وہ افتخار کو پا کر بلکہ..... دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش اور مسرور تھے مگر طوبی کے بیچ

چہرے پر بے نام سی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ افتخار اس کی افسردگی سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس لیے اس نے اس کی

ہے تمہیں اس شادی کے بارے میں اپنے حتمی فیصلے سے ڈیڈ کو آگاہ کرنا ہی پڑے گا۔“ طوبی نے کسی خیال کے تحت اپنے

ہونے والے سرسیٹھ نار احمد سے مصالحت کی کوشش جاری رکھی۔ افتخار نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ تبھی تو انہیں تمہارے باپ کے ساتھ گل کھلانے کا موقع ملا تھا۔ اب میں

نہیں چاہتا کہ وہ پھر ہم دونوں کے بیچ کوئی دوسری خندق کھودیں۔ لہذا اب صرف شادی ہوگی اور جلدی ہوگی.....

دش آل.....“ افتخار نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ کھڑے کر کے کہا۔

☆.....☆.....☆

دو دن بعد افتخار نے طوبی سے شادی کر لی اور اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے آیا۔ سیٹھ نار احمد جیسے پتھر اکر رہے

گئے مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

”بالآخر تم نے اپنی ضد پوری کر کے ہی چھوڑی۔“

”یہ ضد نہیں تھی ڈیڈ! یہ تو.....“ افتخار نے بڑے رसान کے ساتھ باپ سے کہنا چاہا مگر سیٹھ نار نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔

”دش الف..... اینڈ ناؤ، زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بدستور پتھر بنے رہے۔ اس سے وہ

کسی بھی روپ میں باپ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جیسے افتخار ان کا بیٹا نہیں بلکہ کوئی تالاق ترین ملازم ہو جسے وہ نوکری سے

ڈس مس کرتے ہوئے اس کی کوئی بات ماننے یا سننے کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ قریب موجود بیگم نار شوہر اور بیٹے کے

بیچ گہری پڑتی دراڑ کے تصور سے اپنا خون خشک کیے کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو غم اور انجانے اندیشے گڈ گڈ

ہو کر سکتے کی سی کیفیت طاری کیے ہوئے تھے۔ وہ بے جاری خوفزدہ نظروں سے بھی اپنے شوہر کو دیکھتیں تو کبھی بیٹے

کو مجبور نگاہوں سے دیکھتیں۔ انہوں نے شاید اس بھیا تک اور کر بناک حقیقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب

سک انھیں۔

”تمہارا آج کے بعد سے، ہم سے اور اس گھر کے درو دیوار سے کوئی ناتا نہیں رہا۔ سمجھے تم.....“ پتھر آئی ہوئی

بے رحم آواز افتخار احمد نے خاموشی سے سنی پھر وہ دھیرے سے مگر قدرے طمانیت کے ساتھ بولا۔

”جی بہتر ڈیڈ..... اور کچھ؟“

ادھر بیگم نار کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے لگے



عید کے خوشمارنگوں سے سجایا کیزہ اگست 2016 کا عید نمبر

کراچی  
رفت سراج کا نیا سلسلہ وار ناول

یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

ایک اچھوتے اور پُراثر بیان کے ساتھ

ماہنامہ  
**پاک سوسائٹی**

انجم انصار، درّ ثمن بلال و مدیحہ شاہد کے مسحور کن قسط وار سلسلے

نایاب جیلانی کے منی ناول کی رازوں سے پردے اٹھاتی آخری قسط

فاخرہ گل کا دلکش مکمل ناول محبت ہے سمندر سی

اختر شجاعت کا پُر فکر مضمون تکبر، غضب الہی

**STAY TUNED TO  
PAKSOCIETY.COM**

فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ

میں سب کی ہر دلعزیز، شہروزی کی نیلوفر عباسی

بہنیں ہماری مہمان

ساون کی باتیں، شائستہ زریں کے پُرکشش سروے میں

(اس کی جلاوہ)

شمیم فضل خالق، شائستہ عزیز، پروین عذرا تشنہ، فرحین اظفر،

رفاقت جاوید، رفعت شبانہ و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی دلفریب تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے دل خوش کن سلسلے صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے



دلجوئی شروع کر دی۔

”طوبی! ہمیں اور کیا چاہیے بھلا۔ ساری دنیا کی دولت تو ہمارے قدموں تلے ہے۔“

”کتنا اچھا ہوتا افتخار اگر..... اگر تمہارے ڈیڈ.....“

”پلیز! طوبی لیواٹ ناؤ۔ اب آگے کی سوچو، زندگی ہم دونوں نے گزاری ہے۔ ڈیڈ کا یہ وقتی ابال ہے۔ آہستہ آہستہ جب ان کا غصہ سرد پڑ جائے گا، وہ خود ہی ہمیں ایک دن لینے یہاں آن پہنچیں گے۔“ افتخار نے جیسے طوبی کو تسلی دی مگر خود اسے اپنی آواز کا کھوکھلا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر طوبی کو بھی کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ افتخار اس کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔ وہ پھر کبیدہ خاطر ہو کر بولی۔

”افتخار! میری وجہ سے تم اپنے باپ سے دور ہوئے۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔“

”او..... کم آن..... طوبی! اب چھوڑو بھی..... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ افتخار نے کہا۔

”اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ میرے ڈیڈ مجھے کیش کرانا چاہتے تھے۔ وہ میرے جذبات اور احساسات کو اپنے کاروباری اصولوں کی بجھٹ چڑھانا چاہتے تھے اور..... پھر میری ذاتی زندگی کو بھی ایک ”بزنس ڈیل“ سمجھ کر اسے تا عمر روندتے ہی رہتے۔“

طوبی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ سب تمہاری غلط فہمی ہو۔ ایک باپ بھلا کب یہ چاہے گا کہ.....“ طوبی کی بات ادھوری رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے افتخار نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز نظروں سے مسکرا کر کہا۔

”اور..... تمہارا اپنے باپ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی تو تمہیں ”کیش“ کرانا چاہتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ابا کو تو کم از کم اس معاملے میں ضرور کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے افتخار نے شرارت بھری نظروں سے طوبی کی طرف دیکھا تو طوبی نے خفت کے مارے اپنا سر جھکا دیا۔ افتخار نے محبت پاش نظروں سے اس کے نکھرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ٹھوڑی آہستگی سے اوپر کی۔ اس کا حنائی ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیا پھر محبت سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”طوبی! مجھے صرف اس چار دیواری سے محبت ہوگی جہاں تمہارے وجود کی خوشبو ہو، جہاں تمہاری موجودگی کا مسرت بھرا کیف اور احساس ہو۔ چاہے چار دیواری

سونے کی ہو یا گارے مٹی کی.....“ افتخار کے محبت سے لبریز لہجے کی چاہت بھری خوشبو نے طوبی کو سرور کر ڈالا۔ ایسے میں طوبی کے گلابی لبوں میں لرزش پیدا ہوئی، جیسے دل کی بات لبوں تک آتے آتے رہ گئی ہو۔

”ہاں طوبی! تمہاری محبت، تمہاری سنگت..... میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ تمہاری من موہنی صورت، تمہارا گلاب سا نازک اندام پیکر صحیح معنوں میں مجھے ملکیت کا احساس تقا کر بخشنے لگا ہے۔ مجھے اس بات کا بھلا کیا غم کہ میرے ڈیڈ نے مجھے اپنی منقولہ وغیرہ منقولہ جائیداد سے عاق کر دیا ہے۔ میری اصل دولت اور جائیداد تو تم ہو۔ صرف تم۔ باقی سب بیچ ہے تمہارے آگے۔“

”اور میری دولت تم ہو افتخار۔ صرف تم۔“ افتخار کے خاموش ہوتے ہی طوبی کے دلکش لبوں سے نکلا۔ اس لیے اس نے اپنی سرمئی پلکوں کی جھار کو اٹھا کر افتخار کے روشن روشن چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر افتخار کی نشیمنی نظروں سے طوبی کی مد بھری نگاہیں چار ہوئیں تو جیسے دو پیارے لبالب بھرے جام چھلک پڑے۔ افتخار سے نہ رہا گیا اور اس نے طوبی کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔

”طوبی! میری اس چھوٹی سی چار دیواری کو جنت بنا دو بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

☆.....☆.....☆

وہ ساحل سمندر پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھنٹوں دنیا و مافیہا سے لاتعلقی ٹیلی ریت پر ننگے پاؤں گھوم رہے تھے۔ ان سرور بھری ساعتوں کو دیکھ کر دونوں کے مسرت بھرے دل سے بے اختیار یہ خواہش ابھرنے لگی کہ کاش یہ کیف آور لمحے تھم جائیں۔

طوبی اور افتخار گھنٹوں ساحل پر گھومتے رہتے اور خوش آئند دنوں کی منصوبہ بندی کرتے رہتے۔

”جناب! اب یہ سیر سپاٹے چھوڑیں اور کچھ ذریعہ معاش کی طرف بھی دھیان دیں۔“ سی ویو کے ایک اوپن ایئر ریسٹوران کے قدرے تنہا گوشے میں چنوں کی چاٹ کھاتے ہوئے طوبی نے افتخار سے کہا۔ اس وقت دور پُرسکون سمندر کے بلکورے لیتے افق پر سورج کی لال ٹکیا ڈوب رہی تھی۔

”ابھی میرے پاس بہت سا روپیہ ہے۔“ افتخار نے طوبی کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے بے نیازی سے کہا۔ ”میرے اکاؤنٹ میں ابھی کافی بیلنس ہے۔ ابھی تو ہمیں ہنی مولن پر بھی نکلنا ہے۔ میں نے بہت



کام کر لیا اب ذرا کچھ دن خوشیوں اور شادمانیوں کے بھی گزار لینے دو۔“

”افتخار! بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔“ طوبی کے لہجے میں اچانک گہری متانت عود کر آئی۔ ”جہنی میون ضروری نہیں۔“ طوبی کے لہجے میں فکر فردا کی کاٹ تھی جسے افتخار نے محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ اب وہ بھی قدرے سنجیدہ نظر آنے لگا اور کچھ سوچتے ہوئے طوبی سے بولا۔

”طوبی! تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں جلد ہی کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔ کم از کم مجھے کسی بھی اچھی فرم میں جنرل منیجر کی نوکری تو ضرور مل جائے گی۔“

”ڈھونڈو گے تو ملے گی نا۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرنے سے تو نہیں ملے گی۔“

”اوہو..... بھی تم نے یہ کیا تھانیداری دکھانی شروع کر دی ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ کہاں دھرے بیٹھا ہوں میں۔“

افتخار نے معنی خیز انداز میں شرارت بھری نظروں سے طوبی کے چہرے کی طرف دیکھا تو بے اختیار طوبی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

وقت گزرتا گیا۔ کسی نے کسی کی کوئی خبر نہ لی، طوبی البتہ اپنے باپ کے ہاں ہو آتی تھی۔ افتخار کہاں جاتا؟ اس کا اپنے گھر میں داخلہ گویا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ ماں کی محبت سے مجبور ہو کر وہ فون پر اس سے بات کر لیا کرتا تھا۔

ٹار نے اپنے بیٹے کی کوئی خبر نہ لی، وہ گویا جیسے واقعی اپنے بیٹے کو بھلا بیٹھا تھا۔ باپ کی شفقت اور محبت کے سلسلے میں افتخار کے دل میں جو غور آمیز مان تھا کہ..... ایک دن باپ اپنی اولاد..... اپنے بیٹے کی پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر اسے منانے آجائے گا مگر وہ مان اب ریت کی طرح بندھن سے ٹکٹا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر، میں بھی آخر ان کا ہی بیٹا ہوں۔“

سیٹھ ثار احمد کا بیٹا۔ افتخار احمد خان..... اگر ایک باپ کو بیٹے کا غم نہیں تو..... پھر بیٹے کو بھی ایسے بے حس باپ کی فکر نہیں ہونی چاہیے..... کیوں طوبی..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....“

وہ معصوم ٹوٹے ہوئے دل رکھنے والے بچے کی طرح سکھنے لگا۔ طوبی کو ڈر ہونے لگا تھا کہ اس کے شوہر کو کہیں باپ کا غم نہ لے ڈوبے۔ وہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ زندگی کی کچھ دوسری تلخیوں

نے ظاہر ہونا شروع کر دیا تھا جس میں سے اہم مسئلہ ذریعہ معاش کا تھا۔ افتخار کا یہ ”نسلی بخش“ خیال باطل ثابت ہوا تھا کہ اسے فوراً اچھی نوکری مل جائے گی۔ اسے اپنے کاروباری حلقے کا جو زعم تھا اسے اندازہ ہوا کہ وہ باپ کے عاق نامے کے بعد ہی قطع ہو چکا ہے۔ وہ بہت دلبرداشتہ ہوا۔ ”کیا میری اپنی کوئی پہچان نہ تھی؟ میری شناخت میرے حوالے سے نہ تھی؟ پھر..... پھر میں کیا تھا؟“ وہ سوچتا۔ وہ بالکل ڈھے گیا ہوتا اگر طوبی کا ساتھ نہ ہوتا۔

جو جمع پونجی تھی، وہ اس زعم میں تیزی کے ساتھ سیر پانے میں لٹا رہا تھا کہ اسے عام لوگوں کی طرح کون سا نوکری کے لیے جوتے پہنانے پڑیں گے مگر اب اسے آٹے وال کا بھاء معلوم ہونے لگا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ اسے اپنے ”فیصلے“ پر کوئی پچھتاوا ہو۔ طوبی کو پا کر اسے کسی اور شے کی بھلا طلب ہی کہاں رہی تھی۔ تاہم زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تو درکار ہوتا ہے۔ وہ اس کے حصول کے لیے مصروف ضرور تھا۔

اب پتا نہیں بے روزگاری کا دکھ تھا یا باپ کی بے مروتی کا غم..... افتخار بیمار رہنے لگا۔ طوبی نے بیوشن کا کورس کر رکھا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے ایک کمرے میں بیوی پار رکھ لیا جاتی تھی مگر اس کے لیے بھی تو سرمائے کی ضرورت پڑتی جو ان کے پاس نہ تھا۔ تاہم طوبی نے اس کا طریقہ نکالا..... اس نے پہلے افتخار کو اعتماد میں لیا، اس کے بعد اس پر عمل شروع کر دیا۔ یہ فلیٹ بڑا تھا اور ان کی ضرورت سے زیادہ بھی۔ ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کی گئی، فلیٹ فروخت کر دیا گیا اور دوسرا ایسا ہی فلیٹ کرائے پر لے لیا گیا۔ کچھ پیسے فکس ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ اسکیم میں لگا دیے اور باقی پیسوں سے طوبی نے ایک کمرے میں بیوی پار رکھ لیا۔

زندگی کی گاڑی کو ذرا دھکا لگا تو پڑ مردہ زندگی کچھ مسکرائی مگر ادھر تقدیر نے کسی پیاسی ڈائن کی طرح ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ طوبی کو تو مصروفیات کا بہانہ مل گیا تھا مگر افتخار کی طبیعت پھر بھی نہ سنبھل پائی۔ حتیٰ کہ وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ طوبی حیران پریشان اسے قریبی ڈاکٹر کے کلینک میں لے گئی۔ اس نے چند ضروری دواؤں کا ایک نسخہ طوبی کو تھما دیا۔ مگر ساتھ میں یہ بھی فرمایا دیا کہ اگر طبیعت نہ سنبھلے تو کسی دماغی یا نفسیاتی ڈاکٹر سے کونسلٹ کریں۔ یہی ہوا۔ مذکورہ ڈاکٹر سے بھی افاقہ نہ ہوا تو مجبوراً طوبی افتخار کو لے کر ایک مشہور ماہر نفسیات کے پاس گئی جس نے سب سے پہلے نگڑی فیس کھری کی۔ پھر آدھے گھنٹے کے تفصیلی معائنے کے بعد



اسے چکر آئے۔ راہ چلتے کچھ خدا ترس لوگوں نے طوبیٰ کو قریب ہی ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچا دیا۔ وہاں اسے ماں بننے کی خوش خبری ملی۔ طوبیٰ بے چاری دم بخود رہ گئی۔ سوچنے لگی کہ اس خبر پر وہ خوشی منائے یا..... اب تو جیسے خوشیوں کو بھی گہن لگ گیا تھا۔

اس نے گھر آ کر مبہم لہجے میں افتخار کو یہ ”خوشخبری“ سنائی۔ دونوں کے چہروں پر ذرا دیر کو نئے آنے والے مہمان کی وجہ سے خوشی کے تاثرات بھی ابھرے مگر وہی گہن لگی خوشی..... طوبیٰ نے البتہ افتخار کو اس کے باپ کی بے بسی کے بارے میں نہیں بتایا کہ کہیں اس کا دل مزید بوجھل نہ ہو جائے لیکن اس دن افتخار نے خود ہی طوبیٰ سے کہہ ڈالا۔ ”طوبیٰ! ایک کام تو کرو، میری بیماری کے متعلق ذرا میرے ڈیڈ کو تو آگاہ کر دو خود جا کر۔“

اس کی بات سن کر طوبیٰ کا کلیجہ کٹ گیا۔ وہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ کہیں مزید اس غم میں افتخار کی طبیعت بگڑ جائے وہ خاموش رہی۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو طوبیٰ کو بالآخر یہ تلخ حقیقت بتانا ہی پڑی کہ وہ یہ کام بہت پہلے کر چکی ہے اور اس کے جواب میں سیٹھ ٹار نے اس کے ساتھ کیسا ناروا اور سنگدلانہ سلوک کیا تھا۔

افتخار کے چہرے پر پہلے حیرت، پھر غم کے تاثرات گڈمڈ ہو گئے۔ اس کے بعد اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنستا چلا گیا۔ طوبیٰ خوف زدہ سی نگاہوں سے افتخار کو تنکٹے لگی۔

☆.....☆.....☆

محبت کی ابتدا تو ہے مگر انتہا کوئی نہیں۔ ایک دن افتخار کا ڈپریشن اتنا شدید بڑھا کہ وہ دنیا سے ہی رخصت ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے طوبیٰ کے کان میں ایک وصیت آمیز سرگوشی کی تھی جسے سن کر طوبیٰ کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اس وصیت کو طوبیٰ نے اپنے ذہن کے دور افتادہ گوشے میں محفوظ کر لیا تھا۔

وقت بڑے بڑے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے مگر اپنے محبوب شوہر کی موت کا غم طوبیٰ سے بھلائے نہیں بھولتا تھا لیکن پھر تھوڑے عرصے بعد ہی جب طوبیٰ نے ایک پیارے سے صحت مند بچے کو جنم دیا تو تب کہیں جا کر اس کے بے قرار دل کو کچھ سکون ملا۔ اس کے ماں باپ اس کے فلیٹ میں ہی آکر رہنے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

بچے کی پیدائش کے بعد ہی طوبیٰ کے کانوں میں اپنے

افتخار کی اس بیماری کو ”مینیا“ (Mania) کا نام دے کر چند ضروری ہدایات دیں پھر رخصت کر دیا۔ اس مرض کی دوائیں بھی بڑی مہنگی تھیں۔ دوا کو بھی چھ سے نو ماہ تک کے لیے تفویض کیا گیا تھا۔ اس پر بھی ڈاکٹر موصوف نے علحدگی میں طوبیٰ کو ”مریض“ سے متعلق ایک ضروری ہدایت بھی دی تھی کہ..... ”بی بی! دواؤں سے زیادہ اگر آپ وہ اسباب ری موو (Remove) کرنے کی کوشش کریں تو مریض کو جلد شفا مل سکتی ہے۔“

طوبیٰ جانتی تھی کہ اس کے محبوب شوہر کی بیماری کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے اس کے باپ کی بیٹے سے لاتعلقی..... طوبیٰ کبھی حیرت اور افسوس کے ساتھ اپنے سر سیٹھ ٹار احمد کے بارے میں سوچتی تھی کہ آخر وہ کیسا باپ تھا جو اپنی انا کے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا اور اس نے بیٹے کی پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔

افتخار کی حالت و طبیعت پھر بھی نہ سنبھل پائی کہ ایک دن طوبیٰ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق افتخار کی اس عجیب بیماری کا سبب دور کرنے کے لیے خاموشی سے اپنے سر کی عالیشان کوٹھی جا پہنچی۔ بیگم ٹار تو پریشان ہو گئیں مگر سیٹھ ٹار نے طوبیٰ کو دیکھ کر زہرناک لہجے میں کہا۔ ”تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟ میں کسی فقیر کو خیرات تو دے سکتا ہوں مگر..... مگر..... تمہیں.....“

”میں اپنے لیے خیرات لینے نہیں آئی ہوں سیٹھ صاحب! آپ کے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں آپ کے پاس۔“

طوبیٰ نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اس پر بیگم ٹار نے اپنا سینہ تھام لیا مگر سیٹھ ٹار کے کانوں پر جوں تک نہ رہی۔

”خود ہی بھگتو اب اپنی ضد۔“ انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

بیگم ٹار بلبلانہ انھیں اور روہانسی ہو کر اپنے شوہر سے بولیں۔ ”ٹار! اتنے سنگدل نہ بنو۔ آخر کو وہ ہمارا بیٹا ہے۔ وہ بیمار ہے۔“

”تم خاموش رہو بیگم! میں ان کے ڈرامے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اب لیلیٰ مجنوں کو آٹے دال کا بھوا معلوم ہو رہا ہے۔“ سیٹھ ٹار گھٹور پن سے بولے اور بڑی سنگدلی اور بے مہری سے طوبیٰ کو واپس لوٹا دیا۔

طوبیٰ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ گھر آتے آتے



لیکن طوبی! مجھے یہ منظور نہیں ہوگا کہ میرا باپ اپنے ضمیر کا بوجھ تمہارے ذریعے ہلکا کرنے کی کوشش کرے۔ اب اس بوجھ تلے اسے ساری عمر جینا ہوگا۔ تم سمجھ گئی ہو نا..... میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟“

اور طوبی اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ افتخار کی موت کے بعد اپنے سسرال والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ مشکل افتخار کی وصیت نے آسان کر دی تھی۔

لہذا آج جب افتخار کی بات حیرت انگیز طور پر سچ ثابت ہونے لگی تو طوبی کے اندر سلگتے شعلوں کی تپش تیز تر ہونے لگی مگر اس نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”سیٹھ نثار احمد صاحب! آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے اپنے بیٹے افتخار کو خود سے لائق قرار دے دیا تھا۔ اب بھلا یہ تعلق کیونکر جوڑا جا رہا ہے؟“

”وہ میری غلطی تھی بیٹی.....!“ سیٹھ نثار کے لہجے میں ندامت تھی۔ ”اور میں اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوں اب..... اب میرا سارا ایسا میرے پوتے کا ہی تو ہے۔ تم دونوں میرے پاس خوش رہو گے۔“

”پلیز سیٹھ صاحب! پہلی بات تو یہ کہ مجھے آپ بیٹی نہ کہیں۔ دوسرا یہ کہ میرے بچے کو آپ کی دولت کا سہارا نہیں چاہیے۔ محض آپ کی ضد کی وجہ سے میرا بچہ باپ کی شفقت بھری دولت سے محروم ہو گیا اور اب کون سی دولت اس معصوم کے لیے اہمیت رکھے گی۔“ یہ کہتے ہوئے طوبی کے فرط غم سے آنسو نکل پڑے مگر وجود میں بھری غصے کی تپش روئیں روئیں سے پھوٹ رہی تھی۔ سیٹھ نثار نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر طوبی بول پڑی۔

”پلیز سیٹھ صاحب!..... آپ لوگ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جائیں، کہیں مجھ سے کوئی بدتمیزی نہ ہو جائے۔“

طوبی نے کھلونوں اور کپڑوں والے شاپر بھی انہیں واپس کر دیے..... سیٹھ نثار کے چہرے پر بڑے کرب اور دکھ کے تاثرات تھے۔ وہ شرمسار اور نادام نام سے لوٹ گئے۔

ان کے جانے کے بعد طوبی بھی بے اختیار رو پڑی تھی۔ اس نے افتخار کی وصیت پوری کر دی تھی۔ جس نفسیاتی و ذہنی بیماری کا شکار افتخار ہوا تھا، اس بیماری کا اب سیٹھ نثار بھی شکار ہونے والے تھے۔

مرحوم شوہر افتخار کی سرگوشی گونجنے لگی اور پھر طوبی نے ایک دن بڑے اہتمام کے ساتھ..... سیٹھ نثار کو اس کے دادا بننے کی خبر پہنچائی۔ طوبی نہیں جانتی تھی کہ بیٹے کی موت کے بعد پتھر دل سیٹھ نثار احمد پر کیا بیٹی تھی؟ وہ شاید اپنے بیٹے افتخار کی بیماری کو پہلے ڈراما اور جذباتی بلیک میلنگ سمجھتے تھے۔ طوبی جانتی تھی کہ ایک باپ جب اپنے بیٹے کی بیماری کا سن کر اسے دیکھنے نہیں آیا تو بھلا پوتے کی پیدائش پر اسے دیکھنے کس طرح آسکتا ہے مگر چونکہ یہ بات اس کے شوہر افتخار کی وصیت کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ طوبی نے اس پر عمل کرتے ہوئے سیٹھ نثار تک یہ خبر پہنچا دی تھی۔

اس خبر کے پہنچنے کی دیر تھی کہ اگلے دن ہی سیٹھ نثار اپنی بیگم اور دو عدد نوکروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے شاپر زائدارت رکھے تھے جن میں چھوٹے بچے کے کپڑے اور کھلونے وغیرہ تھے۔ طوبی نے بڑی سرد مہری کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ طوبی کے کانوں میں ابھی تک افتخار کی وصیت کے الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے مرتے وقت کہے تھے اور حیرت کی بات تھی کہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا سب کچھ۔ طوبی نے محسوس کیا کہ سیٹھ نثار پوتے کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئے جا رہے تھے۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ جس باپ نے محض اپنی جھوٹی انا کی خاطر اپنے بیٹے سے تعلق نہیں رکھا تو اب پوتے پر اس قدر پیار آتا تھا جس کی بات تھی۔ کہتے ہیں کہ جھوٹی انا اور ضد کا خول بھی ٹوٹتا ہے جب دل پر چوٹ لگ جائے۔

افتخار کی اچانک اور ناگہانی موت پر سیٹھ نثار بھی ایک لمحے کو گنگ ہو گئے تھے کیونکہ وہ یہی سمجھتے ہوئے تھے کہ افتخار بیمار نہیں ہے، محض بیماری کا ڈراما رچا کر ان کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ افتخار کا انتقال ہوا تو احساس جاگا کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اب وہ اپنے ننھے پوتے کی صورت میں اپنے بیٹے کی شبیہ دیکھ رہے تھے۔ آخر کو باپ تھے مگر بعض غلطیوں کی تلافی ناممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سیٹھ نثار نے طوبی کو اپنے گھر چلنے کا کہا تو یک دم اسے اپنے شوہر کے آخری الفاظ یاد آ گئے۔

”طوبی! بعض تلخ حقیقتوں کا احساس انسان کو بعد میں ہوتا ہے۔ موت بھی ایسی ہی تلخ حقیقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے باپ کو اپنے غلطی کا احساس ہو جائے..... میرا دل کہتا ہے..... ایسا ضرور ہوگا۔ میرا باپ تلافی کے لیے تمہارے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھنے آئے گا





## حکم ربّی

### ملک صندریات

زن، زن، زمین کا جھگڑا صدیوں پرانا... جانتے سب ہیں، مانتا کوئی نہیں... زمین کے بنوارے، زر کا لالچ اور زن کا عشق اسی طرح... سرچڑھ کر بولتا رہتا ہے اور کوئی نہ کوئی داستان رقم ہوتی رہتی ہے۔ یہاں بھی محبت نے محبت کو پانے کے لیے کھلواڑ کیا اور یہ بھلا دیا کہ محبت خلوص کی محتاج ہوتی ہے، بدی کی سمت کبھی نہیں دھکیلتی... اس نے بھی سیدھی سچی محبت میں قریب اور مکاری جیسا زہر ملا دیا پھر کیسے حسبِ منشا نتائج نکل سکتے تھے... وہ جو تنہائیوں میں بہت رویا، بہت تڑپا مگر محبوب کی سنگدلی پر فرق نہ آیا... بالآخر اس نے پھر کچھ ایسا ہی فیصلہ کیا جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

**حکم ربی پر آنکھ بند کر کے یقین اور دل سے محنت کرنے والے ایک پولیس آفیسر کی ہمت کی کہانی**

اس عورت نے بڑی عجیب بات کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے تھانے آئی تھی اور میرے کمرے میں پہنچ کر اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ تھانے میں بیٹھے بیٹھے ہی تھانے داری کرتے ہیں یا کچھ خبر بھی ہے، ادھر قصبے میں کیا ہو رہا ہے؟“

ان دنوں میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک گنجان آباد قصبے کے تھانے میں تعینات تھا۔ قصبہ ”جلال پور“ کی آبادی کم و بیش دو ہزار رہی ہوگی۔ اس زمانے میں کسی قصبے کی اتنی آبادی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بس، یوں سمجھیں کہ جلال پور ایک چھوٹا شہر ہی تھا جہاں تین، ساڑھے تین سو کے قریب گھر آباد تھے اور ضروریات زندگی کی ہر چیز بھی مل جاتی تھی۔

”بی بی! تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو اور تمہارا نام کیا

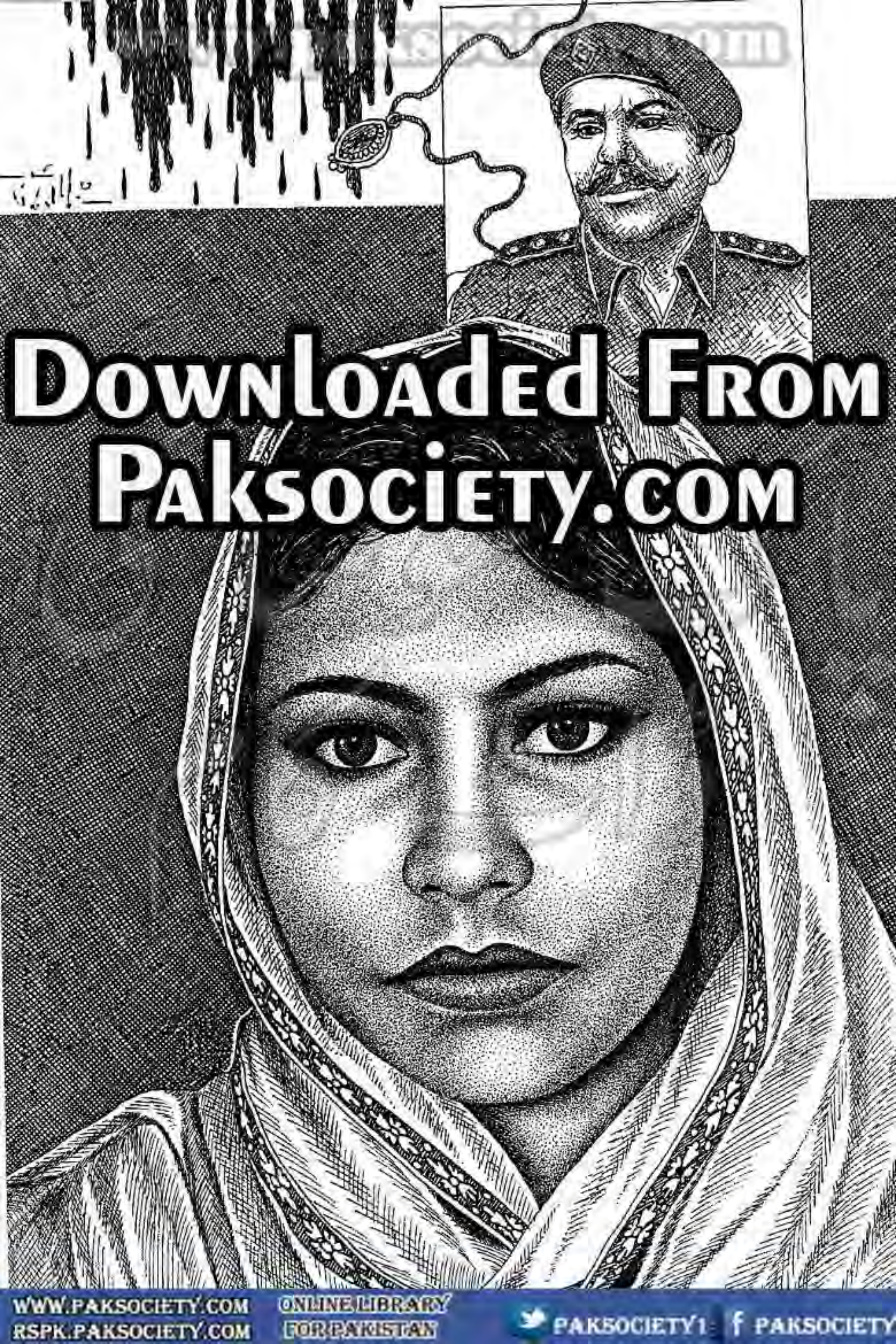
ہے؟“ میں نے اپنے سامنے کھڑی سراپا سوال اس عورت سے پوچھا۔ ”بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔“ میں نے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ”مجھے بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“

وہ بے جھجک ایک کرسی پہنچ کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز و اطوار اور گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک نڈر، بے باک اور بہادر عورت ہے۔ وجود سے مضبوط اور چہرے سے خاصی پُر اعتماد بھی نظر آتی تھی۔ میں اس کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنے سوال کا جواب موصول ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

”میرا نام خورشید بیگم ہے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”میں ادھر جلال پور ہی کی رہنے والی ہوں اور میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے؟“ میں نے شک زدہ نظر سے اسے گھورا۔ ”پھر تم میرے پاس کیا لینے





**Downloaded From**  
**PAKSOCIETY.COM**



آئی ہو؟“

”جس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو کیا وہ آپ کے پاس نہیں آسکتا تھا؟“ اس نے بڑی سادگی سے استفسار کیا۔

”یہ بات نہیں ہے خورشید بی بی!“ میں نے جلدی سے وضاحت کر دی۔ ”دراصل.....“ ”تھانہ اور کچہری دو ایسی جگہیں ہیں جہاں بلا وجہ کوئی بھی قدم نہیں رکھتا۔“

”ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے تھانہ دار صاحب!“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی آپ کے پاس بلا وجہ نہیں آئی لیکن.....“ ”لحاحی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”لیکن میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نرگس کے مسئلے کے لیے یہاں آئی ہوں.....“

”اور یہ نرگس کون ہے؟“

”نرگس میری پڑوسن ہے تھانہ دار صاحب۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔“

”کیسا خطرہ؟“

”مجھے ڈر ہے کہ نرگس کا گھر والا اسے کوئی نقصان پہنچانے والا ہے۔“ اس نے سسنی خیز انداز میں بتایا۔

”اوہ.....“ میں ہونٹ بھیجنے کر گہری نظر سے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خورشید بیگم کو کھنکھنے لگا۔ ”میں کیسے پتا چلا کہ نرگس کا شوہر اس کا دشمن ہے اور اسے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

”میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے جی۔“ وہ پراسرار انداز میں بولی۔ ”جاوید اسے دھمکی دے رہا تھا۔“

”جاوید.....“ میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ نرگس کا گھر والا؟“

”جی، میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”ذرا وضاحت کرو۔“ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”تم نے کب جاوید کو کس قسم کی خطرناک باتیں کرتے سنا ہے۔“

میرا مطلب ہے، وہ کب اپنی بیوی کو دھمکی دے رہا تھا؟“

”وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ.....“ وہ تفصیل بتانے لگی۔ ”دونوں میاں بیوی میں کھٹ پٹ تو کافی عرصے سے چل رہی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جب سے شادی ہوئی ہے، ایک دن بھی ان میں اتفاق اور پیار دیکھنے کو نہیں ملا۔ ایک کا منہ اور مزاج مشرق ہے تو دوسرے کا مغرب۔ ہر روز ایک

نیا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے اور.....“

”ان کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”چھ سال تقریباً۔“ خورشید بیگم نے جواب دیا۔

”میں نے ایک اہم سوال کیا۔“ ان کے بچے کتنے ہیں؟“

”کوئی نہیں تھانہ دار صاحب۔“ وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”جب ان کے بچے ہو جائیں گے تو پھر لڑائی جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی کے دو تین سال بعد تک اگر میاں بیوی صاحب اولاد نہ ہو پائیں تو ان میں ”توتکار“ اور لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گی تھانہ دار صاحب.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک زمانے میں میرے اور طالب حسین کے بیچ بھی اسی قسم کی سرد جنگ جاری رہتی تھی پھر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو گیا لیکن.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہی ہے.....“

میں نے خورشید بیگم کے ”معاملہ سلجھ اور“ کو ایک طرف رکھتے ہوئے پہلے یہ پوچھ لیا۔ ”یہ طالب حسین کون ہے؟“

”طالب حسین میرا گھر والا ہے جناب۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا اچھا!“ میں نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”شادی کے بعد اولاد نہ ہونے کی وجہ سے تم میاں بیوی میں ٹوک جھوک ہوتی رہتی تھی، پھر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو گیا.....“ اب آپ لوگوں کے کتنے بچے ہیں؟“

میرے اندازے کے مطابق، خورشید بیگم کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اگر اس کی شادی کو پندرہ سال بھی ہوئے تھے تو اس وقت اس کے پانچ چھ بچے تو ہونا ہی چاہیے تھے لیکن اس کے جواب نے میرے اندازے کی ایسی میٹھی کر دی۔

”ابھی تک ایک بھی بچہ نہیں ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اور اب آگے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

”مایوسی گناہ ہے خورشید بی بی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ قادر مطلق ہے۔ رحیم و کریم ہے۔ وہ بڑھاپے کی کئی منزلیں طے کرنے والے



والے افسوس ناک قصے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تاہم اس کی پتا کے اختتام پر میں نے یہ ضرور پوچھا تھا۔  
”تم دونوں کی گزراوقات کیسے ہوتی ہے خورشید بی بی؟“  
”آٹھ دس ایکڑ زرعی اراضی ہے تھانے دار صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”میں اور طالب حسین تو کھیتی باڑی کے قابل نہیں ہیں اس لیے ہم نے یہ زمین ایک مزارع کو ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ سال میں یہ زمین اتنا تاج پیدا کر دیتی ہے کہ ہماری گزر بسر بہت اچھے اور باعزت انداز میں ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اس نے کسی کا محتاج نہیں رکھا۔“

”بے شک! آپ دونوں اللہ کی اس نوازش پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ”خورشید بی بی! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ نرگس اور جاوید کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی بنیادی وجہ اولاد کا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ وہاں معاملہ کچھ اور ہے۔۔۔۔۔ تو یہ معاملہ کیا ہے؟“

”اس گھر میں فساد کی دو جڑیں ہیں تھانے دار صاحب۔“ اس نے برا سامنے بناتے ہوئے بتایا۔ ”ایک جاوید کی ماں یعنی نرگس کی ساس رحمت بی بی اور دوسری جاوید کی بڑی بہن خالدہ۔۔۔۔۔ ان دونوں عورتوں نے نرگس کی زندگی کو پچھلے چھ سال سے جہنم کا نمونہ بنا رکھا ہے۔“  
”اور جاوید اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کا کردار کیا ہے؟“

”اگر وہ کسی قابل ہوتا تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا۔“ وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”وہ کینٹ اپنی ماں اور بہن کا غلام ہے۔ انہی کے اشاروں پر ناپتا ہے۔“  
”آپ لوگ ان کے پڑوسی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا فرض بنتا ہے کہ ان لوگوں کو فردا فردا سمجھائیں۔ میرا خیال ہے، یہ معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں کہ پولیس کی مدد کی ضرورت پیش آئے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ ”ہم نے ابتدا میں اپنا فرض نبھاتے ہوئے یہ کوشش کر کے دیکھ لی ہے تھانے دار صاحب۔ جاوید اور اس کی ماں وہن کو قطعاً یہ پسند نہیں کہ ہم ان کے گھریلو معاملات میں بڑھ چڑھ کر مداخلت کریں۔ مجبوراً ہم نے خاموشی اختیار کر لی اور شاید ہماری یہ خاموشی برقرار ہی رہتی کہ پچھلی رات میں نے اتفاق سے جاوید کی باتیں سن لیں۔ وہ بڑے

حضرت ذکر یا کو ان کی بانجھ بیوی میں سے حضرت یحییٰ جیسی اولاد دے سکتا ہے تو وہ ذات پاک تم پر بھی مہربان ہو سکتا ہے۔“  
”میں بلکہ ہم دونوں اللہ کی رحمت اور کرم سے مایوس نہیں ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ چٹائی لہجے میں بولی۔ ”بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے اولاد کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ خوش اور مطمئن رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ عطا کر رکھا ہے اس کے لیے ہم اس کے شکر گزار ہیں اور جو کچھ ہمیں میسر نہیں، اس پر ہم نے صبر کر لیا ہے۔“

”اس سے اچھی تو اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“ میں نے کبھیر انداز میں کہا۔ ”جو شخص اللہ کی رضا پر صابر و شاکر ہے، وہ زندہ ولی ہے۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔  
”تمہارا گھر والا کیوں نہیں آیا؟ اصولی طور پر تو یہ شکایت لے کر طالب حسین کو تھانے آنا چاہیے تھا یا کم از کم اسے تمہارے ساتھ آنا چاہیے تھا؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ اداس لہجے میں بولی۔ ”لیکن طالب حسین کے ساتھ ایک ایسی مجبوری ہے کہ وہ آپ کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔“  
”کیسی مجبوری خورشید بی بی؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”طالب حسین معذور ہے۔“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کٹی ہوئی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں ایک بوجھل نظر اس پر ڈالتے ہوئے ہمدردی بھرے انداز میں مستفسر ہوا۔ ”کوئی حادثہ وغیرہ پیش آ گیا تھا؟“

”بہت ہی سنگین اور عبرت ناک حادثہ۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ”یہ تحریک آزادی کی ایک ”یادگار“ ہے تھانے دار صاحب۔۔۔۔۔“

میں یک ننگ اسے دیکھتا چلا گیا۔ میرے پوچھنے پر خورشید بی بی نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ قیام پاکستان کے وقت طالب حسین بھی تحریک آزادی کا ایک سرگرم رکن رہا تھا اور ہندوؤں سے ایک معرکے کے دوران میں اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ اس ضمن میں خورشید بی بی نے مجھے ایک دردناک کہانی سنا ڈالی تھی۔ یہ کہانی چونکہ زیر نظر داستان کا حصہ نہیں اس لیے میں طالب حسین کو پیش آنے



خطرناک انداز میں نرگس کو دھمکا رہا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی باتیں سن کر مجھے ڈر محسوس ہوا تھا۔ میں نے طالب حسین سے ذکر کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور پھر مجھے مشورہ دیا کہ ہمیں ان حالات کی پولیس کو خبر کر دینا چاہیے۔ کل کلاں کچھ ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا اور اب میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔“

”مثلاً..... وہ کس قسم کی خطرناک باتیں کر رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بس، وہ نرگس کو ڈرا دھمکا رہا تھا کہ یہ اچھا نہیں ہوگا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”خورشید بی بی! تم جس نوعیت کی شکایت لے کر میرے پاس آئی ہو وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن یہ بتاؤ کہ ان میاں بیوی کے معاملے میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ اس علاقے کے تھانے دار ہیں۔“ وہ کراہی آواز میں بولی۔ ”آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ کے لیے بھلا کیا مشکل ہے.....“

”مشکل تو کچھ نہیں ہے لیکن پولیس کو بھی کارروائی کرنے کے لیے کسی اصول اور ضابطے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے مطابق اس گھر میں نرگس کے ساتھ بہت ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے، میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا لیکن مجھے کسی کارروائی کے لیے نرگس کی تائید کی ضرورت ہوگی۔ جب تک خود نرگس یا اس کے میکے کا کوئی قریبی رشتے دار مجھ سے شکایت نہ کرے، میں بھلا جاوید یا اس کی ماں اور بہن پر کسی قسم کا دباؤ کیسے ڈال سکتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟“

”جی..... میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ وہ پُر سوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”کیا تم ایسا کر سکتی ہو کہ.....“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”کسی وقت نرگس کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ میں اس کی زبانی اس کی کہانی سن کر کوئی فیصلہ کرتا ہوں کہ اس کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ان لوگوں نے بڑی کڑی نظر رکھی ہوئی ہے نرگس پر۔ اسے کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتے۔ میں تو پڑوسن ہوں اس لیے اس کے دکھ کی خبر ہے مجھے۔ جاوید اس پر بہت ظلم کرتا ہے۔ کئی کئی ماہ تک اسے میکے بھی نہیں جانے دیتا۔ وہ کسی بے بس قیدی کی طرح زندگی گزار

رہی ہے۔“

”کیا اس کے میکے میں اس کے درد سے کوئی واقف نہیں ہے؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”میرا خیال ہے، نرگس کے ماں باپ کو بڑی حد تک اس کے حالات کا علم ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”لیکن آپ تو جانتے ہیں، بیٹی کے ماں باپ کتنے مجبور ہوتے ہیں۔“

”ہاں، شادی شدہ بیٹیوں کے والدین بسا اوقات بہت کمزور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔“ میں نے خورشید بی بی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”نرگس کا کوئی اور بھائی بہن؟“

”ایک چھوٹا بھائی ہے، بارہ تیرہ سال کا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس بچے کو اپنی بہن کے مسائل کا پوری طرح احساس بھی نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے خورشید بی بی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ میں کوئی حل نکالتا ہوں اس مسئلے کا۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

وہ میرا شکر یہ ادا کر کے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

خورشید بی بی جو مسئلہ لے کر میرے پاس آئی تھی، اس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں مظلوم نرگس کے لیے ایک تھانے دار کی حیثیت سے کیا کر سکتا ہوں۔ خورشید بی بی کا جذبہ ہمدردی اور حق ہمسائیگی اپنی جگہ لیکن عین ممکن تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی انداز میں نرگس کے لیے سوچ رہی ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ ”میاں بیوی“ کے گھریلو جھگڑے ایک ازلی ابدی حقیقت ہے اور کوئی بھی ذی شعور شخص اس حقیقت کی وقوع پذیری سے انکار نہیں کر سکتا۔

میں رات سونے سے پہلے بھی دیر تک اس مسئلے پر غور و فکر کرتا رہا۔ خورشید بی بی کو تو میں نے تسلی بخشی دے کر تھانے سے رخصت کر دیا تھا لیکن اس سلسلے میں کوئی عملی کارروائی کرنے کے لیے میرے ذہن میں باقاعدہ کسی قسم کا لائحہ عمل ہرگز نہیں تھا۔

اگلی صبح میں نے ایک پھر تیلے قسم کے کانٹیل کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ نہایت ہی خفیہ انداز میں نرگس کے شوہر جاوید کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھ تک پہنچائے۔ میں جب تک اس کے حوالے سے بنیادی باتوں سے واقف نہ ہو جاتا، کوئی عملی قدم اٹھانے یا اسے تھانے میں بلا کر پوچھ



تقرری کے ابتدائی دنوں میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ جانے والا تھانے دار کون سے معاملے کو کس حال میں اور کسے چھوڑ کر جاتا ہے اور آئندہ اس معاملے کو کس انداز میں ٹیکل کرنا ہے، یہ سب سوچنا اور اس کے لیے لائحہ عمل بنانا ایک وقت طلب کام ہے۔ میں اس کام میں ایسا مصروف ہوا کہ مجھے اپنے کھانے پینے اور سونے جانے کا کچھ ہوش نہیں رہا، ان حالات میں، میں جاوید اور نرگس کو کہاں یاد رکھتا.....

چند دن بعد کی بات ہے۔ میں ایک روز حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ کھیتوں میں کسی مرد کی لاش پڑی ہے، یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ میں نے اطلاع لانے والے کا ٹشیل سے پوچھا۔

”طفیل! وہ لاش کس کی ہے اور کہاں سے ملی ہے؟“  
”جناب! دو بندے ابھی یہ خبر لے کر تھانے آئے ہیں۔“ طفیل مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ”ان کا کہنا یہ ہے کہ مقتول کا تعلق جلال پور سے ہے۔ وہ مرنے والے کا نام جاوید بتاتے ہیں۔“

”جاوید“ کا نام سن کر میں چونکا اور مجھے یاد آ گیا کہ خورشید بی بی نے بھی مجھ سے کسی خردماغ جاوید کا ذکر کیا تھا جو اپنی بیوی نرگس کے ساتھ بہت ظلم و زیادتی کیا کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ وہی جاوید تو نہیں۔

”طفیل.....“ میں نے کاٹشیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم باری باتوں سے تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اطلاع لانے والے خود جلال پور کے دستیک نہیں ہیں ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ مقتول کا تعلق جلال پور سے ہے.....“  
”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ملک صاحب!“  
کاٹشیل طفیل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ دونوں موضع چک بتی (بتیس) سے آئے ہیں اور جاوید نامی اس شخص کی لاش بھی انہی کے چک کے نزدیک کھیتوں میں پائی گئی ہے۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔  
”چک“ سے مراد آپ ”گاؤں“ سمجھ لیں۔ چک بتی یعنی نمبر بتیس میرے تھانے کے جنوب میں لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر پایا جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں زیادہ سے زیادہ ایک سو گھر آباد ہوں گے۔

میں نے اطلاع لانے والے دونوں افراد کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ شکل صورت سے عام سے دیہاتی نظر آتے تھے۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ

تاچہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر میرا ہمیشہ سے یہ اصول رہا تھا کہ میں خواجواہ کی ”تفتیش“ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جب تک کسی شخص کے مجرم ہونے کا مجھے شک نہ ہو جائے، میں اسے ایک تھپڑ مارنا بھی حماقت اور بے وقوفی ہی سمجھتا ہوں..... اور جاوید کا معاملہ تو فی الحال کچھ تھا بھی نہیں۔

دوروز کے بعد اس کا ٹشیل نے مجھے رپورٹ دی جسے میں نے جاوید کی ٹوہ لینے پر مامور کیا تھا۔ ناصر علی نامی اس کا ٹشیل نے آکر مجھے بتایا کہ جاوید ایک موٹا تازہ اور بے ہنگم شخص تھا۔ اس کی عمر سا تیس اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ”ریل بازار“ میں کپڑے کی ایک دکان چلاتا تھا اور سارا دن اس دکان پر بیٹھ کر مختلف قسم کا کپڑا فروخت کرتا تھا۔ خورشید کا گھر بھی ”ریل بازار“ کے پچھواڑے تھا۔ میرا تھانہ اس سڑک کے کنارے پر واقع تھا جو لائل پور اور لاہور کو آپس میں ملاتی تھی اور اسی روڈ کی دوسری جانب قصبہ جلال پور آباد تھا۔ مذکورہ سڑک سے تھوڑے فاصلے پر ریلوے لائن گزرتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے عین سامنے سڑک سے جو بازار قصبے کی اندرونی سمت جاتا تھا، وہ ”ریل بازار“ کہلاتا تھا۔ مجھے جلال پور کے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ میں جولائی کے اختتام پر یہاں آیا تھا اور اب ماہ اکتوبر چل رہا تھا۔

کاٹشیل ناصر علی سے حاصل ہونے والی معلومات ایسی نہیں تھیں کہ میں کوئی سخت قسم کا ایکشن لیتا۔ البتہ یہ ضرور پتا چلا تھا کہ جاوید غصے کا بہت تیز تھا اور دکان پر آنے والے اکثر گاہکوں سے اس کا جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ پڑوسی دکان داروں سے بھی اس کی لڑائی ہو چکی تھی۔ رخ کلامی تو ایک معمول کی بات تھی۔

یہی حال گھر کے اندر کا بھی تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ گھر کے اندر جاوید کے چیخنے چلانے کی آوازیں اکثر ابھرتی رہتی ہیں اور بیوی کے ساتھ بھی اس کا جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ بہر حال، قصہ مختصر یہ کہ جاوید پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجھے کوئی بھی معقول بہانہ نہیں مل سکا اور میں اس قصے کو بھول بھال گیا۔

اس قصے کو بھولنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پہلے دن کے بعد پھر کسی خورشید بی بی نے یا نرگس کے اور کسی حمایتی نے تھانے کا رخ نہیں تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بتایا، اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ کسی بھی تھانے میں



لایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔  
 ”کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ جس جاوید کی لاش تمہارے گاؤں کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے وہ جلال پور ہی کا رہنے والا ہے؟“

☆ ☆ ☆  
 ہمارا تانگا جب موضع چک بتیس پہنچا تو اس وقت دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ وہ ماہ اکتوبر کا وسط چل رہا تھا۔ چاول کی فصل کا اختتام تھا۔ اکثر کھیتوں میں فصل کی کٹائی ہو چکی تھی اور بعض میں ابھی فصل کھڑی نظر آرہی تھی۔ جاوید کی لاش بھی ایک ایسے ہی کھیت میں پڑی ملی تھی جس کے اندر چاول کی فصل کٹائی کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔ میں اے ایس آئی کے ساتھ موقع واردات پر پہنچ گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، جلال پور سے ایک کچا راستہ چک جی تک آتا تھا جس پر تانگے، بیل گاڑیوں، گھوڑوں اور سائیکل وغیرہ کی آمد و شد جاری رہتی تھی۔ چک جی اور جلال پور کے درمیان لگ بھگ چار میل کا فاصلہ حائل تھا۔ مذکورہ کچے راستے کی دونوں جانب کھیتوں کا سلسلہ تاحہ نگاہ پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ جاوید کی لاش جس کھیت کے اندر سے ملی تھی، وہ اس کچی سڑک کے کنارے سے لگا ہوا تھا اور لاش بھی کھیت کے ابتدائی حصے ہی سے دریافت ہوئی تھی۔ بس آٹھ دس فٹ کھیت کے اندر.....!

میں نے اکڑوں بیٹھ کر لاش کا جائزہ لیا۔ جاوید نے موسم کی مناسبت سے ایک سادہ سا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کی کھلی چپل تھی اور اس کا سر بڑی طرح زخمی تھا..... مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ جاوید کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ڈنڈوں سوٹوں کی مدد سے اس کے سر پر بہت کاری وار کیے گئے تھے جنہ کے نتیجے میں اس کی کھوپڑی کئی جگہ سے بری طرح چٹخ گئی تھی اور یہی اس کی موت کا سبب بھی نظر آتا تھا۔ چٹخی ہوئی کھوپڑی سے خارج ہونے والا خون اس کے چہرے اور گردن پر جم چکا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ موت کی گہری نیند سونے والے جاوید کے دونوں بازو بھی مختلف مقامات سے بری طرح گھائل تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ موت کو گلے لگانے سے پہلے اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے تاہم اس کی کوئی پیش نہیں چل سکی اور کھوپڑی کے علاوہ اس کے دست و بازو بھی زخمی ہوتے چلے گئے۔ بالآخر وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند زمیں بوس ہو کر اس جہاں سے اس جہاں میں منتقل ہو گیا تھا۔

”پکا یقین ہے سرکار!“ ان میں سے ایک مضبوط لہجے میں بولا۔ ”ہم بھلا اس جاوید کو پہچاننے میں کیسے غلطی کر سکتے ہیں۔“  
 ”کیا مطلب؟“ میں نے گھور کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگ غلطی کیوں نہیں کر سکتے۔ کیا مرنے والے کے ساتھ تم لوگوں کا یار نہ تھا؟“  
 ”یار نہ نہیں تھا مائی باپ.....!“ دوسرے شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن جاوید ہمارے پنڈ کا جنوائی تھا جناب۔ ہم پچھلے پانچ چھ سال سے اسے اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے اس کی شناخت میں کسی غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”پنڈ کا جنوائی“ اور پانچ چھ سال کے الفاظ نے مجھے بری طرح چوکنے پر مجبور کر دیا اور خورشید بی بی کی کبھی ہوئی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں۔ میں نے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”کیا آپ لوگ اس جاوید کی بات کر رہے ہو جس کی شادی چھ سال پہلے نرگس سے ہوئی تھی؟“

”جی ہاں، بالکل.....“ وہ بیک زبان ہو کر بولے۔  
 ”نرگس کا تعلق ہمارے ہی چک سے ہے۔ وہ چھ سال پہلے بیاہ کر جلال پور آئی تھی۔“

”ادہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”کیا تم لوگ سیدھے تھانے آئے ہو یا تم نے جاوید کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع دے دی ہے؟“  
 ”ابھی تو ہم سیدھے تھانے ہی آئے ہیں جناب!“  
 ان میں سے ایک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب جو آپ کا حکم ہو؟“

”تم دونوں باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”میں تھوڑی دیر میں تم لوگوں کے ساتھ جائے وقوع کی طرف چلتا ہوں اور جہاں تک جاوید کے گھر والوں کو اس اندوہناک واقعے کے بارے میں بتانے کا معاملہ ہے تو اس کا میں انتظام کر دیتا ہوں۔“  
 وہ اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے تھانے کے معاملات کو سیدھا کیا پھر اے ایس آئی مراد خان کی معیت میں جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ دونوں



سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

کراچی  
سرگزشت  
ماہنامہ

شمارہ اگست 2016ء  
کی جھلکیاں

فخر فن

ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے اردو  
ادب کے حسن کی داستان حیات

ماموں بھانجا

الطاف شیخ کا برسوں پرانا واقعہ  
جو حالات حاضرہ کا عکاس ہے

اپنی اپنی دنیا

کاشف زیر کی ایک شہکار تحریر جو سبق آموز بھی ہے

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال کے قلم کی جادوگری دلچسپ سفر کہانی

قصور کس کا

محمد کبیر عباسی کی عبرت انگیز سچ بیانی

کرب زیاں

اعجاز احمد راجیل کی لہورنگ سچ بیتی

اس کی غلغلہ

ناظم بخاری کی "عیدی" زویا اعجاز کی "دوراہا"  
محمد ظفر کی "بیچ کا آدمی" منظر امام کی "تاریخ عالم"  
صائمہ اقبال کی "اگست کی شخصیات" اختتامی  
مراحل میں پہنچی ہوئی "سراب"

اور بھی بہت سارے سچے واقعات، سچ بیانیاں،  
سچے قصے۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے  
ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے۔

میں نے مقتول کی جامہ تلاشی لی تو اس کی جیبوں میں  
سے مختلف چھوٹی موٹی اشیاء کے علاوہ دو سو روپے کی نقدی بھی  
برآمد ہوئی۔ اس زمانے میں دو سو روپے کو ایک اچھی خاصی  
رقم سمجھا جاتا تھا۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ پچاس ساٹھ روپے  
سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بیس سے پچیس روپے میں ایک  
متوسط خاندان کا مہینے بھر کا راشن آ جاتا تھا۔

ایک بات تو واضح ہو گئی کہ جاوید کو لوٹنے کی غرض  
سے موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا تھا۔ اگر یہ عام راہزنی  
یا لوٹ مار کی واردات ہوتی تو قاتل لٹیرے ہرگز ہرگز اس  
کی جیب میں موجود دو سو روپے چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔  
گویا، یہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جانے والی  
ایک قاتلانہ انتقامی کارروائی ہو سکتی تھی۔

میں نے اوپر لفظ "قاتل لٹیرے" استعمال کیے ہیں  
جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ یعنی میرے اندازے کے مطابق  
قاتل دو یا دو سے زیادہ افراد تھے۔ جاوید کے سر اور دست  
و بازو کو جس برے انداز میں زخمی کیا گیا تھا، اس سے یہی  
ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر لاشیوں اور ڈنڈوں کی برسات کر دی  
گئی تھی۔ اگر یہ کسی ایک شخص کا "کارنامہ" ہوتا تو جاوید نہ تو  
ایسا شدید گھائل ہوتا اور نہ ہی اس کی موت اتنی یقینی ہوتی۔  
میرے محتاط اندازے کے مطابق اسے گھیر کر موت کے  
گھاٹ اتارا گیا تھا۔

لاش کے معائنے کے دوران ہی میں ایک اور سنسنی  
خیز انکشاف بھی ہوا۔ میں جاوید کی لاش کو الٹ پلٹ کر اس کا  
جائزہ لے رہا تھا تو کھیت کی زمین نے مجھے چونکنے پر مجبور  
کر دیا۔ جہاں جاوید کی لاش پڑی تھی، وہاں زمین پر خون کا  
ایک دھبہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ خشک اور نہ ہی تر..... جبکہ  
مقتول کے سر سے خارج ہونے والے خون نے اس کے  
چہرے اور لباس کو اچھی طرح بھگوڑا لایا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ  
اس کے بدن سے نکلنے والا خون زمین پر نہ گرے؟

ہاں..... یہ ایک ہی صورت میں ممکن تھا..... جب  
جاوید کو کسی اور جگہ قتل کیا گیا ہوتا اور اس کی لاش کو لا کر کھیتوں  
میں پھینک دیا گیا ہوتا۔ یقیناً یہی بات تھی۔ ابھی تک تو میں  
اسی سوال کا جواب تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا کہ جاوید  
کھیتوں کے اندر کیا کر رہا تھا جب اسے موت کے گھاٹ  
اتار دیا گیا تھا.....؟

اب سوچ کا ایک نیا دروازہ کھل گیا تھا۔ جاوید کو کسی اور  
جگہ پر قتل کرنے کے بعد یہاں لا کر پھینکا گیا تھا..... مگر کہاں؟  
اس سوال کے جواب کے لیے میں نے ارگرد کے



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

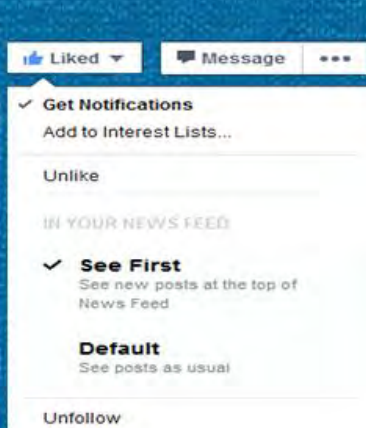
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**





میں اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو مراد خان؟“  
 ”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ملک صاحب۔“ وہ کچے  
 راستے کے کنارے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔  
 ”یہ وہاں مٹی میں پڑا تھا۔“  
 لاکٹ کی حالت بھی یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مٹی  
 دھول میں پڑا رہا ہوگا۔ مراد خان نے اس لاکٹ کی  
 دریافت کا جو مقام بتایا تھا، وہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا  
 جہاں میں نے جاوید اور اس کے قاتلوں کی دھینگا مشتی کے  
 آثار پائے تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ مذکورہ  
 لاکٹ مقتول جاوید یا اس کے قاتلوں میں سے کسی کا تھا جو  
 اس ”معرکہ“ کے دوران میں بدن سے جدا ہو کر زمین پر  
 جا گرا تھا۔

میں اس لاکٹ کو اپنے ہاتھوں میں گھما کر اس کا تفصیلی  
 جائزہ لینے لگا۔ وہ چاندی کا لاکٹ تھا جس میں ایک فیروزہ  
 جڑا ہوا تھا۔ اس فیروزے کا سائز لگ بھگ پون انچ رہا ہوگا  
 اور شکل بیضوی۔ وہ سبزی مائل نیلا فیروزہ تھا اور میرے محتاط  
 اندازے کے مطابق اس کا وزن دس سے پندرہ قیراط کے  
 درمیان رہا ہوگا اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ فیروزہ  
 درمیان سے چٹخا ہوا تھا۔

”فیروزہ“ کے حوالے سے ایک روایت بہت مشہور  
 ہے کہ یہ پتھر دیگر فوائد کے ساتھ ہی انسان کی جان کا بھی  
 محافظ ہے اگر کسی شخص نے فیروزہ پہن رکھا ہو اور اس پر کوئی  
 مصیبت یا سخت مشکل آنے والی ہو تو فیروزہ چٹخ جاتا ہے  
 کیونکہ یہ انسان کی حفاظت کرتے ہوئے خود چٹخ جاتا تھا۔ یہ  
 بھی کہا جاتا ہے کہ چٹخا ہوا فیروزہ استعمال میں نہیں رکھنا  
 چاہیے۔ یہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ایک اور روایت فیروزہ  
 کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس کا اچانک گم ہو جانا اچھا  
 شگون نہیں۔ اس کی گمشدگی کے بعد کوئی نہ کوئی پریشانی ضرور  
 آتی ہے اور یہ بھی کہ ”فیروزہ“ کو کسی پتھروں کے ماہر کے  
 مشورے کے بغیر نہیں پہننا چاہیے۔

مذکورہ فیروزے والے لاکٹ میں زنجیر کی جگہ کالی  
 ڈوری استعمال کی گئی تھی اور وہ ڈوری بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔  
 مطلب یہ کہ گرہ کے قریب سے وہ ڈوری کٹ گئی تھی۔ جیسی  
 وہ لاکٹ پہننے والے شخص کی گردن سے نکل کر زمین پر جا گرا  
 تھا۔ ڈوری کے ایک سرے پر گرہ اور دوسرا سر اٹالی تھا جہاں  
 پر ڈوری ٹوٹ جانے کے باعث دھاگے نکلے ہوئے تھے۔  
 میں نے وہ فیروزے والا لاکٹ موقع پر موجود تمام  
 افراد کو باری باری دکھایا اور پوچھا۔ ”تم میں سے کوئی اس

علاقے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دس منٹ کے بعد مجھے اپنے  
 مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں زمین کے اس حصے پر  
 ”گزر بڑ“ کے آثار تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو کچی  
 سڑک اور کھیت کی منڈیر کے بیچ واقع تھا۔ پھر مجھے سڑک  
 کے کنارے پر بھی افراتفری کے اچھے خاصے نشانات مل  
 گئے۔ قدموں کے بے ترتیب اور آپس میں خلط ملط نشانات  
 اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ وہاں چند افراد میں اچھی  
 خاصی مڈبھیڑ ہوئی تھی اور اسی ”گڈمڈ“ افراتفری کے بیچوں  
 بیچ چند مقامات پر خون کے جھے ہوئے دھبے بھی میزی نظر کی  
 پکڑ میں آ گئے۔ اب مجھے اس بات میں کسی شک و شبہ کی  
 گنجائش نظر نہیں آرہی تھی کہ جاوید کو اسی کچے راستے کے  
 کنارے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا  
 تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی تو یہ جاننے میں بھی کامیاب  
 ہو گیا کہ جاوید کی لاش کو کچے کنارے سے گھسیٹ کر کھیتوں  
 کے اندر پہنچایا گیا تھا۔

وہ لوگ کون تھے جنہوں نے بڑی بے رحمی سے جاوید  
 کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا؟ جاوید کے ساتھ ان کی کیا دشمنی  
 تھی؟ اور یہ کہ جاوید پچھلی شام یا پچھلی رات چک بتی کے  
 آس پاس کیا کر رہا تھا؟..... ان تمام تر سوالات کے مجھے  
 جواب تلاش کرنا تھے کیونکہ ان جوابات کی عدم موجودگی میں  
 قاتلوں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔

موقع کی کارروائی کے دوران میں ہی وہاں دو درجن  
 سے زیادہ لوگ جمع ہو چکے تھے۔ جب میں جائے وقوعہ پر  
 پہنچا تو اس وقت بھی درجن بھر افراد یہاں موجود تھے۔ میں  
 سوال و جواب کے لیے لوگوں کی جانب بڑھا تو اے ایس  
 آئی مراد خان بھی میرے پاس آ گیا۔ جب میں لاش کا  
 معائنہ کر رہا تھا تو مراد خان جائے وقوعہ کے گرد و نواح کی  
 ”سیر“ کو نکل گیا تھا۔ واپسی میں اس کے چہرے پر دبا دبا  
 جوش دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

”کوئی خاص بات مراد خان؟“ میں نے سوالیہ نظر  
 سے اس کی طرف دیکھا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی پتلون کی  
 جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب اس کا مذکورہ ہاتھ جیب سے باہر  
 نکلا تو اس میں ایک لاکٹ کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ وہ اس  
 لاکٹ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔  
 ”ملک صاحب! یہ لاکٹ مجھے جاوید کی لاش سے چند  
 قدموں کے فاصلے پر کھیتوں کے باہر پڑا ملا ہے۔“

”کھیتوں کے باہر!“ میں نے ابھن زدہ انداز



کہ جاوید کے قاتلوں کو بہت جلد بے نقاب کر دوں گا اور انہیں عدالت سے عبرت ناک سزا بھی دلوں گا۔“

”تھانے دار جی! میں بتا رہی ہوں نا، میرے جیدے کے قاتل یہی لوگ ہیں۔“ وہ خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے اصراری لہجے میں بولی۔ ”آپ ان پر سختی کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

”تم فکر نہیں کرو رحمت بی بی! میں سب سے پوچھ چکے کروں گا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”کوئی بھی چھوٹا بڑا میری تفتیش سے بچ نہیں سکے گا۔ تم حوصلہ رکھو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میرے سمجھانے بجھانے کا اس پر اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ اس نے خیر دین اور اس کے خاندان کے خلاف زہرا گلنا بند کر دیا تھا تاہم دلی زبان میں اس کا واویلا اور آہ وزاری اب بھی جاری تھی اور اس کام سے میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ اس بد نصیب کا بیٹا قتل کر دیا گیا تھا۔ میں اسے پہنچنے والے صدمے سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ اسے جی بھر کر دل کا غبار نکال لینے دیا جائے۔

میں نے ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد جاوید عرف جید کی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے اے ایس آئی مراد خان کی زیر نگرانی سرکاری اسپتال بھجوا دیا اور پھر موقع پر موجود لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔

سب سے پہلے میں نے اس شخص کو بلایا جس نے سب سے پہلے جاوید کی لاش کو دیکھا تھا۔ اس بندے کا نام حنیف عرف حنیفو تھا۔ حنیفو کی حیثیت ایک کھیت مزدور ایسی تھی۔ آج صبح وہ کھیتوں کی طرف معمول کے مطابق نکلا تو اس کی جاوید کی لاش پر نظر پڑی اور اس نے شور مچا کر بہت سے لوگوں کو وہاں جمع کر لیا تھا۔

”حنیفو!“ میں نے اس شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم کھیتوں میں کس قسم کی مزدوری کرتے ہو؟“

”سرکار! میں ہر قسم کا کام کر لیتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”فصل کی بیجائی (بویائی) سے لے کر کٹائی اور چھڑائی تک ہر کام آتا ہے مجھے۔“

”آج تم کس کام سے گھر سے نکلے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”آج کل چاول کی کٹائی کا کام چل رہا ہے

جناب۔“ وہ بڑی رसान سے بولا۔ ”میں بھی اسی مقصد سے

کھیتوں کی طرف آیا تھا۔“

جس کھیت کے اندر سے جاوید کی لاش ملی تھی، اس

لاکٹ کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟“

حیرت انگیز طور پر اس ”شناختی پریڈ“ کے نتائج صفر کے برابر برآمد ہوئے۔ وہاں موجود پچیس تیس افراد میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا کہ جو اس لاکٹ کو پہچان پاتا۔ بالآخر تھک ہار کر میں نے وہ لاکٹ اپنی جیب میں رکھ لیا البتہ اس پوچھ تاچھ کا ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ مذکورہ فیروزہ والا لاکٹ مقتول جاوید کا ہرگز نہیں تھا اور یہ معلومات مجھے جاوید کے سر خیر دین سے حاصل ہوئی تھیں جو اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔

اس دوران میں جب میں موقع کی کارروائی میں مصروف تھا، جلال پور سے جاوید کی ماں رحمت بی بی بھی دو افراد کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ وہ جاوید کی لاش کو دیکھ کر باقاعدہ مین کرنے لگی۔

”انہی ظالموں نے میرا بچہ کھایا ہے.....“ وہ خیر دین کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو جیدے سے کہا تھا کہ وہ منحوس میکے گئی ہے تو اس کبخت کو ادھر ہی رہنے دے لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی اور کل چل پڑا اپنی بیوی کو لینے۔ میں نے کہا تھا کہ رات سے پہلے واپس آ جانا..... وہ ادھر ہی رک گیا اور..... گیا جان سے.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر فریادی لہجے میں مجھ سے کہا۔

”تھانے دار صاحب! آپ خیر دین کو گرفتار کر لیں۔ جب آپ اس کی چھتروں کریں گے تو یہ خود بتائے گا کہ جاوید کی جان کس نے لی ہے؟“

رحمت بی بی کی اس داد فریاد سے بہت سی باتیں سامنے آئیں کہ نمبر ایک، وہ ایک بد تمیز اور عاقبت نا اندیش عورت تھی۔ نمبر دو، وہ اپنے سمدھی خیر دین سے نفرت کرتی تھی یا کم از کم اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ نمبر تین، ان دنوں زرگس اپنے میکے یعنی چک بتی آئی ہوئی تھی۔ نمبر چار، مقتول جاوید کل کسی وقت جلال پور سے اپنی بیوی کو لینے چک بتی آیا تھا۔ نمبر پانچ، رحمت بی بی کو پورا شک تھا کہ اس کے بیٹے جاوید کے قتل میں زرگس کے میکے والوں کا ہاتھ ہے..... ان تمام تر نکات کو سمجھنے کے لیے مجھے بڑی پلاننگ سے کام لینا تھا۔

میں نے پہلی فرصت میں رحمت بی بی کے داویلے کو بریک لگوائے۔ تسلی آمیز انداز میں اسے یقین دلایا۔ ”رحمت بی بی! جب میں یہاں موجود ہوں تو پھر تمہیں تھانے دار بننے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں



کھیت کے اندر بھی چاول کی فصل کھڑی تھی۔ اسی بنیاد پر میں نے حنیفو سے سوال کیا۔

”کیا تم اسی کھیت کی فصل کاٹنے آئے تھے جس کے اندر جاوید کی لاش پڑی ملی ہے؟“

”نہیں جی.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا کام تو اس سے کافی آگے کے کھیتوں میں چل رہا ہے۔ بس، میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میری نظر پڑ گئی.....“

حنیفو کی بات مجھے ہضم نہ ہو سکی۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”جاوید کی لاش کھیتوں کے اندر دس بارہ گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ کھڑی فصل کے اندر اتنی دور تک دیکھنا ممکن نہیں پھر تم نے یہاں سے گزرتے ہوئے یہ لاش کیسے دیکھ لی۔ کیا تمہارے پاس کوئی دوربین وغیرہ بھی تھی؟“

”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ میرے مضبوط اعتراض پر جربز ہو کر رہ گیا۔

میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ایسی بات نہیں تو پھر کیسی بات ہے؟“

”وہ جی، میں یہاں سے گزر رہا تھا تو مجھے رفع حاجب کی ضرورت محسوس ہوئی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میں اپنی حاجت پوری کرنے کھیت کے اندر گیا تو ادھر جاوید کی لاش پڑی نظر آئی۔ میں اپنی حاجت کو بھول گیا اور بھاگ کر کھیت سے باہر نکل آیا۔“

”باہر آ کر تم نے سب سے پہلا کام کیا کیا تھا؟“

”میں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔“ وہ اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میری آواز پر کھیتوں میں کام کرنے والے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔“

”جب تم ایسی..... حاجت پوری کرنے گئے تو وہاں تمہیں جاوید کی لاش پڑی دکھائی دی۔“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”کیا لاش پر نگاہ پڑتے ہی تمہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جاوید ہی ہے..... تمہارے چک کا جنوائی..... نرگس کا گھر والا.....؟“

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ میں نے جاوید کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ اس کی چٹنی ہوئی کھوپڑی میں سے نکلنے والے خون نے اس کے چہرے کو اس طرح تر تر کر دیا تھا کہ پہلی نظر میں اس کی شناخت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ اس کے چہرے کے مختلف حصوں اور لباس پر لگنے والا خون جنے کے بعد گہری سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا۔

”نہیں جی.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں فوری طور پر اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ میں نے کھیتوں سے باہر نکل کر ”لاش، لاش“ چلاتا شروع کر دیا تھا۔ پھر جب لوگ جمع ہوئے اور ہم نے ایک ساتھ کھیتوں کے اندر جا کر دوبارہ لاش کا غور سے جائزہ لیا تو تب یہ انکشاف ہوا کہ وہ جاوید تھا۔“

اس کی وضاحت معقولیت کے دائرے کے اندر آتی تھی۔ پھر وہاں موجود دو تین افراد نے اس کے بیان کی تصدیق بھی کر دی تھی لہذا میں نے مزید دو تین سوالات کے بعد حنیف عرف حنیفو کو فارغ کر دیا۔ اگر حنیفو رفع حاجت.... پوری کرنے کھیتوں کا رخ نہ کرتا تو عین ممکن تھا، جاوید کی لاش ایک، دو یا تین دن ادھر کھیتوں کے اندر ہی پڑی رہتی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس کی لاش بروقت دریافت ہو گئی تھی ورنہ میری معلومات کے مطابق ابھی دو تین دن تک اس کھیت کی فصل کی کٹائی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

میں نے حنیفو کے علاوہ بھی وہاں موجود کئی افراد سے پوچھ چکچک کی مگر جاوید کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اب میں نے مقتول کے حقیقی متعلقین کی جانب رخ کیا۔ مقتول کی ماں رحمت بی بی اور اس کا سرخیر دین میرے نزدیک ہی موجود تھے تاہم رحمت بی بی نے اپنے سمدھی کی جانب سے رخ پھیر رکھا تھا۔ خیر دین کی عمر پچاس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ ایک سیدھا سادہ اور شریف انسان نظر آتا تھا اور اس کی شرافت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس نے رحمت بی بی کے سنگین الزامات کے جواب میں اسے اُف تک نہیں کہا تھا بلکہ جوش جذبات میں اور فقدان احساس میں رحمت بی بی نے اسے گالیاں بھی دے ڈالی تھیں مگر مجال ہے، اس کی زبان سے رد عمل میں کوئی سخت بات نکلی ہو۔ خیر دین نے ایک ہاتھ پر خاصی موٹی اور چوڑی پٹی باندھ رکھی تھی جیسے اسے کوئی خطرناک چوٹ لگی ہو۔

یہاں کھیتوں میں کھڑے کھڑے مزید تفتیش مناسب نہیں تھی لہذا میں نے خیر دین سے کہا۔ ”خیر دین! کیا خیال ہے، تمہارے گھر جا کر بیٹھیں۔ باقی کی باتیں وہیں ہوں گی۔ میں تمہاری بیٹی نرگس سے بھی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ست بسم اللہ جی۔ میرا گھر حاضر ہے۔“ وہ پُر خلوص لہجے میں بولا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ۔“

میں نے جاوید کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رحمت بی بی! تم بھی چلو میرے ساتھ۔ تم سے بھی مجھے

www.paksociety.com



ضروری بات چیت کرنا ہے۔“

”میں کہاں چلوں گی.....؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے سکتے لگی۔

”کہاں کا کیا مطلب.....!“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”جب میں خیر دین کے ساتھ اس کے گھر جا رہا ہوں تو تمہیں بھی وہیں چلنا ہوگا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا نے دار جی۔“ وہ بد کے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں اپنے بیٹے کے قاتلوں کے گھر کیسے جاسکتی ہوں.....“

رحمت بی بی کے دماغ کی سوئی جس جگہ پھنس گئی تھی، وہاں سے فوری طور پر نکالنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خیر دین اور جاوید کی سسرال والوں کو اپنا اور جاوید کا دشمن سمجھ رہی تھی۔ میں چند منٹ میں اس کی یہ غلط فہمی دور نہیں کر سکتا تھا اور اگر بالفرض، وہ درست بھی سوچ رہی تھی تو یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں دونوں پارٹیوں کو رو برو بٹھا کر کوئی مناظرہ کراتا۔ جب تک میں خود واقعے کی حقیقت سے واقف نہ ہو جاتا، انہیں کوئی بات سمجھانا حماقت ہی ہوتی لہذا میں نے رحمت بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”رحمت بی بی! تم جلال پور جاؤ۔ میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا تمہاری طرف آؤں گا۔ پھر تم سے تفصیلی بات ہوگی۔“

یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ فی الفور ایک تانکے میں بیٹھ کر جلال پور کے لیے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

خیر دین کا گھر چک بتی کے وسط میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے اندر ہی خیر دین نے کریانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ اس دکان پر برچون کے تمام سودوں کے علاوہ سبزی بھی فروخت ہوتی تھی اور موسم کی مناسبت سے ایک آدھ پھل بھی رکھا نظر آتا تھا۔ یہ دکان گھر کی بیشک میں سجائی گئی تھی اور خیر دین کے علاوہ اس کی بیوی صفیہ بھی امور دکان داری میں اس کا بھرپور ساتھ دیتی تھی۔ علاوہ ازیں خیر دین کا بیٹا خاور بھی اس کام میں حسب ضرورت اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا، اس وقت خاور گھر کے اندر موجود نہیں تھا۔

خیر دین نے مجھے گھر کے ایک اندرونی کمرے میں بٹھانا چاہا مگر میں نے صحن میں بیٹھنے کو ترجیح دی لہذا وہیں پر دو چار پائیاں بچھا دی گئیں۔ خیر دین کے ساتھ ہی ایک چارپائی پر اس کی بیوی صفیہ بھی بیٹھ گئی۔ جاوید کے قتل کے

واقعے نے انہیں دکان نہیں کھولنے دی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ نرگس (جاوید کی بیوہ) اندر ایک کمرے میں بیٹھی ہے۔ صفیہ خالصتاً ایک گھریلو عورت تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے اریب قریب نظر آتی تھی۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے جاوید کی موت کا سخت افسوس ہے۔ آپ لوگوں کے خیال میں اسے کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟“

”ہم کیا جانیں تھانے دار صاحب۔“ خیر دین عجیب سے لہجے میں بولا۔

”آپ نہیں جانو گے تو پھر اور کون جانے گا۔“ میں نے قدرے تلخ انداز میں پوچھا۔ ”وہ تم لوگوں کا داماد تھا اور جلال پور سے یہاں چک بتی تمہارے گھر آیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں، تم لوگوں ہی سے پوچھا جائے گا نا.....؟“

”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ بڑی سادگی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ سچ ہے کہ جاوید ہمارا جوانی تھا لیکن وہ گھر تو نہیں آیا ہوا تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ آپ لوگوں کے گھر نہیں آیا تھا تو پھر چک بتی میں کس کے پاس آیا تھا؟“

”خیر دین بالکل ٹھیک بتا رہا ہے تھانے دار صاحب۔“ صفیہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”جاوید کے یہاں آنے کے بارے میں ہمیں کچھ خبر نہیں۔ ہمیں تو آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ جاوید کو کسی نے قتل کر کے منجی کے کھیتوں میں پھینک دیا ہے۔“

”لیکن.....“ میں نے خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہاں منجی (چادل) کے کھیتوں میں تمہاری سمدھن رحمت بی بی نے تمہارے سامنے کہا تھا کہ جاوید کل جلال پور سے روانہ ہوا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ نرگس کو اپنے ساتھ واپس لے کر جائے گا۔“

”وہ تو پتا نہیں جی..... اور بھی کیا کیا بول رہی تھی۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس عورت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پتا نہیں، کیا کیا بکتی رہتی ہے۔ نرگس کی زندگی بھی اسی شیطان عورت کی وجہ سے جہنم بن کر رہ گئی ہے۔“

خیر دین اسی نوعیت کی باتیں کر رہا تھا جیسی چند روز پہلے خورشید بی بی نے تھانے آکر مجھ سے کی تھیں۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ”تو آپ لوگوں کو جاوید کے یہاں آنے کے



پر وگرام کی کوئی اطلاع نہیں تھی؟“

”بالکل نہیں جناب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔  
”ورنہ ہمیں آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے،  
تھانے دار صاحب.....!“

”ہو سکتا ہے، نرگس کو اس بارے میں کچھ پتا ہو!“  
میں نے سوچتی ہوئی نظر سے باری باری ان میاں بیوی کی  
طرف دیکھا۔

”پتا نہیں جی۔“ صفیہ بی بی بیزاری سے بولی۔ ”مجھ  
سے تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”نرگس کب سے چک بتی آئی ہوئی ہے؟“ میں نے  
ایک اہم سوال کیا۔

”وہ دس تاریخ کو یہاں آئی تھی جناب۔“ اس نے  
جواب دیا۔ ”اور آج تیرہ تاریخ ہے۔“

”اوہ..... تو ابھی اسے یہاں آئے دو، تین دن ہی  
ہوئے ہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے  
ہوئے کہا۔ ”پھر تو اس کی واپسی کی وجہ نظر نہیں آتی۔“

”اور یہ بھی ہم نے نرگس کو جس طرح یہاں بلا یا ہے  
وہ ہمارا خدا ہی جانتا ہے تھانے دار صاحب۔“ صفیہ دھبی  
لہجے میں بولی۔ ”ورنہ ان شخصوں نے تو میری بچی کو قیدی بنا  
کر رکھا ہوا تھا۔ اگر خیر دین کا ہاتھ نہ کٹ جاتا تو شاید وہ  
نرگس کو یہاں نہ بھیجتے.....“

”تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے خیر دین؟“ میں نے پوچھا۔  
وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اس ہاتھ پر مجھے  
زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ بہت ہی موذی سانپ  
تھا وہ۔ پورا ہاتھ یکدم سیاہ ہو گیا تھا۔ مجبوراً کلائی پر سے  
میرا ہاتھ کاٹا پڑا۔ اگر فوری طور پر یہ ہاتھ نہ کاٹا جاتا تو  
زہر پورے بازو میں پھیل سکتا تھا اور پھر کندھے پر سے  
بازو کاٹا پڑتا.....“

”اوہ.....“ میں نے تاسفانہ انداز میں ہونٹ  
سکڑے اور کہا۔ ”بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“

”افسوس تو سارے جہان کو ہوا تھا تھانے دار  
صاحب۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”اگر نہیں افسوس  
ہوا تو صرف تین لوگوں کو..... نمبر ایک جاوید، نمبر دو جاوید کی  
ماں، نمبر تین جاوید کی بہن، خیر.....“ لہجائی توقف کر کے اس  
نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے  
ہوئے بولا۔

”اب تو کافی بہتر ہے۔ حکیم جی کا کہنا ہے، چند بیٹوں  
کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک ہاتھ سے

محروم ہو گیا ہوں مگر اللہ کا شکر ہے کہ..... جان تو بچ گئی۔“  
”جب خیر دین پر یہ مصیبت نازل ہوئی تو ہم نے  
نرگس کو یہاں بلانے کی بہت تگ و دو کی تھی تھانے دار  
صاحب۔“ صفیہ نے بتایا۔ ”لیکن ان لوگوں کو ذرا سا بھی  
احساس نہیں ہوا۔ پھر ایک خدا ترس عورت کی مہربانی اور  
تعاون سے دو دن پہلے ہم نرگس کو یہاں بلانے میں کامیاب  
ہوئے ہیں۔“

”خدا ترس عورت.....“ میں نے چونک کر صفیہ کی  
طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ادھر جلال پور میں ایک بے اولاد جوڑا رہتا ہے۔“  
خیر دین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ اتفاق ہے کہ  
وہ لوگ جاوید کے پڑوسی بھی ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو  
پیغام بھیجا کہ.....“

”خیر دین! تم کہیں خورشید بیگم اور طالب حسین کی  
بات تو نہیں کر رہے.....؟“ اس کی بات مکمل ہونے سے  
پہلے ہی میں نے پوچھ لیا۔

”جی..... جی ہاں..... وہی۔“ وہ جلدی سے اثبات  
میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”خورشید بی بی بہت ہی ہمدرد  
اور نیک عورت ہے۔ جاوید تو اپنی مصروفیت کا بہانہ کرتے  
ہوئے ہر روز نرگس کو ٹالتا رہتا تھا لیکن دو دن پہلے خورشید بی بی  
نے ہمت کی اور نرگس کو یہاں پہنچا دیا لیکن ہمیں کیا پتا تھا  
کہ نرگس کو یہاں بھیجنے کے بعد جاوید بھی ادھر کا رخ کرے گا  
اور پھر چک بتی کے نواحی کھیتوں میں بے دردی سے قتل کر دیا  
جائے گا اور..... اس کی موت کے حوالے سے ہم پر شک کیا  
جائے گا۔“

خورشید بی بی تھانے آ کر مجھ سے ایک ملاقات کر چکی  
تھی۔ وہ نرگس کے گھریلو حالات کی وجہ سے بہت تکلیف  
میں تھی اور مجھ سے اس نے نرگس کے مسائل کے حل کے  
لیے درخواست کی تھی۔ خورشید بی بی نے جاوید کی طرف سے  
نرگس کی جان کو خطرہ بتایا تھا لیکن یہاں تو جاوید ہی اپنی  
زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

”کیا خورشید بی بی نے ایسی کوئی بات کی تھی کہ دو تین  
روز کے بعد جاوید، نرگس کو لینے چک بتی آئے گا؟“ میں نے  
باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں جی..... کوئی نہیں۔“ صفیہ سادگی سے بولی۔  
”ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ اب نرگس کو کم از کم ایک مہینہ  
یہاں رکھیں گے لیکن دو دن کے بعد ہی یہ مصیبت کھڑی  
ہوئی۔ اب پتا نہیں، کیا ہوگا..... نرگس کو واپس جلال پور جانا



اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ ہم مجبوراً اس رشتے کے خاتمے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔“

”وہ عزت اور ذلت کا مالک ہے۔“ خیر دین آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر نرگس کو ہم جاوید سے چھٹکارا دلواتے تو اس پر ایک دھبا لگ جاتا۔ قدرت نے اپنے انداز میں میری بیٹی کو اس رشتے سے آزادی دلا کر ہم سب پر احسان کیا ہے۔“

وہ دونوں میاں بیوی بہت ہی صابر و شاکر اور متوازن سوچ کے مالک تھے۔ تاہم اس معاملے میں نرگس سے تفصیلی بات کرنا بھی ضروری تھا۔ ”نرگس سے میں تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے باری باری ان میاں بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نرگس کو یہاں بلا لیں یا پھر مجھے اس کے پاس لے چلیں۔“

”جی ضرور۔۔۔۔۔“ خیر دین نے اثبات میں گردن ہلائی

اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ۔۔۔۔۔“ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں، اندر کمرے میں نرگس کے روبرو بیٹھا ہوا تھا اور ہم دونوں کے علاوہ اس وقت کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ نرگس کی عمر پچیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک گوری چٹی اور پُرکشش نقش و نگار کی مالک جاذبِ نظر عورت تھی۔ اگر جاوید نے واقعی اس کی قدر نہیں کی تھی تو میری نظر میں وہ دنیا کا احمق ترین اور بد قسمت شخص تھا۔

”نرگس! مجھے جاوید کی المناک موت کا دلی صدمہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے دوبارہ زندہ تو نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جہاں جا چکا ہے، وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں بہت جلد اس کے قاتلوں کا سراغ لگا لوں گا اور پھر انہیں میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔“

اس نے گردن اٹھا کر زردیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور ساٹ آواز میں بولی۔ ”جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا اور آئندہ بھی وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا۔“

”میں تمہارے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں نرگس۔“ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”بے شک! اللہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو چاہے، کر سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے۔ جو بس میں ہو، اس حد تک کوشش لازمی ہے اور میں بھی جاوید کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اپنی سی کوشش

پڑے گا۔“

”اصولی طور پر تو اس واقعے کے بعد نرگس کو فوراً جلال پور روانہ ہو جانا چاہیے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جاوید جیسا بھی تھا، نرگس کا شوہر تھا۔ اس موقع پر نرگس کو میت والے گھر میں ہونا چاہیے لیکن۔۔۔۔۔!“

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا تو میرے دوبارہ بولنے سے پہلے ہی صفیہ نے اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔ ”لیکن کیا تھانے دار صاحب۔۔۔۔۔؟“

”لیکن۔۔۔۔۔“ میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ نرگس کو نہ تو کوئی بلائے گا اور نہ ہی اس کے وہاں نہ جانے سے کوئی اس کی کمی محسوس کرے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں اور۔۔۔۔۔ وہاں رہنے والے افراد کے دلوں میں نرگس کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی گنجائش۔۔۔۔۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!“ خیر دین تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے آپ نرگس کے سسرالی حالات کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”اچھی طرح تو نہیں مگر کافی حد تک ضرور جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جاوید بہت زیادہ برا انسان نہیں تھا تھانے دار صاحب!“ صفیہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”بس وہ کانوں کا کچا تھا اور پوری طرح اپنی ماں اور بڑی بہن کی پیٹیوں پر چلتا تھا اور۔۔۔۔۔ وہ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک کمینہ ہیں۔۔۔۔۔ جاوید کی بہن خالدہ طلاق یافتہ ہے۔۔۔۔۔ زبان کی تیز اور کڑوی۔۔۔۔۔ دو سال پہلے ہی اس کے گھر والے نے طلاق دے کر اسے فارغ کیا ہے۔“

پھر ان دونوں میاں بیوی نے مجھے بتایا کہ خالدہ بہت ہی بد زبان اور شر پسند عورت ہے۔ جب تک وہ اپنے شوہر وہاب علی کے گھر میں رہی، ہر دن کوئی نہ کوئی جھگڑا پھڑا ہوتا رہتا تھا پھر انہی تباہات سے تنگ آ کر وہاب علی نے اسے طلاق دے دی تھی اور اب وہ پچھلے دو سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی شریعتی میں سرِ موفرق نہیں آیا تھا اور ماں بیٹی دونوں نے مل کر نرگس کی زندگی کو نمونہ جہنم بنا دیا تھا۔ صفیہ نے اپنی بات کے اختتام پر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”جاوید کی موت کا افسوس اپنی جگہ ہے لیکن اللہ کے کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ جاوید کے قتل کے بعد نرگس آزاد ہو گئی ہے۔ ورنہ ان لوگوں نے نرگس کو



باتیں نرگس کا بچپا چھلنی کر دیتی تھیں کیونکہ لوگوں کو جب بھی موقع ملتا وہ نرگس کو اس کی ساس کی چہ میگوئیوں کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا پھر جب جاوید کی بڑی بہن خالدہ طلاق کا طوق گلے میں ڈال کر اپنے میکے پہنچی تو نرگس کے عذاب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ”یک نہ شد، دوش نہ شد“ والی صورت حال نے نرگس کی زندگی اجیرن کر دی۔ دونوں ماں بیٹیوں نے مل کر نرگس پر وہ ظلم و ستم ڈھانا شروع کیے کہ وہ خود کو ایک دہکتے ہوئے جہنم میں محسوس کرنے لگی۔

نرگس نے دیکھ بھرے انداز میں مجھے بتایا کہ سسرال میں اس کی حیثیت کسی نوکرانی سے زیادہ نہیں تھی۔ جھاڑو پونچھا، کھانا پکانا، برتن دھونا، کپڑوں کی دھلائی وغیرہ سب اس کے ذمے تھا۔ اس کے علاوہ اسے شوہر اور ساس کی خدمت بھی کرنا پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کو روزانہ رحمت بی بی کے پاؤں دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا اور اگر کبھی وہ بیمار ہو جاتی اور اپنی ان گھریلو ”ذمے داریوں“ کو مناسب انداز میں پورا نہ کر پاتی تو اسے ساس اور زندگی کھری سنا پڑتی تھیں بلکہ وہ دونوں مل کر اس کی پٹائی بھی کر دیا کرتی تھیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا رحمت بی بی اور خالدہ تمہیں باقاعدہ مارا بھی کرتی تھیں.....؟“

”جی ہاں.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”یہی حقیقت ہے۔ خورشید چاچی نے آپ سے کوئی بھی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے ہر لمحے یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں ان لوگوں کی زرخرید لونڈی ہوں.....“

”اور تمہارے گھر والے.....!“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”خیر دین اور صفیہ نے کبھی اس ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ تم ان کی سگی بیٹی ہو، ان کے جگر کا ٹکڑا ہو۔ تم پر وہ لوگ ایک سے بڑھ کر ایک ستم ڈھاتے رہے اور یہ لوگ خاموش تماشا بنے بیٹھے رہے..... کیوں..... اتنی بے بسی کیوں؟“

”اماں اور ابا میری بے بسی کا تماشا نہیں دیکھ رہے تھے تھانے دار صاحب۔“ اس نے دھکی لہجے میں بتایا۔ ”یہ بے قصور ہیں۔ میں انہیں کوئی الزام نہیں دے سکتی۔ مجھے اپنے ماں باپ سے کوئی شکایت نہیں۔“

”یہ لوگ کیسے قصور وار نہیں ہیں۔“ میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم ان کی بیٹی ہو۔ انہوں نے تمہیں بیاہا

کر دیں گا لیکن اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی اشد ضرورت ہوگی۔“

”میرا تعاون.....؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”ہاں..... بالکل.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری مدد کے بغیر میں اس کیس میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔“

”لیکن میں کس طرح آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“ اس کی حیرت میں ابھن بھی شامل ہو گئی۔

”میرے سوالوں کے سچے اور کھرے جواب دے کر۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے جو بھی پوچھوں، پوری سچائی اور دیانت داری سے اس کا جواب دینا.....“

”جی پوچھیں.....“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

”میں آپ کے سامنے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کروں گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ سسرال میں تمہاری زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی تھی؟“

”جی..... اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”مجھے تمہارے حالات کا کسی حد تک اندازہ ہے۔“

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس واقعے سے کچھ عرصے پہلے تمہاری پڑوسن خورشید بی بی، جاوید کی شکایت لے کر میرے پاس آئی تھی۔“

”جی..... چاچی خورشید نے مجھے بتایا تھا۔“ نرگس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔“

”یہ بات ہی ایسی تھی کہ پولیس کی مداخلت کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”بہر حال، تم مختصر الفاظ میں مجھے بتاؤ کہ سسرال میں تمہیں کس قسم کی مشکلات کا سامنا تھا؟“

اس نے آئندہ دس منٹ میں مجھے اپنی پتا سے آگاہ کر دیا۔ اس کے مطابق شادی کے ایک سال بعد ہی سسرال میں اس کے جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ اس کی ساس مزاج کی بہت تیز تھی اور اٹھتے بیٹھے روک ٹوک کرتی رہتی تھی۔ چھوٹی موٹی باتیں تو وہ برداشت کرتی رہی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد رحمت بی بی نے ایک عجیب پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں آس پڑوس میں بتانے لگی کہ اس کی بہو یعنی نرگس ہانچہ ہے اسی لیے شادی کے بعد وہ ابھی تک کوئی بچی بچہ پیدا نہیں کر سکی۔ اس قسم کی



تھا، کوئی ان لوگوں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا تھا؟“  
”یہ لوگ اس لیے بے قصور ہیں تھانے دار صاحب  
کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”کہ انہیں  
میرے حالات کی کچھ خبر نہیں تھی۔“

”کیا مطلب.....!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں  
گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم پچھلے پانچ چھ سال سے  
اپنی سسرال میں لاکھ عذاب اور کروڑ اذیتیں سہہ رہی ہو  
اور تمہارے والدین کو تمہارے حالات کی کچھ خبر ہی  
نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ اس طرح ہوا جناب کہ میں نے زندگی میں کبھی  
اپنا درد انہیں بتایا ہی نہیں۔“ وہ اداس لہجے میں بولی۔  
”میں چپ چاپ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ میں جانتی  
ہوں کہ میں بانجھ نہیں لیکن میں بانجھ پن کے طعنے سنتی رہی۔  
میں خدمت گار نوکرانی ہونے کے باوجود بھی اپنے شوہر اور  
ساس نند کے لات جوتے کھاتی رہی مگر کبھی اپنے ماں باپ  
کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ تو جب دو دن پہلے چاچی خورشید مجھے  
یہاں چھوڑ گئی ہے تو اس کی زبان کھل گئی حالانکہ میں نے  
اسے سختی کے ساتھ منع بھی کیا تھا کہ اماں ابا کو میرے  
حالات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں ان بے چاروں کو....  
خواجواہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر چاچی خورشید بھی جاوید  
اور اس کے گھر والوں کی طرف سے خوب بھری بیٹھی تھی۔  
اس نے پچھلے چھ سال کی درد بھری میری کہانی اماں ابا کو سنا  
کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے  
ہوئے کہا۔ ”تو یہ صورت حال ہے..... پھر یہ دکھ بھری کہانی  
سن کر تمہارے والدین نے کیا رد عمل ظاہر کیا تھا؟“

”انہوں نے تکلیف بھرے انداز میں چاچی خورشید  
کی باتیں سنیں پھر مجھے خوب لتاڑا کہ میں نے اپنے درد کو ان  
سے اتنے عرصے تک کیوں چھپائے رکھا۔“ وہ وضاحت  
کرتے ہوئے بولی۔ ”اور پھر..... اسی دن اماں ابا نے ایک  
فیصلہ کر لیا کہ اب وہ مجھے کبھی جلال پور نہیں بھیجیں گے۔ اگر  
وہاں سے کوئی مجھے لینے آیا تو اس سے دو ٹوک بات ہوگی۔  
اگر وہ لوگ اسٹیپ پیپر پر لکھ کر دیں گے کہ آئندہ میرے  
ساتھ وہ ایسا ظلم نہیں کریں گے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ لوگ اپنے  
گھر میں اچھے اور ہم لوگ اپنے گھر میں پھر.....“ وہ لمبے پھر  
کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل  
کرتے ہوئے بولی۔

”پھر..... آج صبح جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے بعد تو

میرا جلال پور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا نے خود  
ہی مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلادیا ہے۔ جب جاوید ہی  
باقی نہیں رہا تو میں اس کی بیوی بھی نہیں رہی لہذا اب رحمت  
بی بی اور خالدہ سے بھی میرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ پہلے میں  
جاوید کے منہ کو دیکھتے ہوئے اپنی ساس اور نند سے مار کھا  
لیتی تھی۔ انہوں نے مار مار کر میری ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالا  
ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس مصیبت سے نجات  
دلادی ہے۔ اب میں کبھی جلال پور میں قدم بھی رکھوں، اس  
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تھانے دار صاحب۔“

”تم نے اپنے حالات کے مطابق بالکل درست  
فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔  
”نرگس! رحمت بی بی نے ادھر کھیتوں میں بتایا تھا کہ کل  
جاوید گھر سے اس نیت سے نکلا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ  
واپس جلال پور لے جائے گا لیکن تمہارے ماں باپ کے علم  
میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو..... کیا  
اس نے تمہیں بتا رکھا تھا کہ تین دن کے بعد وہ تمہیں لینے  
چک جی آئے گا؟“

”نہیں جی، اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی  
تھی۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے تو خود اس  
بات پر حیرت ہے کہ وہ کل اس طرف کیا لینے آیا تھا۔“  
”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اس  
کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”تمہاری دکھ  
بھری کہانی سن کر مجھے دلی افسوس ہوا ہے۔ اس کہانی کی سطر  
سطر درد میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن دو سوالات میرے ذہن  
میں ایسے ہیں جن کا جواب صرف اور صرف تم ہی مجھے دے  
سکتی ہو.....“

”کون سے سوالات تھانے دار صاحب؟“ وہ الجھن  
زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

”نمبر ایک.....“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں  
میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ جاوید نے  
تمہارے میکے آنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ جب  
تمہارے باپ کو زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور مجبوراً اس کا  
ہاتھ کاٹا پڑا تو اس سانچے کی خبر تم تک بھی پہنچی تھی اور تمہارا  
دل مچلا تھا کہ اڑ کر جلال پور سے چک جی پہنچ جاؤ لیکن جاوید  
کافی دنوں تک مصروفیت کا بہانہ کر کے تمہیں ٹالتا رہا۔ بالآخر  
تمہاری پڑوسن خورشید بی بی نے کسی حیلے بہانے سے تمہیں  
چک جی پہنچا دیا.....“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک  
گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔



کسی سے بھی نہیں کروں گا۔ یہ راز ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گا۔“

اس نے نگاہ اٹھا کر معصومیت بھرے انداز میں مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس کے سینے میں کوئی بہت بڑا طوفان کروٹیں بدل رہا ہے لیکن وہ زبان کھولتے ہوئے ڈر رہی ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پار ہی تھی کہ اسے اپنا درد مجھ سے شیئر کرنا چاہیے یا نہیں۔ میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

”مجھ پر بھروسہ کرو نرگس۔ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اگر تم اپنے دل کی بات مجھے بتا دو گی تو ممکن ہے، میں بہتر انداز میں تمہاری مدد کر سکوں.....“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہانے دار صاحب!“ اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ”آپ میرے مسئلے کو سمجھ سکتے ہیں۔ آپ ایک تجربہ کار اور سمجھ دار انسان ہیں۔“

”تو پھر بتاؤ، تم مجھے کیا بتانے والی تھیں کہ بولتے بولتے اچانک رہ گئیں.....؟“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”رحمت بی بی کو مجھ پر شک تھا.....!“ وہ ہمت کرتے ہوئے بولی۔

”شک..... کس قسم کا شک؟“

”کہ یہاں چک جی میں میرا کسی سے کوئی چکر ہے۔“

”اوہ.....“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”وہ اسی حوالے سے جاوید کے کان بھرتی رہتی تھی۔“ وہ دکھی لہجے میں بتانے لگی۔ ”اور جاوید کا دماغ ماں کی باتیں سن کر بہت زیادہ خراب ہو جاتا تھا پھر وہ مجھے چک جی بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔“

”تمہاری ساس کو تم پر جو شک تھا، کیا میں اس شک کی حقیقت جان سکتا ہوں؟“

نرگس کے اس انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شک ایک نہایت ہی خطرناک سوچ کا نام ہے۔ شک زدہ خیالات انسان کا دماغ خراب کر دیتے ہیں پھر اس خراب دماغ کے اندر سے منفی خیالات ہی جنم لیتے ہیں جو کسی انسان کی زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اگر نرگس کی ساس کو اس کی ذات کے حوالے سے کسی قسم کا شک تھا تو اس شک کی بنیاد کھود کر حقیقت کو برآمد کرنا میرا فرض تھا اور میں اسی کے لیے کوشاں تھا۔

”اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں تمہانے دار

”یہ کوئی اس واقعے تک ہی محدود نہیں۔ میری معلومات کے مطابق جاوید کو تمہارا چک جی آنا بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کی کوشش ہوئی تھی کہ تم یہاں نہ آؤ۔ جاوید کی یہ خواہش اور رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ چک جی میں تمہارے ماں باپ اور چھوٹا بھائی رہتا ہے۔ یہ تمہارا آبائی گاؤں ہے۔ تم یہاں پیدا ہوئی ہو۔ پل بڑھ کر جوان ہوئی ہو۔ چھ سال پہلے اسی گاؤں سے تمہاری ڈولی اٹھی تھی۔ اس چک سے تمہارا تعلق اور ناتا بہت مضبوط ہے پھر جاوید کو ایسی کیا تکلیف تھی کہ وہ تمہیں یہاں بھیجنے پر راضی نہیں ہوتا تھا؟“

”میں جانتی ہوں کہ جاوید کی اس ضد کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ تھا۔“

”اس کی ماں کا ہاتھ.....“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو نرگس؟“

”میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میری ساس اس بات کے حق میں نہیں تھی کہ میں چک جی آؤں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ اشاریوں کنایوں میں مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور درپردہ وہ جاوید کے بھی کان بھرتی تھی اور پھر جاوید مجھ پر پابندیاں لگاتا تھا۔“

”لیکن تمہارے چک جی آنے میں آخر رحمت بی بی کا کیا نقصان تھا؟“

”نقصان یہ تھا کہ.....“ اس نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ”میرے چک جی آنے سے ان کے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ مفت کی نوکرائی ہاتھ سے نکل جاتی تو پھر گھر کا سارا کام کاج ان ماں بیٹی کو خود ہی کرنا پڑتا اور کام کرتے ہوئے تو انہیں موت آتی تھی۔ اس کے علاوہ.....“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اچھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

”اس کے علاوہ کیا نرگس؟“

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے دانستہ اپنی زبان کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔ کوئی ایسی بات جو بہت اہم ہو لیکن وہ مجھے بتانا نہ چاہتی ہو۔ ایسی کیا بات ہو سکتی تھی جو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ میرے استفسار نے اسے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ بات ادھوری چھوڑ کر بری طرح الجھ گئی تھی۔ میں نے نہایت ہی مشفقانہ لہجے میں کہا۔

”نرگس! تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ مجھے اپنا سچا ہمدرد سمجھو اور مجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤ۔ میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ یہاں ہمارے درمیان جو بھی باتیں ہوں گی، میں ان کا ذکر



بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”ساجد مجھے پسند کرتا تھا اور اس کے گھر والوں نے میرے لیے اس کا رشتہ بھی بھیجا تھا لیکن میرے گھر والوں نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس رشتے کے لیے تمہارے گھر والوں نے انکار کیوں کیا تھا لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس انکار کے بعد ساجد اور اس کے گھر والوں کا کیا رد عمل رہا تھا؟“

”میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گی لیکن اس سے پہلے یہ بھی بتاؤں گی کہ میرے اماں ابانے ساجد کے رشتے سے انکار کیوں کیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اصل میں بات یہ ہے کہ ساجد عمر میں مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ جب میری شادی ہوئی، میں انیس سال کی تھی اور ساجد صرف چودہ سال کا لیکن وہ اپنی جسامت اور قد کاٹھ سے اٹھارہ انیس کا نظر آتا تھا۔ عمروں کے اس فرق کی وجہ سے میرے گھر والوں نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے، تمہانے دار صاحب.....“ اس نے لچاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ساجد کے گھر والوں نے تو اس انکار کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا البتہ ساجد کافی دنوں تک اداس رہا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا اور اس انکار سے اسے جذباتی صدمہ پہنچا تھا۔“

”تم نے دو تین بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ساجد تمہیں پسند کرتا تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا اس کی یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی..... تم میری بات کو سمجھ رہی ہو نا.....؟“

”بڑی اچھی طرح سمجھ رہی ہوں تمہانے دار صاحب!“ وہ بڑے اعتماد سے سر کو تائیدی انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ساجد کے بارے میں کبھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی خاور کی طرح تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھا تھا۔ جب ساجد کی خواہش ”رشتے“ کی شکل میں ہمارے گھر پہنچی تو مجھے اس پر شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔“

”اگر تمہاری طرف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو تمہیں حیرت ہونا بھی چاہیے تھی۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”اس واقعے کے بعد ساجد کی ذہنی حالت کیسی

صاحب!“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ”رحمت بی بی کی مت ماری مگنی تھی۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہاں چک بتی میں میرا ساجد سے میل ملاپ ہے۔ اس غلطی عودت نے جاوید کو میرے خلاف اتنا بھڑکایا کہ وہ بھی میرے کردار پر شک کرنے لگا اور اس نے میرے یہاں چک بتی آنے پر پابندی لگا دی تھی۔“

”ساجد“ ایک نیا نام نکل کر سامنے آیا تھا اور مجھے بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر رہا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے یعنی جب کوئی معاملہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور مبینہ طور پر اس معاملے میں کوئی سچائی نہیں ہوتی تو بھی اس پہاڑ ساڑ کے معاملے میں اگر اس کی تہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس معاملے کے حوالے سے رائی کے ساڑ کا کچھ نہ کچھ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ اسی ”دریافت“ کی کوشش میں، میں نے غیر محسوس انداز میں نرگس کو کریدنا شروع کیا۔ ”تمہاری ساس کو تم پر ایک بے بنیاد شک تھا۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن کیا چک بتی میں واقعی کوئی ساجد نام کا شخص موجود ہے؟“

”ساجد ہمارے پڑوسیوں کا لڑکا ہے تمہانے دار صاحب!“ نرگس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”لیکن وہ یہاں نہیں رہتا۔“

”پڑوسیوں کا لڑکا ہے اور یہاں نہیں رہتا.....“ میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑی نرگس؟“

”ساجد کو چار سال پہلے نوکری مل گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ لاہور میں ہوتا ہے۔ مہینے، دو مہینے میں اپنے ماں باپ سے ملنے یہاں چک بتی آتا ہے۔“

نرگس کی شادی کو چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس کا پڑوسی ساجد چار سال پہلے لاہور چلا گیا تھا، یعنی نرگس کی شادی کے دو سال بعد ساجد نے چک بتی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

”نرگس! تمہاری ساس کو ساجد کے حوالے سے تم پر شک کیوں ہوا تھا۔ کیا واقعی تم دونوں کے بیچ کسی قسم کا ربط ضبط رہا تھا؟“

”میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گی تمہانے دار صاحب!“ وہ خامسے توانا لہجے میں بولی۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہوگی۔“

”سچی بات یہ ہے کہ.....“ وہ اپنے بیان کو آگے



”جی ہاں، ادھر ہی۔“ اس نے اثبات میں گردن

ہلا دی۔

”کیا آج کل بھی ساجد چک جی آیا ہوا ہے؟“

”نہیں جی، وہ اس وقت لاہور میں ہے۔“ نرگس

نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، وہ پچھلے

ماہ یہاں کا چکر لگا کر گیا ہے اور اب ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی

ادھر آئے گا۔“

میں نے ابھی تک نرگس سے گھما پھرا کر مختلف زاویوں

سے جتنے بھی سوالات کئے تھے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ

میں نرگس اور ساجد کے بیچ کسی خفیہ کنکشن کی تلاش میں تھا اور

مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ نرگس کے

جوابات کی روشنی میں میرا تجربہ یہ بتاتا تھا کہ اس نے کسی قسم

کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا لہذا میں نے سوالات کے

موضوع کو تبدیل کرنا ضروری جانا اور اس سے پوچھا۔

”نرگس! جتنی بے دردی سے جاوید کو قتل کیا گیا ہے،

اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتلوں کے دلوں اور ذہنوں

میں شدید قسم کی نفرت پل رہی تھی۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے

کہ یہ بہیمانہ قتل کون کر سکتا ہے؟“

میری بات کے اختتام تک اس کی پیشانی پر سلوٹیں

عمودار ہو چکی تھیں۔ ادھر میں خاموش ہوا، ادھر اس نے پوچھ

لیا۔ اس کی آواز میں شدید نوعیت کی حیرت جھلکتی تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تمہارے دار صاحب.....؟“

”کیوں..... میں نے ایسا کیا عجیب کہہ دیا؟“ میں

نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

”آپ کا مطلب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ لوگوں

نے مل کر جاوید کی جان لی ہے؟“

”بالکل، میرا یہی مطلب ہے۔“ میں نے ایک ایک

لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس مطلب تک میں لاش کے

معائنے کے بعد پہنچا ہوں۔ میں نے جاوید کی چٹنی ہوئی

کھوپڑی کا بغور جائزہ لیا ہے۔ اس کے سر اور جسم کے دیگر

حصوں پر لگنے والی چوٹیں بتاتی ہیں کہ اس پر دو تین یا اس

سے بھی زیادہ افراد نے ایک بیک حملہ کیا تھا۔ اگر ایک آدھ

شخص ڈنڈے سوٹے سے اس پر حملہ آور ہوتا تو جاوید اس

سے مار کھانے والا نہیں تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ

کرنے کی کوشش ضرور کرتا یا جائے وقوعہ سے فرار اختیار

کر کے بھی وہ اس ناگہانی سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن وہ ایسا

نہیں کر سکا اور دشمنوں نے گھیر کر اس کے سر پر اتنی کاری

چوٹیں لگائیں کہ وہ بے بسی کی موت مارا گیا۔“

رہی تھی؟“

”چند دنوں تک وہ بولا یا بولا یا پھرتا رہا لیکن پھر

سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”کیونکہ اس

واقعے کے فوراً بعد، دو تین ماہ کے اندر میری جاوید سے

شادی ہو گئی تھی۔“

”اوہ.....“ میں نے چونک کر نرگس کی طرف دیکھا

اور سوال کیا۔ ”ان دو تین ماہ کے اندر ساجد نے کبھی تم سے

ملنے کی یا کوئی بات کرنے کی کوشش کی؟“

”جناب! ہم ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔“ وہ

سادگی سے بولی۔ ”اس لیے ہمارا آمننا سامنا تو ہوتا ہی رہتا

تھا اور ظاہر ہے..... بات بھی ہو جاتی تھی۔“

”میرا اشارہ اس بات چیت کی طرف تھا جو اس کی

پسندیدگی کو اجاگر کرتی ہو۔“ میں نے تکیے لہجے میں پوچھا۔

”کیا اس دوران میں اس نے تم سے کبھی اظہار محبت یا اظہار

پسندیدگی کرنے کی کوشش کی؟“

”نہیں جی..... بالکل نہیں۔“ وہ پوری قطعیت کے

ساتھ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ہمارا جب بھی

سامنا ہوا، وہ مجھے شرمندہ شرمندہ سا نظر آیا جیسے اس نے

میرے لیے رشتہ بھیج کر کوئی سنگین جرم کیا ہو۔“

”پھر دو تین ماہ کے بعد تمہاری جاوید سے شادی

ہو گئی۔“ میں نے ایک خاص زاویے سے کرید کا عمل جاری

رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کے بعد جب بھی تمہارا چک جی

آنا ہوتا تھا تو کیا ساجد سے تمہاری ملاقات ہوتی تھی؟“

”بہت کم..... تقریباً نہ ہونے کے برابر.....“ اس

نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”پھر ڈیڑھ دو سال کے بعد

تو وہ ملازمت کے سلسلے میں لاہور ہی چلا گیا تھا۔ میں جب

بھی چک جی آتی تو یہی پتا چلتا کہ ساجد لاہور میں ہے۔ ان

چار سالوں میں بہ مشکل دو تین بار میرا ساجد سے آمننا سامنا

ہوا ہوگا۔“

”اس آمننا سامنا میں ساجد کے ولی جذبات کیا تھے؟“

”دلوں کا حال تو رب ہی جانتا ہے۔“ وہ ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بولی۔ ”لیکن اس کے چہرے کے تاثرات

سے میں کچھ بھی محسوس نہیں کر سکی تھی اور پھر یہ کہ ہماری یہ

ملاقات ”سلام دعا“ تک ہی محدود رہی تھی۔“

”آخری بار تم نے ساجد کو کب دیکھا تھا؟“ میں نے

دریافت کیا۔

”ایک ڈیڑھ سال پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہیں چک جی میں؟“



”اوہ.....“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”جاوید کے اتنے خطرناک دشمن کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

”یہی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اور جاوید کے ان خطرناک دشمنوں تک تم مجھے پہنچاؤ گی۔“

”میں..... وہ کیسے جی؟“ وہ الجھن بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تم جاوید کی بیوی تھیں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”تم ہی مجھے اس کے دشمنوں تک پہنچا سکتی ہو نرگس۔ میرا شک تو ایک جانب ابھرا تھا مگر تم نے اس کی نفی کر دی ہے؟“

”نفی کر دی ہے۔“ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ ”تھانے دار صاحب! میں نے آپ کے کون سے شک کی نفی کر دی ہے۔“

”ساجد والے شک کی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھے یہ پتا چلا تھا کہ ساجد تمہیں پسند کرتا تھا اور اس کا رشتہ بھی تمہارے لیے آیا تھا لیکن اس رشتے سے انکار کے باعث ساجد کو دلی صدمہ پہنچا تھا تو لامحالہ میرا دھیان ساجد کی طرف چلا گیا تھا لیکن پھر تم نے مجھے جو حالات بتائے، ان کی روشنی میں یہ کارروائی ساجد کی نہیں ہو سکتی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ساجد جوش انتقام میں اس حد تک نہیں جاسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رشتے سے انکار کے بعد جب میری شادی جاوید سے ہوئی تو اس نے حسد محسوس کیا ہوگا۔ اس کے دل میں جاوید کے لیے نفرت بھی پیدا ہوئی ہوگی لیکن اس نے کوئی بھی اوچھا قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ واردات کسی اور ہی نے کی ہے کیونکہ ساجد تو پچھلے ایک ماہ سے لاہور میں ہے اور پھر چھ سال کے بعد وہ اس قسم کی حرکت کرے گا، اس کا کوئی جواز نہیں بنتا جناب۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”اگر تم دونوں کے بیچ دوطرفہ معاملہ ہوتا یعنی جیسے ساجد تمہیں پسند کرتا تھا، تم بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو تیں تو کہا جاسکتا تھا کہ اس نے تمہارے حصول کی خاطر جاوید کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔“

”میں سمجھتی ہوں، جاوید کی موت میں ساجد کا دور دور تک کوئی ہاتھ نہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”یہ کسی اور

ہی کار چایا ہوا خونی کھیل ہے۔“

”اور کسی“ اور ”یہی کی مجھے شدت سے تلاش ہے۔“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”کوئی ایسا شخص جو اپنے دل میں جاوید کے لیے بے پناہ نفرت اور انتقام کے جذبات رکھتا ہو۔ کیا یہاں چک بتی میں ایسا کوئی شخص ہو سکتا ہے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔“ وہ پُر وثوق انداز میں بولی۔ ”چک بتی میں جاوید کا کوئی دشمن نہیں ہے.....“

لحائی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر چونکے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! یہ راہزنی کی کوئی واردات بھی تو ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے لیروں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی ہو اور اس کی مزاحمت پر انہوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔“

نرگس سے میں کافی دیر سے بات چیت کر رہا تھا لیکن اس خونی واردات کے حوالے سے یہ پہلو ابھی زیر بحث نہیں آیا تھا تاہم میرا ذہن اس معاملے میں شیشے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔ یہ کسی بھی صورت راہزنی کی واردات نہیں تھی۔

”راہزنی.....!“ میں نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس قسم کی وارداتوں میں راہزن اور ڈاکو وغیرہ مسافروں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو مسافر شرافت سے لٹ جاتے ہیں ان کی جان سلامت رہتی ہے۔ مال کو وہ جان کا صدقہ سمجھ کر صبر شکر کر لیتے ہیں اور جو مسافر لیروں کی کارروائی میں مزاحمت پیش کرتے ہیں، لٹ تو وہ بھی جاتے ہیں مگر شدید زخمی ہونے کے بعد اور بعض اوقات جان گنوانے کے بعد لیکن جاوید کے ساتھ ایسا نہیں ہوا.....“

”کیا ایسا نہیں ہوا تھانے دار صاحب؟“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”جاوید کو بڑی بے دردی سے قتل تو کر دیا گیا ہے۔ ڈاکو اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے؟“

”یہ اچھا سوال ہے کہ ڈاکو اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔“ میں نے اسی کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکوؤں کا بنیادی مقصد مسافروں کو لوٹنا ہوتا ہے لیکن اس واردات میں ڈاکوؤں نے الفاظ دیگر جاوید کے قاتلوں نے اسے لوٹنے کی کوشش نہیں کی۔“

”جی.....!“ اس کی حیرت ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ ”تھانے دار صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں تمہارے سامنے حقیقت بیان کر رہا ہوں



”جاوید کے ساتھ جو بھی اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے، یہ کسی دوست کا کارنامہ تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً اس کے کسی دشمن ہی نے اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

”جی..... آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔“

”اگر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تو پھر تم میری ضرورت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب تک مجھے جاوید کے دشمنوں کے حوالے سے کوئی سراغ یا اشارہ نہ ملے، میں اس کے قاتلوں تک آسانی سے رسائی حاصل نہیں کر سکوں گا اور اگر میری قاتلوں تک رسائی نہیں ہوگی تو میں انہیں کیفر کردار تک کیسے پہنچاؤں گا؟“

”جی..... میں آپ کی بات کو تو سمجھ رہی ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یقین کریں، میں جاوید کے دشمنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی..... اگر مجھے کچھ پتا ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتی۔“

”مجھے پتا چلا ہے، وہ غصے کا بہت تیز تھا۔“ میں نے ایک اور پہلو سے اسے ٹھنسنے کی کوشش کی۔ ”اکثر لوگوں سے اس کی منہ ماری ہوتی رہتی تھی۔ کیا کبھی کسی سے ایسا جھگڑا بھی ہوا جو متکین صورت اختیار کر گیا ہو..... میرا مطلب ہے، اس جھگڑے میں جاوید نے کسی کی درگت بنا دی ہو؟“

”نہیں جی..... اتنا شدید جھگڑا تو اس کا کسی سے بھی نہیں ہوا تھا۔“ وہ معتدل لہجے میں بولی۔ ”ہاں، یہ بات درست ہے کہ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتا تھا اور اکثر لوگوں سے اس کی گرامگری بھی ہو جاتی تھی۔“

”کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو اپنے گلے میں فیروزے والا لاکٹ پہنتا ہو؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”جی، کیا.....“ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”یہ فیروزے کا لاکٹ کیا ہوتا ہے؟“

سوال پوچھنے کے ساتھ ہی میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ بھی ڈال دیا تھا۔ نرگس کے سوال نے مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ وہ لفظ ”فیروزے“ پر چونکی تھی ورنہ لاکٹ کوئی ایسا ناشائس لفظ نہیں تھا۔ یقیناً وہ فیروزے کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔

میں نے چٹختے ہوئے فیروزے والے لاکٹ کو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لاکٹ مجھے اس جگہ پڑا ملا ہے جہاں قریب ہی کھیتوں میں جاوید کی لاش پائی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے، یہ لاکٹ قاتلوں میں سے ہی کسی کا ہے جو

نرگس! میں نے گہری سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”جاوید کے قاتلوں نے اس کی جیب سے ایک پیسا بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے پاس جو بھی رقم تھی، وہ مجھے اس کی جیب کے اندر سے مل گئی ہے جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جاوید کو پیش آنے والا واقعہ راہزنی کی کوئی واردات نہیں تھی بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔“

”اوہ.....“ وہ تشویش ناک انداز میں مجھے مکنے لگی۔ ”ایسی گھٹیا حرکت کون کر سکتا ہے؟“

”مجھے بھی تو اسی نازک اور اہم سوال کے جواب کی تلاش ہے نرگس!“ میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”یہاں چک بتی میں تمہارے سسرالی حالات سے کون کون واقف تھا؟“

یہ سوال اس حوالے سے میرے ذہن میں چکا تھا کہ ممکن ہے چک بتی کا کوئی وسنیک نرگس سے گہری ہمدردی رکھتا ہو اور جب اسے نرگس کے سسرالی مصائب و آلام کی خبر ہوئی ہو تو اس نے چپ چاپ جاوید کو ٹھکانے لگا دیا ہو لیکن نرگس کے جواب نے میرے اس خیال کی نفی کر دی۔

”نہیں تھانے دار صاحب.....“ وہ اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اپنے سسرالی حالات کو سینے میں دفن کر رکھا تھا۔ جب میں نے اپنے ماں باپ کو کچھ نہیں بتایا تو اور کسی کو کیسے بتا سکتی تھی..... چک بتی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ ادھر سسرال میں مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔“

”ہوں.....“ میں نے گہمیر انداز میں ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ”اور ادھر جلال پور کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جی..... میں سمجھی نہیں!“ وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے مجھ سے کیا پوچھا ہے؟“

”میں نے یہ پوچھا ہے کہ ادھر جلال پور میں جاوید کی کسی سے دشمنی وغیرہ تھی؟“

”نہیں.....!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ ”میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب.....!“

”دیکھو نرگس!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔



سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رکی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے میرے جیدے کے قاتلوں کو گرفتار کر لیا؟“

”جاوید کے قاتل بہت جلد قانون کی گرفت میں ہوں گے رحمت بی بی۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”بس، ذرا مجھے ان تک پہنچنے کا راستہ مل جائے اور یہ راستہ مجھے تم دوگی۔“

”راستہ کیا..... میں نے تو آپ کو بندے کا نام تک بتا دیا تھا۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”مگر آپ نے کچھ نہیں کیا..... کچھ بھی نہیں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

”تم نے مجھے کس بندے کا نام بتایا تھا؟“ میرے لہجے سے حیرت چک رہی تھی ”اور کب.....؟“

”ادھر چک بتی کے کھیتوں میں تھانے دار صاحب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”آپ اتنی جلدی بھول گئے۔ میں نے کہا تھا، اس بندے کو گرفتار کر لیں۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”اوہ..... تم نے تو نرگس کے باپ خیر دین کی طرف اشارہ کیا تھا۔“ مجھے یاد آ گیا۔ ”تو کیا تمہارے خیال میں خیر دین نے جاوید کو قتل کیا ہے؟“

”اس خبیث بڑھے نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے یا کسی اور سے کرایا ہے، یہ میں نہیں جانتی۔“ وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ خیر دین میرے جیدے کے دشمن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ آپ اسے گرفتار کر کے سختی کریں گے تو اس کی زبان کھل جائے گی۔“

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ رحمت بی بی اپنے دل میں نرگس اور اس کے ماں باپ کے لیے حد سے زیادہ عناد رکھتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، خیر دین کا ذکر کرتے ہوئے اس کی زبان زہرا گلنے لگتی تھی۔ پہلے اس کا فوکس خیر دین پر تھا، اب اس نے جاوید کا کوئی دشمن بھی نکال لیا تھا لہذا اس خراٹ عورت کو احتیاط سے ٹٹولنے کی ضرورت تھی۔

”ٹھیک ہے رحمت بی بی! میں خیر دین کو گرفتار کر لوں گا۔“ میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ”لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اپنے بیٹے کے دشمن کو اچھی طرح جانتی ہو..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“

”ٹھیک..... بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ وہ بڑے

واردات کے دوران میں اس کی ڈوری ٹوٹ جانے سے زمین پر گر گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تمہاری ساس رحمت بی بی سے بھی پوچھا تھا۔

”پھر اس نے کیا جواب دیا تھانے دار صاحب؟“

الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”اس کا کہنا ہے کہ اس لاکٹ کا جاوید سے کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے نرگس کو بتایا۔ ”اور نہ ہی وہ اس لاکٹ کے بارے میں اور کچھ بتا سکی ہے۔“

”میرا بھی یہی جواب ہے تھانے دار صاحب!“ وہ پُر اعتماد انداز میں بولی۔ ”میں نے ایسا کوئی لاکٹ جاوید کے پاس کبھی نہیں دیکھا بلکہ جاوید کو تو لاکٹ پہننے کا کبھی شوق ہی نہیں رہا۔“

”کسی اور کے گلے میں تم نے یہ لاکٹ دیکھا ہو؟“

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے مذکورہ لاکٹ کو جیب میں رکھا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جلال پور میں پہنچنے کے بعد میں نے تھانے کا رخ کرنے سے پہلے مقتول جاوید کی ماں رحمت بی بی سے ملاقات کرنا از حد ضروری جانا۔ اگرچہ نرگس کے معاملے میں اس کا کردار بہت ہی منفی اور احمقانہ بلکہ سازش نہ رہا تھا تاہم اس کے بیٹے کی المناک موت ہوئی تھی۔ وہ ایک ماں تھی اور اولاد کے لیے ہر ماں کا دل ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

میں شام سے کچھ پہلے رحمت بی بی کے گھر میں تھا۔ اس سے ابتدائی ملاقات تو ادھر چک بتی کے چاول کے کھیتوں ہی میں ہو گئی تھی اور میں نے اس سے واجبی سی پوچھ تاچھ بھی کی تھی لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس سے تفصیلی ملاقات کی ضرورت تھی۔ چک بتی میں خیر دین، صفیہ اور نرگس کی زبانی مجھے ”نرگس اور جاوید“ کی شادی کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل ہو گئی تھیں اور یہ بات بھی کہ جاوید سے شادی سے چند ماہ پہلے نرگس کے لیے ساجد کا رشتہ آیا تھا تاہم بعد میں ان کے بیچ کسی قسم کا میل ملاپ نہیں رہا تھا۔

نرگس نے بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے بات کی تھی اور میرا تجربہ بتاتا تھا کہ اس نے کسی بھی مرحلے پر دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا اور اس کی باتوں سے میں نے بڑا واضح محسوس کر لیا تھا کہ اب اس کا جلال پور آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے والدین کی بھی یہی مرضی تھی۔

میں اس وقت رحمت بی بی کی بیٹھک میں اس کے



کتنے بچے گھر سے نکلا تھا؟“

اس نے بتایا۔ ”جید اکل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آدھا دن وہ دکان پر گزارے گا۔ اس کے بعد وہ چک بٹی کی طرف جائے گا۔ چک بٹی یہاں سے صرف چار میل دور ہے۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ شام سے پہلے واپس آ جانا لیکن جب وہ کل شام تک گھر نہیں آیا تو مجھے بڑی فکر ہوئی پھر یہ سوچ کر میں نے خود کو تسلی دے لی کہ ہو سکتا ہے نرگس کے گھر والوں نے اسے زبردستی روک لیا ہو۔ صبح آجائے گا لیکن صبح تو مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی جب پتا چلا کہ.....“ اس کی آواز رندہ گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

یہ ٹھیک ہے کہ خورشید بیگم اور نرگس کے باپ خیر دین کی زبانی مجھے رحمت بی بی کے بارے میں جو کچھ پتا چلا تھا، اس کی روشنی میں یہ بہت ہی فتنہ پرور عورت تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک بیٹے کی ماں بھی تھی اور وہ بیٹا گزشتہ رات بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لہذا کبھی دل رحمت بی بی کے جذبات کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے نہایت ہی ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”رحمت بی بی! تمہارے بیٹے کی موت کا مجھے بھی بہت افسوس ہے اور میں یہ ساری پوچھ گچھ اس کے قاتلوں تک پہنچنے کے لیے ہی کر رہا ہوں۔“

”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں سمجھ رہی ہوں۔“

”میری معلومات کے مطابق جاوید کی بیوی نرگس دس اکتوبر کو اپنے میکے گئی تھی“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور دو دن بعد ہی جاوید اسے لینے کے لیے گھر سے چل پڑا۔ کیا جاوید نے نرگس کو یہ بات بتا رکھی تھی کہ وہ دو دن بعد اسے لینے آئے گا؟“

”جید اپنی مرضی کا مالک تھا جناب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مجھے نہیں پتا کہ اس نے نرگس کو دو دن والی بات بتائی تھی یا نہیں۔“

”مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ نرگس کسی خورشید نامی عورت کے ساتھ یہاں سے چک بٹی گئی تھی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ جاوید کے ساتھ کیوں نہیں گئی تھی؟ اور یہ خورشید بیگم کون ہے؟“

میں خورشید بیگم سے مل چکا تھا اور اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات بھی رکھتا تھا لیکن میں رحمت بی بی کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے بتایا۔

اعتماد کے ساتھ بولی۔ ”اس بندے کا نام ہے ساجد.....!“

اگرچہ نرگس کی زبانی مجھے ساجد کے حوالے سے تمام تر معلومات حاصل ہو چکی تھیں مگر رحمت بی بی کا نقطہ نظر جاننا بھی ضروری تھا لہذا میں نے ان جان بختے ہوئے پوچھا۔

”یہ ساجد کون ہے؟“

”نرگس کا یار۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے سوال کیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا رحمت بی بی؟“

میرے سوال کے جواب میں اس نے مجھے ایک چٹ پٹی مسالے دار کہانی سنا ڈالی جس کے مطابق نرگس کا اپنے پڑوسی ساجد کے ساتھ بڑا طوفانی قسم کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ساجد، نرگس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن نرگس کی شادی جاوید سے ہو گئی لہذا ساجد، جاوید کا دشمن بن گیا اور پھر موقع ملے ہی اس نے جاوید کو ٹھکانے لگا دیا تاکہ اپنی محبوبہ سے شادی کر چا سکے، وغیرہ وغیرہ.....!

رحمت بی بی کی کہانی مبنی بر عناد تھی۔ اس نے ساجد کو جس انداز میں پینٹ کیا تھا، اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ اسے اپنے بیٹے کا قاتل ڈکلیئر کر چکی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”رحمت بی بی! تمہاری باتوں سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تم ساجد کو اپنے بیٹے کا قاتل سمجھتی ہو لیکن وہ تو پچھلے چار سال سے لاہور میں ہوتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ لگ بھگ ایک ماہ پہلے چک بٹی آیا تھا اور جاوید کا قتل تو ایک دن پہلے ہوا ہے۔ پھر وہ تمہارے بیٹے کے قتل میں کس طرح ملوث ہو سکتا ہے؟“

”وہ میرے جیدے کا پکا دشمن ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ”وہ ایک ماہ پہلے چک بٹی آیا تھا تو کیا ہوا..... وہ اس کے بعد بھی تو آ سکتا ہے۔ اس کے چک بٹی آنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگی ہوئی۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ نرگس کے باپ اور ساجد کو فوراً گرفتار کر لیں۔ آپ ان دونوں پر سختی کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

میں نے رحمت بی بی سے اس بات پر بحث نہیں کی کیونکہ وہ اپنے موقف سے ایک سوت ادھر ادھر ہتی دکھائی نہیں دیتی تھی اور فی الحال میرے پاس ایسی کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی کہ میں ساجد کو اس معاملے سے لائق ثابت کر کے بے گناہ قرار دے سکتا لہذا میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”رحمت بی بی! تمہارا بیٹا جاوید کل یعنی بارہ اکتوبر کو



خورشید بیگم کا شوہر طالب حسین خاصا زندہ دل اور دور اندیش انسان تھا۔ ہم تھوڑی دیر تک تحریک آزادی کی یادوں کو تازہ کرتے رہے پھر تازہ ترین صورت حال زیر بحث آگئی۔ خورشید بیگم نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی اور بولی۔

”تھانے دار صاحب! میں نے آپ سے کہا تھا نا، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ دیکھ لیں۔ نرگس کے ساتھ تو کچھ نہیں ہوا مگر جاوید جان سے چلا گیا۔“

”بڑی دردناک موت ہوئی ہے اس کی۔“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”ظالموں نے اس کی کھوپڑی اور جسم کے مختلف حصوں کا ستیاناس مار کر رکھ دیا ہے۔ تم لوگوں کے خیال میں جاوید کا قاتل کون ہو سکتا ہے یا ہو سکتے ہیں؟“

اپنی بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”مجھے تو یہ لوٹ مار اور راہزنی کی واردات لگتی ہے۔“ طالب حسین نے کہا۔

خورشید بیگم بولی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے ان دونوں کے خیالات کو رد کرنے کے لیے منطقی انداز میں انہیں بتایا کہ وہ کسی بھی طور پر راہزنی کی واردات نہیں تھی۔ اگر وہ ڈاکو لٹیرے ہوتے تو مقتول کی جیب میں سے مجھے ہرگز ہرگز دو سو روپے نہ ملتے۔ اس وضاحت کے بعد انہوں نے میری بات سے اتفاق کر لیا۔

”خورشید بیگم! مجھے بتایا گیا ہے کہ نرگس تمہارے ساتھ چک بتی گئی تھی؟“

”آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نرگس کافی عرصے سے اپنے میکے جانے کے لیے تڑپ رہی تھی لیکن جاوید کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے ٹال دیتا تھا۔ جب نرگس کے باپ خیر دین کو زہریلے سانپ نے داغیں ہاتھ پر ڈس لیا اور خیر دین کی زندگی بچانے کے لیے اس کے متاثرہ ہاتھ کو کاٹا پڑا تو نرگس اس واقعے سے بہت غم زدہ ہو گئی تھی اور ہر لمحہ چک بتی جانے کو اس کا دل چل رہا تھا لیکن سنگ دل اور بے رحم جاوید پر اس واقعے اور نرگس کی حالت کا ذرا اثر نہ ہوا۔ پھر میرے ذہن میں ایک آئینہ یا آیا اور میں نے فوراً اس آئینے پر عمل بھی کر ڈالا۔“

”تو گویا تمہارا صورت نگر جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا؟“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔

”آپ سمجھدار انسان ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ

”خورشید ہماری پڑوسن ہے تھانے دار صاحب۔ یہ اس دن صورت نگر جا رہی تھی۔ چک بتی صورت نگر جاتے ہوئے راستے میں آتا ہے۔ خورشید نے کہا کہ میں نرگس کو چک بتی چھوڑ کر صورت نگر کی طرف نکل جاؤں گی اس لیے ہم نے نرگس کو اس کے ساتھ بھیج دیا تھا۔“

صورت نگر نامی گاؤں چک بتی سے دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے رحمت بی بی سے پوچھا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ جاوید غصے کا بہت تیز تھا۔ اس واقعے سے پہلے اس کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا تھا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، ادھر بازار میں کسی سے اس کی منہ ماری ہوئی ہو؟“

”نہیں جی، ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ جیدے کو غصہ جلدی آ جاتا تھا لیکن ان دنوں میں اس کا کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔“ لچاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”تھانے دار صاحب! آپ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ میں نے قاتل کی نشان دہی کر دی ہے۔ آپ ساجد کو گرفتار کر کے اس پر سختی کریں۔ مجھے یقین ہے، وہ زبان کھول دے گا۔“

”میں تمہارے اس مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔“ میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ”لیکن ہر زاویے سے تفتیش کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں بہت جلد تمہارے بیٹے کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا دوں گا۔“

میں تھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھا پھر خورشید بیگم کے گھر آیا۔ رحمت بی بی اور خورشید بیگم کے گھر آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ خورشید بیگم اور اس کا شوہر طالب حسین ایک بے اولاد جوڑا تھے۔ طالب حسین نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا اور ایک سانچے میں وہ اس قدر شدید زخمی ہو گیا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹنا پڑی تھیں۔ چند روز پہلے خورشید بیگم میرے پاس تھانے آئی تھی اور اس نے رحمت بی بی، خالدہ اور جاوید کی مجھ سے شکایت کی تھی۔ اس کے خیال میں نرگس کے ساتھ اس گھر میں بہت ظلم ہو رہا تھا۔ میں نے خورشید بیگم کو اس وقت کافی مایوس کیا تھا۔ رحمت بی بی کے گھر میں اس کی مطلقہ بیٹی خالدہ سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اور۔۔۔۔۔ میں نے اسے کافی تیز و طرار پایا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ خالدہ کی زبان درازی کی وجہ سے اسے طلاق ہوئی تھی۔



”مجھے تو جاوید ہی میں کوئی نقص لگتا ہے ملک صاحب۔“ طالب حسین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔  
”نقص کیا، میرے خیال میں بالکل ناکارہ ہے۔“ خورشید بیگم ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ”اسی لیے اسے غصہ بھی زیادہ آتا ہے۔ ناکارہ بندہ اپنی ناکامیوں کا غصہ دوسروں پر ہی نکالتا ہے، یہ تو آپ بھی مانتے ہیں نا تھانے دار صاحب!“  
”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”اس کے علاوہ مولے جیسے والے بندے کو بھی زیادہ غصہ آتا ہے۔ جاوید بھی خاصے بھاری بھر کم وجود کا مالک تھا۔“

میں نے جائے وقوعہ سے ملنے والے فیروزے والے لاکٹ کو نرگس اور رحمت بی بی کو دکھایا تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس لاکٹ کو نہیں پہچانا تھا۔ میں نے مذکورہ لاکٹ خورشید بیگم کو بھی دکھایا لیکن اب کی بار بھی نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ میں ان کے گھر سے اٹھا اور تھانے آ گیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے ایک سادہ لباس اہلکار کو ”خصوصی ہدایات“ کے ساتھ جائے وقوعہ کی جانب روانہ کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے ایک کانشیل کو ساتھ لیا اور ریل بازار پہنچ گیا۔ قصبہ جلال پور مین روڈ اور ریلوے لائن کے بیچ میں واقع تھا اسی لیے اس بازار کا نام ریل بازار رکھا گیا تھا۔ یہ بازار ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے سیدھا اندر قصبے کی طرف آتا تھا اور اسی بازار میں جاوید کی کپڑے کی دکان تھی۔

ریل بازار میں ملی جلی ہر چیز کی دکانیں تھیں۔ جاوید کے قتل کی اطلاع ہر شخص کو ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے آس پاس والے دکان داروں سے پوچھنا چھوڑ دیا تاکہ یہ پتا چلا جائے کہ جاوید کو پیش آنے والے واقعے کا ذمہ دار کون ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ بھی صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ ان میں سے کسی نے بھی جاوید کے قاتلوں کے حوالے سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کی روشنی میں اس کیس کو میں آگے بڑھا سکتا۔ میں ناکام و نامراد واپس تھانے آ گیا۔

نرگس کی زبانی مجھے اس کے نو عمر عاشق ساجد کی کہانی معلوم ہو چکی تھی اور یہ بھی پتا چلا تھا کہ وہ پچھلے چار سال سے لاہور میں نوکری کر رہا ہے۔ نرگس کی شادی سے وہ اس قدر

تعریفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے نرگس کو اس کے ماں باپ اور بھائی سے ملوانے کے لیے ایک ڈراما چایا تھا۔ میں نے رحمت بی بی سے کہا کہ جاوید کو تو وقت نہیں مل رہا چک جی جانے کا۔ میں اتفاق سے صورت نگر جا رہی ہوں۔ تم نرگس کو میرے ساتھ بھیج دو۔ میں اسے چک جی پہنچانے کے بعد صورت نگر چلی جاؤں گی اور..... رحمت بی بی نے میری بات مان لی.....“ لکائی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تھانے دار صاحب! جب گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا ہو تو پھر انگلی کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے.....“  
”اور تم نے چک جی پہنچتے ہی نرگس کے ماں باپ کو اس کے حالات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔“ میں نے کہا۔ ”حالانکہ نرگس نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سستی خیز لہجے میں سوال کیا۔

”یہ بہت ضروری تھا تھانے دار صاحب۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”نرگس کے حالات سے میں بہت دکھی تھی۔ اس کے ماں باپ کو کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، نیک نیتی سے کیا ہے اور نیکی کرتے وقت بہت سی چیزوں کو نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو خورشید بی بی۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ”یہ نرگس کے ہاتھ پن کا کیا قصہ ہے؟“

”یہ سراسر نرگس پر الزام ہے جناب۔“ وہ پُر اعتماد لہجے میں بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ ہاتھ پن والا کوئی معاملہ نہیں۔“

”تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ ”اس کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں اور ابھی تک وہ بے اولاد ہے.....“

”میں یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ان چھ سالوں میں دوبار نرگس کا ابارشن ہوا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر نرگس ہاتھ پن تو پھر اس کے ہاں امید کا پودا پنپنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو خورشید بیگم۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کسی ہاتھ پن عورت کا ابارشن نہیں ہو سکتا۔“



سرف چارمیل كے فاصلے ٲر تھا۔ نرگس اور اس كے ماں باپ كی زبانی مجھے ٲتا چل چكا تھا كہ جاوید چك بئی نہیں ٲنچا تھا۔ اس كا ايك ہی مطلب تھا كہ اسے چك بئی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹھكانے لگا دیا گیا تھا ٲھر اس كی لاش كو گھسیٹ كر چاول كے كھیتوں كے اندر چھپا دیا گیا تھا تا كہ فوری طور ٲر اس ٲر كسی كی نظر نہ ٲڑے۔

میں نے بڑی باريك بینی سے جائے وقوعہ كا معائنہ كیا تھا اور ٲوسٹ مارٹم رٲورٹ میرے تجزیے كی تصدیق كرتی تھی۔ مجھے بھی جاوید كی لاش كو كچے راستے سے گھسیٹ كر كھیتوں كے اندر لانے كے آثار ملے تھے۔ یقیناً جاوید كو اس كچے راستے ٲر گھیر كر مارا گیا تھا جو جلال ٲور سے چك بئی كی طرف آتا تھا گویا چك بئی ٲنچنے سے پہلے ہی اسے موت كی نیند سلا دیا گیا تھا۔

ٲوسٹ مارٹم رٲورٹ نے میرے ايك اور اندازے كی بھی تصدیق كر دی تھی كہ حملہ آور ايك سے زیادہ افراد تھے۔ رٲورٹ كے مطابق كم از كم دو اور زیادہ سے زیادہ چار افراد نے لاشیوں كی مدد سے اس ٲر بھر ٲور حملہ كیا تھا اور اسے سنبھلنے كا ذرا موقع نہیں دیا تھا۔ نتیجے كے طور ٲر اس كی كھو ٲڑی كا حشر نشر ہو گیا۔ علاوہ ازیں اس كے دست و بازو بھی شدید زخمی ہوئے تھے۔

ٲورا دن جاوید كے بہیمانہ قتل كی گتھی كو سلجھانے میں گزر گیا لیكن ابھی تك اس كیس كا كوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اللہ كا شكر ہے كہ میں نے كسی بھی حال میں ماٲوس ہونا نہیں سیکھا۔ میرا یہ ایمان ہے كہ سختی اور ٲریشانی كی كوئی رات چاہے كتنی بھی طویل کیوں نہ ہو، اسے بھی نہ گتھی ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ سحر كو طلوع ہونے سے كوئی نہیں روك سكتا۔ جو لوگ سحر كے انتظار میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ منزل كا سراغ ٲالیتے ہیں۔

چودہ اكتوبر كی شام كو جب میں تھانے سے اٹھ كر اپنے كوارٹر میں آیا تو میرا دل خاصا بوجھل اور دماغ الجھا ہوا تھا اور یہ عین فطری کیفیت تھی۔ ٲچھلے دو دنوں سے میں جس قسم كے حالات سے گزر رہا تھا، یہ سب اسی كے اثرات تھے۔

میں نے رات كا كھانا كھا یا اور عشا كی نماز ادا كی۔ وہ اكتوبر كا زمانہ تھا۔ گلابی جاڑے كا آغاز ہو چكا تھا۔ دن اگر چہ گرم ہی تھا لیكن رات میں ٹھنڈك ہو جاتی تھی۔ میں سونے كے لیے بستر ٲر لیٹا ہی تھا كہ میرے كوارٹر كے دروازے ٲر دستك ہوئی۔ اس وقت دستك كا مطلب ايك ہی تھا كہ تھانے میں كوئی ایمر جنسی ہو گئی تھی۔ جب میں تھانے

دل برداشتہ ہوا تھا كہ اس نے چك بئی ہی كو خیر باد كہہ دیا تھا۔ اب وہ اپنے ماں باپ سے ملنے ادھر كا چكر لگایا كرتا تھا۔ میری معلومات كے مطابق ساجد ايك ماہ پہلے چك بئی آیا تھا اور اس وقت وہ لاہور ہی میں تھا۔

جب نرگس كی زبان سے میں نے ساجد كا ذکر سنا تھا تو فوری طور ٲر میرا ذہن اس كی طرف بھی گیا تھا۔ میں نے نرگس كو اس حوالے سے كا فی كریدا تھا كہ کہیں جوش انتقام میں آ كر ساجد ہی نے تو جاوید كا كام تمام نہیں كر دیا۔ رقابت كا جذبہ بڑے خطرناك نتائج لاسكتا ہے لیكن نرگس نے میرے خیال كی تردید كر دی تھی۔

نرگس كی بات میں اچھا خاصا وزن تھا لہذا اس كیس میں وقتی طور ٲر ساجد كی طرف سے میرا دھیان ہٹ گیا تھا لیكن رحمت بی بی نے دوبارہ اس جانب میری توجہ مبذول كرادی تھی۔ رحمت بی بی كا اصرار تھا كہ میں فوری طور ٲر ساجد كو گرفتار كر كے اس ٲر سختی كروں تو وہ زبان كھول دے گا۔ اسے یقین تھا اور اس نے مجھے بھی یقین دلانے كی كوشش كی تھی كہ ساجد ہی نے اس كے بیٹے جاوید كو موت كے گھاٹ اتارا ہے۔

رحمت بی بی لاکھ لڑاكو، ظالم اور فتنہ ٲرور عورت سہی لیكن وہ مقتول كی وارث تھی۔ اگر وہ اپنے بیٹے كے قاتل كے سلسلے میں كسی شخص ٲر اپنے شك كا اظہار كر رہی تھی تو میں اس كے دعوے كو نظر انداز نہیں كر سكتا تھا۔ رحمت بی بی كی نشان دہی ٲر اس لیے بھی توجہ دینے كی ضرورت تھی كہ ساجد چھ سال پہلے نرگس كا طلب گار رہا تھا۔

میں نے ايك ہوشیار قسم كے اہلكار كو لاہور روانہ كر دیا تا كہ وہ ساجد كے معمولات ٲر گہری نگاہ ركھ سکے۔ اگر وہ جاوید كے قتل میں ملوث تھا تو اس نے کہیں نہ کہیں كوئی غلطی ضرور كرنا تھی اور جی بھی وہ ٲكڑ میں آ جاتا۔

دو ٲہر كے بعد ٲوسٹ مارٹم كی ابتدائی رٲورٹ آ گئی۔ اس كے ساتھ ہی جاوید كی ٲوسٹ مارٹم شدہ لاش بھی تھی۔ میں نے رحمت بی بی كو اطلاع بھجوا دی كہ وہ تھانے آ كر ضروری كارروائی كے بعد اپنے بیٹے كی لاش وصول كر لے۔

ٲوسٹ مارٹم رٲورٹ كے مطابق جاوید كی موت بارہ اكتوبر كی شام كسی وقت واقع ہوئی تھی۔ موت كے وقت كا تعین سہ ٲہر اور شام كے درمیان كیا گیا تھا۔ ریل بازار سے میں ٲتا چلا چكا تھا كہ جاوید بارہ اكتوبر كو دو ٲہر كے بعد دكان بند كر كے چلا گیا تھا۔ اس حساب سے سہ ٲہر كو اسے چك بئی كے آس ٲاس ہونا چاہیے تھا۔ قصبہ جلال ٲور سے چك بئی



میرے سامنے پیش کر دیا اور بتایا۔

”ملک صاحب! میں نے اس بندے کو جائے وقوعہ سے پکڑا ہے۔ یہ ادھر کچے راستے پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آپ نے مجھے جائے وقوعہ کی نگرانی کا کام سونپا تھا۔ یہ بندہ اور اس کی حرکتیں مجھے مشکوک لگیں تو میں نے اسے پکڑ لیا اور پکڑ کر آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ باقی کا انٹرویو آپ خود کر لیں۔“

وہ بندہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اور قد کاٹھ اچھا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”بھولا جی..... مجھے بھولا کہتے ہیں۔“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔

”بھولا.....!“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم تو کہیں سے بھی بھولے نظر نہیں آتے۔ مجھے تو تم دس نمبری بد معاش لگتے ہو۔“

”تھانے دار صاحب! میں بے قصور ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں بولا۔ ”آپ کا بندہ مجھے خواجواہ ہی پکڑ کر یہاں لے آیا ہے۔“

سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ جاتا تھا تو پھر میرا اسٹاف چھوٹے موٹے معاملات کے لیے مجھے پریشان نہیں کرتا تھا حالانکہ میں نے واضح الفاظ میں ان سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی بھی معاملہ ہو، مجھے فوراً بلا لیا جائے۔ میرا کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں احاطے کے اندر ہی بنا ہوا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو شبینہ ڈیوٹی والے ایک کانسٹیبل کی صورت دکھائی دی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”قاروق! خیریت تو ہے نا.....؟“

”ملک صاحب! چک بتی سے ناصر واپس آ گیا ہے اور وہ اپنے ساتھ ایک بندے کو بھی لایا ہے۔“ ناصر وہی پولیس اہلکار تھا جسے میں نے سادہ لباس میں جائے وقوعہ کی کڑی نگرانی پر تعینات کیا تھا۔ اگر وہ کسی بندے کو ساتھ لایا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس کوئی بڑی خبر تھی۔

”تم چلو میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کانسٹیبل قاروق سے کہا۔

وہ مجھے سیلیوٹ مار کر واپس چلا گیا۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد میں تھانے میں اپنے کمرے میں سول ڈریس میں موجود تھا۔ ناصر نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بندے کو فوراً

Downloaded From  
PAKSOCIETY.COM

جولائی کے سترہ ویں دن کی کہانی

ماہنامہ جاسوسی

اولین سوغات ● دعا بازی اور فریب کاری کے جال میں ابھی ایک انوکھی داستان، ایچ اقبال کے قلم کی سوغات

انگاریہ ● شریف آدمی کو بد معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی جسے دینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم ہے

ماہنامہ ● چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پانی... عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرواز کی کہانیاں ●

بھلا رنگ ● معصومیت اور پاکیزگی کو داغ دار بنادینے والے عوامل کی معاشرتی کہانی

دوسرا رنگ ● جرم اور قانون کی پیروی میں آگے بڑھتی کہانی کے جج و خیم



جس کا

آپ کے تجربے... مشورے... شکایتیں... اور نئی دلیپ بائیں... کہنا



ہوئے پوچھا۔

”ان جھمکوں کو پہچانتے ہو.....؟“

یہ سوال کرتے وقت میں بھولا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی بڑی واضح چمک نوٹ کی یعنی اس نے فیروزے والے لاکٹ کو پہچان لیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے ڈھٹائی نے اس چمک کی جگہ لے لی اور وہ منافقانہ لہجے میں بولا۔

”یہ جھمکے تو نہیں ہیں، ایک لاکٹ ہے اور..... اس لاکٹ سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں.....“

”میں نے پوچھا کہ اس لاکٹ کا تم سے واسطہ تعلق ہے یا نہیں؟“ میں نے کہا جانے والی نظر سے اسے گھورا۔

”وہ جی..... آپ مجھے دکھا جو..... رہے ہیں اس لیے..... میں نے کہا.....“ وہ لکت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ”تو یہ لاکٹ تمہارا نہیں ہے؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”ناصر! یہ بندہ آج کی رات تمہارا مہمان ہے۔“

میں نے کانشیل کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”تم رات بھر اس کی خوب خاطر تواضع کرو۔ صبح تک اس کی زبان کا تالا کھل جانا چاہیے۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!“ کانشیل ناصر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کا ”بہت خیال“ رکھوں گا۔ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا اور صبح جب آپ تھانے آئیں گے تو یہ کسی ٹیپ کی طرح فر فر بولنے کے قابل ہو جائے گا..... انشاء اللہ!“

اگر میں نے بھولا کی آنکھوں میں فیروزہ والے لاکٹ کے حوالے سے شناسائی کی چمک نہ دیکھی ہوتی تو میں اسے ہرگز ہرگز ناصر کے حوالے نہ کرتا۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی روشن اور چمک دار تھی۔ یہ صبح میرے لیے ایک خاص زاویے سے اہمیت کی حامل تھی کیونکہ چندرہ اکتوبر کی صبح میں تھانے پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھا تو ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔ ناصر نے میرے پاس آ کر بتایا۔

”ملک صاحب! بھولا نے زبان کھول دی ہے۔“

”کیا اس نے فیروزے والے لاکٹ کی ملکیت قبول کر لی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہ صرف ملکیت قبول کر لی ہے بلکہ اس نے جاوید کے قتل کا اقرار بھی کر لیا ہے۔“ کانشیل نے سنسنی خیز لہجے

”میرے اسٹاف کے لوگ خواہ مخواہ کچھ بھی نہیں کرتے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”بتاؤ، تم کچے راستے پر کیا تلاش کر رہے تھے؟ کیا تمہاری ماں کے جھمکے وہاں گم ہو گئے تھے؟“

”وہ جی..... میں تو وہاں کچھ بھی نہیں ڈھونڈ رہا تھا۔“

وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ ”بس جی، میں تو ادھر سے گزر رہا تھا اور آپ کے بندے نے مجھے پکڑ لیا۔“

”یہ ایسے زبان نہیں کھولے گا ملک صاحب!“ ناصر نے دے دے جوش کے ساتھ کہا۔ ”آج کی رات آپ اسے میرے حوالے کر دیں، میں اس کے سارے کس بل نکال کر الف کی طرح سیدھا کر دوں گا۔“

”کیوں بھی بھولا.....!“ میں نے اس بندے کی طرف دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”تم شرافت سے زبان کھولتے ہو یا میں تمہیں ناصر کے حوالے کر دوں؟“

”آپ میری بات کا یقین کریں جناب۔“ وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا۔“

اگرچہ بھولا کا انداز منت سماجت والا تھا لیکن میں نے اس کی آنکھوں سے جھلکتی مکاری اور عیاری کو صاف پڑھ لیا تھا لہذا اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی یا نرمی کے جذبات ابھر ہی نہیں سکتے تھے۔

”اگر میں تمہیں تمہاری اماں جان کے گم شدہ جھمکوں کی جھلک دکھا دوں تو پھر تم سب سچ سچ بتا دو گے نا.....“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

”کون سے جھمکے؟“ وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

”وہی جھمکے..... جنہیں تم چمک بتی کے کچے راستے پر بڑی شد و مد سے تلاش کر رہے تھے۔“ میں نے کہا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ مصنوعی پریشانی سے بولا۔

میں نے اس کی اداکاری کو بھانپ لیا اور اپنی میز کی دراز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی سب تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ ماں کے جھمکے تمہاری کھوئی ہوئی یادداشت کو واپس لے آئیں گے۔“

وہ ہراساں نظر سے ادھر ادھر ہنکنے لگا۔ میں نے میز کی دراز کے اندر سے فیروزے والا وہ لاکٹ برآمد کر لیا جو جائے وقوعہ سے مجھے ملا تھا اور اس میں جڑا ہوا فیروزہ چٹنا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لاکٹ انہی حملہ آوروں میں سے کسی کا تھا جنہوں نے جاوید کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے مذکورہ لاکٹ کو بھولا کی آنکھوں کے سامنے لہراتے



میں نے گزشتہ روز ایک اہلکار کو اس کی کڑی نگرانی کے لیے لاہور روانہ کیا تھا لیکن اب حالات نے جو کروٹ لی تھی اس کی روشنی میں ساجد کو فی الفور گرفتار کر کے یہاں لانا ضروری تھا لہذا میں نے دو افراد کی ٹیم کو ساجد کی گرفتاری کے لیے فوراً لاہور روانہ کر دیا۔

پندرہ اکتوبر کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ کیس اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ ناصر نے قادر اور فرید کی گرفتاری کے لیے جن اہلکاروں کو روانہ کیا تھا، وہ دوپہر تک کامیاب واپس آ گئے۔ قادر اور فرید کی ٹھیک ٹھاک چھتروں کے بعد ان کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ انہوں نے بھولا کے شریک جرم ہونے کا اقرار کر لیا تھا۔ انہیں بھی بھولا کے ساتھ ہی حوالات میں بند کر دیا گیا۔

لاہور جانے والی ٹیم لگ بھگ پانچ بجے واپس آئی اور اپنے ساتھ ساجد کو بھی لائی، میں نے ساجد کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور کرخٹ لہجے میں کہا۔

”تم نے جن تین افراد کو پیسے دے کر جاوید کے قتل کا فریضہ سونپا تھا، وہ اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہیں۔ انہوں نے تمہارے جرم کی قلعی کھول دی ہے۔ تم اپنی حمایت میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

”میں نے بھولا، قادر اور فرید کو حوالات میں بیٹھے دیکھ لیا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ان میں سے میں صرف بھولا کو جانتا ہوں۔ باقی دونوں بھولا کے ساتھی ہیں۔ ان کے نام مجھے آپ سے معلوم ہوئے ہیں اور میں نے آج پہلی مرتبہ انہیں دیکھا ہے اور جہاں تک اپنی حمایت میں کچھ کہنے کی بات ہے تو.....“ لسانی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں بہت بد قسمت ہوں۔ میں نہ تو نرگس کو حاصل کر سکا اور نہ ہی اسے جاوید کے ظلم و ستم سے بچانے میں کامیاب ہو سکا.....“

”کامیاب تو تم ہو چکے ساجد۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جاوید کی موت کے بعد نرگس آزاد ہو چکی ہے۔“

”وہ تو آزاد ہو چکی ہے.....“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”لیکن میری آزادی چھن گئی ہے۔ اگر بھولا نہ پکڑا جاتا تو آپ کبھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔“

ایک لحاظ سے وہ درست ہی کہہ رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میں نے اس کی نگرانی کا کامل بندوبست کر رکھا تھا، میں نے اس سے پوچھا۔

میں بتایا۔ ”اس نے اپنے دوستاچیوں کی مدد سے بارہ اکتوبر کی سہ پہر چک بتی کے قریب کچے راستے پر جاوید پر لٹھیوں سے حملہ کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ان کے وار ایسے زوردار تھے کہ جاوید کو اپنی حفاظت کا موقع ہی نہیں مل سکا اور وہ چند لمحات ہی میں اپنی جان کی بازی ہار گیا۔“

”کیا بھولا نے اپنے دونوں ساتھیوں کے نام بھی بتائے ہیں؟“

”جی بتائے ہیں۔“ کانٹیل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ان میں سے ایک کا نام قادر اور دوسرے کا نام فرید ہے۔ میں نے بھولا کی نشان دہی پر قادر اور فرید کی گرفتاری کے لیے دو اہلکاروں کو روانہ کر دیا ہے۔“

”شاباش!“ ناصر اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر چکا تو میں نے تعریفی انداز میں اس کی ”پھرتی“ کو رابا۔

ایک لحاظ سے جاوید کے قتل کا معاملہ ہو چکا تھا۔ اگر بھولا نے اقبال جرم کر لیا تھا تو اس کے شریک جرم ساتھیوں قادر اور فرید کو پکڑنا زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس کیس کا ایک پہلو ابھی تک تشنہ تھا۔ مجھے اس سوال کا بھی جواب چاہیے تھا کہ انہوں نے جاوید کی جان کیوں لی؟

میں نے ناصر سے پوچھا۔ ”کیا بھولا نے بتایا کہ ان لوگوں کی جاوید سے کیا دشمنی تھی؟“

”براہ راست ان کی جاوید سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”یہ کام انہوں نے پیسوں کے لالچ میں کیا ہے۔“

”پیسوں کے لالچ میں.....؟“ میں چونک اٹھا۔ ”کس نے انہیں پیسے دیے تھے..... جاوید کا اصل دشمن کون ہے؟“

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”ساجد.....!“

”اوہ.....“ میں گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ”وہی ساجد تاجس کا تعلق چک بتی سے ہے اور وہ لاہور میں نوکری کرتا ہے؟“

”جی بالکل وہی۔“ کانٹیل نے سر کو اشیاتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”بھولا نے اسی کا نام لیا ہے۔“

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا..... تو گویا رحمت بی بی کا دعویٰ درست تھا۔ جاوید کے قتل کا ذمہ دار ساجد ہی تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تو جاوید کی جان نہیں لی تھی لیکن یہ قتل اسی کے ایما پر ہوا تھا لہذا وہ اس قتل کی واردات میں برابر کا شریک تھا۔



”ساجد! کیا تمہیں یقین تھا کہ جاوید کے قتل کے بعد نرگس تم سے شادی کے لیے تیار ہو جائے گی؟“

”میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”اگر وہ راضی ہو جاتی تو میں اپنی قسمت پر رشک کرتا اور اگر اس بار بھی ادھر سے مجھے انکار ہی سننے کو ملتا تو میں یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ..... کم از کم میں نے نرگس کو جاوید، رحمت بی بی اور خالدہ کے ظلم و ستم سے تو نجات دلادی۔ وہ گھر نرگس کے لیے کسی جہنم سے کم نہیں تھا۔“

ساجد کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ ”تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی کہ جاوید کا گھر نرگس کے لیے دوزخ سے کم نہیں تھا؟“

میرے سوال پر وہ جزبہ ہو کر رہ گیا۔

”نرگس کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کی زندگی تو روز اول ہی سے سپردِ عذاب تھی۔ پھر تمہیں چھ سال کے بعد اسے جہنم سے نکالنے کا خیال کیوں آیا۔ کیا اب تک تم بھنگ پی کر سو رہے تھے؟“

”مجھے ایک ماہ پہلے ہی نرگس کے حالات کی خبر ہوئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”جب میں چک بتی آیا تھا۔“

نرگس کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ سسرال میں اس پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے جا رہے تھے، اس کی صدا پہلی مرتبہ چک بتی میں چار روز پہلے دس اکتوبر کو اس وقت گونجی تھی جب خورشید بیگم نے خیر دین اور صفیہ بی بی یعنی نرگس کی ماں کو اس کی پتا سنائی تھی۔ دس اکتوبر سے پہلے چک بتی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ قصبہ جلال پور میں پچھلے چھ سال سے نرگس کن حالات کا شکار ہے۔ پھر ایک ماہ پہلے ساجد کو کس نے ان حالات کی خبر دی؟

یہی سوال میں نے جب ساجد سے کیا تو اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔

”نرگس کے حالات کے بارے میں مجھے خورشید بیگم نے بتایا تھا۔“

خورشید بیگم کو ساجد کے جواب کے بعد شامل تفتیش کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اسے تھانے بلا لیا۔ پچھلی بار میں نے اس کے گھر میں تیرہ اکتوبر کی شام اس سے ملاقات کی تھی اور اس کے یہ الفاظ ابھی تک میرے ذہن میں نقش تھے..... تھانے دار صاحب! جب مجھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا ہو تو پھر انگلی کو ٹیڑھا تو

کرنا ہی پڑتا ہے نا!

گویا خورشید بیگم نے نرگس کو اس جہنم سے نکالنے کے لیے دو مرتبہ اپنی انگلی ٹیڑھی کی تھی۔ پہلی بار ایک ماہ پہلے جب اس نے ساجد کو اس کے حالات سے آگاہ کیا تھا اور دوسری مرتبہ چار دن پہلے جب اس نے نرگس کے ماں باپ کو ساری کہانی سنائی تھی۔

خورشید بیگم تھانے پہنچی تو اس کے چہرے پر ڈر اور خوف کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

”تو اس سارے کھیل میں تم نے اہم کردار ادا کیا ہے؟“

اس وقت میرے اور خورشید بیگم کے سوا کمرے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔

”تھانے دار صاحب! میں تو سب سے پہلے شکایت لے کر آپ ہی کے پاس آئی تھی لیکن آپ نے میری بات کا یقین ہی نہیں کیا تھا.....“

”جب میں نے تمہاری خواہش کے مطابق رحمت بی بی، خالدہ اور جاوید کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تو تم نے خود تھانے دار فی بننے کا فیصلہ کر لیا..... ہیں نا۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سوچا کھی سیدھی انگلی سے تو نکل نہیں رہا، اب انگلی کو ٹیڑھا کرنا چاہیے۔“

”میں نے جو کچھ کیا، خلوص نیت سے کیا ہے۔“ وہ بے خوف لہجے میں بولی۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ساجد، جاوید کو قتل کرادے۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ ساجد کسی طرح نرگس کو اس جہنم سے نکالے۔ ساجد نے کرائے کے قاتلوں کی مدد سے جو کچھ کیا، یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ میں اس کے اعمال کی ذمہ دار نہیں ہوں۔“

ساجد کے اقبالِ جرم کے بعد میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جاوید نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے۔ یہ سب حکمِ ربی سے ہوا تھا لیکن میں اس وقت کے ذمہ داروں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے ساجد، بھولا، قادر اور فرید کو جاوید کے قتل کے الزام میں حوالہ عدالت کر دیا۔

میں نے خورشید بیگم کو بھی ایک سزا دی تھی لیکن میں آپ کو بتاؤں گا نہیں کہ وہ سزا کیا تھی۔ ذہین قارئین اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔

(تحریر: حسام بٹ)



زوردار آواز آئی۔ گولی کی آواز..... اس آواز کو سنتے ہی وہاں موجود لوگوں میں افراتفری پھیل گئی۔ گولی مارنے والا باہر کے گیٹ کی جانب بھاگا جسے گیٹ پر موجود گن مین نے پکڑ لیا اور کمال مہارت سے اس کے ہاتھ میں موجود پستل

گفتگو کی جھنجھٹ میں..... لوگوں کے ازدحام میں ایک کمزور سی آواز ابھری تھی۔ ”اس سے پستول چھین لو..... یہ مجھے مار ڈالے گا.....“ مگر اس شور میں یہ آواز دب کر رہ گئی اور ایک

## ایک بلیک میلر کی खाغت کی شرانگیزی اور عبرت ناک انجام

انسانی فطرت اتنی الجھی ہوئی اور سخت ہو گئی، خدا کی قدرت اس بات کو پہلے سے جانتی تھی تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے زندگی، موت اور رزق جیسے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے... اس کے باوجود کچھ لوگ، دوسروں کو حلال رزق کمانے کے لئے میں رکاوٹیں ڈال کر اپنی برتر حیثیت اور اختیارات کی دھاک بٹھا کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی جیسا کرنے پر اسے مجبور کر دیا گیا... لیکن وہ ایسا نہ کرتی تو پھر ویسا ہو جاتا جیسا وہ شاطر چاہتا تھا۔

## بندگلی

علی اختر





بھی چھین لیا۔  
دوسرے لوگ اس کے اونچی آواز میں چلانے سے اندازہ لگا لیتے کہ وہ کس انداز میں بات کرنے کا عادی تھا۔

اس کے علاوہ وہ ہر وقت نشے میں رہنے کے سبب اول فول بکنے اور فحش و لچر گفتگو کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اسے کام لینے کے لیے افسران کو خریدنے کا فن بھی آتا تھا۔ اس کے جاننے والے جانتے تھے کہ اس کام میں وہ خوب صورت کال گرلز اور کاروباری لڑکیوں کو بھی افسران بالاسک پہنچانے سے گریز نہ کرتا۔

بینک اور خصوصاً اس برانچ میں لڑکیاں بھی ملازمت کرتی تھیں جن سے اس کے تعلقات بڑے اچھے طریقے سے قائم تھے۔ گھریلو جھگڑے کی بازگشت اب اس کے ساتھی ملازمین تک بھی پہنچ چکی تھی۔ رشید یونین میں ہونے کی وجہ سے ہر وقت اپنی حفاظت کے لیے پستول ساتھ رکھتا تھا چونکہ ملازمین کی جامہ تلاشی نہیں لی جاتی تھی۔ اس لیے حمید بھی اسلحہ بینک میں بغیر کسی روک ٹوک کے لے کر آتا تھا۔ چونکہ دونوں اسلحہ رکھتے تھے اور رشید کو پستول نکالنے میں تھوڑی دیر ہوتی تھی اس لیے حمید نے اپنا کام دکھا ڈالا۔

سجاد احمد نے ابتدائی اطلاعات کو ایک کاغذ پر لکھ لیا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ وہ اس کیس کے باقاعدہ اندراج کے بعد اگلی کارروائی کا آغاز کرے گا۔ اگلے ہی دن بینک میں اسپتال سے اطلاع ملی کہ رشید زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا ہے۔ اب قتل کی باقاعدہ تفتیش مرحوم کی نوجوان بیوی پر یہ کہ اندراج پر چرچ کی مدعیت میں ہونے لگی تھی۔ اسی روز ہتھکڑیوں میں چکڑے ہوئے حمید کو ایک بار پھر تفتیش کے لیے بینک کی برانچ میں لایا گیا اور اس سے باقاعدہ تفتیش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس وقت برانچ میں بینک کے اعلیٰ عہدیدار بھی موجود تھے۔ حمید کی آنکھوں میں خوف ضرور جھلک رہا تھا مگر اس کی باڈی لینگویج سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے اپنے اقدام پر قطعاً کوئی شرمندگی نہیں۔

”آپ جانتے ہیں کہ قتل ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے بینک کے کچھ ملازمین کو بیانات کے لیے پولیس اسٹیشن بلا یا جاسکتا ہے۔“ سجاد احمد نے دوران چائے نوشی آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے افسران اعلیٰ سے کہا۔  
”ہمیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن ناجائز دباؤ اور کسی قسم کی تشددانہ کارروائی سے گریز کیا جائے۔“ انہوں نے کہا۔

”اگرچہ اصل قاتل ہماری حراست میں ہے لیکن پھر بھی..... یہ سب ضروری ہوتا ہے۔ آپ تو سمجھتے ہی ہیں۔“

زخمی کو دو آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے جانے لگے۔ اس کا خون بہہ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے جہاں شور تھا وہاں اب معمول کا کام شروع ہو گیا تھا۔ یہ ساری کارروائی ایک مشہور بینک کی مین برانچ میں ہوئی تھی۔ برانچ منیجر پریشانی کے عالم میں اپنے کیمپن سے نکل کر واردات کی جگہ پہنچا تھا۔ یہ ایک بڑی برانچ کا وسیع و عریض ہال تھا۔ وہیں یہ تمام کارروائی ہوئی تھی۔ گولی چلانے اور زخمی ہونے والے دونوں بینک کے ملازم تھے اور آپس میں بھائی بھی تھے۔

برانچ منیجر عرفان بیگ نے فوری طور پر مقامی پولیس اسٹیشن میں اس کی اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس کے چند سپاہی اور آفیسر سجاد احمد تفتیش کے لیے برانچ میں آ گئے۔ پولیس انسپٹر سجاد احمد کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ذہین نوجوان ہے اور اپنے کام میں مہارت رکھتا ہے۔ اس نے آتے ہی اس مخصوص جگہ کا معائنہ کیا جہاں کچھ دیر پہلے زخمی رشید اور حمید میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے ایک سپاہی نے جائے واردات کا نقشہ بنایا اور پھر کچھ عینی شاہدین کو منیجر کے کمرے میں بلا کر ان کے بیانات لیے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان گھریلو جاکد کا تنازعہ کافی عرصے سے چل رہا تھا۔ جس کے بارے میں کچھ کچھ خبریں اس کے ساتھی ملازمین تک بھی پہنچتی رہی تھیں اور آج اس کا نتیجہ اس جھگڑے کی صورت میں ہوا۔ زخمی رشید بینک کی مقامی یونین کا آفس سیکریٹری تھا اور اس کے تمام بڑے افسران سے ذاتی تعلقات اس لیے بھی قائم تھے کہ وہ نہ صرف مقامی ٹریڈ یونین کا عہدیدار تھا بلکہ اسے تعلقات بنانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ اس لیے بھی افسران اس سے خاصا دبتے تھے۔ حمید اس کا سگا بھائی تھا اور عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔

والد کے مرنے کے بعد سے لے کر اب تک ان دونوں میں جاکد کے بیواری کا جھگڑا چل رہا تھا اور رشید اپنی متکبرانہ طبیعت کے باعث اس بیواری کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ویسے بھی رشید اپنے مکارانہ رویے کے باعث پورے بینک میں بدنام تھا۔ اونچا لانا قد، اس پر بڑی بڑی اور بے ہنگم موچھیں، ہر وقت نشے میں دھت رشید جب کسی کام کی غرض سے بینک کے اعلیٰ عہدے داروں کے کمروں میں جاتا تو اپنے بوٹ کی نوک سے دروازہ کھولتا اور بغیر اجازت کمرے میں چلا جاتا اور پھر باہر کھڑے



سجاد احمد نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنے ساتھی سپاہی کی طرف دیکھا جس نے اپنی بیلٹ کے ساتھ بندھی ہوئی ہتھکڑی کو سنبھالتے ہوئے حمید کو اٹھایا اور ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی مقتول کے جسم کے ساتھ لگا کر چلائی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے گولی کا زہر پورے جسم میں انتہائی سرعت کے ساتھ پھیل گیا تھا اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے دورانِ آپریشن مقتول مر گیا تھا۔ مقتول کے نزاعی بیان میں بھی اس کے گھریلو جھگڑے کا ذکر موجود تھا۔ اس سلسلے میں بینک کے اعلیٰ افسران کا دباؤ یہ تھا کہ چونکہ بینک ایک اعلیٰ اور شاندار روایات کا حامل نجی ادارہ ہے، لہذا اس کی شہرت کو نقصان پہنچائے بغیر اگر اس قتل کی انکوائری کر لی جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ سجاد احمد بھی اس بات سے پوری طرح متفق تھا لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی تھی۔ اخباری نمائندگان اور میڈیا کی شہر میں موجود ٹیمیں ہر وقت ادھر ادھر دندناتی پھرتی ہیں۔ اس لحاظ سے سجاد احمد دہرے دباؤ کا شکار تھا..... اوپر سے جب سجاد احمد مقتول کے گھر اس کی بیوہ سے بیان لینے پہنچا تو اس کے ساتھ بھی اخبارات کے مقامی نمائندے موجود تھے۔

”کیا آپ کے نزدیک یہ صرف جامدات کی تقسیم کے شاخسانے میں کیا جانے والا قتل ہے یا اس کے عوامل کچھ اور بھی ہیں.....؟“ ایک تیز طرار اخباری نمائندے نے سجاد احمد کو وہاں موجود پانچ سوال کیا۔

”ہو سکتا ہے، لیکن جب تک تفتیش نہیں مکمل ہو جاتی، کچھ کہا نہیں جاسکتا.....“ سجاد احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرے خیال میں جب سے آپ کی تعیناتی اس اسٹیشن میں ہوئی ہے، یہ یہاں کا پہلا کیس ہے اور سنا ہے کہ آپ ایسے اندھے قتل کو حل کرنے میں خاصی مہارت اور شہرت رکھتے ہیں۔“ ایک اور نمائندے نے پوچھا۔

”یہ تو سب اوپر والے کا کرم ہے۔ میں ہر قتل کو کسی مجرم کا..... یا بے گناہ کا قتل نہیں سمجھتا بلکہ انسانیت کا قتل سمجھتا ہوں جو کہ میرے نزدیک ایک گناہ و ناجرم ہے۔ ابھی تو اس کیس کی ابتدا ہے، آگے دیکھیں.....“ سجاد احمد نے جان چھڑائی۔

رشید کے گھر میں تعزیت کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ سجاد احمد نے مقتول کی بیوہ پر یہ تک رسائی حاصل کرتے

ہوئے اسے الگ لے جا کر بیان دینے کے لیے کہا۔ گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا گیا اور سجاد احمد کو ادھر بلا لیا گیا۔ ایک اونچے لمبے قد کی سرخ و سپید رنگت اور تھکے نقوش والی، آئیڈیل جسمانی خطوط کی حامل بڑی بڑی گہری نیلی آنکھوں والی نوجوان خاتون بیٹھک میں داخل ہوئی تو سجاد احمد نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

اس کی گہری نیلی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سو جی ہوئی تھیں۔ چہرے پر غم کی پرچھائیں موجود تھیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ سجاد احمد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو سجاد احمد نے گفتگو شروع کی۔

”مجھے آپ کے خاوند کے قتل کا افسوس ہے۔ مجھے اس سلسلے میں آپ سے معلومات درکار ہے۔ آخر وہ کیا معاملہ تھا جس کا سبب اس کے قتل تک آپ پہنچا؟“ سجاد احمد نے رکتے رکتے اپنے آنے کا سبب بتایا۔ پھر پریشہ کی حالت دیکھتے ہوئے مزید کہا۔

## پاکستان

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں تمہارے خزاں کی..... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی اگست کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

اگست 2016ء

سپنس ڈائجسٹ



سے بھی اس کے تعلقات قائم تھے۔ "سجاد احمد نے آہستہ آہستہ اپنا مقصد واضح کیا۔

"ہوں گے..... کون سے مرد کے ایسے تعلقات نہیں ہوتے۔ ہر بندہ چاہے گھر میں پری ڈال رکھے، لیکن باہر جھک ضرور مارتا ہے اور اگر رشید کے تعلقات باہر ہوں گے تو مجھے اس سے غرض نہیں تھی..... کہ میری تمام ضروریات کا وہ بے حد خیال رکھتا تھا۔" اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

وہ ابھی سوال جواب کر رہے تھے کہ ایک ہلکی سی دستک کے ساتھ بند دروازے کو کھولا گیا اور ایک خوب صورت نوجوان..... جس کے بڑے بڑے بال اس کے کندھے پر گر رہے تھے، اندر داخل ہوا۔ اس نے چٹلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ نفیس لباس اور اس کی بولتی آنکھیں بتا رہی تھیں جیسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ بہت پریشان ہو رہا ہو..... اور اسی لیے وہ جلدی اور پھرتی سے ادھر بٹھک میں آیا ہو جہاں سجاد احمد اور پریسہ بیٹھے تھے۔

تیزی سے اندر داخل ہو کر اس نے تجسس نظروں سے سجاد احمد کی طرف دیکھا اور پریشانی میں اپنا ہاتھ مصالغے کے لیے بڑھا دیا۔

"سجاد احمد....." اس نے بھی اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دراصل میں اس قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور اسی سلسلے میں یہاں بیٹھا ہوں۔" سجاد نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ..... دخل اندازی کی معذرت..... دراصل باہر کچھ خواتین ان سے افسوس کرنے آئی تھیں۔ اس لیے....." اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے واپس پلٹنا چاہا۔

"کوئی بات نہیں..... چاہیں تو آپ ادھر بیٹھ رہیں۔" سجاد احمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک متوحش سی جھلک اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نظر آئی۔

سجاد احمد نے اپنی پیشہ ورانہ ذہانت کے سبب اسے نوٹ کرتے ہی پریسہ کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورت اور نیلی آنکھوں میں بھی اسے کچھ ایسا ہی ارتعاش نظر آیا۔ لگتا تھا جیسے اسے یہاں بے سبب آنے کی وجہ سے خلجان سا ہونے لگا تھا۔

"یہ میرے کزن ہیں....." پریسہ نے اپنی پریشانی پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"میں چلتا ہوں۔" وہاج افضل نے کہا اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

"میں جانتا ہوں کہ اگرچہ آپ اس وقت گہرے رنج سے گزر رہی ہیں لیکن کچھ سوالات پوچھنا بھی ضروری تھے۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔" سجاد احمد نے مزید توجیہ دے دی۔

"جی پوچھیے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کیا حمید کی فیملی بھی آپ کے ساتھ ہی رہتی ہے؟"

"جی....." مختصر جواب دیا گیا۔

"وہ کدھر..... میرا مطلب ہے، ان کے کمرے الگ سے تھے؟"

سجاد احمد نے بات بدلی۔

"گر بیجویشن کیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں..... تو کیا بتا رہی تھیں آپ....." سجاد احمد نے دوبارہ پوچھا۔

"ہم مشترکہ خاندانی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔ حمید کی بیوی ہمیشہ اسے یہاں سے الگ کرنے کے بارے میں اکساتی رہتی تھی اور جب سے میرے سرفوت ہوئے ہیں، یہ جھگڑے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔"

"کیا وہ لوگ پُرسے کے لیے ادھر آئے ہیں؟" سجاد احمد نے سوال کیا۔

"نہ جی..... جب سے انہوں نے اس بارے میں سنا ہے وہ تو وہ..... خود حمید کی بیوی بھی ادھر سے غائب ہیں۔ وہ لوگ سنا ہے گھر بار کوتالے ڈال کر کہیں اور جا چکے ہیں۔"

پریسہ نے رک رک کر جواب دیا۔

"آپ کے اپنے شوہر کے ساتھ کیسے تعلقات تھے..... اور آپ کے شوہر کیسے انسان تھے؟" سجاد احمد نے سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جیسے ایک شوہر کے اپنی بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ذرا میری طرف دیکھ کر جواب دیں۔" سجاد احمد بولا۔

اس نے اپنی ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ.....؟"

"میں نے سنا ہے، وہ نشہ کرتا تھا اور بازاری عورتوں



## احمق

ایک لکھ پتی نے اپنی بیٹی کے امیدوار سے شادی کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم میری بیٹی سے اس وقت بھی محبت کرو گے جب میں اسے تمام جائیداد سے عاق کر دوں گا؟“

”ہاں یقیناً.....“ نو جوان نے جواب دیا۔  
”تم جاسکتے ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“  
لکھ پتی نے کہا۔  
”اپنے فیصلے سے مجھے بھی آگاہ کر دیجیے گا۔“

”میں ابھی تمہیں آگاہ کر دیتا ہوں کہ میں اپنے خاندان میں کسی احمق کا اضافہ نہیں کر سکتا۔“  
انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

سجاد احمد نے ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

”روزنامہ فٹ پاتھ کا کرائم رپورٹر امانت علی بول رہا ہوں۔ کیسے کیسے ہیں؟“ اس کی آواز میں بڑی کھٹک تھی۔  
اس نے مزید کہا۔ ”سنا ہے، دوسرے پولیس والوں کی طرح آپ اس کیس میں لیت و لعل سے کام لے رہے ہیں اور اپنی کوششوں سے اسے بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

اس کی بات سن کر سجاد احمد کو غصہ آ گیا۔  
”کون سے کیس کی بات کر رہے ہو تم..... اور تمہیں کم از کم تصدیق سے پہلے الزام لگانے کا حق کس نے دیا ہے۔“

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بولا گیا

”ارے صاحب..... ناراض ہو گئے..... آپ تو ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو دھو کر صاف رکھنے میں مشہور ہیں اور ماشاء اللہ پیچھے کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتے..... میں دراصل رشید کیس کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے چبا چبا کر کہا۔  
”اس کی تفتیش جاری ہے..... پھر اصل مجرم ہمارے پاس ہے اور صاف بات ہے کہ قتل اسی نے کیا ہے۔“ سجاد احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تھانیدار جی..... سکے کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ہی رخ کو نہیں دیکھتے رہنا چاہیے۔“ امانت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”دیکھیے..... کیس ابھی شروع ہوتا ہے، ممکن ہے، اس سلسلے میں مجھے کئی بار ادھر آنا پڑے۔ آپ کو ناگوار تو نہیں گزرے گا؟“ سجاد احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”دراصل مجھے یہ کام اپنے پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر کرنا چاہیے لیکن چونکہ آپ کا تعلق ایک شریف اور معزز فیملی سے ہے اس لیے میں آپ کو ادھر نہیں بلانا چاہتا.....“

”نہیں..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... آپ جب چاہیں..... مجھے فون کر دیں، یہ میرا سیل نمبر ہے.....“ اس نے ایک چھوٹی چٹ پر نمبر لکھ دیا اور خود بھی اٹھ گئی۔

سجاد احمد کی پیشہ ورانہ تربیت اسے بتا رہی تھی کہ اس قتل کے محرکات میں ایک سبب تو جائیداد کی تقسیم ہو سکتا ہے مگر اس کے پیچھے اور بھی خدشات سر ابھار رہے تھے کیونکہ جب وہاج افضل بیٹھک میں داخل ہوا اسی وقت مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں بے کلی سی اتر آئی تھی اور یہی حیرانی وہاج کی آنکھوں سے بھی جھانک رہی تھی۔ سجاد احمد کو اسی وقت ایک شک سا گزرا تھا کہ ممکن ہے اس قتل کا محرک کچھ اور بھی ہو..... مگر یہ سوچ اس وقت دم توڑ جاتی تھی، جب اس کا قاتل خود پولیس کی تحویل میں تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ واپس تھانے آ گیا۔ تھانے آ کر اس نے ابتدائی رپورٹ کے مطابق حمید کے خلاف پرچہ کاٹا اور اگلے دن اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ لے لیا۔

☆☆☆

روزنامہ ”فٹ پاتھ“ اپنی زرد صحافت کی وجہ سے شہر بھر میں بدنام تھا جو وقتاً فوقتاً اپنی مطلب برآری کے لیے کسی نہ کسی سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کے خلاف کالم لکھتے، خبریں لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور اس سے بچنے کے لیے ان اداروں کے لوگ اسے اپنی بدنامی کے خوف سے منہ مانگی رقوم دے دیتے تھے۔ اس کے نمائندے شہر میں دندناتے پھرتے تھے اور وہ جس کام کے بھی پیچھے لگ جاتے تو جب تک ان کے مقاصد حاصل نہ کر لیتے اطمینان سے نہ بیٹھتے تھے۔ اس کیس میں بھی یہی ہوا..... جس ادارے میں یہ قتل ہوا تھا، اس کو بدنام کرنے کی سکت تو شاید اس روزنامے کے بس کی بات نہ تھی لیکن پولیس کو اپنے مقصد کے استعمال میں انہوں نے پورا زور لگا رکھا تھا۔

حمید کے ریمانڈ کی خبر ان تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لہذا اسی روز جب سجاد احمد اپنی ڈیوٹی پر آ کر بیٹھا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔



”تم خود کیوں نہیں تفتیش کر لیتے۔۔۔۔۔“ سجاد احمد نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

”جس کا کام اسی کو سامجھے۔۔۔۔۔ ہم تو صرف دھیان رکھتے ہیں، کہیں کوئی گھپلا نہ ہو جائے۔ آپ تو ناراض ہو گئے۔ ہم وقتاً فوقتاً آپ کو تکلیف دیتے رہیں گے۔ اگر آپ غصہ کرتے رہے تو ہمارا کام کیسے چلے گا۔ اللہ حافظ۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سجاد احمد غصے سے کچھ بڑبڑایا۔ پھر اس نے۔۔۔۔۔ گھنٹی بجائی تو ایک سنتری اندر آ گیا۔

”جی صاحب۔۔۔۔۔“

”اشرف کو بلاؤ اور اسے کہو۔۔۔۔۔ حمید کو لے کر آئے اور جب تک وہ میرے کمرے میں رہے کسی اور کو اندر نہ آنے دینا۔“ سجاد احمد نے کہا۔

”جی اچھا۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا اور کچھ دیر بعد اشرف، حمید کو لے کر آ گیا اور اس کو سامنے کھڑا کر دیا۔

رات بھر کے جاگنے اور مسلسل مارنے پینے سے اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا اور اس سے کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کیا بنا۔۔۔۔۔“ سجاد نے اشرف سے پوچھا۔

”یہ مان نہیں رہا۔۔۔۔۔“ اشرف نے کہا۔

”کیوں بے۔۔۔۔۔ جھگڑا تمہارا ہوا۔۔۔۔۔“ پستول تم سے برآمد ہو گیا۔ آلہ قتل پولیس کے پاس موجود ہے پھر بھی تم انکاری ہو؟“ سجاد احمد نے رک رک کر جرح کی۔

”یہ ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔۔ پستول میرے ہاتھ سے پکڑا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمارا جھگڑا بھی ہوا تھا لیکن صاحب کون ایسا بے درد ہو سکتا ہے کہ اپنے سگے بڑے بھائی کو جان سے مار دے۔۔۔۔۔“ اس نے لڑکھڑاتے الفاظ میں جواب دیا۔

”دیکھو۔۔۔۔۔ تمام شہادتیں اور گواہوں کے بیانات تمہارے خلاف ہیں۔ ان کے بارے میں تم کیا کہو گے۔۔۔۔۔“ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔۔۔۔۔ صاف صاف قبول لو۔۔۔۔۔ جاکنداد کے پیچھے تو روزانہ ہزاروں قتل ہوتے ہیں۔“ سجاد احمد نے دوبارہ پوچھا۔

”صاحب جی۔۔۔۔۔ آپ جس قسم کی چاہیں قسم لے لیں۔۔۔۔۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ میں نے قتل نہیں کیا۔“ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

”تمہارا جاکنداد کے علاوہ بھی کوئی جھگڑا تھا اور پھر ایسے جھگڑے تو گھر بیٹھ کر کسی بڑے کی یا پچپائی کے

ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ اس پر ایک ناحق جان کو مار ڈالنے سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ لعنت ہے تم پر۔۔۔۔۔“ سجاد احمد نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

”صاحب جی۔۔۔۔۔ میں ان پڑھ، جنونی یا جذباتی تو

ہوں نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا بلکہ اللہ

مجھے اس کی طرف سے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ ہتھ چھٹ اور

مکار طبیعت کا مالک ہے۔ کہیں اشتعال میں آ کر مجھے ہی نہ

مار ڈالے۔ اس لیے میں یہ پستول ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا

اور المیہ یہ تھا کہ ہم دونوں ایک ہی ادارے میں کام کرتے

تھے جہاں دن میں ہزاروں بار ایک دوسرے کے سامنے

آتے تھے بلکہ صاحب۔۔۔۔۔ میں نے تو یہاں سے اپنے

تبادلے کی درخواست بھی دے رکھی تھی جس کا ابھی فیصلہ نہیں

ہوا تھا۔ ہم تقریباً روزانہ رات کو جاکنداد پر جھگڑتے تھے مگر

اس کا کوئی حل بھی رشید بھائی کو قبول نہ تھا۔ اللہ وہ مجھے اور

میری گھر والی کو گندی گندی گالیاں دیتا تھا اور کہتا تھا کہ

میری بیوی کے ناجائز تعلقات کسی کے ساتھ قائم ہیں جس کی

وجہ سے وہ مجھے اس سے الگ رہنے کا مشورہ دے رہی ہے،

حالانکہ خود اس کی بیوی۔۔۔۔۔ مگر چھوڑیں صاحب جی۔۔۔۔۔ میں

اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ جس طرح۔۔۔۔۔ کا مرضی اطمینان

کر لیں۔ میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ اس روز بھی جھگڑے کے

دوران اور مجھ سے ٹکڑا ہونے کے باوجود نہ جانے کس طرح وہ

نیچے گر گیا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا جو میں نے اس کی

سامنے کی طرف سے اس کے گردوں کے قریب لگا رکھا تھا

اور وہ چیخ رہا تھا کہ اس کے پاس پستول ہے، اس سے چھین

لو۔۔۔۔۔ یہ مجھے گولی مار دے گا۔ اس کی آواز سن کر کچھ لوگوں

نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر میرا اگر بیان اس کے

ہاتھ میں تھا، اسی چھینا جھپٹی میں ایک گولی چلی۔۔۔۔۔ اس

اچانک آواز سے میں ڈر گیا تھا۔ شاید یہ میرے پستول ہی

کی گولی ہو۔۔۔۔۔ میں نے یہ سوچ کر باہر کی جانب بھاگنا چاہا

تو چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا اور مجھ سے پستول بھی چھین لیا۔“

وہ چپ ہوا تو سجاد احمد طنز یہ لہجے میں بولا۔

”لگتا ہے ڈرائنگ روم کی سیر نے بھی تمہیں سچ بولنے

پر نہیں اکسایا۔ ابھی کوئی کسر باقی ہے۔ سوچ لو۔۔۔۔۔ یہاں تو

آ کر پتھر بھی بولنے لگتے ہیں تو، تو پھر بندہ ہے۔ جاوئے

اشرف سمجھا اسے۔۔۔۔۔ اور لے جا۔۔۔۔۔ ابھی ریمانڈ ختم ہونے

میں دس روز باقی ہیں۔ دس دن کا مہمان ہے یہ۔۔۔۔۔

کوشش کر دیکھ۔ اگر نہ مانا تو سجاد احمد کی سبکی ہوگی۔ ساری

شہرت داغ دار ہو جائے گی۔“



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





ان کے نکلنے کے بعد ایک بار پھر فون کی کھنٹی بجنے لگی۔

سجاد احمد نے فوراً ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے تحکمانہ آواز آئی۔

”ملک قیصر بول رہا ہوں۔ تمہارے حلقے کا ایم این اے.....“

”جی سر..... جی سر..... کیسے ہیں آپ..... جی میں سن رہا ہوں.....“ سجاد احمد نے روایتی جملوں سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔

”یہ میرے قریب میرے نہایت عزیز اور بھائی وہاج افضل بیٹھے ہیں۔ ادھر تمہارے قریبی بینک کی ایک شاخ میں قتل ہو گیا ہے۔ سنا ہے قاتل بھی تمہاری گرفت میں ہے۔ جائداد وغیرہ کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا یا..... اے جلد از جلد فارغ کر دو..... اور ذرا مضبوط کیس بنا کر قانون کے حوالے کر دو..... رعایت نہیں برتنی..... سنا تم نے.....“ اسی رعب دار آواز میں کہا گیا۔

”مگر سر..... ملزم تو انکاری ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا۔“ سجاد احمد نے آہستگی سے جواب دیا۔

”وہاٹ..... وہاٹ..... ٹ!“ اس نے رک رک کر تیز لہجے میں کہا۔ ”آلہ قتل کے برآمد ہونے اور رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے پر بھی وہ کس طرح اس قتل سے انکار کر سکتا ہے۔ دیکھو..... ذرا دھیان سے اس کیس کو ہینڈل کرو..... اور پسماندگان کے ساتھ پوری طرح انصاف ہونا چاہیے۔“

ادھر سے تحکمانہ لہجے میں کیا گیا۔

”میں دلچسپی کے ساتھ اس کو ڈیل کر رہا ہوں سر!“ سجاد احمد نے بتایا۔

”اوکے..... کہیں کوئی سفارش اور رخنہ اندازی ہو تو مجھے بتانا۔“ یہ کہہ کر ایم این اے کا ٹیلی فون بند تو ہو گیا مگر سجاد احمد کے لیے ایک نئی کھڑکی کھول گیا..... ایک نئی راہ.....

پکی گواہیاں..... آلہ قتل کی موجودگی..... لیکن قاتل کا انکار..... یہ سب کیا تھا جو اسے آہستہ آہستہ اپنی زنجیر میں جکڑنے لگا تھا۔ اگلے روز وہ پھر پریسہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

☆☆☆

”ادارے سرکاری ہوں یا پرائیویٹ ان کے اپنے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں سر..... پھر ہم تو ملازم لوگ

ہیں۔ سارا سارا دن ہاتھ میں اسکیئر پکڑے آتے جاتے لوگوں کے جسموں پر پھیرتے رہتے ہیں۔ ہماری ذمہ داری تو آنے والے لوگوں سے کوئی ناجائز چیز پکڑنا ہوتی ہے، کوئی اسلحہ یا کوئی بھی مشکوک چیز تحویل میں لے لیتا یا اس کی نشاندہی ہوتی ہے مگر صاحب ادارے کے ملازموں کی تلاشی لینا تو ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر بڑے افسران ہمیں کہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں مگر آج تک کبھی کسی افسر نے ہم سے نہیں کہا۔“ بینک میں اس روز ڈیوٹی پر موجود گن مین زیارت خان نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

”تو کیا ہر ملازم نجی اسلحہ لے کر بینک کے اوقات میں اندر باہر آ جا سکتا ہے؟“ سجاد احمد نے جرح کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں جی..... اور پھر رشید تو بہت کمینہ قسم کا بندہ تھا جی..... اور معاف کریں، فوراً ماں بہن ایک کر دیتا تھا جی..... بڑے افسروں کی مونچھ کا بال تھا..... اس کی بیلٹ میں ہر وقت جدید اور اعلیٰ نسل کا پستول لٹکا ہوتا تھا اور وہ دن میں کئی کئی مرتبہ پرائیج میں آتا جاتا رہتا تھا.....“ زیارت خان ہر بات بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا۔

”زیارت خان! پھر..... تمہارا یہ اسکیئر پکڑ کر ہر وقت کھڑے رہتا تو بے کار ہوتا.....“ سجاد احمد نے پوچھا۔

”یہی سمجھ لیں جی..... ہمیں کہیں گے تو ہم اس پر عمل کریں گے۔“

”اس روز کیا ہوا تھا؟“ سجاد احمد نے اس سے پوچھا۔

”پتا نہیں جی، ہم تو ادھر گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اندر پرائیج میں شور مچا۔ میں بھی دروازے سے اندر آیا تو پتا چلا کچھ جھگڑا ہو گیا ہے اور پھر کسی نے بڑی تیزی سے کہا۔“

”گیٹ بند کرو..... بھاگنے نہ پائے..... میں نے فوراً گیٹ بند کر دیا..... حمید بھاگا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے اس سے چھیننا چاہا۔ پہلے تو اس نے مجھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی..... مگر میں نے اس پر چھپی ڈال لی اور اس سے پستول چھین لیا۔ اس کے بعد کچھ لوگ اس کے برادر رشید کو سہارا دے کر باہر لائے۔ بینک کی جیب میں اسے ڈالا۔ اس وقت اس کے جسم سے بے حد خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی کچھ اور لوگ اسے اسپتال دیکھنے دوڑ گئے۔ اسٹاف کا معاملہ تھا نا جی..... میں نے حمید کو منجر کے کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر پولیس آ کر اسے لے گئی اور پستول بھی میں نے ایک پولیس والے کو پکڑا دیا تھا۔ مجھے



کہ میرے شوہر کا قتل کسی اور نے کیا ہے۔“ اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

”جی..... اب تو کچھ کچھ مجھے بھی یقین سا ہونے لگا ہے کہ واقعتاً یہ قتل کسی اور نے کیا ہے۔ حمید تو صرف استعمال ہوا ہے.....“ سجاد احمد نے اس کی نیلی کجراحی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بتایا۔

”کیا..... کیا آپ کو پکا یقین ہے.....“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”دیکھیے مسز رشید..... ہم نے اپنا ہر حربہ اس پر استعمال کر کے دیکھ لیا۔ تھرڈ ڈگری انداز تفتیش بھی اس پر کارگر نہیں ہوا۔ اس کا صرف ایک ہی بیان ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا اور وہ اس سلسلے میں بے قصور ہے۔“

”کمال ہے..... اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ کی تفتیش ناکامی کا منہ دیکھتے جا رہی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی اور مزید کہا۔

”آپ جیسے ذہین، خوب صورت اور محنتی آفیسر کا یہ احساس شکست کچھ اچھا نہیں لگا۔“ اس نے طنز کے سارے تیر برسانا شروع کر دیے۔ تب اچانک سجاد احمد نے بھی پیئٹر ابدلا۔

”کبھی کبھی خوب صورتی کے آگے ہتھیار بھی کند ہو جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے تمام تر ہتھیار اور حربے اس نے ایک ہی بات کی ڈھال پر سہ ڈالے کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا.....“ سجاد احمد نے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک ہلکی سی خوفزدہ سوچ وہاں تیرتے ہوئے نظر آئی۔ ٹھیک اسی لمحے سجاد احمد نے چوٹ کی۔

”اگر آپ برانہ مانیں تو میں وہاں انقل کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ دیکھیے یہ بھی ہماری تفتیش کا ایک حصہ ہے۔ آپ کا خاوند قتل ہوا ہے اور قاتل لاکھاپ میں موجود ہے، جو اس سے انکاری ہے پھر تیسرا شخص کون ہے..... اسے میری طرح آپ کو بھی تلاش ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کو اپنے خاوند کے قتل کا اس قدر افسوس نہیں ہے جس قدر حمید کو سزا دلوانے میں آپ اور وہاں دلچسپی لے رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی کمزور پہلو ضرور ہے جو شک کی بنیادوں کو یقین کی دیواریں بنارہا ہے۔“ سجاد احمد نے دھیرے دھیرے کہا تو پریشانہ اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔

”انسپکٹر صاحب..... آپ کو ایک شریف عورت پر شک کرنے کی اجازت کس نے دی ہے۔“

نہیں پتا ان کے درمیان جھگڑا کس بات کا تھا یا کیا ہوا تھا بہر حال بُرا ہوا۔ کیا زمانہ آگیا ہے جی..... بھائی..... بھائی کے خون کا پیسا ہو گیا ہے۔“

زیارت خان کو اس سے بڑھ کر اور کچھ معلوم نہ تھا۔ اس لیے تفصیل کے ساتھ اس کا بیان قلم بند کرنے کے بعد اسے پولیس اسٹیشن سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

بے پناہ تشدد اور ہر حربہ استعمال کرنے کے باوجود حمید کا یہی بیان تھا کہ اس نے گولی نہیں چلائی۔ البتہ اس کا جرم اتنا ضرور تھا کہ اس نے اپنا پستول صرف ڈرانے کے لیے رشید کے جسم کے ساتھ لگایا تھا لیکن اس نے تو اپنی انگلی بھی ٹریگر سے باہر رکھی ہوئی تھی۔ مبادا جذبات میں آکر اس سے گولی نہ چل جائے۔

اس کے اس بیان نے پولیس کو محضے میں ڈال دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس نے گولی نہیں چلائی..... تو پھر گولی کس نے چلائی تھی..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی بالکل نزدیک سے چلائی گئی تھی۔

یہی سوچ کر اگلے دن سجاد احمد نے پریس کو تھانے بلایا تھا۔ کیس کو الجھتا دیکھ کر سجاد احمد نے نئے رخ سے اس کی تفتیش کرنا شروع کر دی تھی۔ محض اس خیال سے کہ شاید کوئی اور نشان کوئی اور کڑی مل جائے جس سے کیس درست سمت اختیار کر جائے کیونکہ قاتل حمید کا یہی بیان تھا کہ اس نے قتل نہیں کیا۔

پریس اس روز بڑا بن ٹھن کر پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے پہلی بار اس کے جو بن پر بہار آئی ہو۔ گو جس طرح کا سیاہ لباس اس نے پہن رکھا تھا، اس کی سوگواریت پر دلالت کرتا تھا مگر پہلی نظر میں دیکھنے والا کسی طرح بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ حال ہی میں قتل ہونے والے رشید کی بیوہ ہے۔

سجاد احمد نے اسے کمرے میں آتے دیکھ کر چڑا سی کو دروازہ بند کرنے کا کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے آکر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی اور پھر بڑے والہانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیا آپ آنے والوں کو بیٹھنے کا نہیں کہتے.....؟“

”اوہ میں بھول گیا..... معذرت خواہ ہوں۔ آپ بیٹھیں.....“ سجاد احمد نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

”شکریہ.....“ اسے لگا جیسے قیامت بیٹھ گئی ہو۔

”اتنے سارے شواہد کے ہوتے ہوئے اور قاتل کے ہاتھ سے آلہ قتل برآمد ہونے کے باوجود آپ کو لگتا ہے



”میرے اندازے کے مطابق ابھی تک کسی کو نہیں.....“  
اس نے روتے ہوئے بتایا۔  
”ٹھیک ہے، اب آپ گھر جائیں۔ کسی بھی وقت  
قانونی ضرورت کے تحت آپ کو دوبارہ بلایا جاسکتا ہے۔“  
سجاد احمد نے بتایا۔

”ہم حاضر ہیں.....“ پریس نے اپنے پرس سے ٹشو  
نکال کر اپنی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ایگزمن رپورٹ پولیس اسٹیشن میں اس کی میز پر  
پڑی تھی جس میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ پستول کے  
میگزین میں موجود گولیوں سے مقتول کو لگنے والی میچ نہیں  
کرتی۔ اگرچہ میگزین میں ایک گولی کم تھی مگر رشید کے جسم  
سے برآمد ہونے والی گولی ان سے میچ نہیں کرتی تھی۔ جس کا  
مطلب یہ تھا کہ حمید کا بیان سچ تھا کہ اس کے بھائی کے جسم  
سے نکالی جانے والی گولی اس کے پستول کی نہ تھی..... پھر یہ  
گولی کس نے چلائی تھی؟ کسی کو اس کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی  
تھی؟ حمید دوبارہ رہمانڈ پر پولیس اسٹیشن میں موجود تھا اور  
آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔

تب سجاد احمد نے ایک بار پھر اسے بلا کر پوچھا۔  
”دیکھو..... اگر تم قاتل نہیں ہو تو پھر اسے کس نے قتل  
کیا ہے؟ تمہیں کسی پر شبہ.....“

”یقین کریں صاحب جی..... میں بالکل نہیں  
جانتا..... کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ وہ عیاش طبع تھا اور  
بڑے لوگوں کو لڑکیاں بھی پیش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اسٹاف  
میں بھرتی ہونے والی لڑکیاں بھی اس کی پہنچ سے دور نہ  
تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اپنی ترقی کے خواب دیکھنے والی  
کچھ لڑکیاں کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ اکثر جب سیدھے  
ہاتھ سے کچی نہ نکلتا دیکھتا تو بڑے مذموم ہنسنڈے استعمال  
کرنے لگتا تھا۔ ہاں یاد آیا..... وہ پچھلے کچھ دنوں سے  
زوئیلہ..... جو کہ نئی نئی عارضی آفیسر بن کر اس برانچ میں آئی  
تھی اس کو ورغلا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان  
رہتی تھی۔ ایک روز اس نے بھائی رشید کی شکایت مجھ سے بھی  
کی تھی۔ تب میں نے اسے تو تسلی دے دی تھی کہ میں اس  
کے لیے کچھ کروں گا مگر اسے میری بزدلی جانیں کہ میں رشید  
بھائی سے کچھ نہ کہہ سکا..... زوئیلہ دہلی پتلی اور انتہائی خوب  
صورت لڑکی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے ہنستے ہوئے کہتی تھی۔

”حمید بھائی..... یہ حسن بھی بڑی زحمت ہے۔ یہ جس کو  
مل جائے اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ اب دیکھو اس

”دیکھیے محترمہ..... آپ نے بتایا کہ آپ کے اور  
مقتول رشید کے گھریلو تعلقات ٹھیک چل رہے تھے مگر  
میرے اندازے کچھ اور کہہ رہے ہیں۔“ بات کرتے  
کرتے سجاد احمد رک گیا۔  
”آپ کا کیا اندازہ ہے، میں نے جھوٹ کہا  
ہے.....“ پریس خوفزدہ ہو کر بولی۔

”جی ہاں..... یہی کہ آپ کے گھریلو تعلقات ٹھیک  
نہیں تھے۔ چونکہ آپ کا خاوند نہ صرف شراب کا عادی تھا  
بلکہ اس کے بازاری عورتوں سے تعلقات بھی تھے اور پھر  
سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر  
بڑے بڑے آفیسرز کو ان کی من پسند لڑکیاں بھی پیش کرتا  
تھا۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں.....“ سجاد احمد تھوڑی دیر کو رک  
پھر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا، تو اسے ایسا لگا جیسے پریس  
اندر سے کہیں ٹوٹ گئی ہو..... اس کی خوب صورت آنکھیں  
چھلک پڑیں۔

”آپ کا اندازہ درست ہے آفیسر..... رشید مجھے  
شروع سے ہی پسند نہ تھا لیکن چونکہ ہماری شادی ایک  
خاندانی معاملہ تھا اس لیے بڑوں کے فیصلوں کی صلیبوں پر  
ہم جیسی لڑکیوں کو چپ چاپ چڑھنا پڑ جاتا ہے جبکہ اس کے  
بجائے مجھے وہاں پسند تھا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت بھی  
کرتے تھے لیکن اسے آپ اور میں صرف تقدیر کہہ سکتے  
ہیں۔ میں رشید کی بیوی بن گئی۔ یہاں آکر جب میں نے  
رشید کا رویہ اور اس کی شہرت سنی تو اس نے مجھے اس سے  
بدظن کر ڈالا اور میرا جھکاؤ ایک بار پھر وہاں کی طرف ہو گیا۔  
اسی اثنا میں دونوں بھائیوں کے درمیان جانداد کا جھگڑا اٹھ  
کھڑا ہوا..... رشید اپنی حرکتوں کے سبب گھر میں بھی اکثر  
دیر سے آتا اور کئی بار تو وہ کسی بہانے گھر سے بھی کئی روز  
غائب رہتا تھا۔ اس کی مذموم حرکات کا اکثر و بیشتر مجھے علم  
ہو جاتا تھا۔ وہاں نے کئی بار مجھے اس سے خلع لینے کا مشورہ  
دیا مگر میں ٹال گئی لیکن آپ جس طرح مرضی اطمینان کر لیں،  
ہم حاضر ہیں کہ اس قتل میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں  
ہے۔“ پریس نے روتے ہوئے ہولے سے بتایا۔

”دیکھیں محترمہ..... مجھے آپ کے ذاتی معاملات  
سے کوئی غرض نہیں۔ میں نے تو اس قتل کا مسئلہ حل کرنا ہے۔  
جو میرے نزدیک ایک جیتے جاگتے انسان کا قتل ہے اور میں  
اس معاملے میں بہت دور تک بھی جاسکتا ہوں۔ بہر حال  
اب آپ جاسکتی ہیں، آخر میں..... میں یہ پوچھنا چاہوں گا  
کہ آپ کے اور وہاں کے تعلقات کا کس کس کو علم ہے؟“



## گنجائش

غور کیجئے تو مباحثے اور مناظرے کے لیے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں اور بحث و تکرار کے لیے اس سے بہتر طرز نشست ممکن نہیں، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو بھی آپس سے باہر نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ لدی پھندی چارپائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غیبت کرتے ہیں مگر دل برے نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ بھی جانتے ہیں کہ غیبت اسی کی ہوتی ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں اور کچھ یوں بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطع محبت ہے نہ گزارش احوال واقعی بلکہ محفل میں..... لبو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ.....

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمپاسے رہتے ہیں مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لیے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھڑائے کچر کچر لڑتی رہتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں، پھر لڑتے ہیں۔ عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں بحث کرتی ہیں۔ مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر یک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو گھڑا نہیں دیکھا۔ لیکن اس نوع کے نظریاتی مسائل میں اعداد و شمار پر بے جاذور دینے سے بعض اوقات عجیب و غریب نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ جس وقت مسلمانوں نے اندکس فتح کیا تو وہاں کے بڑے گرجا میں چوٹی کے مسیحی علماء و فقہاء اس مسئلہ پر کمال سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

ادارے میں مجھے جاب ملی تو میں خوش تھی کہ ایک معتبر ادارے میں ملازمت مل گئی ہے۔ اب میری عزت اور آبرو محفوظ رہے گی مگر یہاں بھی میرے ارد گرد بھوکے گدھے منڈلانے لگے ہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ میں استعفا دے دوں۔“

”میں نے اسے بے حد روکا..... مگر میرا اپنا بھائی اس کی عزت کے درپے ہو رہا تھا۔ اس روز بھی اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ اب تو اس کا جینا دو بھر ہو چکا ہے۔ دو ہی راستے ہیں اس کے پاس یا تو خودکشی یا پھر دوبارہ بے روزگاری.....“

”تمہارے بھائی نے کل مجھے وارننگ دی تھی کہ اگر اس کی بات نہ مانی تو مجھے اغوا کر لیا جائے گا کیونکہ اسے اپنا ایک ضروری کام نکلوانے کے لیے میری ضرورت ہے۔“ حمید نے آہستہ سے اسے بتایا تو اس کی سوچوں میں ایک دھماکا سا ہوا۔ وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے، لے جاؤ اسے اور صبح اسے عدالت میں پیش کر دینا۔ دوبارہ ریمانڈ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اب ایک نیا راستہ زونیلہ کی صورت میں اس کو دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے اگلے روز پولیس اسٹیشن آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بینک منیجر سے بات کی۔

”میں پولیس اسٹیشن سے سجاد احمد بول رہا ہوں۔“ اس کی آواز سن کر دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا، تب وہ دوبارہ بولا۔

”مجھے آپ کی برانچ کی پرویشری آفیسر زونیلہ سے قتل کی بابت سمجھ انکوائری کرنا ہے۔ آپ اسے کچھ دیر کے لیے پولیس اسٹیشن بھجوا سکتے ہیں۔ کہیں تو میں اس سلسلے میں لیڈی پولیس کو بھجوا دوں۔“

”ہاں..... ہاں بھجوا دیں لیکن احتیاط رہے کہ وہ سادہ کپڑوں میں ہو۔ پولیس کی وردی میں ہوگی تو ہماری بدنامی ہونے کے ساتھ ساتھ زونیلہ بھی گھبرائے گی۔ وہ ایک بہت شریف اور گھریلو قسم کی لڑکی ہے۔ اس کی ہر طرح کی ضمانت خود میں دینے کو بھی تیار ہوں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔“

”میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے یقین دہانی کرائی اور ایک لیڈی کانسٹیبل کو بینک بھجوا دیا۔

کچھ دیر بعد زونیلہ اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں موجود تھی۔ وہ خاصی خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا اب اس کا



سرخ و سپید رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ سجاد نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں اس کی اپنی شہرت پر کچھ آج آئے اور پھر اسے اس کی جوانی پر بھی ترس آ رہا تھا۔  
”یہاں جو بھی گفتگو ہوگی اس کی بازگشت باہر سنائی نہ دے۔“

سجاد احمد نے اپنی ساتھی پولیس کانسٹیبل کو کہا تو وہ آہستہ سے بولی۔

”جی..... سر.....!“ اس نے اٹھ کر پانی کا ایک گلاس زونیلہ کے پاس رکھ دیا اور اسے پینے کو کہا مگر زونیلہ نے انکار کر دیا اور سب سے ہونے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے یہاں کس سلسلے میں لایا گیا ہے؟“  
”دراصل آپ کو رشید قتل کیس کے سلسلے میں بلایا گیا ہے۔ اس کی انکوائری میں آپ سے کچھ پوچھنا تھا.....“  
سجاد نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”میرا اس سے کیا تعلق؟“ اس کے اندر مری ہوئی کوئل بولی۔

اس کی آواز میں بلا کی نفی تھی۔ سجاد احمد اس کی خوب صورتی کے ساتھ اس کی آواز کے کوچ سے بھی گھائل ہونے لگا تھا۔

”دیکھیں بی بی..... بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نام کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں گی تو یہ آپ کے لیے بہتر ہوگا، ورنہ سچ اگوانے کے لیے ہمیں دوسرے حربے بھی استعمال کرنا آتے ہیں۔“

یہ سن کر زونیلہ کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”پوچھیے..... جو پوچھیں گے..... میں سچ بچ بتاؤں گی۔ ویسے بھی یہ حسن میرے لیے وبال بن چکا ہے۔ میں خود اپنی اس خوب صورتی سے تنگ آ چکی ہوں، جس نے مجھے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور مجھے بدنامی کی پاتال میں گرائی جا رہی ہے۔“ وہ روتے ہوئے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

”مجھے بس آپ کا اقبالی بیان چاہیے کہ یہ قتل آپ نے کیا ہے۔“ سجاد احمد نے سیدھے الفاظ میں کہا تو وہ روتے ہوئے بولی۔  
”دیکھیں.....“

سجاد احمد نے لیڈی پولیس کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اب دھیرے دھیرے زونیلہ بولے

جاری تھی اور وہ لکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سجاد احمد نے ایک چھوٹا شیپ ریکارڈر بھی آن کر لیا تھا۔ زونیلہ اپنا اقبالی بیان ریکارڈ کروانے لگی۔

”میں زونیلہ بنت عبد اللہ بقا کی ہوش و حواس یہ بیان ریکارڈ کروا رہی ہوں کہ میں رشید کی قاتلہ ہوں، میں نے یہ قتل محض اپنی عزت بچانے کی خاطر کیا..... جس کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔ میں ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں..... میں نے اپنی تعلیم بڑے ہی خراب حالات میں مکمل کی۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ اس سلسلے میں بعض اوقات ہمیں کئی کئی دن بھوکا رہنا پڑا۔ میرا محنت کش باپ قانچ کا شکار ہو گیا تو اماں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگیں۔ اس سے جو آمدنی ہوتی وہ میرے تعلیمی اخراجات اور گھر کے معاملات چلانے کے قابل بھی نہ تھی۔ میں نے دسویں کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا اور اپنے تعلیمی اخراجات کو بھی کھینے لگی۔“

”مجھے میرے ارد گرد کے ماحول نے شروع دن سے ہی یہ احساس دلادیا تھا کہ میں بے حد خوب صورت ہوں۔ اب راہ چلتے لوگوں کے آوازے اور پیشکشیں مجھے اور بھی پریشان کرنے لگی تھیں۔ محلے کے لڑکے ویسے ہی میری جان کے دشمن ہو چلے تھے۔ میں نے اپنی ثابت قدمی سے انہیں ہر وقت اپنے سے دور رکھا۔ میٹرک سے نکل کر اب میں اگلی کلاسوں میں جانے کے لیے پرتولنے لگی تھی مگر اس کے لیے مجھے بے حد اخراجات کی ضرورت تھی۔ کالج کی فیسیں الگ.....“

”یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے انسان کے دل میں رحم ڈال دیا جس نے نہ صرف میری ہمت بندھائی بلکہ اخراجات کا بوجھ بھی اٹھالیا۔ یہ میری ایک ہمسائی تھی جو بے حد امیر تھی مگر اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ اس نے اس طرح کے مبینہ نیک کاموں کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ اس طرح میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم بھی جیسے تیسے پوری کر لی اور پھر مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ مگر میری خوب صورتی جو ہمیشہ سے میری گھات میں تھی۔ یہاں بھی مجھے چین سے نہ رہنے دے رہی تھی۔ یہاں کے اعلیٰ افسران اب مجھے اپنے نشانے پر لینے کو تلے ہوئے تھے۔ اب تو ان کی طرف سے خفیہ طریقوں سے تعاون کرنے کی پیشکشیں ہونے لگی تھیں اور ان کے بدلے میں میرے درخشاں مستقبل کی نوید بھی سنائی جانے لگی تھی۔ جسے میں بڑی ہمت سے ٹھکراتی چلی آئی تھی۔“  
”اس معاملے میں..... ایک بار میں نے اسٹاف



یونین کے کرتا دھرتا لوگوں سے بات کی تو انہوں نے بھی میری کوئی مدد نہ کی بلکہ الٹا اس کے ایک رکن رشید نے مجھ سے رابطہ بڑھا کر مجھے اس راستے پر چلنے کی پیشکش کی جسے میں نے نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ اس کی اچھی خاصی گوشمالی بھی کر ڈالی لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی ذلالت سے واقف تھا مجھے زچ کرنے لگا تھا۔ پھر ایک روز تو اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”زونیلہ..... کیا ہے اگر تمہارے حسن کی خیرات کسی ایسے بندے کی جھولی میں گر جائے۔ یقین کرو..... ایسا کرنے سے نہ صرف وہ بندہ تمہارا زندگی بھر کا غلام ہو جائے گا بلکہ ترقی کے تمام دروازے بھی تم پر کھل جائیں گے۔ میری مانو..... عیش کرو گی عیش..... یہ جو تمہارے ارد گرد دوسری لڑکیاں یہاں ملازمت کر رہی ہیں اور دن دو گنی رات چو گنی ترقی کر رہی ہیں۔ اس کا سبب بھی تقریباً وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ سوچ لو..... خوب اچھی طرح..... میں نے اس کو نہ صرف دھتکار دیا بلکہ اس کی بے عزتی بھی کی اور اس کی شکایت اس کے چھوٹے بھائی حمید سے بھی کی..... لیکن وہ بھی اس معاملے میں بے بس نکلا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتی ہوں۔

”ان ہی دنوں میری منگنی اپنے رشتے داروں میں ہو گئی۔ وجاہت نہ صرف شکل صورت کا بلکہ دل کا بھی بے حد خوب صورت انسان تھا۔ وہ ایسا تھا جس کی ہمراہی کی خواہش ہر لڑکی کرتی ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے وجاہت ایسا سا مل گیا۔ میں اب جلد ہی اپنی ملازمت کو چھوڑنے والی تھی لیکن وجاہت کی چند مجبوریوں نے مجھے کام سے استعفا دینے سے روک رکھا، ان ہی دنوں رشید نے میرے ارد گرد اپنے مذموم ارادوں کا گھیرا جگ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کا ذکر وجاہت سے بھی کیا اور اپنی حفاظت کے لیے اس سے کہہ کر پستول کا لائسنس بھی لے لیا۔ اس نے اپنے خرچ سے کچھ پیسے بچا کر مجھے ایک پستول بھی لے دیا۔ جو میں اب اپنے پاس رکھنے لگی تھی۔ اس روز رشید نے مجھے صریحاً دھمکی دی تھی۔

”آخری بار تمہیں کہہ رہا ہوں، میری بات مانو گی تو خوش رہو گی۔ ورنہ کل تک تم اٹھالی جاؤ گی۔ پھر دیکھو گا تم کیسے نخرے کرتی ہو، بہت دیکھ لے تمہارے چونچلے.....“

”چونکہ اسٹاف کی تلاش نہیں ہوتی اس لیے میں پستول ہمیشہ اپنے دتی بیگ میں رکھتی تھی۔ اس روز رشید اور اس کے بھائی حمید کے درمیان جھگڑا ہوا۔ نوبت ہاتھ پائی

تک آپہنچی..... میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر حمید نے اسے صوفوں کے قریب گرا لیا اور اس کے جسم پر سوار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا سوچھا۔ میں نے دل میں دعا کی..... کہ اللہ کرے حمید اسے قتل کر دے۔ حمید نے جب پستول کی نال اس کے گردوں پر لگائی تو رشید ڈر کے مارے چیخ اٹھا۔

”بچاؤ..... اس کے ہاتھ میں پستول ہے، یہ مجھے جان سے مار دے گا۔“ کچھ لوگ اس کی طرف بھاگے تو میرے ذہن میں جانے کہاں سے یہ بات آئی کہ رشید جیسے گند کو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے ہنڈ بیگ سے اپنا پستول نکالا اور بڑی پھرتی کے ساتھ ادھر جا پہنچی۔ نہ جانے کس نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر اونچا کر دیا تھا اور اس سے اس کا پستول چھیننا چاہا۔ میں نے فوراً اسی جگہ پر اپنا پستول رکھا اور اس کا ٹریگر دبا دیا..... گولی کے چلنے کے ساتھ رشید کی آواز آئی۔

”اوہ اس نے مجھے مار ڈالا.....“ حمید ڈر کر بھاگا..... لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور میں اپنی سیٹ پر دوبارہ آکر بیٹھ گئی..... حمید کو گرفتار کر لیا گیا اور رشید قتل ہو چکا تھا۔ ایک برائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی اور میں مطمئن تھی کہ میرا نام اس قتل میں بھی نہیں آئے گا مگر میری سوچ غلط تھی۔ آج میں بھائی ہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ رشید کی اصل قاتل میں ہوں، میں ہوں.....“

اتنا لکھوانے کے بعد وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیڈی کا ٹیبل نے اس کے بیان کے نیچے اس کے دستخط لیے اور اس کی باقاعدہ گرفتاری ڈال کر اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سجاد احمد نے اس کا بڑی سوچ بچار کے بعد چالان مکمل کیا اور اس کے بیان کی روشنی میں بہت ہی نرم شقیں لگا کر اس کا چالان کر کے اس کی گرفتاری ڈال دی۔ کیا اس نے ایسا خدا ترسی کی وجہ سے کیا تھا..... اس کی خوب صورتی سے مرعوب ہو کر کیا تھا یا اس کی جوانی پر اسے ترس آ گیا تھا؟ انتہائی نرم شقیں لگا کر مکمل ہونے والا یہ اس کا پہلا اور شاید آخری چالان تھا اور گرفتاری بھی..... اس نے ایسا کس لیے کیا؟ یہ وہ آج تک سمجھ نہ سکا۔ اس سے جب بھی پوچھا تو اس نے یہی کہا کہ بندگی میں تو اس کا اپنا سانس ٹھننے لگتا ہے۔ وہ اب قانون کی بندگی میں زونیلہ کو ساری زندگی قید نہیں رکھنا چاہتا اس لیے اس نے یہ رعایت برتی ہے۔





✽ محمد زاہد سیال..... پاک پتن شریف  
آج توڑنے ہوں گے گھر کے سب آئینے مجھے دلنشین  
محبت میں ہارے لوگ اب دیکھے نہیں جاتے  
✽ محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی

حیراں ہوں چارہ گر کو سناؤں میں کیا حال  
اب تک تو دردِ دل میں ذرا بھی کمی نہیں  
میں خود بدل گیا ہوں کہ زمانہ بدل گیا  
مدت سے اب بہار میں کیوں دلکشی نہیں  
✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال  
واقف نہیں تم اپنی نگاہوں کے اثر سے  
اس راز کو پوچھو کسی برباد نظر سے



✽ سیدہ ثانیہ کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان  
سکوں میں رقص کنناں، رقص میں سکون پذیر  
خرام حسن کا آئینہ ہے خرام حیات  
✽ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف بائی پاس

آج تم یاد کیوں نہیں آئے  
آج تم سے بہت خفا ہوں میں  
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال  
مجھ سے مخلص، نہ واقف میرے جذبات سے تھا  
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا  
اب جو بگھڑا ہے تو کیا روئیں جدائی پہ اس کی  
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ہی ملاقات سے تھا

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ڈاہرا نوالہ  
جرائم آج جتنے ہیں وہ کل بھی بر ملا ہوں گے  
جو سارے لازم و ملزوم ہیں کیونکر جدا ہوں گے

✽ حافظ شعیب معاویہ..... خان پور، رحیم یار خان  
جو زندگی میں مشکل مقام آیا تو کیا کرو گے؟  
میں رو رہا ہوں، تم ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے؟  
کچھ اپنے دل پہ بھی زخم کھاؤ، میری جگہ سے بہار کب تک؟  
مجھے سہارا بنانے والو! میں لڑکھڑایا تو کیا کرو گے؟

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال  
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب  
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں  
✽ محمد اسلم گھلو..... خانیوال  
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو  
دیر سے انتظار ہے اپنا  
✽ سید عبادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان  
عید کی رات ہے برسات میری آنکھوں میں  
لیجے بس یہی سوغات میری آنکھوں میں  
پھر نئے زخم کیے زیب تن عید کے دن  
پوچھ لو کیسی کئی رات میری آنکھوں میں  
✽ محمد اکبر ناچ..... لودھراں  
ہوا کے دوش پہ رکھا ہے آرزو کا چراغ  
خود اپنی ذات سے یہ دشمنی عجیب ہے



✽ تنویر لودھی..... آفیسر زکا لونی، واہ کینٹ

جاں ان کی ہے، دل ان کا  
ہم اُن کے ہیں، سب ان کا  
وہ لیں گے تو کیا لیں گے  
ہم دیں گے تو کیا دیں گے

✽ رانا بشیر احمد یاز..... احسان پور، رحیم یار خان

تیز بارش میں تبھی سرد ہواؤں میں رہا  
اک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا  
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم ہیں مگر  
تیرا چہرہ ہی فقط میری دعاؤں میں رہا

✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص

یہ کون پھر سے انہی راستوں میں چھوڑ گیا  
ابھی ابھی میں عذاب سفر سے نکلا تھا  
میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا  
کہ دل کا زہر میری چشم تر سے نکلا تھا

✽ ورداء، آریز احمد ملک..... کراچی

دل سے لٹ کر بھی سخاوت کی تمنا نہ گئی  
کوئی اجڑا ہوا آئے تو دعا لے جائے

✽ قیصر اقبال گچہ..... بکول ضلع بھکر

دیکھ رفتہ رفتہ نکل ہی گئے نا آخر  
مصر سے یوسف، جنت سے آدم اور ترے دل سے ہم

✽ جاوید اختر رانا..... پاک پتن شریف

میں نے جس جس کو بھی چاہا ہے بہت چاہا ہے  
تم کسی ایک سے تصدیق کرا سکتی ہو  
کل میں اک خواب کسی آنکھ میں بھول آیا تھا  
کیا تم اس خواب کا انجام بتا سکتی ہو

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

شاید یہی تضاد قیامت کی جان ہے  
فطرت ضعیف ہے مگر انساں جوان ہے

✽ محمد رشید سیال..... روہڑی ضلع سکھر

یہ زندگی ہاتھوں میں لیے پھرتی ہے پتھر عدم  
ہم نے کس شوق سے گھر شیشے کے بنوائے تھے

✽ نواب احمد..... آزاد کشمیر

ہر ایک شے پہ اجالا سا ہلکا ہلکا ہے  
ترا خیال ہے یا صبح کا دھندلکا ہے

✽ رشید احمد..... سیالکوٹ

چاند ہے، پھول ہیں، لب جو ہے  
میرے پہلو میں دل نہیں، تو ہے

✽ انور علی..... ملتان

لبوں میں نرم تقسیم رجا کے کھل جائیں  
خدا کرے مرے آنسو کسی کے کام آئیں  
جو ابتدائے سفر میں دیے بچھا بیٹھیں  
وہ بدنصیب کسی کا سراغ کیا پائیں

✽ احمد علی..... پشاور

یوں بیکار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ  
اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ  
سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ  
دھوکا دینے والا رو دے، ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

✽ ادریس احمد..... مانسہرہ

کیا ترے لطف کا معیار زباں بندی ہے؟  
بات بے بات بدل جاتے ہیں تیور تیرے  
اک ہم ہی کو نہ تجھے اپنا بنانا آیا  
انجمن تیری ہے، سے تیری ہے، ساغر تیرے

✽ عاصم خان..... سرگودھا

لٹ کر بھی کوئی دشت جنوں کی نہ راہ لے  
اپنی شکست ہی میں محبت پناہ لے

✽ فردوس احمد..... میرپور خاص

یہ کون دور سے دامن کشاں گزرنے لگا  
چراغ لو کو ہوا کے سپرد کرنے لگا

✽ مہتاب احمد..... حیدر آباد

کرن کا رنگ فریب نگاہ ہوتا ہے  
ثواب اصل میں عذیر گناہ ہوتا ہے

✽ شبانہ ادریس..... بہاولپور

میں کب سے گوش برآواز ہوں، پکارو بھی  
زمین پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی  
مری غیور امنگو، شاب فانی ہے  
غروب عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

✽ ناہید یوسف..... اسلام آباد

مسلل سرخوشی مرگ مسلل ہوتی جاتی ہے  
کہ تیرے قرب سے اک عمر اک پل ہوتی جاتی ہے



☆ اطہر حسین.....کراچی

عشق سے گرمیاں حیات کی ہیں  
سب تفصیل ایک بات کی ہیں

☆ بلقیس بانو.....حیدرآباد

کس درجہ سختی نظر آتے ہیں دور سے  
وہ قافلے جو رک نہ سکیں گے حضور سے

☆ زارا انور.....لاہور

کتنا بلند، کتنا انوکھا مقام ہے  
انسان اک تسلسلِ شیریں کا نام ہے

☆ عابد علی.....راولپنڈی

زندگی کے سانچے میں جو نظام ڈھلتا ہے  
زندگی کے سانچے کو توڑ کر نکلتا ہے

☆ ظہیر احمد.....کراچی

وہ جن کو لوگ حقیقت پرست کہتے ہیں  
حقیقتوں کے تصور میں مست رہتے ہیں

☆ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی

عجیب درد بھری لذتیں بہار میں ہیں  
کہ جتنے پھول ہیں، شبنم کے انتظار میں ہیں

☆ حسان احمد.....ملتان

تمہیں خلعت کے بدلے فرشِ پا انداز ملتا ہے  
یہیں سے بات کھلتی ہے یہیں سے راز ملتا ہے

☆ بلاول انصاری.....سکھر

چن میں اہل چمن درپے چمن ہوں گے  
خبر نہ تھی کہ بہاروں کے یہ چلن ہوں گے

☆ اوریس خواجہ.....سیالکوٹ

اگرچہ مسلکِ ماضی رہا ہے آگ ہی آگ  
اجڑ سکا نہ مگر مادرِ زمیں کا سہاگ

☆ محمد صفدر.....پشاور

ہنسے تو مجھ پہ ہنسے اور وہ بھی برسرِ عام  
ستا ہے آپ تو ڈرتے تھے جگ ہنسی سے

☆ نرین اعجاز.....فیصل آباد

تم اتنی دور سے چل کر مرے قریب آئے  
تو اب قریب ہی بیٹھو، تھکن مجھے دے دو

☆ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

وہ دور کوئی اور تھا جب دل کا بھرم تھا  
اب ملتا ہے بازار میں دوچار درم کا

☆ مدحت.....کراچی

ہم اپنی وضع کے بندھے ہیں ہم اپنی طرز کے انساں ہیں  
جو زیست مرا سرمایہ تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے

☆ محمد قاسم.....لاہور

آنا پڑا ہے اس کو ہمارے حضور میں  
ہم سے الگ رہے تھے مقابل کے فیصلے

☆ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

ہر سمت نظارے تو ہیں بکھرے ہوئے لیکن  
اک اس کے تبسم کا وہ جلوہ نہیں ملتا

☆ اوریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی

بات کا زخم ہے قتل کے زخموں سے سوا  
نیکیے قتل مگر منہ سے کچھ ارشاد نہ ہو

☆ افضل خان.....کوئٹہ

یوں بھی ہوتا ہے کہ طوفان کی زد میں آکر  
بادل اٹدے ہوئے طوفان پہ چھا جاتے ہیں

☆ انعم کمال.....کراچی

جس کے موڑوں پہ لٹایا گیا انساں کا سہاگ  
میں تو اس راہ کو تلووں کا لبو تک بھی نہ دوں

☆ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی

جلتے ہوئے سورج کو سمندر سے نکالو  
ساحل کو جلانے سے اُجالا نہیں ہوتا

☆ عشرت جہاں.....سکھر

وہ کفر ہے ایمان کی معراجِ کمال  
جس کفر کو انساں سے محبت ہو جائے

مختل شعروں کی محبت

کوین

برائے

شمارہ

ستمبر

2016

نام:

پتا:

اگست 2016ء

170

سپنس ڈائجسٹ



# دھماکا

عظیم جمال

ایک چھوٹا سا دل اور اس کے بڑے کمال... اگر اس میں عشق کا جذبہ نہ ہوتا تو شاید انسان میں اتنی جرأت بھی نہ ہوتی... وہ بھی بے خوف و خطر موت کے راستے پر چل رہے تھے... چاہت میں جینے کی آرزو میں آخری سفر کے مسافر جب منزل پر پہنچے تو گویا تمام تھکن اتر گئی۔

ایک دوسرے کو پانے کی تمنا میں فنا ہو جانے والے عاشقوں کا قصہ



ڈیزل کشتی کے پرچے اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک بم میں لگے ہوئے فیوز کے تاروں کو چیک کرتا رہا۔ اس نے فیوز کے تاروں کے دونوں سرے بڑی احتیاط سے ایک دوسرے سے جدا کر رکھے تھے کیونکہ

مل ٹابون اپنے کمرے میں ایک نہایت اہم کام میں مشغول تھا۔ وہ چھ عدد ہلکے قسم کے ڈائنامیٹ بموں کو ایک ساتھ باندھ رہا تھا اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک نہایت طاقتور بم تھا جو ایک بڑی

اگست 2016ء



سپنس ڈائجسٹ





”اوہ..... اس طرح! اگر یہ پھٹ گیا تو؟“ جین نے

قد بے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ چھ کے چھ ڈائنامیٹ اس وقت بغیر فیوز کے ہیں۔“ ٹابون نے کہا۔

”چھ ڈائنامیٹ!“

”بالکل.....“ ٹابون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”یہ نہ صرف اس کی کشتی کے پرچے اڑا دیں گے بلکہ ان کے دھماکے کی آواز بھی دور دور تک سنی جاسکے گی۔“

”لیکن ٹابون میں.....“

”اوہ جین خدا کے لیے۔“ ٹابون نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب کسی دوسری تجویز کی گنجائش نہیں ہے، ہم اسی منصوبے کو بروئے کار لائیں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ٹابون لیکن مجھے خدشہ ہے کہ ہم پر شبہ ضرور کیا جائے گا۔“

”نہایت لغو خیال ہے۔“ ٹابون نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاورڈ حسب معمول اپنی کشتی میں سوار ہوگا اور انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے انجینیشن کی چابی گھمائے گا اور بس..... دھماکا!“

”اوہ۔“ جین نے جھرجھری سی لی۔

”ہاں۔“ مل ٹابون نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد تم چند ماہ تک ایک سو گوار بیوہ کی کامیاب اداکاری کرو گی اور ان چند ماہ کے دوران سب سے پہلے تو تم انشورنس کمپنی سے ہاورڈ کی زندگی کے بیمے کی رقم جو چالیس ہزار ڈالر بنتی ہے، حاصل کرو گی۔ بیس ہزار ڈالر کا یہ مکان اور اتنی ہی مالیت کے یونٹ وغیرہ۔ ممکن ہے دس پندرہ ہزار ڈالر کی نقدی ہاورڈ کے اکاؤنٹ میں بھی موجود ہو اور پھر اس کا سیف ڈیپازٹ لا کر بھی تمہارے سامنے کھولا جائے گا۔ اس میں سے ظاہر ہے کہ کنکر پتھر نہیں برآمد ہوں گے۔ یہ ساری کی ساری رقم ایک لاکھ ڈالر سے بھی زیادہ بنتی ہے جو قانونی طور پر تمہاری ہو جائے گی اور تمہارے مال دار ہو جانے کے بعد بھلا میں کس طرح غریب رہ سکتا ہوں۔ دونوں مل کر عیش کریں گے۔“

”لیکن اس طرح تو تم بھی شے سے بالاتر نہیں رہ سکو گے۔“ جین نے کہا۔

”پھر وہی لغو خیال۔ بھلا مجھ پر کیوں شبہ کیا جائے گا؟ جبکہ ایسے کیس میں عام طور پر بیوی پر شبہ کیا جاتا ہے لیکن سو گوار بیوہ کا جو کہ مال دار بھی ہو، ساتھ دینے والے بہت سے پیدا ہو جاتے ہیں اور جو لوگ تم سے ہمدردی کریں گے،

یہ ہم اس نے خود اپنے جسم کے پرچے اڑانے کے لیے نہیں بنایا تھا۔

رسٹ وائچ پر نظر ڈالتے ہی وہ چونک پڑا۔ ہم کو اس نے بڑی احتیاط سے دبیز کاغذ کی ایک تھیلی میں رکھا۔ لباس درست کرنے کے بعد آئینے پر الوداعی نظر ڈالی اور گھر سے باہر نکل آیا۔ اب وہ اپنی کار میں بیٹھا ہاورڈ کو رے کے مکان کی طرف جارہا تھا۔ ہاورڈ نہ تو اس کا دوست تھا، نہ ہی شناساؤں میں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ہاورڈ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ اس کا بنگلہ نما مکان آبادی سے قدرے ہٹ کر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا اور آبادی سے پہاڑی تک جانے کا راستہ ہر وقت سسنان پڑا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب چاہتا، ہاورڈ کی غیر موجودگی میں اس کے مکان پر پہنچ جاتا۔ یہاں تک کہ کوئی راہ گیر بھی اس کی اس آمد و رفت کو نہیں دیکھ پاتا تھا۔

اس نے اپنی کار مکان سے سو گز دور ہی پام کے ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑی کی۔ وہ ہمیشہ اپنی کار اسی جگہ کھڑی کرتا تھا کیونکہ اس جگہ کھڑی ہوئی کار کو نہ بڑی شاہراہ پر سے دیکھا جاسکتا تھا اور نہ وہ ہاورڈ کے مکان سے نظر آسکتی تھی۔ اب وہ کاغذ کی تھیلی کو ہاتھ میں لیے ہوئے بڑی تیزی سے مکان کے پچھلے دروازے کی طرف جارہا تھا۔

ہاورڈ کی بیوی جین کو نیز بھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ متوسط قد کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ سر کے بال سنہرے اور چمک دار تھے جس کی وجہ سے اس کے حسن کی رعنائی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ بڑی بڑی خوابیدہ آنکھوں سے ذہانت اور سخت گیری عیاں تھی۔

ٹابون نے باورچی خانے کا پچھلا دروازہ بند کرنے کے بعد قریب رکھے ہوئے ایک اسٹول پر دبیز کاغذ کی وہ تھیلی رکھ دی جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے بعد اس نے گیس کے چولہے کے قریب کھڑی ہوئی جین کو اپنی آغوش میں لے لیا لیکن اس کے ہونٹ جین کے ہونٹوں سے نہ ٹکرا سکے۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنا چہرہ ایک جانب گھم لیا تھا جس کے نتیجے میں ٹابون کے ہونٹ اس کے رخسار سے چپک کر رہ گئے۔

”کیوں..... کچھ ناراض ہو؟“ ٹابون نے پوچھا۔

”میں اس وقت بہت پریشان ہوں ٹابون۔“ یہ کہہ کر اس نے اسٹول پر رکھی ہوئی خاکی رنگ کے دبیز کاغذ والی تھیلی کو گھور کر دیکھا اور بولی۔ ”لے آئے کیا؟“

”ہاں۔“



## سائنس کی دنیا

س: یہ بتائیے کہ قدرتی سائنس کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

ج: دو علم نباتات اور علم حیوانات

س: کیا آپ دنیا کی اس واحد رنگین گیس کا نام جانتے ہیں جو سبزی مائل زرد رنگ کی ہوتی ہے؟

ج: کلورین

س: یہ بتائیے کہ بارش کے ایک قطرے کا اوسط وزن کتنا ہوتا ہے؟

ج: 0.2 گرام

س: ان شعاعوں کا نام بتائیں جسے فوٹو گرافرز اندھیرے میں تصاویر بنانے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں؟

ج: انفراریڈ ریز

س: اس مرکب کا نام بتائیں جس کی مقدار سوئی گیس میں سب سے زیادہ ہوتی ہے؟

ج: میتھین

س: یہ بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ فارن ہائیٹ پر جم جاتا ہے؟

ج: صفر درجہ فارن ہائیٹ سے بھی 38 درجے نیچے پر۔

س: یہ بتائیے کہ واٹر گیس کسے کہتے ہیں؟

ج: ہائیڈروجن اور کاربن مونو آکسائیڈ کے آمیزے کو۔

س: یہ بتائیے کہ روشنی کتنے رنگوں کا مرکب ہے؟

ج: سات۔

س: یہ بتائیے کہ روشنی کس شکل میں سفر کرتی ہے؟

ج: لہروں کی صورت میں۔

س: یہ بتائیے کہ قدیم ترین سائنس کا علم کسے کہا جاتا ہے؟

ج: علم ہیئت۔

قلمی تعاون: ادریس بھٹی، منڈی بہاؤ الدین

میں بھی انہی میں سے ایک ہوں گا اور پھر تم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو کہ تمہارا شوہر ایک رسوائے زمانہ شخص ہے۔ درجنوں لوگ رات دن اسے کوستے رہے ہیں اور اس کی موت کے خواہاں ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جین کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور کہا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں جین کہ ان حالات میں ہم پر کسی طرح بھی شبہ نہیں کیا جائے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر پولیس.....“

”پولیس اس میں کیا کر سکے گی؟ وہ ہمارے خلاف ثبوت کہاں سے لائے گی؟ ہم دونوں کے تعلقات کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے۔ ہم کبھی کسی کے سامنے ایک دوسرے سے نہیں ملے لیکن ہاورڈ کے کرتوتوں اور اس کے دشمنوں سے کبھی واقف ہیں۔ بھلا ایک ایسا شخص جس نے اپنے درجنوں دشمن بنا رکھے ہوں، کسی وقت بھی کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس نے نہ جانے کتنے خاندان اجاڑے ہوں گے لہذا ایسے شخص کی سلامتی کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں جین کہ اب اس بم کا دھماکا ضرور ہوگا۔“

جین کچھ نہیں بولی۔ اس کے بجائے وہ فریج کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر مشروب کی بوتل نکال لی۔ ”میری طبیعت بہت پریشان ہے ٹابون۔ میں اپنے ذہن کا کچھ بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر ابھی نہیں۔“ ٹابون نے اس کے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے کہا۔ ”بعد میں..... پہلے ہم یہ کام کریں گے جو بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد ہمارے لیے پینا اور پلانا ہی باقی رہ جائے گا۔ ہم اپنی کامیابی کا جشن اور ہاورڈ کی موت کا سوگ پی پی کر منائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”لیکن ٹابون.....“

”اب کیا ہے؟“

”ایک چیز اور ہے جو میں نے محسوس کی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ہاورڈ ہم پر شبہ کرنے لگا ہے۔“

”پھر وہی۔“ ٹابون نے کہا۔ ”تم...“ ”ہم“ کا استعمال کر کے مجھے بھی شامل کر رہی ہو۔ میرے متعلق ہاورڈ کچھ نہیں جانتا۔ اب صرف تم باقی رہ جاتی ہو۔ تو تم نے بھلا یہ کیونکر محسوس کیا کہ وہ تم پر شبہ کرنے لگا ہے؟“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن کئی بار میں نے ایسا محسوس کیا ہے۔“ جین نے کہا۔



سے نکل کر ساحل کی طرف جا رہے تھے جہاں ہاورڈ کی تیس فٹ لمبی ڈیزل کشتی ایک چھوٹی سی برتھ سے لگی ہوئی ہلکے ہلکے ہلکورے کھا رہی تھی۔ برتھ پر چڑھنے کے بعد دونوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن اطراف میں مکمل سناٹا تھا۔ دونوں خاموشی سے کشتی میں اتر گئے۔

ٹل ٹایون کو اپنے فن کے جوہر دکھانے میں مشکل سے نصف گھنٹا لگا تھا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے بم کا فیوز انجن کے سوئچ سے منسلک کر دیا تھا۔ کام ختم ہو جانے کے بعد دونوں چند لمحوں تک اسٹیرنگ ویل کے پاس ہی دبکے بیٹھے رہے۔ کشتی کے اطراف ہلکی ہلکی لہروں کے ٹکرائے کے شور کے سوا اور کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک جین نے جھرجھری سی لی اور کسی سردی کھائی ہوئی بکری کی طرح کانپنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں ٹایون کہ جب وہ اس انکیشن سوئچ میں چابی گھمائے گا تو کیا ہوگا؟“

”یہ بات ہم کشتی سے باہر نکل کر بھی سوچ سکتے ہیں۔“ ٹایون نے کہا۔ ”آئیہاں سے نکلیں۔ ہاورڈ اب آتا ہی ہوگا۔ اسے تم بچ کھلاؤ گی اس کے بعد وہ اپنے روزانہ دورے پر روانہ ہونے کے لیے کشتی پر آئے گا۔ انکیشن سوئچ میں چابی گھمائے گا، اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ ہم کل کے کسی بھی اخبار میں پڑھ سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جین کا ہاتھ پکڑا اور کشتی میں سے بھورے رنگ کے دبیز کاغذ کی اس تھیلی کو اٹھاتا بھی نہیں بھولا تھا جس میں وہ بم رکھ کر لایا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ برتھ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے، جین کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ خود ٹایون بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ان دونوں ہی کی نظریں ایک ساتھ اس لمبے تڑنگے شخص پر پڑی تھیں جو بڑی کینہ توز مسکراہٹ کے ساتھ ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”خوب، بہت خوب۔“ اس نے ان دونوں کے قریب آ کر کہا۔ اس کا انداز راستہ روکنے کا سا تھا۔ ”تو تم دونوں کو معاشرۂ لڑانے کے لیے یہ کشتی ہی مناسب معلوم ہوئی..... کیوں؟“

”ہاورڈ!“ جین نے سکاری سی لی۔

”ہاں، کہو میری جان۔“ ہاورڈ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ ٹایون کی طرف گھوما اور اس کی سٹھی میں

”تمہارا اشارہ کہیں بیسہ پالیسی کی طرف تو نہیں؟“

”ہاں۔“ جین نے کہا۔ ”کیا یہ بات مشکوک نہیں ہے کہ جب میں نے ہاورڈ سے اس کی بیسہ پالیسی کو دگنا کرنے کے لیے کہا تو وہ بلا حیل و حجت راضی ہو گیا اور اسی دن اس نے نہ صرف اپنی بلکہ اس کے ساتھ ہی میری بیسہ پالیسی کی رقم بھی دگنی کر دی۔“

”تو اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟“

”اوہ ٹایون..... تم سمجھتے کیوں نہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو اور نہ میری بیسہ پالیسی کی رقم کو دگنا کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

”بالفرض اگر ایسا بھی ہے تو کیا تم یہ جھٹکتی ہو کہ بم دھماکے کے بعد وہ تمہیں قتل کرنے اور تمہاری بیسہ پالیسی کی رقم حاصل کرنے کے لیے زندہ رہ جائے گا۔“ یہ کہہ کر ٹایون نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”جین! تم واقعی بری طرح نروس ہو لیکن اگر تم ذرا بھی غور کرو تو حقیقت یہ ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

چند لمحوں تک جین ٹایون کو غیر یقینی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ خشک ہونٹوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی سفید دانتوں کی قطاریں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اچانک اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھیجنے لیے اور بولی۔

”ہاورڈ کو ضرور مرنا چاہیے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

یہ سن کر ٹایون نے چپکتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہوئی نا بات..... اب یہ سمجھ لو کہ آج اس شہر میں سب سے پہلے مرنے والا شخص ہاورڈ کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔“ پھر اس نے جین کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اس فیصلے کے بعد تم کس قدر حسین لگ رہی ہو جین کہ بس..... لیکن آؤ پہلے موت کے اس ہرکارے کو اس کی اپنی جگہ پر نصب کر آئیں۔ پھر آج رات ہم ہوں گے اور یہ مشروب ہوگا۔“

”لیکن ایک گلاس تو واپسی پر.....“

”نہیں، ہرگز نہیں۔“ ٹایون نے کہا۔ ”واپسی پر تم گھر میں سب سے پہلے ٹی وی دیکھو گی اور اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرو گی۔ میں سیدھا ہوٹل پام گرو اور اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزاروں گا تاکہ ان سب کو وہاں میری موجودگی کا احساس ہو سکے اور وہ لوگ میری موجودگی میں ہی اس دھماکے کی آواز سن سکیں۔“

بات جین کی سمجھ میں آگئی تھی اور اب دونوں مکان



دہی ہوئی بھورے رنگ کی کافز کی خالی تھیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اور مسٹر ٹایون! یقیناً تم اس تھیلی میں سینڈو چڑلائے ہو گے حالانکہ ایسے رنگین موقع پر بوتل زیادہ کارآمد رہتی ہے۔“

”ہاورڈ..... ہم دونوں..... میرا مطلب ہے کہ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہم دونوں صرف.....“

”یوشٹ اپ.....“ ہاورڈ نے دہاڑ کر کہا۔ ”میں تم دونوں پر کافی عرصے سے نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔“

”آپ اپنی بیوی پر الزام لگا رہے ہیں مسٹر ہاورڈ.....“ ٹایون نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”بیٹا تم تو چپ ہی رہو۔“ ہاورڈ نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی بیوی پر الزام بھی نہ لگاؤں اور تم دوسرے کی بیوی کے ساتھ گل چہرے اڑاؤ۔ چلو تم دونوں کشتی میں واپس چلو۔“

”خدا کے لیے ہاورڈ جلد بازی سے کام نہ لو۔“ جین نے التجا کی۔ یہ سن کر ہاورڈ نے اپنے کوٹ کی بٹلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں چھوٹی نال کا ایک پستول دبا ہوا تھا۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور کشتی پر واپس چلو۔“ اس نے پستول کو حرکت دے کر غراتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں ہاورڈ..... کشتی نہیں۔“ جین نے بوکھلا کر کہا۔

”کیوں..... کشتی میں کیوں نہیں؟ وہی تو ایک مناسب جگہ ہے۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں نے کشتی میں ہی استفادہ حاصل کیا ہے۔“

”میری بات سنو ہاورڈ۔ کشتی میں.....“

”چل..... کمینٹی!“ ہاورڈ نے اسے برتھ کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ ٹایون بھی اپنا سفید چہرہ لیے ہوئے جین کے ساتھ تھا۔ کشتی میں سوار ہوتے ہی ہاورڈ نے باریک ڈور کا ایک لچھا جین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو ذرا جلدی سے اپنے اس نامراد عاشق کے ہاتھ پیر کس کر باندھ دو۔“

”ہاورڈ! خدا کے لیے ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم نے کشتی میں.....“

”میں سب جانتا ہوں، اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

مجبوراً جین نے اس کے ہاتھ سے باریک ڈوری کا لچھا لیا اور ٹایون کے دونوں ہاتھ کس کر اس کی پشت پر

باندھ دیے۔ اس کے بعد پیر بھی باندھ دیے۔ ہاورڈ پستول تانے کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے فرسٹ ایڈ بکس کھولا اور اس میں سے ٹیپ کارول نکال کر جین کو دیتے ہوئے کہا۔

”اب اس ٹیپ سے اس کا منہ بند کرو۔“

پھر جیسے ہی جین اس کام سے فارغ ہوئی، ہاورڈ نے بڑی آسانی سے اسے بھی باندھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، منہ پر ٹیپ بھی چپکا دی۔ ”بس اب تم یہ نہیں بتا سکو گے کہ تم نے کشتی میں کیا کیا ہے۔“ اس نے

ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا اور ان دونوں کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا اور خود اسٹیرنگ والی نشست پر جا بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ دھیل تھام لیا۔ وہ ٹایون کی طرف گھوما اور بولا۔ ”کچھ دیر بعد میں تمہاری کار جھیل والی پہاڑی پر لے جاؤں گا جہاں چٹان میں اتنا بڑا سوراخ

موجود ہے کہ اس میں سے تمہاری کار گزر کر دو سو فٹ کی بلندی پر سے جھیل میں جا گرے گی۔ نشانی کے طور پر تم دونوں کے کچھ کپڑے بھی ڈال دوں گا تاکہ پولیس کو یقین ہو جائے کہ تم دونوں اس حادثے میں ہلاک ہو چکے ہو۔“

یہ سن کر جین اور ٹایون خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ ہاورڈ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”لیکن اس سے پہلے میں تم دونوں کو گہرے سمندر کے اس حصے میں لے جا کر ڈالوں گا جہاں آج کل شارک مچھلیوں کا بہت زور ہے۔“

پھر اس نے جیب سے ایک چاقو نکالا۔ اسے کھول کر اس کے چمک دار پھل کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے

کہا۔ ”اور سمندر میں پھینکنے سے پہلے اس چاقو سے تم دونوں کے جسموں پر کچھ نقش و نگار بھی بناؤں گا۔ یہ میرا شوق بھی ہے اور یقیناً مچھلیاں بھی اسے پسند کریں گی۔“

یہ سن کر جین اور ٹایون خود کو آزاد کرانے کے لیے ایک بار پھر ناکام جدوجہد کرنے لگے۔ وہ تڑپ رہے تھے،

نکل رہے تھے اور ان کی پُر خوف اور سرخ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ چاقو جیب میں رکھنے کے بعد ہاورڈ

چند لمحوں تک ان دونوں کی جدوجہد سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اس نے انکیشن سوچ میں چابی داخل کی اور ان دونوں کی طرف گھوم کر بولا۔ ”بس..... تو اب تیار ہو جاؤ دوستو! یہ

اپنی نوعیت کی واحد اور دھماکا خیز موت ہوگی۔“ ہاورڈ نے کہا اور چابی گھما دی۔



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|              |                   |                 |                  |
|--------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد   | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد    | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق  | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما    | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبداللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ      | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج    | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



www.paksociety.com

حکایتیں

حکایتیں

تینتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کئی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی منائوں، رفاقتوں اور تاجوں کا ایک دل رہا سلسلہ



Downloaded From  
PAKSOCIETY.COM





**Downloaded From**  
**PAKSOCIETY.COM**



## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دو برجدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی سنگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جیمرو اور چاچی منی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا ڈیرہ اشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گلوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، ڈیرہ اشمت کی منگی گیری کرتا تھا۔ ڈیرہ اشمت جلالی اور اس کے بیٹے رواجی بدنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنا لیا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضائقہ علاقے سین گلوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ سین مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیگون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم محل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم محل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ اشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرہ سے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کر لی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مس کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشت نشین ہوتا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سیراکو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمنا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے یہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرہ اشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے انکار کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سبیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گلوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کوہر ہارن کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے پیچھے سے فرار ہو گیا۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET فیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پیچھے سے اس پر پائل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر جزل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹینی سن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں سیکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے سیکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور سیکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے انکار کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلہ ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھاتا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ رہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الٹ ہو گئے اور وہاں خون کی بولی کھیلی جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ علیحدہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگار کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے



مراد کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرید مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے نیکہ نگار سے نکاح پڑھوایا اور بشری اور بیٹے کو اپنی سکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگار میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِ اقتدار آ گیا۔ بابا اجیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے۔ یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں پہنے چبوائے۔ ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنادی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریکِ حیات بنالیا۔ مراد کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس کے تابع کئی جنات ہیں جن سے وہ دشمنوں کو زیر کرتا آ رہا ہے۔ دشمن اس کا توڑ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر دشمن خفیہوں نے مراد کو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا سر پرست بن جائے ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار رہے۔ مراد نے جنگی براؤن کو فون کیا اور اسے انجام سے خبردار کیا تو وہ مراد سے دشمنی سے باز آ گیا اور اس نے مراد کے دس دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ادھر جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو ختم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ بچہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کر دیا۔ وہ کروٹ بھی لے رہا تھا اور دودھ کی فیڈر کو ہاتھوں سے پکڑ کر دودھ پیتا تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بیچے (عابد علی ملنگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابدی دس برس کا ہو گیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگتا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابدی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابدی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابدی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ دو اغوا کاروں کو عابدی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ مراد اور ہم زاد اس کے لیے پریشان تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ عابدی اغوا کاروں کے ساتھ اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ادھر یہودی تنظیم فری مین کے عہدیدار اس کا برین واش کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔ عابدی وہاں کے دارالسلطنت کس تاؤ پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے رومانیہ آ گیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عابدی کی طرح عجوبہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بنی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کر گئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہو گئی تھی۔ مراد نے ماسٹر کو یو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کر لیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالیے۔ حماد کے پیچھے شامک شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرا دیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ایئر فورس پر شامکہ پر حملہ ہوا عابدی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابدی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر عابدی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے بیٹی کی ذمہ داری عابدی کے سپرد کر دی۔ عابدی نے ماروی سے نکاح پڑھالیا۔ عابدی اپنے دوست پولیس آفیسر کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ماروی بھی اس کے ساتھ تھی۔ ادھر زیب النساء کے ساتھ غیر معمولی واقعات ہو رہے تھے۔ جب وہ بم اللہ پڑھتی تو اس کے پیٹ میں واہیریشن سی ہوتی جیسے نومولود بچی نے جواب میں پڑھا ہو۔ انہیں بابا اجیری کی یاد آنے لگی۔ یہ امید تھی کہ ان سے رابطہ ہوگا اور کوئی انہونی ہو سکتی تھی۔

### اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد علی ملنگی پہلے ہی ناقابلِ تسخیر تھا۔ اب اس کے بیٹے عابد علی ملنگی نے اسے اور زیادہ فولاد بنا دیا تھا۔ یہ تمام مخالفین کو نظر آ رہا تھا۔ ان حالات میں تمام مخالفین عارضی طور پر خود تو جھک سکتے تھے لیکن اپنے مذاہب کو دین اسلام سے کمتر ہوتے کبھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فی الحال مجبور تھے کہ ان باب بیٹے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے سیاسی حکمت عملی سے دوستی بنا رہے تھے۔ کوئی فرد ہو، کوئی قوم ہو، وہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کمزوری کا شکار ہوتی ہے۔ ازل سے تاریخ کے صفحات میں مسلسل کوئی بھی طاقتور نہیں رہا۔ یہ امید تھی کہ ان باپ بیٹے کو بھی جلد یا بدیر زوال آئے گا۔ ان کی کوئی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آئے گی۔ تب وہ برتری حاصل کر کے

وہ تناور درخت جو کبھی جھکتے نہیں وہ آندھیوں میں جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ کارمن ڈی مور کو یہ غور تھا کہ اسے کوئی جھکا سکتا ہے، نہ توڑ سکتا ہے لیکن اب وہ جھک رہا تھا۔ پرنس عابدی کا طوفان اس کے قدم اکھاڑ رہا تھا۔ وہ خطرناک طاقتور تنظیموں سے دوستی اور تعاون کی درخواست کر چکا تھا لیکن عابدی کے خلاف کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ سب ہی کہہ چکے تھے کہ دنیا کی کوئی قانونی اور غیر قانونی قوت اسے پناہ نہیں دے سکے گی۔ دے یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں جتنی فرعونی طاقتیں ہیں، وہ کبھی کسی سے کمتر ہونا گوارا نہیں کرتیں۔ وہ عارضی طور پر برابری کا سمجھوتا تو کر لیتی ہیں لیکن دیر پردہ برابر ہونے والے کو خاک کر دینے کی تدابیر پر عمل کرتی رہتی ہیں۔



میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو عالی پر جادوی کرنے کے سلسلے میں دوبار جادوئی حربے استعمال کر چکی تھی۔ اسے مار ڈالنے کے لیے ایسے خطرناک منتر پڑھتی رہی تھی جس کے نتیجے میں وہ فولادوام کی طرح پگھل جاتا لیکن حیران تھی کہ اس پر کسی طرح کا رد عمل نہیں ہوا تھا۔

عالی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس پر جادو کر رہا ہے۔ جادو تو ہر بندے پر اثر کرتا ہے۔ وہ پریشان تھی کہ اس کے پراسرار علوم بے اثر کیوں ہو گئے ہیں؟ اس نے سنا تھا کہ وہ بہت ہی دین دار اور عبادت گزار ہے۔ آسمانی کتاب کا ایک ایک لفظ اس کے لبوں میں گردش کرتا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے کسی بھی کالے عمل کو اس کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا ہوگا۔

اس نے بیٹے کو فون پر کہا۔ ”وہ پرنس کوئی زبردست جادوگر ہے۔ اسے آسانی سے زیر نہیں کیا جاسکے گا۔ میں چلہ کشی کروں گی، تب ہی وہ شکنجے میں آئے گا۔ تب تک تم میرے پاس آ کر رہو۔ یہاں تمہیں کالے منٹروں کے حصار میں رکھوں گی۔ وہ تمہارے قریب بھی نہیں آسکے گا۔“

وہ بچپن سے ماں کے جادوئی کمالات دیکھتا آ رہا تھا۔ اس کے دست راست والٹو نے کہا۔ ”آپ کو جادو کے ذریعے بھی بچاؤ کی تدبیر کرنی چاہیے۔ آپ کی مام بڑی باکمال وچ لیڈی ہیں۔ آپ وہاں کچھ روزہ کر اپنی مام کی کالی شکتی کو آزمائیں۔“

اس کی ماں کا نام ثانی ووڈ تھا۔ وہ انٹرنیشنل شیطانی سوسائٹی کی ایک اہم رکن تھی۔ خوبصورت تھی لیکن چڑیل صفت تھی۔ ثانی ثانی یعنی بد معاش ثانی کہلاتی تھی۔ استنبول کی ایک قدیم بستی میں بڑھا پا گزار رہی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن ماں کی پناہ میں پہنچ گیا۔ اسے جھینے کی جلدی تھی۔ وہ اتنی جلدی اپنا چہرہ اور اپنی شخصیت تبدیل کر کے نئے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پیرس سے فلورنس پھر فلورنس سے استنبول تک کارمن ڈی موراک کی حیثیت سے ہی سفر کیا۔ خود کو سمجھایا کہ رات کی تاریکی میں اسے دوست اور دشمن دیکھنے نہیں آئیں گے۔

جرائم پیشہ افراد دنیا کے تمام انٹرنیشنل ائرپورٹ پر کسی نہ کسی مقصد سے ضرور موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماسٹر کو بوبو کے ایک ماتحت نے اسے دیکھ لیا پھر فون پر اطلاع دی۔ ”باس! میں استنبول کے انا ترک ائرپورٹ میں کارمن ڈی موراک کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی ماں ثانی ثانی اسے ریسیو کرنے آئی ہے۔“

انہیں خاک میں ملا سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ جل جلالہ وجل شانہ نے اس دنیا کو ایک طرح سے تماشا گاہ بنایا ہے۔ وہ غم و خوشی، عروج و زوال اور... شہ زوری و کمزوری کو الٹ پلٹ کر ہنگامہ آرائیاں جاری رکھتا ہے۔ صحت کے ساتھ بیماریاں اور جوانی کے ساتھ بڑھاپے کی کمزوری لگادی ہے۔ پیہیا گھومتا رہتا ہے۔ ثواب اور عذاب ایک دوسرے کے بھی پیچھے کبھی آگے چلتے رہتے ہیں۔ ان باپ بیٹے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا۔ ان کا دین ایمان سلامت تھا۔ وہ کمزور ہونے والے نہیں تھے لیکن ذرا بھی بھول چوک ہو تو اللہ تعالیٰ انسان کو یہ ضرور دکھاتا ہے کہ اس کی دنیا میں سیر پر سوا سیر بھی ہوا کرتے ہیں۔ اگر ایک فولاد ہے تو کوئی فولاد شکن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اور ایسا ہو رہا تھا اور جو ہو رہا تھا وہ ابھی نامعلوم تھا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا تھا۔ مراد کو اور عالی کو ابھی نامعلوم مصائب سے اور آزمائشوں سے گزرنا تھا۔

ابھی کارمن ڈی موراک کی روداد جاری ہے۔ وہ راتوں رات ہیلی کاپٹر کے ذریعے پیرس اور اٹلی کے ایک سرحدی شہر میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں سے اپنے ملک کے ایک شہر فلورنس میں آ کر شہر روم کی طرف جانے والا تھا۔ اس کے دست راست والٹو کریز نے کہا۔ ”آپ کا کوئی رشتہ دار، کوئی قابل اعتماد دوست بھی روم کی خفیہ پناہ گاہ کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔ وہاں آپ اپنی شناخت تبدیل کر کے محفوظ رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ تم میرے وقادار اور جاں نثار ہو لیکن اندیشہ تمہاری طرف سے یوں ہے کہ پرنس یا اس کا باپ تمہاری گردن دیوچ کر اس پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔ تم ان سے جان نہیں چھڑا سکو گے۔“

”باس! میں بھی آپ کے ساتھ روپوش رہوں گا پھر کوئی ہماری پر چھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔“

وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ ”پتا نہیں کتنے عرصے تک روپوش رہنا ہوگا۔ وہ روبوٹ ہے اسے زیر نہیں کر سکوں گا۔ کیا تمام عمر ایک خفیہ پناہ گاہ میں قیدی بن کر رہوں گا؟“

”پریشانیوں ہمیشہ نہیں رہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری تدبیر سے نہ مرے، ہماری بددعاؤں سے مرجائے۔ ایسا بعض اوقات دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے آج یا کل قدرتی موت آسکتی ہے۔“

کارمن کی ماں ایک وچ لیڈی تھی۔ اسے کالے علوم



طرح دور ہو کر یاد آتی رہتی ہے۔ اس نے صبح تک سونے اور جاگنے کے دوران اسے یاد نہ کرنے کے باوجود یاد کیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ اس کے خیالوں میں آتی رہی تھی۔ دوسری صبح وہ پھر مل گئے۔ سامان سفر کے ساتھ جہاز میں آکر بیٹھ گئے۔ انہیں مسافروں کے درمیان ایسی تنہائی ملی تھی کہ وہ صرف باتیں کر سکتے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیسی ہو؟“

اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ٹھیک ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔“

”اچھی نیند آئی تھی؟“

”آں..... نہیں۔ رات بھر طرح طرح کے خیالات گڈمڈ ہوتے رہے۔ ایک ہی دن میں ایسا صدمہ ملا جو ذہن پر حاوی رہے گا اور اتنی ساری خوشیاں ملی ہیں کہ میں ہواؤں میں اڑی جا رہی ہوں۔ پتا ہی نہ چلا کہ کیسے تمام رات جاگتی رہی۔“

عابی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”کل پہلی بار تمہارے قریب آئی تو بتا نہیں سکتی کیا حال ہو رہا تھا۔ میں اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ خوف نہیں تھا۔ اچھا لگ رہا تھا۔“

”میرا بھی عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا تمہارے پاس چلا آؤں۔ تمہارے بغیر کچھ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ اچانک ہی تم میرے لیے ضروری ہو گئی ہو۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔“

”کیا ہم ابھی دنیا والوں سے دور نہیں جاسکتے؟“

”یہی میں سوچ رہا ہوں لیکن ممکن نہیں ہے۔ پیرس کے ایئر پورٹ پر استقبال کرنے والوں کا جھوم ہوگا۔ ہم وہاں سے اپنی ماں کے ایئر ٹنٹ میں جائیں گے۔“

پھر اس نے کہا۔ ”بہتر ہے میں اپنی ماں کے بارے میں اپنی محبت، عقیدت، جذبات و احساسات بیان کر دوں۔“ وہ اپنی ماں سے بہت متاثر تھا۔ اس کا دیوانہ تھا۔

ماریہ کے لیے ابھی محبت تھی، دیوانگی نہیں تھی۔ پیار کے اہم مراحل سے گزرنے کے بعد دیوانگی طاری ہوتی ہے۔ ابھی وہ ماں کے ایئر ٹنٹ میں گویا ماں کی آغوش میں جانے والا تھا۔

وہ اسے بتانے لگا کہ جینیفر عرف جینی کتنی عظیم تھی کیونکہ اس کی ماں تھی اور ماں کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ بے شک جینی نے ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ اس نے تخلیق کے کرب سے اور بڑے عذابوں سے

ماسٹر نے کہا۔ ”وہ ہمارے پرنس سے چھپنے کے لیے ادھر گیا ہے۔ اسے نظروں میں رکھو۔“

نٹالی بیٹے کی سلامتی کے لیے پریشان تھی۔ وہ پچھلی رات سے عمل پڑھتی رہی تھی۔ اس کی حویلی نما رہائش گاہ کے ایک حصے میں شیطانی سوسائٹی کے ارکان آکر شیطان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ وہاں نٹالی نے اپنے گرو گھنٹال کے تعاون سے بیٹے کے اطراف حصار باندھ دیا۔ یہ اطمینان ہو گیا کہ پرنس عابی اور اس کا باپ بھی کارمن ڈی موراک کے قریب آکر اسے چھو نہیں سکے گا۔

عابی ان کی شیطانی دشمنی سے بے خبر تھا جبکہ نٹالی کئی خطرناک منتر پڑھ کر اس کی سمت حملے کر چکی تھی۔ وہ منتر اس کے آس پاس سے ہوا کی طرح گزر گئے ہوں گے اور یہ ناکامی بتا رہی تھی کہ اس پر نادریدہ شیطانی حملے بھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

عابی کو پیرس جا کر بڑے ہی تلخ اور جذباتی حقائق سے دوچار ہونا تھا۔ ان میں سے ایک تو یہ کہ کارمن کو ٹھکانے لگانا تھا جبکہ وہ دشمن اب پیرس میں نہیں تھا۔ دوسرا اہم معاملہ اپنی ماں جینی سے محبت اور عقیدت کا تھا۔ وہ ماں کے معاملے میں بہت جذباتی تھا۔ اس ماں نے اپنی جان پر کھیل کر اسے جہنم دیا تھا۔ عابی اس کے ایئر ٹنٹ میں جا کر رہتا تو جیسے ماں کی گود میں پہنچ جاتا۔

ڈی جان ہنٹر پورے یورپ میں انسانی اعضا کی خرید و فروخت کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ مراد نے اس کے ایک تجارتی مرکز کو آگ لگا کر اسے کھنڈر بنا کر کروڑوں ڈالرز کا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ تجارتی مرکز یہودیوں کی ملکیت تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ پرنس عابی نے اتنے بڑے ادارے کو نیست و نابود کیا ہے اور عابی نے سخت لہجے میں کہا تھا کہ اسی نے یہ نیک کام کیا ہے۔ آئندہ بھی کرے گا اور پیرس جا کر ڈی جان ہنٹر کے جسمانی اعضا چیل کوٹوں کو کھلائے گا۔

فی الحال جذباتی معاملہ حاوی تھا۔ ماریہ کو منکوحہ بنانے کے بعد وہ پہلی بار ایک صنف نازک کے قریب آیا تھا۔ کار کی محدود چاد دیواری میں وہ تھوڑی دیر تک ایک دوسرے سے لگے رہے تھے پھر فوراً ہی الگ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ صرف شادی کا ہی دن نہیں تھا۔ ایک مقتول باپ اور سرسرا کا ماتم بھی کرنا تھا۔

وہ ایک رات کے لیے دور ہو گئے تھے۔ پہلی بار عابی کو معلوم ہوا کہ قربت کی آنچ دے کر جانے والی کوئی ہستی کس



گزر کر ایک عجیب و غریب بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ماریہ اس کی روداد سن کر لرز گئی تھی۔

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ”میں تمہاری مام کو سلام کرتی ہوں۔ رب کریم سے دعا کرتی ہوں، کوئی ماں پھر کبھی ایسے عذاب سے نہ گزرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔“

عابی نے کہا۔ ”میری دوسری مام کے ساتھ پھر یہی اندیشہ ہے۔ میرے جیسی ایک عجیب و غریب بہن پیدا ہونے والی ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یا خدا.....! کیا واقعی؟“

”ہاں۔“ کوششیں کی جا رہی ہیں کہ میری دوسری مام کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ دنیا جہان کے تجربہ کار ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔ مام کو دن رات اینڈ کیا جاتا ہے۔“

وہ پیرس پہنچ گئے۔ اس روز ان پورٹ کی انتظامیہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا سارا شہر اٹھ آیا ہے۔

یہودی تنظیم کا ایک مسلح لشکر تھا۔ لشکر میں صرف اسلحہ نہیں تھا۔

رنگا رنگ پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے تھے۔ وہ تمام بحرمانہ تنظیمیں جو مراد اور عابی سے سمجھوتا اور دوستی کرتی رہتی تھیں، پرنس کی دلہن کا استقبال کرنے کے لیے پھولوں سے لدی ہوئی آئی تھیں۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک کے نمائندے بھی پھولوں کا انبار لے کر آئے تھے۔

ان پورٹ کے اندر ممنوعہ حصوں میں فرانسیسی حکومت کے سپاہی اور افسران بڑی اپنائیت سے ماریہ اور عابی کو پھول پیش کر رہے تھے۔

اس ملک کے حکمران وہاں سے دور اپنے محلوں میں بیٹھے ٹی وی اسکرین پر انہیں دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

”کیسی مجبوری ہے، ہم پھول پیش کر رہے ہیں جبکہ جانتے ہیں آج سے ہمارے شہر کا، ہمارے ملک کا امن و امان غارت ہونے والا ہے۔“

عابی خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ سب طاقت کی پوجا کر رہے تھے۔ کوئی اس کے نام سے اور صورت سے محبت کرنے کے لیے پھول لے کر نہیں آیا تھا۔ ہزاروں کے ہجوم میں صرف ماسٹر کو بوبو کے جاں نثار کارندے قابل اعتماد تھے پھر یہ کہ اپنی مام تک پہنچنے کے لیے یہودیوں سے بنائے رکھنا لازمی تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ کریگ ہوٹل اور ان کے خاص عہدیداروں کو اندر آنے دیا جائے۔ وہ ان کے ساتھ رہائش کے لیے جائے گا۔ اس طرح ان یہودی اکابرین کو ان کے شایان شان اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ انہیں اطمینان

ہو گیا کہ عابی اب کہیں نہیں بھٹکے گا۔ اپنی مام کے اپارٹمنٹ میں ان کے سامنے ہی رہا کرے گا۔

ڈی جان ہنٹر اپنے وسیع و عریض لاؤنج میں ایک صوفے کے پاس کھڑائی وی اسکرین پر عابی کو دیکھ کر ناگواری سے منہ بنارہا تھا۔ اس شہزادے سے کروڑوں ڈالر کا نقصان اٹھا چکا تھا۔ اس اسپتال میں انسانی دل، گردوں اور آنکھوں کا اچھا خاصا ذخیرہ میڈیکل پروکس سے گزار کر محفوظ کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ مگر پھر عابی (مراد) نے اس انسٹیٹیوٹ کی وسیع و عریض عمارت کو جلا کر رکھ کر دیا تھا۔

ڈی جان ہنٹر انسانی اعضا کی خرید و فروخت کا بہت بڑا تاجر تھا۔ بظاہر نیک کام کر رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ اپنے پیسے اور اعمال کے حساب سے ایک فرشتہ تھا۔ دیکھی انسانیت کے کام آتا رہتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مرنے والے اپنے دل، گردے اور آنکھیں دے کر نہیں جاتے۔ اس دنیا میں کروڑوں ناکارہ افراد ہیں۔ ان کی ضرورتیں پوری کرنے اپنے کاروبار سے لاکھوں کروڑوں ڈالر کماتے رہنے کے لیے چور دروازوں سے دل، گردے اور آنکھیں حاصل کی جاتی ہیں۔

ڈی جان ہنٹر جیسے تاجروں نے جو اسپتال قائم کیے تھے وہاں کسی لاوارث یا گنہگار مریض کے آپریشن کے دوران میں رازداری سے ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ کسی کا پوسٹ مارٹم کرتے وقت اس کے سینے کو دل سے خالی کر دیا جاتا ہے۔ ایسی چوریاں ہوتی ہیں کہ مرنے والے کے عزیزوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ لاوارث لاشوں کے تو دل، گردے اور آنکھیں نکال کر انہیں کہیں بھی پھینک دیں، کوئی پوچھنے نہیں آتا۔ بے رحمی اور درندگی کی انتہا یہ ہے کہ زندہ عورتوں، مردوں اور بچوں کو اغوا کر کے ان کے اہم اعضا نکال لیے جاتے ہیں۔

ڈی جان ہنٹر بھی یہی کر رہا تھا، ان کے علاوہ انسانی کھال، ٹشو اور ہڈیوں کی بھی منافع بخش تجارت ہو رہی ہے۔ میڈیکل سائنس نے کمال دکھایا ہے۔ مردوں کے ٹشو سے زندوں کو نئی زندگی دی جاتی ہے۔ منافع زیادہ کمانے کے لیے زندوں کی بھی شامت آ جاتی ہے۔

یہ چوری شاید پکڑی نہیں جاسکتی کہ ٹشو کس طرح جائز اور ناجائز طریقوں سے حاصل کیے جاتے ہیں؟

جب مراد کو یہ معلوم ہوا تھا کہ ایک نوجوان کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اسے لاوارث سمجھ کر ڈی جان





## سائیکل

جب سائیکل نئی نئی ایجاد ہوئی تو ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو سائیکل لے کر دی، اس کا بیٹا سائیکل لے کر باہر نکلا، تو لوگوں نے دیکھا کہ لڑکے کو کوئی چیز اٹھا کر لے جا رہی ہے اور لڑکا لاتیں چلا رہا ہے لیکن وہ چیز لڑکے کی جان چھوڑ نہیں رہی، لوگوں نے ڈنڈے مار مار کے سائیکل کو توڑ دیا لڑکے باپ کو پتا چلا تو غصے سے بھرا ہوا آیا اور لوگوں سے کہہا۔ ”تم بختوں نے میرے بیٹے کی سائیکل کو توڑ دیا۔“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”چودھری جی اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کے بیٹے کی جان بچ گئی، یہ عجیب چیز آپ کے بیٹے کو اٹھا کر لے جا رہی تھی، ہم لوگ نہ ہوتے تو یہ پتا نہیں اسے کہاں لے جاتی۔“

## پاکستانی

جہنم میں عذاب کے کنوؤں پر ایک ایک فرشتے کی ڈیوٹی تھی، جب کوئی جہنمی کنویں سے باہر نکلتا تو فرشتے اسے دوبارہ دکھیل دیتا، ایک کنواں فرشتے کی ڈیوٹی کے بغیر تھا، ایک فرشتے نے پوچھا۔ ”ہر کنوئیں پر تو فرشتہ مقرر ہے پھر وہ کنواں فرشتے کے بغیر کیوں ہے۔“ جواب ملا۔ ”اس کنوئیں میں پاکستانی ہیں، جب بھی کوئی نکلنے کی کوشش کرتا ہے دوسرے اس کی ٹانگ پکڑ کے پھر اندر کھینچ لیتے ہیں۔“

## ترکیب

کھلونوں کی دکان پر ایک جیسے دو ہرن رکھے تھے ان ہرنوں پر ان کی قیمتیں درج تھیں ایک ہرن کی قیمت پانچ سو جبکہ دوسرے ہرن کی قیمت دو سو درج تھی۔ ایک گاہک نے دونوں کو اچھی طرح دیکھا اور کم قیمت والا ہرن خرید لیا۔ جب گاہک دکان سے چلا گیا۔ سبز زمین نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”دیکھا ہماری سامان بیچنے کی یہ ترکیب، کبھی ناکام نہیں ہوتی۔“

مرسلہ: رضوان ثنوی کرپڑوی۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

ہنٹر کے اس اسپتال میں پہنچا گیا تھا۔ وہاں اس کے دل گردے اور آنکھیں نکال لی گئیں۔ لاش کو کہیں پھینک دیا گیا تھا، تب مراد نے اس درندگی کی سزا اسے دی تھی۔ پورے اسپتال کو جلا کر کھنڈر بنا دیا تھا۔ عالی نے کہا تھا کہ وہ پیرس آکر ڈی جان ہنٹر کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ایسے تمام تاجروں کو جہنم میں پہنچائے گا جو زندہ لوگوں کے اندر سے ضروری اعضا چرایا کرتے ہیں۔

اس وقت ڈی جان ہنٹر صوفے کے پاس کھڑائی دی اسکرین پر عالی کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جن آنکھوں سے گھور رہا تھا وہ اس کی اپنی نہیں تھیں۔ انہیں کسی زندہ شخص کے چہرے سے چرایا تھا۔ اس کا ایک گردہ بھی چوری کا مال تھا۔ سینے میں جودل دھڑک رہا تھا وہ اپنے مکین سے بچھڑ کر اس کے مکان میں آ گیا تھا۔ اس کے ایک گھٹنے کی مرمت یون میرو کے ذریعے کی گئی تھی۔

اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں۔ اس وقت وہ تمام مردوں کا مال متاع سمیٹ کر زندہ کھڑا ہوا تھا اور پچھلے دو برسوں سے بھیک میں مانگی ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔

کوئی مر جائے تو اس کی قبر پر پھول بچھائے جاتے ہیں۔ اگر جی جلائی جاتی ہے اور گلاب کا عرق چھڑکا جاتا ہے۔ ڈی جان ہنٹر نفسیاتی مریض تھا۔ آدھا مردہ تھا۔ اپنے اوپر پرفیوم اسپرے کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب اسپرے کی ہوئی خوشبو کم ہونے لگتی تو وہ گھبرا جاتا تھا۔ فوراً نئی پھرا اسپرے کرتا تھا۔ اسی لیے خوشبوؤں کے شہر پیرس میں رہتا تھا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون کے پاس آ کر وہاں بیٹھ کر نمبر پڑھے۔ کوئی پراسرار اجنبی تھا۔ پہلے بھی کال کر چکا تھا۔ اس نے سوچا کال ریسیو کرے یا نہ کرے؟ تجسس تھا۔ کیسے ریسیو نہ کرتا؟ اس نے ریسیو کر لیا اور کال سے لگا لیا۔

دوسری طرف سے اجنبی کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”اسکرین پر پرنس کو دیکھ رہے ہو یا اپنی موت کو.....؟“ وہ پیرس کی زمین پر قدم رکھ چکا ہے۔“

ڈی جان ہنٹر نے کہا۔ ”اپنی بات کرو۔ تم دعویٰ کرتے ہو کہ پرنس مجھے ایک ذرا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تم ہو کون؟ میں کیسے یقین کروں؟“

”تمہیں یقین دلانا ضروری نہیں ہے۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار کر تمہارے پورے کاروبار پر قبضہ جما سکتا ہوں لیکن چاہتا ہوں تم راضی خوشی اپنی تمام تجارت میرے نام لکھ دو۔ اس کے عوض میں تمہیں عالی کے حلقوں



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**

Like Liked Message

✓ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First  
See new posts at the top of News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow



سے بچاؤں گا۔ تم اپنی طبعی عمر تک آرام سے زندگی گزارتے رہو گے۔“

”میں کیا پاگل ہوں کہ ہر ماہ حاصل ہونے والا کروڑوں کا منافع تمہارے نام لکھ دوں؟ پہلے سامنے تو آؤ۔“

”میں روپوش رہنے پر مجبور ہوں اس لیے تمہارے ساتھ یہ گیم کھیل رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے تمہیں ختم کر دوں۔ تمہارے بعد تمام منافع اپنے طور پر جبراً حاصل کرتا رہوں گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا تم خود کو سپر مین سمجھتے ہو؟“

”میری طاقت دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھو۔ تم اچھل کر کھڑے ہو جاؤ گے۔ پھر اپنی واکنگ اسٹک کو اپنے سر پر مار کر بیٹھ جاؤ گے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ یکبارگی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ واکنگ اسٹک کو اپنے سر پر نہیں مارنا چاہتا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سر پر ماری پھر ٹیلیفون کے پاس بیٹھ گیا۔

وہ حیرانی سے منہ کھول کر خلا میں ٹکنے لگا۔ ریسورکان سے لگا ہوا تھا۔ اجنبی کی آواز سنائی دی۔ ”کیا ہوا.....؟“ دیکھ لیا.....؟ یہ میں ہوں۔ جو کہہ دیتا ہوں وہی ہوتا ہے۔ اب اٹھو اور اپنی موت کیسے آئے گی یہ دیکھو۔“

وہ نکلخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن جانے لگا۔ وہاں اس نے ایک الماری کھولی۔ پھر ایک دروازہ کھول کر اس میں سے پستول نکال لیا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ جونہی چاہتا ہے، وہ بے اختیار کر رہا ہے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اپنا دماغ اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ کوئی اس پر قبضہ بجا کر اپنے طور پر اسے استعمال کر رہا ہے۔

وہ الماری کی طرف سے گھوم کر قد آدم آئینے کے سامنے آ گیا۔ وہاں اس کے رو برو دوسرا ڈی جان ہنٹر بھی پستول لیے کھڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔

پھر گولی چل گئی۔ فائرنگ کی زوردار آواز کے ساتھ ہی آئینہ ایک چھنا کے سے کرچی کرچی ہو کر دور تک بکھر گیا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ پستول کو پھینک کر اپنے آپ کو ٹٹولنے لگا پھر جلد ہی یقین ہو گیا کہ ابھی زندہ ہے۔

وہ لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے فون نکال کر تھپی سی اسکرین کو دیکھا۔ وہی اجنبی تھا۔ رابطہ کرنے پر بولا۔ ”چند لمحوں میں موت بھی ملی

اور زندگی بھی۔ یہ ہے میرا تماشا..... سوچو تمہارے جسم میں اپنا کوئی پیدائشی عضو نہیں ہے۔ چوری ڈکیتی کے مال سے کب تک جیو گے؟ تمہاری زندگی یوں بھی مختصر ہے۔ آئے دن اپنے اعضا کی مرمت کراتے رہتے ہو۔ دوبارہ گردے تبدیل کرا چکے ہو۔ سینے میں پرایا دل پریشان کرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹروں اور دواؤں کے ذریعے اس کی دھڑکنیں قائم رکھتے ہو۔ بہتر ہے آرام سے میری چھاؤں میں عیش کرتے ہوئے دنیا سے جاؤ۔ اپنا تمام کاروبار میرے نام لکھ دو۔ میں آسانی چاہتا ہوں۔ مشکل پیدا کرو گے تو آج رات ٹھیک بارہ بجے تمہاری سانسیں روک دوں گا۔ سوچ لو۔ موت کس کے ہاتھوں سے چاہتے ہو؟ عالی کے ہاتھوں سے یا مجھے زحمت کرنی ہوگی؟“

فون خاموش ہو گیا۔ وہ گم صم سا بیٹھا ہوا تھا۔ فرش پر درور تک شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بکھر چکا تھا۔ اب تو وہی اجنبی اسے سیٹ کر رہی سہی زندگی دے سکتا تھا۔

☆☆☆

ایئر پورٹ میں وہی رونق تھی۔ وہی جھوم تھا۔ پرنس عالی اور ماریہ کی سواری وہاں سے جارہی تھی۔ ان کے آگے پیچھے یہودیوں کی گاڑیاں تھیں اور درجنوں مسلح محافظ تھے۔ ماسٹر کو بوبو کے کارندوں کی بھی کئی گاڑیاں تھیں۔ یہ شاہانہ جلوس ثابت کر رہا تھا کہ دوست ہوں یا دشمن، عالی کی شہ زوری کو تسلیم کر رہے ہیں۔

سپر پاور کے محل میں درجنوں اعلیٰ عہدیدار تھے۔ انہوں نے اسکاٹپ کے ذریعے اپنے اتحادیوں سے رابطہ رکھا تھا۔ وہ سب ٹی وی اسکرین پر عالی اور ماریہ کو دیکھ رہے تھے اور اپنے اپنے طور پر تبصرے کر رہے تھے۔

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”عالی ایک انتہا پسند مسلمان ہے۔ ہمارے یہودی اراکین اس کے آس پاس رہ کر دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ جب بھی حالت جنگ میں رہتا ہے، اپنی آسمانی کتاب کی آیتیں انگریزی ترجمے کے ساتھ پڑھتا ہے اور دشمنوں کو سمجھاتا ہے کہ اللہ انہیں کیسی منافع بخش ہدایات فرماتا ہے۔ ان ہدایات پر عمل کرنے والے کس طرح فلاح پائیں گے۔“

ایک عہدیدار نے کہا۔ ”میں نے مالدوا جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تنہا عالی سے شکست کھانے والے فوجیوں میں دو افسر اور سات سپاہیوں نے دین اسلام قبول کیا تھا۔“

ایک نے کہا۔ ”نوجوان نسل اس سے متاثر ہو رہی



## یوم آزادی

یوم آزادی ہی سے متعلق ایک بات اور ہے۔ اس موقع پر چند روز پہلے سے اپیلیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں کہا جاتا ہے۔  
”یوم آزادی شایان شان طور پر منایا جائے۔“

”جھنڈیوں اور پرچموں سے اپنے مکان اور دکانیں سجائیں۔“  
”پاکستانی پرچموں سے بازار سجائیں۔“  
”پوری قوم کو اس پر مسرت موقع پر بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔“

ٹیلی ویژن پر کچھ لوگوں کو دکھایا جاتا ہے جن میں زیادہ تر بچے ہوتے ہیں۔ شاید ٹیلی ویژن والوں کے ذہن میں ہو کہ یوم آزادی محض کھیل کا موقع ہے۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے، میں یوں کروں گا اور کوئی کہتا ہے کہ میں دوں کروں گا۔ اسی طرح ریڈیو پر بھی اپیلیں کی جاتی ہیں اور اخبارات میں بھی بیانات چھپتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں واقعی لوگ گھروں، مکانوں، دکانوں اور بازاروں میں پاکستانی پرچم کی جھنڈیاں لہرا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ یہ بہار 14 اگست کو دیکھنے والی ہوتی ہے مگر اس کے دوسرے روز سے جھنڈیوں کی شکل میں چھپے ہوئے ان قومی پرچموں کا جو حشر دیکھنے میں آتا ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ کاش اپیلیں کرنے والے کچھ اس کے بارے میں بھی ذکر فرمادیا کریں۔ سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر گلیوں اور تالیوں میں جس طرح پرچم والی ان جھنڈیوں کی توقیر ہوتی ہے، اسے دیکھ کر شرم سے سر جھک جاتا ہے۔

اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل

ہم مسلمانوں کو وہشت گرد ثابت کرنے اور ان سے متفر کرنے کے ہتھکنڈے آزما رہے ہیں اور یہ جنگ لڑتے ہوئے آیتوں کے ذریعے یہ تاثر دیتا رہتا ہے کہ مسلمان لڑتے وقت بھی محبت، امن و آشتی کی باتیں کرتے ہیں اور صرف باتیں ہی نہیں کرتے، امن و شانتی کا عملی ثبوت بھی دیتے ہیں۔“

ایک حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ اس سے کوئی غلطی نہیں ہو رہی ہے۔ یہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا رہا ہے۔ کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ یہ صرف طاقت سے ہی نہیں حسن سلوک سے بھی برتری حاصل کر رہا ہے۔ یہ بہت گہرا ہے۔“  
ایک نے پوچھا۔ ”ہم کب تک تماشائی بن کر رہیں گے؟“  
دوسرے نے بے بسی سے کہا۔ ”ہاں، ہم تماشائی ہیں۔ خود اپنا تماشا دیکھ رہے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”افسوس! ہم ایک کمزور قوم کی طرح دعائیں مانگ رہے ہیں اور اچھے دنوں کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اور کیا کریں۔ دوانہ ملے تو ایک دعا ہی رہ جاتی ہے۔“  
اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”شاید دعا قبول ہو رہی ہے۔ کل رات میرے ساتھ عجیب سا واقعہ پیش آیا ہے؟“

سب ہی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ”میں سونے سے پہلے ڈائری لکھنے کا عادی ہوں۔ رات کو بیڈروم میں تنہا تھا۔ اچانک ہی محسوس ہوا کہ کوئی موجود ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہوا؟ میں نہیں جانتا۔ بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوئی آن نہیں سکتا تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ میرا وہم ہے۔ میں پھر لکھنے کے لیے ڈائری پر جھک گیا پھر عجیب سی بات ہوئی۔ اچانک ہی محسوس ہوا کہ میرا دماغ میرے اپنے قابو میں نہیں ہے۔ میں بے اختیار وہ لکھ رہا ہوں جو بھی سوچا بھی نہیں تھا پھر میرے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ نارمل ہو گیا ہوں۔ میں نے حیرانی سے ڈائری کے اس صفحے کو دیکھا میں نے وہاں لکھا تھا۔ ”طاقت کا توازن کبھی بڑھتا رہتا ہے۔ کبھی گھٹتا رہتا ہے۔ تم بڑھنے والے ہو۔ اس کے برابر ہونے والے ہو۔ اسے جھکا نہیں سکو گے، وہ بھی تمہیں جھکا نہیں سکے گا۔“  
پھر اس تحریر کے نیچے لکھا تھا۔ ”تمہارا نجات دہندہ.....“

حاکم اعلیٰ نے وہ ڈائری نکال کر اس صفحے کو کھول کر کیمرے کے سامنے لا کر کہا۔ ”آپ حضرات دیکھیں۔ اس



صحنے پر میں اپنی باتیں لکھ رہا تھا۔ اس کے نیچے اچانک تحریر بدل گئی ہے۔

”کیا یقین آ گیا؟ یہ قصہ کہانی نہیں ہے؟“

سب ہی کے سر ہاں کے انداز میں ہلنے لگے۔ حاکم اعلیٰ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے بھی جہاں جہاں جن ملکوں میں تھے وہاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ حاکم اعلیٰ کہہ رہا تھا۔ ”ہم تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ سے التجا ہے کہ ہم سے یو لیں۔ ہم سے متعارف ہوں۔ آپ ہمیں اپنا جاں نثار دوست بنائیں گے۔“

اسکرین پر تحریر ابھرنے لگی۔ ”سیاست کی اور جرائم کی دنیا میں کوئی کسی کے لیے جان نثار نہیں کرتا۔ سب اپنا اپنا الوسیدھا کرتے ہیں۔ کام کی باتیں کر دو۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم سپر پاور کہلاتے ہیں۔ پرنس عالی ہماری سادھ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔“

دوسرے اتحادی کہنے لگے۔ ”ہم امن و امان چاہتے ہیں۔ وہ جس ملک سے بھی گزرتا آ رہا ہے وہاں قانون کے خلاف ہنگامے برپا کر رہا ہے۔ اب وہ پیرس میں رہے گا تو اپنی من مانی کرے گا۔ اپنے دینی احکامات کے مطابق حکومت فرانس کے قوانین کے خلاف دشمنوں کو سزا دیں دیتا رہے گا۔“

تحریر ابھرنے لگی۔ ”انسان کے خیالات اور نظریات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ مذاہب ایک دوسرے کے خلاف فسادات پھیلاتے ہیں۔ یہ پھیل رہا ہے۔ یہ ہنگامے قیامت تک رہیں گے۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”یہ دنیا جیسی بھی رہے۔ ہم اپنی برتری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل میں ہیں۔ پلیز اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے ہمارے کام آئیں۔“

تحریر ابھری۔ ”پرنس عالی کو دیکھو۔“

ان سب نے ٹی وی کے چینل تبدیل کیے۔ وہ چینل دیکھنے لگے۔ اسکرین پر عالی اور ماریہ کالائیو پروگرام پیش کیا جا رہا تھا۔ عالی اپنی مام کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ کار سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف مسلح گارڈز تھے۔ اسی اسکرین پر کی بورڈ کی کھٹا کھٹ سنائی دی پھر تحریر ابھری۔ ”تمنا شاید کھو۔ عالی نشانے پر آ گیا ہے۔“

سب نے دیکھا۔ عالی کے سامنے جو سکیورٹی افسر تھا۔ اس نے اچانک ہی عالی کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”خبردار.....! مجھ پر جواباً حملہ نہ کرنا۔ وعدہ کرتا ہوں جان نہیں لوں گا۔ صرف زخمی کر کے دنیا والوں کو دکھاؤں گا کہ سیر پر سوا سیر آ گیا ہے۔“

اچانک ایسی سچویشن پیدا ہو گئی تھی کہ اس وقت ٹی وی

تمام اتحادی اپنے اپنے ٹی وی پر اس تحریر کو دیکھ رہے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”آپ ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ اچانک ہی آپ کے ساتھ ایسا جادو ہو چکا ہے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کیا اسے جادو کہیں گے؟ ایسا کس نے کیا ہوگا؟ آپ بتائیں، اس کے بعد کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ پھر وہی بیڈروم کی خاموشی اور تنہائی تھی۔ میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ خود کو میرے نجات دہندہ کہتے ہو۔ پلیز سامنے آؤ۔ کوئی نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ”نہ آؤ۔ مگر کچھ بول تو سہی۔“

”میں نے انتظار کیا لیکن ایسی خاموشی رہی جیسے وہاں میرے ساتھ کوئی عجیب سی غیر معمولی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ میری تو فینڈاڑ گئی تھی۔ وہ خود کو نجات دہندہ کہنے والا مجھے تجسس اور اضطراب میں مبتلا کر کے چلا گیا تھا۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ تو بڑی پراسرار سی قصہ کہانیوں والی بات ہو گئی ہے۔ اگرچہ ثبوت ہے، یہ کہانی نہیں ہے پھر بھی کیا ہم بہلتے رہیں؟ کیا کسی نامعلوم نجات دہندہ سے اندھی امیدیں رکھیں؟“

ایک حاکم نے کہا۔ ”وہ تو ایک شوشہ چھوڑ گیا ہے۔ ہم نہ چاہنے کے باوجود اس کا آسرا کرتے رہیں گے۔“

”ہاں، یہی سمجھ میں آ رہا ہے۔ ہم آسمان کی طرف دیکھتے رہیں گے لیکن من و سلوکی نہیں اترے گا۔“

اس عہدیدار نے ایسا کہتے ہی ایک زور کا ہاتھ میز پر مارا پھر دوسری بار تیسری بار بھی یہی کیا۔ ایک حاکم نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے مسٹر ڈین! خود کو تکلیف کیوں پہنچا رہے ہو؟“

اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ”میں ایسا نہیں کر رہا تھا۔ اپنی مرضی کے بغیر بے اختیار ایسا ہو رہا تھا۔“

دوسری اسکرین پر دیکھا گیا۔ وہاں ایک عہدیدار اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے باہر گیا۔ پھر اسی طرح دوڑتا ہوا واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ دوسرے عہدیدار بھی یکے بعد دیگرے یہی کرنے لگے۔

حاکم اعلیٰ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

اچانک ایسی آواز ابھری جیسے کی بورڈ پر انگلیاں چل رہی ہوں۔ تمام ٹی وی اسکرین پر تحریر ابھرنے لگی۔



کہ وہ افسر نہ جانی دشمن تھا، نہ اس نے بھاری رقم کے لالچ میں گولی چلائی تھی۔ وہ وفادار افسر احمق نہیں تھا کہ سخت سیکورٹی کے درمیان رہ کر گولی مارتا اور خود مارا جاتا۔

مراد دور سے تماشا دیکھتا رہا تھا۔ اس نے فون پر کہا۔ ”بیٹے! وہ سیکورٹی افسر اپنا رٹل نہیں تھا۔ لیکن اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ اس کے اپنے قابو میں نہیں تھا۔“

عابی نے کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کسی پراسرار علم کے ذریعے اس کے دماغ کو جکڑ لیا گیا تھا۔ کوئی اسے اپنا آلہ کار بنا کر مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔“

مراد نے کہا۔ ”اگر اس سیکورٹی افسر کو گولی نہ ماری جاتی تو ہم ضرور معلوم کر لیتے کہ اس نے تمہیں مار ڈالنے کے لیے اپنی جان کا خطرہ کیوں مول لیا تھا؟ کس نے اسے ٹریپ کیا تھا؟ شاید ہم اس پراسرار شخص تک پہنچ جاتے۔“

ہم زاذب النساء، بشری اور بلے سب ہی نے وہ منظر دیکھا تھا۔ پریشانی یہ تھی کہ عابی پر پہلی بار جیسا پراسرار حملہ ہوا تھا، اس کے پیش نظر یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ آئندہ ایسے حملے ہوتے رہے تو وہ کسی نادیدہ دشمن پر جوانی حملہ نہیں کر سکیں گے اور یہی اس دشمن کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

فی الحال یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ کسی روپوش ہونے والے تک پہنچنے میں کچھ تو وقت لگتا ہے۔ اس وقت تک وہ نہ جانے اور کیا کرنے والا تھا۔

وہ سب یہی دعائیں مانگ رہے تھے کہ آئندہ کبھی حملے سے پہلے ہی وہ نظروں میں آجائے۔ یہودی اکابرین بھی پریشان تھے۔

عابی نے ماریہ کے ساتھ اپارٹمنٹ کے اندر آ کر کہا۔ ”مشکلیں پیش آتی رہتی ہیں۔ مصاحب سے گزرتے وقت بھی زندگی کو اپنی روشنی کے مطابق گزارنا پڑتا ہے۔“

وہ ماریہ کو بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ ”دشمن وار کرے ہم پیار کرتے رہیں گے۔ یہ میری مام کا گھر ہے۔ میں اپنی مام کے لیے ایک بہو کا خوبصورت تحفہ لایا ہوں۔ اپنی ماں کی چار دیواری میں ان کی چھاؤں میں تمہیں سرسبز دیتا رہوں گا۔“

وہ ایک دوسرے کو بڑے پیار سے وصول کرنے لگے۔ ماریہ نے دھیمی سی لڑتی ہوئی سرگوشی میں کہا۔ ”میں کیا کہوں کتنا اچھا لگ رہا ہے مگر ڈر بھی لگ رہا ہے۔“

عابی نے کہا۔ ”ہاں۔ ہمیں نادانی سے بچنا چاہیے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔“

انتظار کی بات پر وہ اور قریب ہو گئی۔ الگ نہیں ہونا

دیکھنے والے کروڑوں افراد دم بخود رہ گئے۔ سپر پاور اور اس کے تمام اتحادی تو اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

ماریہ اچھل کر عابی کے سامنے آ گئی۔ اس سے لپٹ کر ڈھال بن گئی تھی۔ سیکورٹی افسر نے اپنی بات ختم کرتے ہی ٹریگر کو دبایا۔ یہ اب تک دیکھنے میں آیا تھا، ابھی ایک گولی بھی اس کے وجود کو چھو کر نہیں گزری تھی۔ موت اس سے کترا کر نکل جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ بالکل قریب سے نشانہ خالی کیا۔

پھر اسے دوسرا موقع کیسے ملا۔ چاروں طرف سے تڑا تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ سیکورٹی افسر چھلنی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ایک بہت بڑا یادگار رہنے والا ڈراما اچانک شروع ہو کر ختم ہو گیا۔ تمام مخالفین جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

حاکم اعلیٰ نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے پکارا۔ ”مسٹر ان لون! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ یہ کیا ہو گیا؟ ایسا سنہری موقع ضائع ہو گیا۔ کیا عقل تسلیم کرتی ہے کہ قریب سے گولی چلائی جائے اور آدمی نہ مرے؟“

اسکرین پر تحریر ابھری۔ ”تمہیں تماشا دکھایا ہے۔ میں جب چاہوں گا، اس بجوے کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ ابھی کر دیتا تو پھر کیا رہ جاتا؟ تمہارے سارے دلزدہ دور ہو جاتے۔ پھر کیا میری پوجا کرنے کے لیے تم لوگ یہاں بیٹھے رہتے؟ کبھی نہیں۔ سوچو کہ میں تمہارے لیے کتنا اہم ہوں؟ یہ تو طے ہے کہ سیجا ہوں۔ تم سب میرے بیمار ہو۔ بیمار ہو پھر کسی وقت تمہاری نبض ٹٹولنے آؤں گا۔“

اسکرین سے تحریر بجھ گئی، وہ چلا گیا۔ بے شک اس نے پرنس عابی کی شہ رگ تک پہنچ کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی اس کی یقینی موت بن سکتا ہے۔ اس کے موجودہ رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت مغرور، ضدی، سرکش اور سر پھرا ہے۔ اتنی جلدی آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

☆☆☆

مراد اور عابی کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ ایسی حیرت انگیز چونکا دینے والی واردات ہوئی تھی، جس کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ عابی اپنی مام کے لیے بڑی عقیدت اور جذبوں سے اس اپارٹمنٹ میں آیا تھا لیکن حالات کی تبدیلی نے عقیدت اور جذبوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انکوائری ہو رہی تھی کہ وہ وفادار اور جاں نثار سیکورٹی افسر اچانک پرنس کا جانی دشمن کیوں بن گیا تھا؟

انکوائری کرنے والوں کو جلد ہی معلوم ہونے والا تھا



چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ ”جب خواہش بے لگام ہو جائے تو عقل بھی بے لگام ہو جاتی ہے۔ بندے کو اور زیادہ ترغیب دیتی ہے۔ ہم کوئی غلطی کریں گے تو بعد میں نقصان اٹھانا پڑے گا۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے الگ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”تم بہت شہ زور ہو۔ تمہاری جیسی قوتِ ارادی مجھ میں نہیں ہے۔“ ماریہ نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ عالی نے کہا۔ ”میرے ساتھ ناموافق حالات میں بھی زندگی گزارنی ہوگی۔ جو خواہشات پھل رہی ہیں، ان پر قابو پانے کی کوششیں کرتی رہو۔ اگر ہم سنبھل کر رہ سکیں گے تو بہتری ہوگی ورنہ.....“

ماریہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”ہمارے درمیان دیوار اٹھانی ہوگی۔ اپنے اندر سے تحریریں و ترغیب کی لعنت کو دور کرتے رہنے کی کوششیں کی جائیں تو خود اعتمادی اور قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں خود پر جبر کرتے ہوئے نادانی سے بچنا ہے۔ یہاں آرام سے بیٹھ کر سوچو اچھی طرح سمجھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں کریگ ہوسٹن اور دو چار یہودی اکابرین اس کے منتظر تھے۔ اسے اپارٹمنٹ کے ایک ایک کمرے میں لے جا کر اس کی مام سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں دکھانے لگے۔ ہر کمرے کی دیواروں پر جینی کی مسکرائی ہوئی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ وہ بڑے جذبول سے محبتوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک کمرے میں بہت بڑی ٹی وی اسکرین تھی۔ کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ”آپ یہاں بیٹھیں اور اپنی مام کو چلتے پھرتے اور بولتے ہوئے دیکھیں۔“

عالی ماریہ کو وہاں لے آیا۔ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ کر جینتھر عرف جینی کو متحرک دیکھنے لگے۔ وہ اسکرین پر بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ماں کو دیکھ کر وہ بھی خوشی سے کھل گیا۔

پہلا منظر یہ تھا کہ جینی رنگا رنگ فواروں کے سامنے خوشی سے رقص کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”آج مجھے دنیا کی بہت بڑی خوشی مل رہی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔“

وہ ایک سمت ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”کیا اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد بھی تم نادیدہ رہو گے؟ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں، کیا اپنے بچے کے سامنے بھی نہیں آؤ گے؟“

اپنی ماں کی بے چینی اور تڑپ دیکھ کر عالی نے دل

میں کہا۔ ”بابا کو اب مام کے سامنے آنا چاہیے تھا۔“ منظر بدل گیا۔ جینی اسپتال کے بیڈ پر تھی۔ پیٹ پھولا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں ایک بیٹے کو جنم دوں گی لیکن بیٹا عام بچوں سے مختلف ہے۔ جسامت زیادہ ہے۔ میڈیکل رپورٹ اسے عجوبہ کہہ رہی ہے۔ میں اس پر قربان ہو رہی ہوں۔ کہتے ہیں زچگی اپنا رٹل ہوگی، میجر آپریشن سے گزرتا ہوگا۔“

وہ بڑی ممتا سے بول رہی تھی۔ ”میں اپنے گاڈ سے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ او گاڈ.....! میں اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔“

عالی ماں کی یہ بات سن کر تڑپ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرے بچے! میں یہ آڈیو ریکارڈنگ تمہارے لیے کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں نہ رہوں، میری باتیں تو رہیں گی۔ میرا دل کہتا ہے میں نہیں رہوں گی تب بھی تم کہیں بیٹھے مجھے دیکھ رہے ہو گے۔ ان لمحات میں یقیناً میری روح کو سکون ملے گا۔“

ماں نے جو سوچا تھا، وہی ہو رہا تھا۔ وہ ان لمحات میں ماں کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں سے متحرک دیکھ رہا تھا پھر منظر بدل گیا۔ وہ ایک نیم تاریک کمرے میں بیڈ پر پڑی تھی۔ تکلیف سے کراہتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لیے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر تم سے آخری باتیں کر لوں۔ پھر یہ ویڈیو ریکارڈ نہیں رہے گی۔ صبح کی فلائٹ سے مجھے تمہارے بابا کے پاس ارضی اسلام بھیجا جا رہا ہے۔ بیٹے! تم باپ کے دین پر چلو گے۔ ماں بڑے عذابوں سے گزر کر تمہیں جنم دینے والی ہے۔ کیا اس کی بے لوث ممتا کا انعام اسے نہیں دو گے؟ کیا ماں کے دین کو چھوڑ دو گے؟ بے شک تم جو دین چاہو اسے قبول کرو۔ مسلمان رہنا چاہو مسلمان رہو لیکن ایک وعدہ کرو، ماں کے دین سے کبھی دشمنی نہیں کرو گے۔ میرے بزرگانِ دین کی توہین نہیں کرو گے۔ تمام یہودی اکابرین کی تعظیم کرو گے۔ ایک بات ابھی اپنے دل پر لکھ لو، کبھی کسی یہودی کو پتھر مارو گے تو وہ پتھر تمہاری ماں کو آ کر لگے گا۔ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں بولوں گی۔ میرے بچے! یہ کبھی نہ بھولنا کہ ایک زلزلے سے گزر کر تمہیں جنم دینے والی ہوں۔“

اس کی آخری باتیں دل میں اتر جانے والی اور گھر کر جانے والی تھیں۔ وہ اس لیے بھی متاثر ہو رہا تھا کہ ماں نے دین اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے باپ کا دین قبول کرنے کو ضرور کہا تھا لیکن بیٹے سے منصفانہ طور پر



اپنے دین کے تحفظ کی ضمانت چاہی تھی۔

ویڈیو ریکارڈنگ کے اختتام پر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ یہودی اکابرین اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا رہے تھے کہ ماں کی باتوں نے اسے اسیر کر لیا ہے۔ آئندہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود یہودیوں کا ہم نوا رہے گا۔ انہیں کبھی کسی وجہ سے بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہ اپنی مام کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھنے کے دوران ماریہ سے کچھ فاصلہ رکھ کر بیٹھا ہوا تھا پھر اسے بدن کی آنچ محسوس ہوئی۔ وہ اتنی دیر میں آہستہ آہستہ کھسک کر اس سے آگئی تھی۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”تمہارے لیے سب سے پہلے دینی تربیت لازمی ہے۔ ہم جب تک اپنی عمر کے حساب سے معصوم رہ سکتے ہیں، ہمیں معصوم رہ کر غلطیوں سے پاک رہنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ میرا فیصلہ ہے، تم بالغ ہونے تک ارض اسلام میں رہ کر دینی تعلیم و تربیت حاصل کرتی رہو گی۔“

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تمہاری توقع سے زیادہ یہیں رہ کر دینی تعلیم و تربیت حاصل کروں گی۔ تم جلد ہی مجھ پر فخر کرو گے۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ الگ ہونے کی بات نہ کرو۔ میں جان دے دوں گی۔“

”تم میری شریک حیات ہو۔ میں تم پر ظلم نہیں کروں گا لیکن تمہارے فیصلے کی قوت بہت کمزور ہے۔ میرے ساتھ رہو گی تو بہکتی رہو گی مجھے بھی بہکتی رہو گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں، تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔ کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ جب تک تم میری قربت کے باوجود پارسار ہو گے، تب تک میں بھی پارسارہ کر دکھاؤں گی۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اندر حوصلے اور ارادوں کی پختگی ہو۔ ٹھیک ہے ہم ساتھ رہیں گے لیکن ہمارے درمیان فاصلہ رہا کرے گا۔“

وہ دور ہو گیا۔ وہاں سے دوسرے بیڈروم میں آ گیا۔

☆☆☆

کریگ ہوسٹن اپنی رہائش گاہ میں دوسرے اکابرین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان سب کو عالی پر ہونے والے ناکام حملے نے پریشان کر دیا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ آئندہ ہونے والا حملہ ناکام نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ بچاؤ کی تدبیر کیسے کی جائے؟

انہوں نے سپریا اور ان کے اتحادیوں سے رابطہ کیا اس بلائے ناگہانی کے متعلق اس سے پوچھا۔ وہاں سے جواب ملا۔ ”ہاں۔ ایک پراسرار شخص نے تحریر کے ذریعے ہمیں مخاطب کیا تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دینے کے لیے پرنس عالی پر قاتلانہ حملہ کر لیا تھا۔ ہم سب بی ڈی اسکرین پر وہ منظر دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ ہم نے اس سے ناکامی کی وجہ پوچھی کہ تم اتنی آسانی سے اس کے پاس پہنچ گئے تھے پھر قریب سے گولی چلانے کے باوجود اسے ہلاک کیوں نہ کر سکے؟ اس نے تحریر کے ذریعے جواب دیا۔ ”یہ تم لوگوں کو محض ایک تماشہ دکھایا ہے۔ میں جب چاہوں گا اس عجوبے کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ ابھی کر دیتا تو پھر کیا رہ جاتا؟ تمہارے سارے ولد و دور ہو جاتے پھر کیا میری بوجہ کرنے کے لیے تم لوگ یہاں بیٹھے رہتے؟ کبھی نہیں..... سوچو کہ میں تمہارے لیے کتنا اہم ہوں؟ یہ تو طے ہے کہ مسیحا ہوں۔ تم سب میرے بیمار ہو۔ پھر کسی وقت تمہاری نبض مٹنے لگے آؤں گا۔“

”اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اسکرین پر پھر کوئی تحریر نہیں ابھری۔“

کریگ ہوسٹن نے پوچھا۔ ”اس واردات کو چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا اس نے پھر رابطہ نہیں کیا؟“

”نہیں، وہ اپنی اہمیت منوا کر گم ہو گیا ہے۔ پتا نہیں وہ کس طرح کا گیم کھیل رہا ہے؟ ہمیں یقین ہے کسی دن کسی وقت ہم سے رابطہ ضرور کرے گا۔“

سپریا اور اس کے اتحادیوں سے یہ باتیں سن کر کریگ ہوسٹن نے یہودی اکابرین کو دیکھا۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”وہ پراسرار شخص بہت لمبا گیم کھیل رہا ہے۔ سیاسی بساط پر بڑی طاقتوں کے لیے چیلنج بن چکا ہے۔“

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ”پرنس عالی پر حملہ کر کے ہمارے مقاصد کو ہماری پلاننگ کو خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ ہمارے لیے بھی چیلنج بن گیا ہے۔“

”اس وقت دنیا کے تمام اٹھیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس، تمام خفیہ ایجنسیاں اسے ڈھونڈ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں گی لیکن وہ بولتا نہیں ہے۔ تحریر کے ذریعے خود کو متعارف کرا رہا ہے۔ ابھی اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ہی ڈی جان ہنٹر نے ان سے رابطہ کیا۔ اس انسانی اعضا کے تاجر سے یہودیوں کا گہرا



کاروباری رشتہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پراسرار اجنبی پرنس عابی پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے پاس آیا تھا اور ٹیلیفون کے ذریعے بات کی تھی۔

وہ تمام اکابرین حیرانی سے اس کی باتیں سننے لگے۔ چشم تصور سے دیکھنے لگے۔ ڈی جان ہنٹر کا دماغ اس کے شکنجے میں آ گیا تھا۔ وہ بے اختیار اپنی الماری کے پاس گیا تھا۔ وہاں سے ایک پستول نکال کر اس نے آئینے کے سامنے آ کر اپنے عکس کو گولی ماری تھی۔ یہ ثابت کیا تھا کہ وہ خود کو گولی مار کر حرام موت مر سکتا تھا لیکن اسے زندگی دی جا رہی تھی۔ شرط یہ تھی کہ وہ انسانی اعضا کی تمام تجارت اس اجنبی کے نام لکھ دے۔ اگر انکار کرے گا تو آج رات بارہ بجے مارا جائے گا۔

ڈی جان ہنٹر کی یہ باتیں سنتے ہی ان اکابرین میں سے ایک نے کہا۔ ”فوراً اس کی بات مانو۔ اس کے نام اپنا کاروبار لکھو گے تو اس کا نام، پتا ٹھکانا معلوم ہو جائے گا۔“ کریگ ہوشن نے کہا۔ ”اس نے تمہیں کال کی تھی۔ اس کا نمبر تمہارے پاس ہوگا۔ اسے فوراً سمجھو۔“

اس نے نمبر سمجھنے کے بعد کہا۔ ”مجھے اس کی بات ماننی پڑے گی۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ جتنی زندگی مل سکتی ہے اسے جی لیتا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی اس کے ہاتھوں سے بچا نہیں سکے گا۔“

کریگ ہوشن نے کہا۔ ”تمہارا کاروبار ہے، تم جانو۔“ انہوں نے ڈی جان ہنٹر سے رابطہ ختم کیا۔ اکابرین میں سے ایک نے کہا۔ ”کیا اس نمبر پر اس سے رابطہ ہو جائے گا؟“

دوسرے نے کہا۔ ”جسے پوری دنیا کے جاسوس ڈھونڈ رہے ہیں، کیا وہ ہمیں گھر بیٹھے آسانی سے مل جائے گا؟“ ایک نے کہا۔ ”یہ اس شخص کی ایکسٹرا سم ہوگی۔ اسے ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے بعد فون سے نکال دیتا ہوگا۔“

اسی وقت کریگ ہوشن کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ اسکرین پر نمبر پڑھتے ہی چونک کر بولا۔ ”وہی اجنبی ہے۔ وہی نمبر ہے جسے ڈی جان ہنٹر نے ابھی بھیجا ہے۔“

وہ سب ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ فون کا لاؤڈ اسپیکر آن ہو گیا۔ ایک بھاری بھر کم سی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہاں، درست سمجھ رہے ہو۔ یہ ایکسٹرا سم ہے۔ ابھی رابطہ ختم ہونے کے بعد میرے فون سے نکل جائے گی۔“

کریگ ہوشن نے باتیں سننے کے دوران اپنے پی اے کو اشارہ کیا کہ وہ اس نمبر کا سراغ لگائے۔ ادھر سے فون پر اس نے کہا۔ ”ہاں، یہ نمبر تمام اعلیٰ جنس والوں کو بھیج دو۔ وہ میرے سائے کے پیچھے بھاگنا شروع کریں گے۔“

کریگ ہوشن چونک گیا۔ اس نے پی اے کو اشارے سے کہا تھا اور اجنبی نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ وہاں ہے اور ان سب کو دیکھ رہا ہے۔

اس نے جلدی سے کہا۔ ”مسٹر انون! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ پلیز ہم سے دوستی کریں۔“

ادھر سے آواز آئی۔ ”یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں نے تمہارے سب سے بڑے بزنس ایجنٹ ڈی جان ہنٹر کو آج رات مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ تمہارے ہر دل عزیز پرنس عابی کو میں نے گولی مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپ حضرات مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہیں؟“

ہوشن نے کہا۔ ”اس دنیا میں سب ہی طاقت کو سلام کرتے ہیں۔ تمہاری طاقت کا کسی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔ پلیز اپنا مختصر سا تعارف پیش کرو۔“

”مختصر سا تعارف یہ ہے کہ میں طاقت تھا، طاقت ہوں اور طاقت رہوں گا۔ میرا نام طاقت ہے۔ طاقت کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے میری کوئی صورت کوئی ایک رہائشی جگہ نہیں ہے۔ ہوا کسی ایک جگہ نہیں رہتی۔ میں جب چاہتا ہوں جہاں سے چاہتا ہوں ہوا ہو جاتا ہوں۔“

”تم ڈی جان ہنٹر کا کاروبار اپنے نام کرنا چاہتے ہو۔ پھر تو تمہیں اپنا نام پتا ٹھکانا ظاہر کرنا ہوگا۔“

”وہ میرے کسی آلہ کار کے نام ہوگا۔“

”تم نے ہمارے پیشوائے اعظم اور ربیوں کے بیانات پڑھے ہوں گے۔ ہماری کتابوں اور بزرگان دین کی پیش گوئی کے مطابق پرنس عابد علی منگی ہمارے دجال معظم کا نمائندہ ہے۔ یہ ہمارے دین کا اور یہودی قوم کا بول بالا کرے گا۔ تم ہمارے مذہب سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟“

”مجھے کسی مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”پھر پرنس عابی کو کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہو؟ کیا اس سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

اس نے کہا۔ ”خاص وجہ طاقت کا توازن ہے۔ فی الحال ہماری اس دنیا میں صرف عابد علی منگی ہی میرے لیے چیلنج ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنے زیر اثر لا کر اسے اپنا تابعدار بنا کر رکھنا چاہتا ہوں اگر وہ زیر اثر



ملازم نے ان سب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔  
”ابھی فون پر میں ہی بول رہا تھا۔“  
سب ہی اسے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ”میں نے اچانک ہی اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پایا تھا اور یہ صاف سمجھ رہا تھا کہ آپ سے فون پر باتیں کر رہا ہوں۔ میں اس کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا آپ حضرات کو دیکھ رہا تھا اور بڑی دلیری سے ناقابل گرفت کہلا رہا تھا۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”او گاڈ! وہ ان فون اس کے اندر رہ کر بول رہا تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔“  
کریگ ہوشن نے کہا۔ ”یہ صاف سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ کسی کے بھی دماغ میں کھس آتا ہے۔ پرنس عالی پر حملہ کرتے وقت سیکورٹی آفیسر کے دماغ میں گھسا ہوا تھا۔“  
ایک نے کہا۔ ”اور ڈی جان ہنٹر کے دماغ میں جا کر اس کے ہاتھوں سے اس کے ہی عکس پر گولی چلائی تھی۔“  
”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے آپ کے کسی کے بھی اندر آ کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہم اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بن کر رہ جائیں گے۔ سوچیں ایسا ہوگا تو ہماری اپنی حیثیت..... کیا رہ جائے گی؟ او گاڈ.....! ہم صفر ہو جائیں گے۔“

یہ حقیقت سب ہی کے لیے انتہائی تشویش ناک تھی کہ انسانی کھوپڑیوں میں کھس کر جنگ لڑنے اور فاتح بننے والا شہ زور پیدا ہو گیا تھا اور جلد ہی اپنی طاقت کا لوہا منوانے والا تھا۔

موجودہ حالات میں یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ مقابلتا پرنس عالی کی پوزیشن کیا ہوگی؟ کیا وہ اپنے دماغ میں کھس آنے والے طوفان کو روک سکے گا؟  
کریگ ہوشن نے کہا۔ ”ایک بات سمجھنے کی ہے۔ یہ ان فون جس طرح ڈی جان ہنٹر کے سیکورٹی آفیسر کے اور ہمارے ملازم کے دماغوں میں آچکا ہے اسی طرح پرنس عالی کے اندر بھی جا کر اس کے ہی ہاتھوں سے گولیاں چلا سکتا تھا۔ اسے آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا؟“

ایک عہدیدار نے کہا۔ ”وہ کہہ چکا ہے کہ عالی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف اپنی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔“

”سوچنے سمجھنے کے لیے یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ وہ پرنس عالی کے دماغ میں بھی جا کر ایسا مظاہرہ کر سکتا تھا لیکن اب

نہیں آئے گا تو آج پوری دنیا یہ تماشا دیکھ چکی ہے کہ میں چشم زدن میں پرنس کی شہ رگ تک پہنچ گیا تھا۔ ابھی اسی لمحے میں پھر پہنچ سکتا ہوں لیکن جلدی نہیں ہے۔ میں فاتح رہوں گا اسی لیے دشمن کو سوچنے اور دم لینے کی مہلت دے رہا ہوں۔“  
ہوشن نے کہا۔ ”موجودہ حالات میں اندازہ ہو گیا ہے کہ تم فاتح ہو سکتے ہو لیکن تاریک پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر تم زیر ہو جاؤ گے تو مارے جاؤ گے یا پرنس سے سمجھوتا کرو گے۔ یہ دانشمندی ہوگی کہ ابھی سمجھوتا کرو۔ دوستی اور امن وامان کا راستہ اختیار کرو۔ اس طرح ہمارے صیہونی مقاصد کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہماری دوستی سے تمہیں فائدہ پہنچتا رہے گا۔“

وہ بولا۔ ”میں دشمنی سے فائدے حاصل کرنا جانتا ہوں۔ ایک بنیادی بات کہہ چکا ہوں۔ اس دنیا میں ابھی پرنس عالی اپنی طاقت کا لوہا منوار رہا ہے، اب میں سیر پر سوا سیر بن کر آ رہا ہوں۔ صرف ہم دو طاقتوں کے درمیان جنگ جاری رہے گی۔ باقی چھوٹی بڑی قوتیں ہماری آلہ کار بن کر رہنے پر مجبور رہا کریں گی۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”ہمارا خیال ہے پرنس عالی خون خرابا پسند نہیں کرے گا۔ ایک بار اس سے گفتگو کرو۔ ہو سکتا ہے اس سے کسی طرح کا سمجھوتا ہو جائے۔“  
”ہم آگ اور پانی ہیں۔ دوستی نہیں ہو سکے گی پھر بھی ایک بار اس سے بھی غائبانہ ملاقات ضروری ہے۔ اسے میری قوت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ آئندہ اور ہوگا۔ میں کسی وقت اس سے بات کروں گا۔ اوکے، اب یہ فون ختم ہو رہا ہے۔“

فون خاموش ہو گیا۔ وہ سب خاموشی سے ایک دوسرے کو نکتے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”وہ جا چکا ہے۔“  
ہوشن نے کہا۔ ”وہ یہاں موجود تھا۔ میں نے پی اے کو اشارے سے جو کہا اسے وہ دیکھ رہا تھا۔“

وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم کہہ نہیں سکتے کہ وہ جا چکا ہے۔ اس نے صرف فون کو آف کیا ہے۔“  
ایک عہدیدار نے کہا۔ ”ہم کیسے مجبور اور بے بس ہو گئے ہیں۔ اس کے غیر معمولی علم کے آگے اندھے اور بہرے بن گئے ہیں۔ وہ بولے گا تو ہم سنیں گے اور ہم اس کی مرضی کے بغیر اسے دیکھ نہیں سکیں گے۔“

ایسے وقت کریگ ہوشن کا ایک ملازم کمرے میں آیا پھر دست بستہ ہو کر بولا۔ ”سر! میں بول رہا تھا۔“  
ہوشن نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا بول رہے تھے؟  
کب بول رہے تھے؟“



”وہ کہہ رہا تھا“ کسی دن آپ سے غائبانہ ملاقات کرے گا۔“

اچانک ہی کریگ ہوشن کی آواز اور لہجہ بدل گیا۔ وہ بولا۔ ”اور یہی ہماری غائبانہ ملاقات ہے۔“

عالی کسی حد تک سمجھ گیا پھر بھی اس نے پوچھا۔ ”مسٹر ہوشن! آپ کی آواز کیوں بدل گئی ہے؟“

بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”میں ان نون بول رہا ہوں۔“

عالی نے کہا۔ ”اچھا تو تم ہو..... بولو۔“

وہ بولا۔ ”میں بہت اچھا دوست ہوں اور بہت برا دشمن ہوں۔ ابتدا میں دوستی کروں گا لیکن دشمنی دائمی ہوگی۔“

وہ ذرا چپ ہوا۔ عالی نے کہا۔ ”میں نے سن لیا..... اور کچھ؟“

”دوستی کروں گا اپنے مفادات کے لیے۔ دشمنی کروں گا تمہارے مفادات کچلنے کے لیے.....“

”کچلنے کے لیے براہ راست سامنے آؤ۔ مسٹر ہوشن کو بیساکھی بنا کر باتیں کیوں بنا رہے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”یہ میرا طریقہ کار ہے۔ ابھی جو کہہ رہا ہوں، اسے سننے کے لیے کریگ ہوشن اور یہودی اکابرین کی موجودگی بھی لازمی ہے۔ پہلے تمہارے ساتھ تھوڑی نیکی کر رہا ہوں۔ ان یہودیوں کا فراڈ تمہیں بتا رہا ہوں۔ آج تم نے ٹی وی اسکرین پر اپنی ماں جینیفر کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ ایک کرائے کی یاڈل گرل تھی۔“

یہ ایسی دھماکا خیز اطلاع تھی کہ ادھر تمام یہودی اکابرین چیخ پڑے۔ ”مسٹر ہوشن! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

کریگ ہوشن فون کو کان سے لگائے ان سب کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ ان نون کے شکنجے میں رہ کر اپنے ہی خلاف بول رہا تھا۔

وہ تمام اکابرین کے منع کرنے کے باوجود بے اختیار بولتا جا رہا تھا۔ ”پرنس.....! وہ ماڈل گرل تھرنی کننگٹن اسٹریٹ لندن میں رہتی ہے۔ اس کا نام مار تھا ہے۔ تم ابھی اس سے بات کر سکتے ہو۔ اس کا فون نمبر.....“

کئی اکابرین دوڑتے ہوئے آگئے۔ انہوں نے کریگ ہوشن کا منہ بند کر دیا۔ اس سے فون کو چھین کر دور پھینک دیا۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ہوش میں آؤ۔“

وہ تو ہوش میں آگیا لیکن وہ فون جہاں جا کر گر تھا۔ وہاں سے ایک عہدیدار نے اٹھا لیا تھا۔ اسے کان سے لگا کر مار تھا کا فون نمبر بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”پرنس.....! میں

تک پرنس سے دور ہے۔ اس سے فاصلہ رکھنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔“

”بے شک ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا پرنس عجوبہ ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔“

”ہمیں ان نون کے بارے میں ابھی جتنی معلومات حاصل ہوئی ہیں، انہیں پرنس کے علم میں لانا چاہیے۔“

کریگ ہوشن نے ماریہ کے ممبر شیخ کے رابطہ ہونے پر کہا۔ ”میڈم! پرنس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”ویٹ اے منٹ۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آئی پھر دستک دے کر بولا۔ ”مسٹر ہوشن کی ضروری کال ہے۔“

عالی نے دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اس سے فون لے کر کہا۔ ”اسے کھلا رہنے دو۔ ابھی فون واپس کروں گا۔“

اس نے اپنے بیڈروم میں آکر فون پر پوچھا۔ ”ویل مسٹر ہوشن! کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”آپ کے ان نون دشمن کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس کی پراسرار قوت یہ ہے کہ وہ کسی کے بھی دماغ میں گھس جاتا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”اور جس کے دماغ میں گھستا ہے اس سے اپنی مرضی کے مطابق عمل کراتا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”یہ تو اسی وقت سمجھ میں آگیا تھا جب اس سکیورٹی آفیسر نے اپنے انجام سے بے خبر ہو کر مجھ پر گولی چلائی تھی۔ وہ اپنے ہوش میں، اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ کوئی اس کے دماغ کو آپریٹ کر رہا تھا۔“

”ہاں۔ ہمیں بھی اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دماغوں میں گھسنے والا ٹھیل کھیل رہا ہے۔ پھر جب ڈی جان ہنٹر اور سپر پاور کے حکام کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے تو یقین ہو گیا ہے۔ پرنس! وہ صاف الفاظ میں کہہ رہا تھا کہ آج تم پوری دنیا میں اپنی طاقت کا لوہا منوا رہے ہو۔ اب وہ منوائے گا۔ یہاں اور کوئی تیسری سپر پاور نہیں ہوگی۔ صرف آپ دونوں ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں گے۔“

باقی قوتیں تماشائی بن کر تابعدار بن کر رہا کریں گی۔“

”وہ اپنے ارادے بیان کر رہا ہے۔ آپ سننے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔“

”ہم آپ کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ کسی دن کسی وقت بھی آپ کے دماغ میں گھس آئے گا۔“

”تو پھر روکا کس نے ہے؟ آتا کیوں نہیں ہے؟“



کرو گے۔ میرے بیٹے ایک بات ابھی اپنے دل پر لکھ لو  
کبھی کسی یہودی کو پتھر مارو گے تو وہ پتھر تمہاری ماں کو  
آ کر لگے گا۔“

انہوں نے واقعی دل میں اتر جانے والی باتیں ایک  
فرضی ماں کے ذریعے کہلوائی تھیں۔ اب وہ تمام ڈراما نگاری  
کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ عابی نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔  
فی الحال اس فریب کو خاموشی سے برداشت کرنا تھا۔

اس نے فون کے ذریعے مراد سے رابطہ کیا۔ اسے  
تمام موجودہ حالات بتائے پھر کہا۔ ”بابا جانی! مجھے ان  
یہودیوں کے حصار سے چپ چاپ نکل جانا چاہیے۔“

”ہاں مگر جلدی نہ کرو۔ جو حقیقت معلوم ہو چکی ہے  
اس سے انجان بن کر رہو۔ ابھی یہ سمجھنا ہے کہ ان نون جانی  
دشمن ہو کر تمہیں یہودیوں کی چالبازی سے آگاہ کیوں کر رہا  
ہے؟ وہ اس کھیل سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟“

”بابا جانی! آپ کی سمجھ میں کیا آتا ہے؟“  
”سیدھی سی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تم یہودیوں  
کے دشمن ہو جاؤ گے تو وہ لوگ تم سے نمٹنے کے لیے ان نون  
سے دوستی اور سمجھوتا کریں گے۔“

”یہودیوں کی دشمنی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میں  
آئندہ ان سے دوستی نہ جانتے ہوئے دشمنی کا جواب دیا کروں  
گا۔ یہ سچ ہے کہ منافقوں سے بھری ہوئی دنیا میں دشمنی دوستی  
کی طرح اور دوستی دشمنی کی طرح ہوا کرتی ہے۔“

بعض اوقات زندگی میں ہر سمت سے مسائل و  
مصائب کی یلغار ہوتی ہے۔ ایک پراسرار ان نون بہت ہی  
زبردست چیلنج بن گیا تھا۔ پتا نہیں کتنے عرصے تک سر پر مسلط  
رہنے والا تھا۔

عابی نے اب تک اپنے دماغ میں ناگواری خلاف  
معمول باتیں محسوس نہیں کی تھیں اور نہ ہی اپنے اختیار سے  
باہر ہو کر دماغی کمزوری محسوس کی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہا  
تھا اور معمول کے مطابق عبادت میں مصروف رہنے لگا تھا۔

ادھر ان نون بڑی واردات کرنے اور اپنی غیر معمولی  
طاقت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود عابی کے قریب نہیں آ رہا  
تھا۔ اس نے دور ہی سے فون کے ذریعے اس سے گفتگو کی تھی۔  
وہ کسی وجہ سے مجبور ہو گیا اس کی اپنی حکمت عملی ہوگی۔ وہ خود ہی  
فاصلہ رکھنا چاہتا ہوگا۔ بہر حال وہ عابی کے اطراف گھیرا تنگ  
کر رہا تھا لیکن قریب آ کر تنگ نہیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

یہودی اکابرین بوکھلا گئے تھے۔ یہ بھید کھل رہا تھا کہ

ان نون بول رہا ہوں۔ تم نہیں جانتے یہاں کریک ہوشن کا  
منہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس بے چاری مار تھا  
کا بھی منہ بند کر دیا جائے، اس نمبر پر میری اطلاع کی  
تصدیق کرو۔“

کئی اکابرین اس عہدیدار پر بھی ہل پڑے۔ اس فون  
کا سوچ آف کر دیا گیا۔ عابی نے اپنے خاموش فون کو دیکھا۔  
یہ ایک عجیب سچویشن تھی۔ اس کا جانی دشمن اسے یہودیوں کے  
فراڈ سے آگاہ کر رہا تھا۔ عابی نے مار تھا کے نمبر پیچ کیے۔ فوراً ہی  
رابطہ ہو گیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو کون؟“

”میں پرنس عابد علی منگی بول رہا ہوں۔ کیا تم مار تھا ہو؟“  
وہ بہت ہی جوشیلے انداز میں بولی۔ ”کیا واقعی.....؟“  
اومائی گاڈ.....! تم پرنس عابد علی منگی ہو؟“

”ہاں۔ ابھی میں نے تمہاری ویڈیو ریکارڈنگ  
دیکھی۔ تم نے واقعی کمال کی ایکٹنگ کی ہے۔ ہو بہو میری مام  
لگ رہی ہو۔“

”آں.....؟“ وہ ذرا گڑبڑائی پھر بولی۔ ”لیکن  
انہوں نے کہا تھا کہ میں کبھی تم سے نہیں ملوں گی۔ کبھی کسی  
سے اس ویڈیو ریکارڈنگ کا ذکر نہیں کروں گی۔“

”بے شک انہوں نے کہا تھا لیکن اب اس معاملے کو  
راز نہیں رکھا جا رہا ہے۔ انہوں نے مجھے تمہارا یہ نمبر دیا ہے۔  
میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”اومائی گڈنس! یہ میرے لیے  
بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ میں کل ہی پیرس آ جاؤں گی۔“  
”آ جاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔“

عابی نے فون بند کر دیا۔ گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔  
اس کی آنکھوں کے سامنے ویڈیو ریکارڈنگ کے مناظر۔۔۔

یکے بعد دیگرے دکھائی دینے لگے۔ اسے ماں کے حوالے  
سے دلی صدمہ پہنچنے لگا۔ اب وہ مار تھا تھی۔ آہ.....! تہ ماں  
تھی، نہ ممتا کے سچے بھرپور جذبات تھے۔ محض اداکاری تھی۔

یہودیوں نے ایک بیٹے کے جذبات سے کھیلنے کے  
لیے ایک کرائے کی ماں کو استعمال کیا تھا۔ وہ ایسا ڈراما نہ بھی  
کرتے تو وہ جانتا تھا سمجھتا تھا کہ اس کی مام اپنے بیٹے کے  
لیے کسے جذبات رکھتی ہوگی لیکن اس نے ایک ماں کی صحیح  
تصویر نہیں دیکھی تھی۔

یہودیوں نے اسے اپنے دین سے باندھ کر رکھنے  
کے لیے اس کی فرضی ماں سے یہ کہلوا یا تھا۔ ”وعدہ کرو ماں  
کے دین سے کبھی دشمنی نہیں کرو گے۔ میرے بزرگان دین  
کی توہین نہیں کرو گے تمام یہودی اکابرین کی تعظیم



ایک کرائے کی جینیفر عرف جینی کی جھوٹی مناسبت کے ذریعے پرنس عالی کو الو بتایا جا رہا ہے۔

یہ سچ ثابت ہو گیا تھا کہ مارتھا نامی ایک ماڈل نے ویڈیو ریکارڈنگ میں اس کی ماں کا رول لیے کیا تھا۔ وہ یہودی اکابرین ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ عالی کو ان نون کی باتوں کا یقین نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ عالی مارتھا تک پہنچ کر اس کے منہ سے سچ سنے اس کا منہ ہی بند کر دینا چاہیے۔

ایسے نیک کاموں میں دیر نہیں کی جاتی۔ اس مقصد کے لیے خفیہ ایجنسی کے قاتل مارتھا کے آپریشنس میں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ان نون بھی وہاں پہنچ گیا۔ مارتھا نے اس یہودی شخص کو دو گن میمنوں کے ساتھ دیکھا تو کہا۔ ”مسٹر والٹن! میں آپ کو کال کرنے والی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ میری وہ ویڈیو ریکارڈنگ راز میں رہے گی۔ کبھی اس بیٹے کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں اس کی ماں بن کر ایکٹنگ کر رہی تھی۔“

والٹن نے کہا۔ ”ہاں، تمہیں یہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا۔ کیا پرنس نے اس سلسلے میں تم سے کچھ کہا ہے؟“

”اس نے ابھی شام کو مجھے کال کی تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اس ویڈیو میں، میں نے اس کی ماں کا رول لیے کیا ہے۔“

”کیا تم نے اعتراف کر لیا ہے کہ وہ درست کہہ رہا ہے؟“

”ہاں، جب وہ جانتا ہے تو میں اعتراف کیوں نہ کرتی؟“

والٹن نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”یونان سنس! تم ابھی اسی وقت اپنی موت کو کال کر چکی ہو۔“

اس نے دوسرا ہاتھ مارتے ہوئے ایک شوٹر کو حکم دیا۔

”اسے ختم کرو اور چلو یہاں سے۔“

اس شوٹر نے ایک الٹا ہاتھ والٹن کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مارتھا کے طمانچے کا جواب ہے۔“

وہ غصے سے تلملا کر گالیاں دینا چاہتا تھا پھر اس کی گن کا رخ اپنی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بے یقینی سے بولا۔

”مجھے گولی مارو گے؟ کیا دماغ چل گیا ہے؟“

ان نون کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”جہاں میں آجاتا ہوں وہاں دماغ ایسے ہی گھوم جاتا ہے۔ یہ سن لو کہ مارتھا میری آلہ کار ہے۔ میں نے اس کے ذریعے ضروری معلومات حاصل کی ہیں۔ اس کے طمانچے کا جواب طمانچہ ہے تو اس کی موت کا جواب تم تینوں کی موت ہوگی۔“

والٹن ایک تھپڑ کے بعد ہی سہا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم مارتھا سے دشمنی نہیں کریں گے۔ ہمیں سلامتی

انہوں نے سلامتی سے اپنے اکابرین کے پاس آکر وہاں کی روداد سنائی۔ یہ ان کے لیے انتہائی فکر و تر دو میں مبتلا کرنے والی بات تھی کہ ان نون ان سے بہت ہی سنگین دشمنی کر رہا تھا۔ عالی کو ان سے متفر کر رہا تھا۔

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”ان نون نے یہ کہا تھا کہ اس دنیا میں دو ہی طاقتیں ہوں گی۔ ایک تو وہ خود ہوگا اور دوسرا پرنس عالی رہے گا۔ وہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہیں گے۔ باقی قوتیں ان کے زیر اثر تماشاکی بن کر رہیں گی لیکن وہ تو عالی سے نہیں، ہم سے لڑ رہا ہے۔ عالی کو فائدہ اور ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ”اس کا جواب تو وہی دے گا۔ اگر وہ سن رہا ہے تو پلیز اتنا بتاؤ گے ہم سے دشمنی کیوں کر رہا ہے؟“

ایک عہدیدار نے کہا۔ ”مسٹر ان نون! ہم تمہیں نہیں جانتے۔ شاید انجانے میں بھی تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا ہے پھر تم پرنس عالی کو کیوں ہم سے بدظن اور متفر کر رہے ہو؟“

وہ سب چپ رہ کر انتظار کرنے لگے۔ اس کی طرف سے خاموشی تھی۔ انہوں نے کئی بار خوشامداندہ انداز میں اسے مخاطب کیا لیکن مایوس ہوتے رہے۔ پھر کریگ ہوسٹن نے عالی سے ٹون پر رابطہ کیا۔ ”پرنس! ہم بہت پریشان ہیں۔ یہ ان نون بڑی مکاری سے تمہیں ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”میں بھڑک جانے والا نادان بچہ نہیں ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

ہوسٹن نے کہا۔ ”میں ان نون کی یہ چالاکی بتا دوں کہ اس نے کسی مارتھا کے دماغ میں گھس کر اسے تمہاری مام جینی بنایا ہے۔ تمہارے پاس اس کا فون نمبر پہنچایا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”میں مارتھا سے باتیں کر چکا ہوں۔ مسٹر ہوسٹن! جولا کھوں، کروڑوں ناظرین کے سامنے مجھے گولی مارنے اور جانی دشمن ہونے کا اعلان کر چکا ہوں وہ کبھی دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنی تو عقل ہے مجھ میں.....“

وہ بولا۔ ”تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم اس مکار دشمن کو خوب سمجھ رہے ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ تم ہمارے جیسے نیک نیت اور محبت کرنے والوں سے دور ہو جاؤ۔ خدا کا شکر ہے۔ نہ تم نادان ہو نہ ہم تمہارا ساتھ کبھی چھوڑیں گے۔“

فی الحال عالی کی یہی حکمت عملی تھی کہ دشمنوں کی چال بازیاں سمجھ میں آجائیں اور کسی چال بازی کے جواب میں فوری کارروائی ضروری نہ ہو تو کوئی رد عمل پیش نہ کیا جائے۔ انجان



لکھا تھا۔ ”آج رات سونے سے پہلے ایک ایسا دھماکا کروں گا کہ تم ہل کر رہ جاؤ گے پھر ان یہودیوں کو ہلا کر رکھ دو گے۔“

اس نے ماریہ کو فون دیتے ہوئے کہا۔ ”یہی زندگی ہے۔ شیطانی معاملات پیچھے آتے رہتے ہیں۔ ہم حوصلے سے آگے آگے چلتے رہیں گے۔“

☆☆☆

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حسن بکھرا پڑا ہے۔ حسین نظارے پکارتے ہیں..... آؤ ہم سے لطف اندوز ہونے کے لیے آؤ۔ یہی زندگی ہے۔ ہم ایک محدود ماحول تک رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

عابی کو بھی حالات نے جکڑ دیا تھا۔ وہ پیرس جیسے خوبصورت شہر میں آکر ماریہ کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی تھی۔ نامحرم نہیں تھی۔ اسے اپنی دھڑکنوں سے لگا سکتا تھا لیکن لاکھ شہ زور ہونے کے باوجود اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

حالات تقاضا کر رہے تھے کہ وہ صرف جنگ جاری رکھے اپنی زندگی میں تفریح کے لمحات کو نظر انداز کرتا رہے۔ اس کی زندگی میں ایکشن ہی ایکشن رہے۔ پیار و محبت کا ایکشن اور ری ایکشن نہ رہے اور یہ سراسر ظلم ہو رہا تھا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ آخر تک آمد بجنگ آمد کے مصداق ماریہ کو لے کر حالات کے زنداں سے نکل آیا تھا۔

پیرس کا حسن دیکھنے سے نظر آتا ہے۔ تصویروں میں دیکھو تو یہی حسن آدھے سے بھی آدھا رہ جاتا ہے۔ الفاظ میں تعریفیں سنو تو خواب جیسا لگتا ہے۔ جو دیکھنے کی چیز ہے، اسے آنکھوں سے ضرور دیکھنا چاہیے۔

وہ دونوں پہلی بار اس شہر کی خوبصورتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایفل ٹاور کی بلندی پر آگئے تھے۔ وہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا پورا شہر یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے قدموں تلے دور تک جادو کی شطرنج کی طرح بجھتا چلا گیا ہے۔ وہ سحر زدہ سے ہو کر ماور کے دائرے میں چھوڑ جاتے رہے اور بدلتے ہوئے نظارے دیکھتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں سحر زدہ سے ہو رہے تھے۔ اپنے آپ میں نہیں رہے تھے۔ ممنوع قربت کو بھول گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ کبھی کبھی اس کے بازو سے لگ جاتی تھی اور وہ کبھی سرکشی کے لیے بے اختیار اس پر جھک جاتا تھا۔

بن کر دشمنوں کو خوش فہمی میں رکھا جائے کہ اگلا نادان ہے۔ عابی نے نادان اور انجان بن کر انہیں مطمئن کر دیا۔ وہ فون تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کسی سے بھی بات کرنا نہ ہوتا وہ ماریہ کے فون پر بولتا تھا۔ اس نے ماریہ کے دروازے پر دستک دی۔ اسے فون واپس کرنا تھا۔ وہ دونوں تنہا ایک چھت کے نیچے صرف کھانے بیٹے اور ضروری باتیں کرنے کے لیے یکجا ہوتے تھے۔ باقی وقت اپنے اپنے بیڈروم میں رہا کرتے تھے۔ ماریہ نے فون لینے کے لیے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھولا تو خوشبو کا ایک تازہ جھونکا سا آیا۔

اس نے بہت ہی دیدہ زیب لباس پہنا ہوا تھا۔ نگاہوں کو سنبھال رہی تھی۔ عابی نے اسے بڑی محبت سے دیکھ کر کہا۔ ”بہت حسین بہت ہی دل نشین لگ رہی ہو۔ تم میری زندگی ہو۔ میرے ساتھ رہنے آئی ہو۔ ایک بات کہوں؟“

”کہو۔ دل سے سنوں گی۔“

”اگر میری طرح مستقل مزاج رہو گی۔ مضبوط ارادے رکھو گی تو ہم ابھی آؤنگ کے لیے جائیں گے۔“

وہ فوراً ہی خوش ہو کر بولی۔ ”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتی ہوں۔ آپ اپنی ماریہ کو نوا دیا میں گے۔“

ایسے وقت فون پر پیسج کی ٹون سنائی دی۔ عابی نے بٹن کو دبایا، اسکرین پر لکھا تھا۔ ”میں رنگ میں بھنگ نہیں ڈالتا چاہتا۔ جاؤ خوب انجوائے کرو۔“

یہ بات تشویش ناک تھی کہ وہ ماریہ کے دماغ میں آکر ان میاں بیوی کی باتیں سن رہا تھا۔ عابی نے کہا۔ ”تم میرے دماغ میں نہیں آ سکتے۔ ابھی ماریہ کے اندر موجود ہو۔“

اسے جواب نہیں ملا۔ عابی نے یہی بات پیسج کے ذریعے کہی تو فون پر اس کی تحریر ابھری۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ماریہ تم سے دور رہے تو اس کے دماغ میں پہنچ جاتا ہوں۔“

عابی نے فوراً ہی مراد سے رابطہ کر کے کہا۔ ”بابا جانی! وہ دشمن ماریہ کے دماغ میں آ جاتا ہے۔ آپ فوراً... ہینا ٹائمز کرنے والے کی خدمات حاصل کریں۔ وہ اس کے دماغ کو لاک کر دے گا تو پھر وہ خبیث میری شریک حیات کے قریب نہیں آ سکے گا۔“

باب نے اسے تسلی دی۔ ”انتظار کرو۔ ابھی ایک تنویمی عمل کرنے والا آ جائے گا۔“

اس نے ماریہ سے کہا۔ ”ہم تنویمی عمل کے بعد آؤنگ کے لیے جائیں گے۔“

ادھر ان نون نے ایک اور پیسج ارسال کیا۔ اس نے



وہ اپارٹمنٹ میں آکر بڑی دیر تک اس کے سینے سے لگی رہی۔ عالی بہت خوش تھا۔ اسے سمیٹ لینا اور بار بار چوم لینا چاہتا تھا لیکن بہت زیادہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔

اس نے سمجھایا۔ ”صرف کچھ دنوں کی بات ہے۔ ابھی دور ہو جاؤ اور مستقل مزاجی کا ثبوت دو۔ ہم خلاف اصول خلاف عقل جلد بازی سے پرہیز کریں گے۔“

وہ دوسرے بیڈ روم میں آگیا۔ آدھی رات گزرنے والی تھی۔ ایسے وقت ماریہ نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازے کو کھولا۔ اس نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہی کجخت ان نون ہے۔۔۔۔۔“

وہ فون دے کر چلی گئی۔ عالی نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”پلیز! میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔ یہ میرے آرام کا اور نیند کا وقت ہے۔ جو بولنا ہے کم سے کم الفاظ میں بولو۔“

وہ بولا۔ ”ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ جواب ملے گا تو کتنے ہی راز کھلتے چلے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ تمہاری مام کی وفات کے بعد اس کی لاش یہودی ڈاکٹروں کے حوالے کیوں کر دی گئی؟ اس کی آخری رسومات ادا ہونے تک تمہارے بابا جانی کو یا کسی اہم رشتے دار کو وہاں موجود رہنا چاہیے تھا۔ یا تمہاری مام کی تدفین ارض اسلام میں ہو سکتی تھی۔ وہاں کیوں نہ ہوئی؟“

یہ ایسی باتیں تھیں کہ عالی بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم بہت ہی اہم سوالات کر رہے ہو۔ میں نے اس پہلو سے بھی سوچا نہیں تھا۔ میں بابا جانی سے پوچھوں گا کہ میری مام کی میت کو اہمیت کیوں نہیں دی گئی تھی؟“

”مجھے پتا ہے۔ تمہارے بابا جانی جو جواب دیں گے اسے ابھی میں سنا دیتا ہوں۔“ وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”جتنے اہم افراد تمہاری مام کی زندگی سے اور اس کی موت سے دلچسپی لیتے رہے، میں ان سب کی کھوپڑیوں میں گھس کر بہت سے اہم راز معلوم کرتا رہا ہوں۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ یہ تمہاری نیند کا وقت ہے۔ مجھے مختصر بولنا چاہیے لیکن یہ روداد ذرا لمبی ہے۔ اب بولو کہ آگے بولوں یا تمہیں سونے دوں؟“

”تم نے نیند اڑا دی ہے۔ آگے بولو۔“

”بات تمہاری مام سے شروع کرتا ہوں۔ جینی ایک بہت ہی ٹاپ کی کامیاب ماڈل گرل تھی۔ وہ یہودی تھی لیکن اسے اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“

عالی نے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کیا تم میری مام کے دماغ

پیرس کا حسن اور ان دونوں کی اپنی ذات میں رہے بے ہوئے جذبے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ ایسی بے خودی میں کوئی نہ ہونے والی بات ہو سکتی تھی۔

پیرس کی خوبی اور خاصیت یہ ہے کہ یہ پھولوں کا اور خوشبوؤں کا شہر ہے۔ پوری دنیا میں جتنے معروف و مقبول پرفیومز ہیں وہ سب پیرس میں تیار ہوتے ہیں۔

عالی نے ایفل ٹاور کی بلندی سے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمام مخلوقات میں اس لیے افضل اور اعلیٰ ہیں کہ پاکیزگی اور غلاقت خوشبو اور بدبو میں تمیز کر سکتے ہیں۔“

اس نے ماریہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اولین حس دی ہے وہ سونگھنے کی ہے اور خوشبو کی لطافت کو سمجھ لینے کی ہے۔“

ماریہ نے کہا۔ ”ہاں۔ میرے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ کچھ کھٹی میٹھی باتیں تم سے بول نہیں پاتی۔ موجودہ حالات کہتے ہیں ابھی بولنے کا موسم نہیں ہے۔ انتظار کرو۔ یہ انتظار میرے اندر خوشبو کی طرح بسا ہوا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”اے رب عظیم! تو نے کیسے احساسات پیدا کیے ہیں۔ جب ہم اذان سنتے ہیں تو ایمان پر در خوشبو کا احساس ہمارے ذہن کو چھو کر گزرتا ہے۔“

وہ گھومنے پھرنے کے دوران میں کبھی ایک دوسرے سے لگ رہے تھے، کبھی الگ ہو رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں بے لگامی اور ایسے وقت کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ ہاں، جو نہ سوچو وہ ہو جاتا ہے اور اچانک ہی کچھ ہو گیا۔

اچانک ماریہ نے تکلیف محسوس کی۔ اس کا ایک ہاتھ عالی کی گرفت میں تھا۔ وہ دوسرا ہاتھ پیٹ پر رکھ کر کراہتی ہوئی فرش کی طرف جھکنے لگی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے تمام کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“ وہ اپنی ناف پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا۔ دوڑتا ہوا لفٹ کے پاس آیا۔ پھر نیچے گراؤنڈ فلور کی طرف جانے لگا۔ اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر نے اسے امیڈ کیا پھر اپنے چیمبر میں آکر عالی کو تکلیف کے بارے میں آگاہ کیا۔

عالی حیرانی سے دیدے پھاڑ کر خلا میں نکلنے لگا۔ ماریہ کو بالغ ہونے کی سند حاصل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اپارٹمنٹ سے باہر آکر صرف چار گھنٹے تک ایک دوسرے سے لگے پھرتے رہے تھے۔ وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔



میں بھی جاتے رہے ہو؟“

”نہیں۔ یہ بارہ برس پہلے کی باتیں ہیں۔ ان دنوں میں تمہارے بابا مراد علی منگی کی گھوپڑی میں پہنچنے کی کوششیں کرتا رہتا تھا اور ناکام ہوتا رہتا تھا۔ بابا صلاح الدین اجیری کی روحانی قوتیں آڑے آتی رہتی تھیں۔ جب تمہاری مام کی زچگی کا وقت قریب آنے لگا اور مجھے ڈاکٹروں کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ ایک عجیب و غریب بچے کو جنم دینے والی ہے، تب میں نے جیتی میں دلچسپی لی۔ اس کے اندر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جینی سے تمہارے باپ کا جسمانی رابطہ بہت پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے جلد ہی ارض اسلام بھیجا جائے گا۔“

عابی نے کہا۔ ”تم نے میری مام کی اچھی بری باتوں کو ان کے اندر رہ کر معلوم کیا ہے۔ پہلے میری ماں کے بارے میں بولو۔“

”وہ کوئی مذہبی عورت نہیں تھی۔ اسے نہ یہودیت سے اور نہ ہی اسلام سے کوئی لگاؤ تھا لیکن وہ بہت ہی محبت کرنے والی فرمانبردار عورت تھی اور زندگی کے آخری ایام میں تو صرف تمہارے تصور میں کھوئی رہتی تھی۔“

”وہ بڑی ممتا سے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر صرف تم سے بولتی رہتی تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ خیالوں میں تمہیں دیکھتی تھی اور تمہیں سینے سے لگاتی تھی۔ اس کی ممتا کے بارے میں بولنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الحال جذبات کو نظر انداز کرو اور حقائق کی طرف آؤ۔“

وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ ”اچانک ہی تمہاری مام سیاسی اور مذہبی حلقوں میں اہمیت حاصل کرنے لگی۔ جب میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا کہ تین ماہ کا بچہ پیٹ میں متحرک ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے کا کچھ حصہ جھلک رہا ہے اور وہ جسامت میں تمام بچوں سے کچھ بڑا ہے تو صیہونی تنظیم کے اکابرین اچھل پڑے۔ یہودیوں کے پیشوا نے اعظم نے اور دیگر رہیوں نے بیانات دیے۔ قدیم عبرانی تحریر کے نسخے پیش کیے کہ قیامت سے پہلے دنیا میں عجیب و غریب بچے جنم لیں گے۔ ان میں ایک بچہ دجال معظم کا نمائندہ ہوگا اور اس بچے کی نشانی یہ ہوگی کہ اسے ایک یہودی مام جنم دے گی اور بچے کا کوئی باپ نہیں ہوگا۔ ان کی پیش کردہ دونوں نشانیاں درست تھیں۔ میں نے تمہاری مام کے دماغ میں رہ کر معلوم کیا ہے۔ جب تمہارے بابا اس سے ملنے آتے تھے تو نادیدہ ہوتے تھے۔ تمہاری مام نے مرتے دم تک تمہارے باپ کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ دنیا والوں

سے بھی کہتی رہی کہ اس کی زندگی میں آنے والا مرد نادیدہ ہے۔ اس کو یا کسی کو بھی نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے نظر نہ آنے سے یہودی پیشوا اور رہیوں نے کہا، کوئی ہے ہی نہیں تو نظر کیسے آئے گا؟ وہ اپنے دعوتے کو درست ثابت کر رہے تھے کہ بچے کا کوئی باپ نہیں ہے۔ وہ اپنے دینی علوم کی سچائی کو اور قدیم عبرانی نسخوں کی اہمیت کو منوانے کی جی جان سے کوششیں کر رہے تھے۔

”وہ اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات کے ذریعے سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک کو اپنا حمایتی بنارہے تھے۔ ڈاکٹروں کی جو بھی ٹیم تمہاری ماں کا علاج کرنے آئی جاتی رہتی تھی، اس ٹیم میں یہودی ڈاکٹر زیادہ تعداد میں رہا کرتے تھے۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تمہارے باپ مراد سے کہتے تھے کہ جینی سے ہونے والے بچے کا کوئی باپ نہیں ہے۔ لہذا بچے پر صرف یہودی ماں کا یہودی پیشوا اور رہیوں کا اور پوری یہودی قوم کا حق ہے۔ تمہارے بابا جانی ان کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہودی پوری دنیا میں منظم اور مستحکم ہونے کے باوجود تمہیں ان سے چھین کر نہیں لے جاسکیں گے۔ زچگی کے لمحات میں تمہاری ماں کی وفات نے حالات کو بدل دیا۔ تمہارے باپ کی نظروں میں صرف تم اہم تھے۔ تمہاری ماں کی اہمیت موت کے بعد ثانوی تھی۔ یہودی اکابرین اس کی میت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک نے ان کی حمایت میں تمہارے باپ کو سمجھایا کہ جینی آخری دم تک یہودی رہی تھی۔ اسے یہودیوں کے حوالے کر دیں۔ تمہارے باپ نے ان سے کہا..... جینی کی روح ہم سے محبت کرتی تھی۔ اس کا جسم یہودی تھا۔ ہم ایک یہودی کی قبر کی دیکھ بھال تو کر سکیں گے لیکن فاتحہ نہیں پڑھیں گے۔ ارض اسلام میں اس کی قبر ہو یا نہ ہو۔ ہم اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں گے۔ اس طرح مراد علی منگی نے تمہاری ماں کی میت کو وہاں سے لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اسے لے گئے۔“

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”میں نے یہ باتیں شروع کرنے سے پہلے ایک سوال کیا تھا، اسے پھر دہراتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ تمہاری مام کی وفات کے بعد اس کی لاش یہودی ڈاکٹروں کے حوالے کیوں کر دی گئی؟ اس کی آخری رسومات ادا ہونے تک تمہارے بابا جانی کو یا کسی اہم رشتے دار کو وہاں موجود رہنا چاہیے تھا۔“

عابی نے کہا۔ ”تم اصولاً درست کہتے ہو لیکن بابا جانی



جھوٹ بول رہا ہے تو تیرے گلڑے گلڑے کردوں گا۔ اگر سچ ہے تو اس روئے زمین پر کسی بھی ایسے تاجر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے ان کے نام اور پتے بتاؤ۔ ابھی بتاؤ۔“

”مادہ ایسی دل دہلا دینے والی گرج دار آواز سے گھبرا گئی۔ باہر سے سکیورٹی گارڈز دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ وہ دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”عابی! کیا ہوا ہے؟ دروازہ کھولو۔“

باہر سے ایک گارڈ نے کہا۔ ”سراہم حاضر ہیں۔ حکم کریں۔“ وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”کوئی حکم نہیں ہے۔ کوئی نہ بولے۔ جاؤ یہاں سے۔“

ماریہ نے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ دروازہ نہیں کھولو گے تو رونے لگوں گی۔“

وہ فون پر بولا۔ ”چپ کیوں ہو؟ ان کے نام اور پتے بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”کل صبح تک تمام مطلوبہ افراد کے نام پتے اور فون نمبر تمہارے اس نمبر پر بھیج دوں گا۔ ابھی اپنی زندگی کی بدترین رات گزارو۔“

فون بند ہو گیا۔ عابی پہلی بار غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ اپنی فطری ذہانت کی بدولت بہت ہی حاضر دماغ تھا۔ جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود اپنی غلطی کو سمجھ کر غصے پر قابو پانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

ماریہ نے پھر دروازے پر دستک دی۔ وہ ذرا سنبھل گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ماریہ نے سہی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے خلاف توقع اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ کر بازوؤں میں بھر لیا۔ اسے تھکتے ہوئے بولا۔ ”میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری شریک حیات میرے غصے سے ڈر جائے۔ خدا کا شکر ہے۔ میں نے فوراً ہی اپنی غلطی سمجھ لی ہے۔“

”تمہیں کس بات پر غصہ آیا ہے؟“

”میں ابھی تمہارے کراہنا محاسبہ کروں گا۔ جس بات پر مجھے غصہ آیا ہے، اس بات پر مجھے نارمل رہنا ہوگا۔ کیسے رہنا ہوگا؟ یہ مجھے اچھی طرح سوچنا سمجھنا ہے۔ پلیز مائنڈ نہ کرو۔ مجھے تنہا رہنے دو۔ میں ابھی تک بکھرا ہوا ہوں۔ مجھے خود کو سنبھالنے دو۔“

وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ عابی نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ لائٹس آف کیں۔ پھر بیڈ پر آکر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ اس نے سوچا، جو بات سوچنے سے بری لگتی ہے اور غصہ آتا ہے، اس بات کو اہمیت نہ دی جائے۔

نے یہودیوں کے اور ان کے حمایت کرنے والوں کے پیہم اصرار پر ان کی یہودی عورت یعنی میری یہودی مام کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔“

”اور یہی بہت بڑی غلطی کی تھی۔“

عابی نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو..... ان کی یہودی بیٹی کو ان کے حوالے کرنا کیا غلطی ہے؟“

”بہت بڑی غلطی..... ایک شوہر کو مرحوم بیوی سے اتنا لگاؤ نہیں ہوتا لیکن ایک مرحوم ماں سے بیٹے کو روحانی لگاؤ رہتا ہے۔ تمہیں اپنی ماں سے روحانی لگاؤ ہے۔“

وہ اچانک ہی طنزیہ انداز میں بولا۔ ”ماں کے روحانی لاڈلے! تیری ماں کی قبر کہاں ہے؟ اس دنیا کی کسی زمین پر ہے بھی یا نہیں؟“

”ہے۔ وہ اکابرین کہہ رہے تھے کہ جہاں ان کے رہیوں کو اور اکابرین کو دفن کیا جاتا ہے وہیں مام کی قبر ہے۔ میں جلد ہی ان کے ساتھ وہاں جاؤں گا۔“

”جاؤ گے اور قبر کو دیکھو گے..... کیا ماں نظر آئے گی؟ کوئی قبر کے اندر جا کر مُردے کو نہیں دیکھتا۔ میں نے زندہ انسانوں کی کھوپڑیوں میں جا کر معلوم کیا ہے۔ تمہاری اس ماں کی قبر میں کسی لاوارث کی ہڈیاں پڑی ہیں۔“

وہ بڑی بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔ ”میں تمہاری بات کا کیسے یقین کروں؟“

”میں نے مارتھا کے ذریعے اپنی ایک بات کو سچ ثابت کیا تھا۔ جن لوگوں نے تمہاری ماں کی قبر میں کسی لاوارث کی لاش رکھی تھی، میں ان کے نام پتے اور فون نمبر بتاؤں گا۔ اگر ان سے سچ اگلا سکو تو پھر میری سچائی ثابت ہوگی۔“

اس نے پوچھا۔ ”مام کی لاش وہاں نہیں ہے پھر کہاں ہے؟“

وہ عادی ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”میں نے کہا تھا۔ آج رات سونے سے پہلے ایسا دھماکا کروں گا کہ تم ہل کر رہ جاؤ گے پھر ان یہودیوں کو ہلا کر رکھ دو گے۔ اب جگر تھام کے سنو۔ تمہاری ماں کی لاش میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، دل اور گردے بیچ دیے گئے تھے۔“

یہ ایسی اطلاع تھی کہ بیٹے کے وجود میں زلزلہ سا آگیا۔ اس کے حلق سے دل دہلا دینے والی ایسی آواز نکلی جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ”نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔“

ان فون نے بھی چیخ کر کہا۔ ”یہ سچ ہے۔“

عابی کے گرتے سے درو دیوار ہل رہے تھے۔

”میری ماں کے بدن کی کوئی تجارت نہیں کر سکتا۔ تو اگر



آکر بیٹھ جاؤں گا۔ یہ نہ سمجھو کہ تمہارے دماغ میں نہیں آسکوں گا۔“

”میرے دماغ میں بیٹھنے کی تو کیا کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ کیسے آؤ گے؟“

وہ ذرا چپ رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تم سے فاصلہ رکھا ہے تو اس خوش فہمی میں نہ رہو کہ تمہارے دماغ کو اپنی مٹھی میں نہیں لے سکوں گا۔“

”پلیز! میری خوش فہمی دور کر دو۔ یونہی دھمکی دینے کے لیے آکر ہیلو کر دو۔“

”یہ میرا اپنا طریقہ کار ہے۔ یہ میری اپنی حکمت عملی ہے۔ تم سے دور رہ کر تمہیں تجسس میں مبتلا رکھوں گا پھر اچانک ہی کبھی شب خون ماروں گا۔“

”بھئی جواب نہیں ہے۔ کیا خوب حکمت عملی ہے۔ شب خون مارنے والے دشمن بھی ہو اور یہودیوں کے خلاف مجھ سے دوستانہ رویہ بھی اختیار کر رہے ہو۔“

”بے شک میرے اس رویے سے تم تشویش میں مبتلا رہو گے اور یہ تسلیم بھی کرو گے کہ میرے ذریعے تمہاری ماں سے دشمنی کرنے والے بے نقاب ہو رہے ہیں۔ میں جارہا ہوں۔ ابھی میسج کے ذریعے ان کے نام اور پتے بھیج رہا ہوں۔ میرا یہ احسان یاد رکھنا۔“

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کئی نام اور ان کے رہائشی پتے اور ان کے فون نمبر بھی سی اسکرین پر آنے لگے۔ ہر نام کے ساتھ یہ لکھا ہوا تھا کہ کس نے جیسف عرف جینی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ بہت ہی طیش دلانے والی باتیں بھی لکھی گئی تھیں۔

عابی نے مراد کو فون پر مخاطب کیا۔ اسے جینی کے ساتھ ہونے والے مظالم کی وہ تمام روداد سنائی جو ان فون سے سن چکا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”بیٹے! ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہاری ماں کے ساتھ ایسی زیادتی کی جائے گی۔ یہ تمہاری ذہانت اور قوت ارادی ہے کہ تم نے غصے کو پی لیا ہے۔ ہم بڑی سہولت سے سوچ سمجھ کر تمہاری ماں کے دشمنوں کو عبرتناک انجام تک پہنچائیں گے۔“

”بابا جانی! سوچنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان فون صرف مجھ سے مقابلہ کرنے اور مجھے مار ڈالنے کا دعویٰ کر رہا ہے اور ماں کے حوالے سے میرے ساتھ ہمدردی اور مہربانیاں بھی کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے ایسی دوغلی چال کے پیچھے ادھر یہودیوں کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ ادھر میرے سامنے ہمدردی کا چار اڈال کر میرے دماغ میں جھپٹنے کا کوئی

مثلاً میں اس بات پر تامل کیا کہ میری ماں کی آنکھیں، دل اور گردے بچ دیے گئے۔ اب کہتا ہوں۔ بے شمار ماؤں اور بہنوں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہوگا۔ یہ ہم سنتے رہے ہیں پڑھتے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا کسی خیر میں پڑھتے اور سنتے وقت ہمیں غصہ کیوں نہیں آتا؟ کیا اس لیے کہ وہ مائیں اور بہنیں پرانی ہوتی ہیں؟

یہ خوش فہمی ہمارے ذہن میں ہوتی ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا پھر ایک دن ہمارے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ تب ہمیں غصہ آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ذہانت بھی دی ہے اور شہ زوری بھی۔ میں ٹھنڈے دماغ سے بڑی سہولت سے جسمانی اعضا کے تاجروں کو خاک میں ملا دوں گا لیکن ان سے اپنی ماں کی آنکھیں، دل اور گردے چھین کر نہیں لاسکوں گا۔ کیونکہ میری ماں کے اعضا حاصل کر کے جوئی زندگی گزار رہے ہیں وہ جینے کا حق رکھتے ہیں۔ غلط راستے سے ہی سہی ان کے ساتھ نیکی ہو رہی ہے۔ انہیں نقصان پہنچانا غیر انسانی عمل ہوگا۔

غصہ تھوک دیا تو گویا دشمنوں پر تھوک دیا۔ ان پر تھوکتے کا مطلب ہے۔ جوش میں نہیں آئے، ہوش میں آئے۔ یہی دانشمندی ہے۔ ہوش میں رہ کر ہی ان سے منمنے کی صحیح اور مستحکم پلاننگ کی جاتی ہے۔ ہوش مندی نے سمجھایا، انتقام فوراً نہیں لیا جاتا۔ دشمنوں کو نگل جانے کی حماقت نہ کرو۔ انہیں دانہ دانہ چباتے رہو اور تھوکتے رہو اور میں یہی کروں گا۔

وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتے سوچتے سو گیا۔ فجر کی اذان تک گہری پرسکون نیند سوتا رہا۔ پھر اس نے بیدار ہو کر تازہ دم ہو کر نماز پڑھی۔ اپنے رب سے سکون قلب کی دعائیں مانگیں۔ دینی احکامات کی روئین کے مطابق دن رات گزرتے رہیں تو ناقابل بیان روحانی سکون حاصل ہوتا رہتا ہے۔ جو مسائل پیش آتے رہتے ہیں، انہیں حل کرنے کا بھرپور اعتماد حاصل ہوتا رہتا ہے۔

ان فون نے اسے کال کی۔ ماریہ کا فون عابی کے پاس رکھا تھا۔ دشمن نے وعدے کے مطابق اسے مخاطب کیا۔ ”ہیلو پرس! میں نے ایک ناقابل برداشت راز کو فاش کر کے تمہاری نیند اڑا دی ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم تمام رات سو نہیں سکے ہو۔ اب تک جاگ رہے ہو۔“

عابی نے کہا۔ ”تم سب ہی کے دماغوں میں گھس جاتے ہو۔ میرے اندر بھی آؤ۔ معلوم کرو کہ نیند اڑ گئی تھی یا نہیں؟“

”یہ تو موٹی سی عقل سے سمجھنے والی بات ہے۔ تم جاگ رہے تھے۔ جب کوئی اہم معاملہ ہوگا تو تمہارے دماغ میں



مراد نے عالی سے فون پر کہا۔ ”میرے ذہن میں بار بار یہ بات آرہی ہے کہ ان نون تمہارے اندر پہنچ نہیں پا رہا ہے۔ لہذا ایسی چالیں چل رہا ہے کہ دوسروں کے ذریعے تمہیں اپنی گرفت میں لے آئے۔ اس کی چالوں کو سمجھنا ہوگا۔“

”میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی ہے کہ وہ مجھ سے دشمنی دوستی یا ہمدردی جو بھی کر رہا ہے وہ صرف میرے دماغ میں گھسنے کے لیے کر رہا ہے۔“

”بیٹے! میں جو واردات کر رہا ہوں، اس سے تم انجان بن جاؤ۔ ان نون کو یہی معلوم ہو کہ تم اپنی ماں کے دشمن روڈنی وزڈم کو ڈھونڈ رہے ہو۔“

”اوکے۔ میں یہی کہوں گا۔“

باپ سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ماریہ کے پاس آیا۔ ڈائمنگ میبل پر ناشا تیار تھا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر کھانے لگے۔ پیچیدہ مسائل سے اور ناگوار مراحل سے گزرنے کے دوران ان کی زندگی میں مسرتوں بھری ملن کی رات آنے والی تھی۔

عالی بہت خوش تھا۔ اس نے ماریہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنی اجازت تو مل گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چھو سکیں۔“

وہ مسکرانے لگی۔ کہنے لگی۔ ”میرے اللہ نے میری سن لی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اپنے معبود کا شکر کیسے ادا کروں۔“

”دل سے عبادت کرتی رہو اور زیادہ سے زیادہ آیتیں یاد کرتی رہو۔ شکر ادا ہوتا رہے گا۔ کیا تم نے محل میں امی (زیب النساء) سے بات کی ہے؟“

”یہاں پہنچ کر انہیں بتایا تھا کہ ہم پیرس میں ہیں۔ اس وقت نئی جگہ آکر زیادہ باتیں نہ کر سکی۔ ابھی کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ امی کو بتانا چاہتی ہو۔“

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ جھومتے ہوئے لہراتے ہوئے۔ صبح معنوں میں زندگی گزارنے کا لطف حاصل ہو رہا تھا۔

وہ ناشتے کے بعد واش بیسن کے پاس آئے۔ منہ صاف کرنے کے لیے برش کرنے لگے۔ عالی نے کہا۔ ”امی سے باتیں کرنے کے بعد تیار ہو جاؤ۔ ہم آؤٹنگ کے لیے جا رہے ہیں۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”آئی ٹو یو۔“

راستہ تلاش کر رہا ہے۔ اب تک کے حالات سے یقین ہو گیا ہے کہ وہ میرے دماغ کے اندر پہنچنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ فی الحال یہ اس کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اپنی موجودہ حکمت عملی کے ذریعے کسی طرح مجھے زیر کر سکے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”انشاء اللہ۔ ہم جلد ہی معلوم کر لیں گے کہ وہ تمہارے خلاف کیا کرتا پھر رہا ہے۔ تم ان دشمنوں کے نام اور پتے بھیجو۔“

بیٹے نے تمام معلومات پہنچا دیں۔ مراد نے اسکرین پر لکھا ہوا پہلا نام روڈنی وزڈم پڑھا۔ وہ یورپ میں انسانی اعضا کا بہت بڑا ڈیلر تھا۔ جو ضرورت مند ہوتے تھے وہ اس سے رابطہ رکھتے تھے۔ اس کے آفس میں جاتے تھے اور اپنے مطلوبہ اعضا کی بکنگ کراتے تھے اور معقول معاوضہ ادا کر کے اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کی مرمت کرا لیا کرتے تھے۔

روڈنی وزڈم کا نام پتا اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ مراد اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ میں بھی پہنچ سکتا تھا لیکن اس سے یہ سچ نہیں اگلا سکتا تھا کہ اس نے جینی کی آنکھیں دل اور گردوں کی مارکیٹنگ کی ہے۔ اگلوانے کے لیے لازمی تھا کہ مجرم کے ساتھ مجرمانہ سلوک کیا جائے۔

اس نے ماسٹر کو بو بو سے جینی کے ساتھ ہونے والی زیادتی بیان کی۔ اسے روڈنی وزڈم کا نام بتایا تو اس نے کہا۔ ”وزڈم انسانی اعضا کا باقاعدہ ڈیلر نہیں ہے۔ ایک خفیہ ایجنسی کا سربراہ ہے۔ مال کمانے کے لیے کچھ بھی کر گزرتا ہے۔“

”ماسٹر! وہ بہت سخت جان ہوگا۔ آسانی سے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں اسے اغوا کر کے کسی خفیہ مقام پر پہنچایا جائے۔“

”یہ ہو جائے گا لیکن وہ ان نون ایسے وقت اس کے دماغ میں گھسا ہوگا۔ اسے یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ تم یہ واردات کر رہے ہو۔ پھر وزڈم تم سے وہی باتیں کہے گا جو ٹیلی فنی کے ذریعے اسے سمجھایا جائے گا۔“

”اسے معلوم نہ ہو تو اچھا ہوگا لیکن وہ وزڈم کو اغوا کرنے والوں کے دماغوں میں پہنچ کر معلوم کر لے گا کہ آپ نے وہ واردات کرائی ہے۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”اس کی فکر نہ کرو۔ میں ایسے لوگوں سے یہ کام کراؤں گا جو مجھے نہیں جانتے۔ وہ معاوضہ لے کر کسی کا بھی کام کرتے رہتے ہیں۔“

”یہ مناسب ہوگا۔ آپ یہی کریں۔“



دالی بیٹی کو خیالی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔  
میتا بھری مسرتوں میں کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ پیٹ  
میں نہیں ہے۔ گود میں آگئی ہے۔ اس کے وجود پر چھا گئی  
ہے۔ تب ہی تو اس کی گرتی ہوئی صحت سنبھل رہی تھی۔ اس  
نے جینی کے انجام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ آرام سے چلتی  
پھرتی تھی۔ صبح چھت پر اور کبھی گارڈن میں داک کرتی تھی۔  
چہرے پر رونق آگئی تھی۔

اسے دن رات نگرانی میں رکھنے والے تمام ڈاکٹر  
حیران تھے۔ حاملہ عورتوں کو جو چھوٹے بڑے مسائل پیش  
آتے ہیں۔ وہ زیب النساء کے پاس بھی نہیں پھنک رہے  
تھے۔ نہ وہ کوئی دوا پیتی تھی۔ نہ ہی کبھی انجکشن لگانا ضروری  
ہوتا تھا۔

وہ اپنے حالات کے پیش نظر سوچتی تھی۔ ”رب کریم  
مجھے صحت اور توانائی عطا فرما رہا ہے۔ مجھے دوسروں کی دکھ  
بیماریوں میں کام آنا چاہیے۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن  
مریضوں پر توجہ دوں گی۔ ان کی تیمارداری کروں گی۔ ان  
کے کام آتی رہوں گی تو ان کی آدھی بیماریاں ختم ہوتی  
رہیں گی۔“

وہ ان دنوں کئی بار محل سے نکل کر مختلف اسپتالوں میں  
جا کر مریضوں کی مزاج پرسی کرنے لگی تھی۔ ان کے علاج اور  
ان کی مہنگی دواؤں کا خاص خیال رکھتی تھی۔ دوائیں ریاست  
میں نہ ہوں تو بیرونی ممالک سے منگواتی تھی۔ اس کی توجہ اور  
کوششوں سے علاج سستا اور آسان ہو جاتا تھا۔ یوں اسے  
اور زیادہ دلی مسرتیں اور روحانی سکون ملتا رہتا تھا۔

ایک رات تہجد پڑھنے کے لیے آنکھ کھلی تو اس نے  
عادت کے مطابق زیر لب اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ کہا۔  
اس کے ساتھ ہی پیٹ میں وابٹریشن محسوس ہوئی۔ یکلخت  
اس کے روحانی احساسات بیدار ہو گئے۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ  
کر خلا میں تکتے لگی۔

کئی دنوں کے بعد پھر ویسی ہی صوتی لہری گنگناہٹ  
سی سنائی دی تھی۔ حروف کے بغیر بہت دھیمی سی منمنناہٹ سی  
ابھری تھی۔ اس نے پھر اللہ اکبر کہا۔ اس بار بھی ویسی ہی  
دھیمی سی وابٹریشن ہوئی۔ کیسا ایمان افروز کرشمہ اس کے  
ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ مسرتوں سے سرشار ہو رہی تھی۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ اسے فجر تک نیند  
پوری کرنی تھی۔ وہ سو گئی۔ اس نے مختصر سی نیند میں چار سال  
کی ایک بچی کو دیکھا وہ اسے ماکہ رہی تھی۔ ماں کو اپنی ننھی  
سی انگلی پکڑا کر چلا رہی تھی۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ بچے ماں

اسے بھی جوابا کہتا تھا۔ ”آئی لو یو ٹو.....“ لیکن منہ  
میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ کلی کرنے کے لیے بیسن پر جھکا تو  
ایسے وقت ماریہ نے نکلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کلی کی دھار  
اس کی ہتھیلی کی پشت پر آ کر ایسے لگی جیسے تیر پیوست ہو رہا  
ہو۔ وہ تکلیف کے مارے چیخ پڑی۔  
وہ بھول گئی تھی کہ اس کا مجازی خدا انسان کی کھال  
میں ایک رو بوٹ ہے۔ ہولے سے ہاتھ پکڑتا ہے تو لگتا ہے  
جکڑ لیا ہے۔

عابی نے فوراً ہی اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھوں میں لے  
کر سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”یا خدا.....! رحم فرما۔ کیا ہو گیا؟  
تم نے چیخ کیوں ماری ہے؟“

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی کلی  
نیزے کی طرح آ کر لگی ہے۔ ہتھیلی بہت دکھ رہی ہے۔“

اس نے دیکھا، ہتھیلی کی پشت کا وہ حصہ سرخ ہو گیا تھا  
اور جہاں کلی کی دھار پڑی تھی وہاں ہلکا گڑھا سا پڑ گیا تھا۔  
وہ اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر پکڑا کرتے ہوئے  
بولی۔ ”برداشت کرو۔ ابھی ہم آؤنگ کے لیے حائیں گے تو  
ایک پین کٹر ٹیبلٹ کھاتے ہی تکلیف دور ہو جائے گی۔“

ماریہ نے بیڈروم میں آ کر زیب النساء کے نمبر بیچ  
کے۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد عابی کے ساتھ تفریح  
کے لیے کھلی فضاؤں میں جانا تھا۔

☆☆☆

زیب النساء نے ننھی سی اسکرین پر ماریہ کا نام پڑھا  
پھر مٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”السلام علیکم۔“  
وہ سلام کا جواب دے کر بولی۔ ”آپ بزرگ ہیں۔  
پہلے مجھے سلام کرنا چاہیے۔ آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔“

اس نے کہا۔ ”بزرگ اپنے بچوں کی سلامتی چاہتے  
ہیں اور السلام علیکم کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو۔ ہمارے دین  
میں صرف بچے ہی بڑوں کو نہیں بڑے بھی بچوں کو سلام  
کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کیا حال ہے؟ میرا بیٹا کیسا ہے؟“  
”یہ نہ پوچھیں کیسا ہے؟ وہ تو ایسے ہیں، جیسا کوئی ہو  
ہی نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑی خوش خبری سنارہی ہوں۔“  
”فوراً سناؤ۔“

وہ ذرا جھجکتے ہوئے زیب النساء کو ساری تفصیل  
سنانے لگی اور لیڈی ڈاکٹر سے ہونے والی بات بھی بتائی۔  
زیب النساء نے ساری تفصیل سن کر خوشی کا اظہار کیا۔  
رابطہ ختم ہو گیا۔ زیب النساء کرسی پر نیم دراز تھی۔  
اس نے فون کو ایک سائنڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ پھر اپنی ہونے



باب کی انگلیاں پکڑ کر چلتے ہیں اور وہ بچی ماں کو اپنی انگلی  
تھما کر کہیں لے جا رہی تھی۔

اس خواب کے دوسرے منظر میں ایک خاتون کہیں  
بیٹھی روٹیاں کھا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک گڑیا رکھی تھی۔  
اس بچی نے خاتون کے پاس جا کر کھانے کی پلیٹ کو اس کے  
سامنے سے ہٹا دیا۔ خاتون بھوکے تھی پھر اسے اٹھا کر کھانا  
چاہتی تھی۔ اس نے پھر اسے دور کر دیا۔

اس خواب سے بچکانا ضد ظاہر ہو رہی تھی پھر خواب کا  
منظر بدل گیا۔ وہ بچی کی انگلی تھام کر اجیر شریف پہنچ گئی تھی۔  
وہاں ایک کالی کلونی سی عورت گاند بن کر ان کی راہنمائی  
کرنے لگی۔ اس عورت نے زیب النساء سے کہا۔ ”خواجہ  
معین الدین چشتی کے دربار میں جانے سے پہلے غسل کرو۔“  
اس بات پر کالے بادل اڑ کر آنے لگے۔ بجلیاں  
کڑکنے لگیں پھر وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ آسمان سے لہو  
کی بارش ہونے لگی۔ وہ بچی فوراً ہی ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی  
ہوئی سائے میں لے آئی۔ اس پر لہو کا ایک قطرہ بھی پڑنے  
نہیں دیا۔

خواب ادھورے ہی رہ جاتے ہیں۔ آنکھ کھلتے ہی وہ  
پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ لہو کی بارش کیوں دیکھی  
ہے؟ خواب سمجھ میں نہیں آتے۔ کبھی تعبیر ملے تو ایسے خواب  
سمجھ میں آتے ہیں۔ اس نے ہم زاد سے دونوں خواب بیان  
کیے۔ اس نے کہا عجیب سی بات ہے۔ میں کئی دنوں سے  
سوچ رہا ہوں۔ بابا صلاح الدین اجیری بہت یاد آرہے  
ہیں۔ ان کی دعائیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ہیں۔ خدا  
جانے وہ اس دنیا میں ہیں بھی یا نہیں؟ ان کی دعاؤں سے  
تمہیں صحت یابی نصیب ہو رہی ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ  
رہا ہوں۔ تمہیں وہاں لے جانا چاہتا ہوں جہاں وہ عبادت  
کیا کرتے تھے۔“

وہ خوش ہو کر ہم زاد کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”اس سے  
بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوگی کہ جہاں بابا اجیری کے قدم  
پڑتے رہے وہاں میں جاؤں گی۔ نیک بندے دنیا میں  
رہیں یا نہ رہیں ان کی نیکیاں ہمارے ساتھ قائم رہتی ہیں۔“  
پھر وہ بولی۔ ”لیکن یہ خواب تشویش میں مبتلا کر رہا ہے۔“  
اس نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ زندگی کے راستوں  
میں کہاں ٹھوکر لگتی ہے اور کیسے لگتی ہے۔ اب ہمیں ٹھوکر کا علم  
ہو گیا ہے تو اچھی بات ہے۔ ہم محتاط رہیں گے۔“

”بے شک شیطانی رکاوٹیں پیش آتی رہتی ہیں۔ میرا دل  
کہتا ہے، مجھے جلد سے جلد بابا صاحب کے در پر جانا چاہیے۔“

”اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔ مراد وہاں بیٹے کے ساتھ لگا  
ہوا ہے۔ یہاں مملکت کی تمام ذمے داریاں مجھ پر اور بلے پر  
آپڑی ہیں پھر بھی ہم اسی ماہ کے آخر تک جا سکیں گے۔“  
ازیب النساء نے دو طرح کے خواب دیکھے تھے۔ وہ  
بچی اسے اپنی انگلی تھما کر دو مقامات پر لے گئی تھی۔ اس پہلے  
مقام سے متعلق رکھنے والی تعبیر اسی دن مل گئی۔

وہ مریضوں کی تیمارداری اور دلجوئی کے لیے ایک  
ہسپتال میں آئی۔ وہاں ایک ماں بننے والی خاتون کی حالت  
تشویش ناک تھی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق بچہ پیٹ  
میں بہت کمزور تھا۔ دوائیں خاطر خواہ اثر نہیں کر رہی  
تھیں۔ وہ زچگی کے مراحل تک پہنچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔  
پھر بھی ڈاکٹر اسے اپنے تجربات اور توجہ سے بچانے کی  
کوشش کر رہے تھے۔

زیب النساء نے اس خاتون کے پاس آ کر اس کا  
حال دریافت کیا۔ ”تم میڈیکل رپورٹ کے مطابق حاملہ  
ہونے سے پہلے صحت مند تھیں۔ پھر اچانک ایسا کیا روگ  
لگ گیا ہے کہ تجربہ کار ڈاکٹر بھی تمہارا علاج کرنے میں  
ناکام ہو رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”میں کیا بولوں؟ میری کوئی نہیں سنا  
میری سوکن مجھ پر جادو کر رہی ہے۔ اس نے تین بیٹیاں  
پیدا کی ہیں اور یہ نہیں چاہتی کہ میں خوش فسمتی سے ایک بیٹا  
پیدا کر کے شوہر کی نظروں میں اہم ہو جاؤں۔“  
زیب النساء نے پوچھا۔ ”تم نے جادو کا توڑ  
کرایا ہوگا؟“

”ہاں میرے شوہر بھی ایک وارث کے لیے بہت  
بے چین ہیں۔ دعائیں بھی کر رہے ہیں اور جادو کے  
مقابلے میں جادو بھی کر رہے ہیں لیکن آپ دیکھ رہی ہیں۔  
ڈاکٹروں سے بھی سن چکی ہیں۔ بچہ زچگی سے پہلے کمزور ہوتا  
جا رہا ہے۔ اگرچہ سوکن کو اور اس کے رشتے داروں کو مجھ  
سے دور رکھا گیا ہے۔ پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ وہ مجھ سے  
عداوت کر رہی ہے۔“

وہ بول رہی تھی۔ ایسے وقت وارڈ بوائے ایک ٹرائی پر  
اس کے لیے کھانا لے آیا۔ زیب النساء نے کہا۔ ”تم روٹی  
کھاؤ۔ میں ڈاکٹر سے مل کر بھی آتی ہوں۔“

وہ پلٹ کر جانا چاہتی تھی پھر یکھت رک گئی۔ پچھلی  
رات کے خواب نے اسے چونکا دیا۔ اس خاتون کے  
سرہانے ایک گڑیا رکھی تھی۔ وہ گڑیا ویسا ہی سرخ رنگ کا  
لباس پہنے ہوئے تھی۔ یہ یاد آیا کہ خاتون بھی اس خواب



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





ایک روح میرے اندر ساگنی ہے۔ جس سازش تک کوئی پہنچ نہیں سکتا تھا، اس نے اپنی انگلی پکڑا کر مجھے وہاں پہنچا دیا۔ اے میرے پاک پروردگار! تیرا شکر ہے۔ میں ماروی کے نام سے ایک مسیحائی کو جہنم دینے والی ہوں۔“

اس نے اپنا سر ہم زاد کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ اپنی کار کی انگلی سیٹ پر بیٹھے محل کی سمت جا رہے تھے۔ ابھی حالات کتنی ہی سمتیں بدلنے والے تھے۔ ایک خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ دوسرا خواب ہیبت ناک تھا۔ کوئی صحیح تعبیر بتا نہیں سکتا تھا کہ لہو کی بارش کے پیچھے کیا سرا ہے؟

☆☆☆

روڈنی وزڈم اپنی ایک خفیہ ایجنسی آرڈیلیو کا سربراہ تھا۔ اچھا خاصا معاوضہ لے کر سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک کے اہم خفیہ معاملات کو بڑی رازداری سے نمٹاتا تھا۔

اس کے ریکارڈ میں صرف کی یہ رہ گئی تھی کہ وہ مراد علی منگی کو ٹریپ کرنے میں کئی بار ناکام رہا تھا۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی کہ وہ بہت محتاط رہنے کا عادی تھا۔ اس نے مراد کے سامنے بھی خود کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس سے چھپ کر اس سے دور رہ کر اسے کسی شکنجے میں لینے کی حسرت رہ گئی تھی۔ اس نے اس ایک ناکامی کو درگزر کیا تھا۔ باقی تمام مجرمانہ ڈیلنگز میں لاکھوں ڈالر زکام ہا تھا۔ ایک ماہ پہلے کی اجنبی نے فون پر کہا تھا۔ ”میرے آلہ کار بن کر رہو۔ فائدے میں رہو گے۔ تم اپنے کسی بھی مشکل نارگٹ تک پہنچنے میں ناکام نہیں رہو گے۔ میں تمہیں وہاں آسانی سے پہنچا دیا کروں گا۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا تم جادو جانتے ہو؟ مجھے کہیں بھی کسے پہنچا دیا کرو گے؟“

”تم اپنی کوئی مشکل بیان کرو۔ پھر تمنا دیکھو۔“ وزڈم نے کہا۔ ”ایک ڈیلر نے میری ایک لاکھ دس ہزار ڈالر کی ہیمنٹ روک لی ہے۔ اس سے رقم وصول کرنے کے۔۔۔۔۔“

اجنبی نے بات کاٹ کر کہا۔ ”آگے نہ بولو۔ اسے کال کرو۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔“

”وہ میری کال انیڈ نہیں کرتا ہے۔“

”اس کا نمبر بتاؤ۔“

وزڈم نے اس کے نمبر بتائے۔ اس نے کہا۔

”انتظار کرو۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر رقم لے کر تمہارے دروازے پر آئے گا۔“

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کیا تم اسے کوئی چوہا سمجھ رہے ہو؟“

والی سے مشابہت رکھتی ہے۔

خاتون نے پوچھا۔ ”آپ جاتے جاتے کیوں رک گئیں؟“

اس نے کہا۔ ”یہ کھانا گھر کا ہے یا اسپتال کا؟“

وہ بولی۔ ”اسپتال میں سختی ہے۔ باہر سے یا گھر سے

کھانا لانے کی اجازت نہیں دی جاتی اور یہ میرے لیے اچھا

ہی ہے۔“

زیب النساء اس کے سامنے رکھے ہوئے کھانے کو توجہ

سے دیکھ رہی تھی۔ اس بچی نے کھانے کی اس پلیٹ کو خاتون

کے سامنے سے ہٹا دیا تھا اور وہ ماں بننے والی مریضہ لقمہ

اٹھانے جا رہی تھی۔

وہ فوراً ہی بولی۔ ”رک جاؤ۔“

خاتون اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے

ڈاکٹر اور اسپتال کے انچارج کو بلا کر کہا۔ ”میں ابھی ان

کھانوں کی میڈیکل رپورٹ چاہتی ہوں۔ یہاں سے

مطمئن ہو کر جاؤں گی۔“

فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی۔ کھانے پینے کی تمام چیزوں

کو لیب میں بھیجا گیا۔ ملکہ معظمہ آئی ہوئی تھیں۔ لہذا سینئر

ڈاکٹر زنجی آگئے تھے۔ انہوں نے جلد ہی رپورٹ پیش کی۔

چکن سوپ میں اور ایک سالن میں مضر رساں دوائیں ملائی

گئی تھیں۔

یہ بڑی دھماکا خیز رپورٹ تھی۔ اسپتال میں کچن کے

تمام عملے کو گرفتار کر کے سختی سے انکوائری ہونے لگی۔ جلد یا...

یہ دیر ایک سوکن کی سازش کو بے نقاب ہونا تھا۔ معلوم ہوا کہ

کچن کا ایک باورچی خاتون کی سوکن سے بھاری رشوت لے

کر ایک مضر رساں دوا کم سے کم مقدار میں کھانے پینے کے

ذریعے دیا کرتا تھا۔

اس سوکن سمیت سازش میں شریک رہنے والوں کو

آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ عدالت دینی احکامات

کے مطابق فیصلہ سنانے والی تھی۔ ڈاکٹر ازسرنو اس ماں بننے

والی پر بھرپور توجہ دینے والے تھے۔ اب کسی شک و شبہ

کے بغیر وہ پیدا ہونے والا بچہ شر سے محفوظ ہو گیا تھا۔

زیب النساء نے ہم زاد سے کہا۔ ”میڈیکل رپورٹ

سے پہلے کوئی ڈاکٹر سمجھ نہیں پایا کہ اسے سلو پوائزن دیا جا رہا

ہے۔ کیا خدا کی قدرت ہے میری بیٹی نے میری ماروی نے

سمجھ لیا تھا۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”آج تم بڑے جذبے اور عقیدت

سے ماروی کا نام لے رہی ہو۔“

”بے شک۔ اس پر میرا عقیدہ پختہ ہو گیا ہے۔ وہ



کر سکتا لیکن ابھی وہ نہیں اس کا بیٹا میرا مار گٹ ہے۔ میں اس بلند پرواز کے پر کاٹوں گا تو باپ آپ ہی زمین پر آگرے گا۔“

پھر وہ ناگواری سے بولا۔ ”مجھ سے صرف کام کی بات کرو۔ کام کی بات یہ ہے کہ پرنس عالی کی ماں کے جسمانی اعضا فروخت کرنے والے کا نام روڈنی وائر تھا۔ وہ مرچکا ہے۔ تمہارا نام روڈنی وزڈم ہے۔ تم بھی جرائم کے زبردست کھلاڑی ہو۔“

”مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟“

”میں پرنس عالی کو یہ کہہ کر تمہارے پیچھے لگانا چاہتا ہوں کہ تم نے ہی اس کی ماں سے زیادتی کی ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہوگا کہ زیادتی کرنے والا مر گیا ہے تو انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی اور میں اسے یہودیوں کے خلاف بھڑکانا چاہتا ہوں۔“

وزڈم نے کہا۔ ”سنائے پرنس انسان نہیں رو بوٹ ہے۔ ایک چکی میں مسل دیتا ہے۔“

”میں تمہیں بجانے والا ہوں۔ تم پر ذرا آج نہیں آئے گی۔ جب میرا مشن مکمل ہو جائے گا تو تم عالی کو گولی مار دو گے۔“

اس نے کہا۔ ”جو کہو گے وہ کروں گا لیکن تم تو اسے بڑی آسانی سے مار سکتے ہو۔“

وہ جھجلا کر بولا۔ ”میں اسے نہیں مار سکتا۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تعجب ہے۔ کیا اس کے دماغ کے اندر گھس کر نہیں مار سکو گے؟“

وہ جیسے ہیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ ”ضرور مار سکتا ہوں لیکن میں نے آج تک ایک چیونٹی بھی نہیں ماری ہے۔ اپنے آلہ کاروں کے ذریعے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ بحث نہ کرو۔ انتظار کرو پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔“

وہ چلا گیا۔ وزڈم اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اس سے راضی ہوتا یا نہ ہوتا اس کا آلہ کار اور تا بعد اربن کر رہنا ہی تھا لیکن یہ بات اسے عجیب سی لگ رہی تھی کہ وہ کسی کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کرتا ہے۔ یہ ماننے والی بات نہیں تھی کہ بے شمار مخالفین کا لہوا اچھالنے والا اپنے ہاتھ میں گن نہیں پکڑتا ہوگا۔

ایک ہفتے بعد ہی ان نون نے اس کے دماغ میں آکر کہا۔ ”میں نے پرنس عالی کے سامنے تمہارے نام کا چارا ڈال دیا۔ وہ اپنی ماں سے ہونے والی زیادتی کا انتقام لینے

فون بند ہو گیا۔ اسے جواب نہیں ملا۔ ایک گھنٹے بعد ہی کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس دشمن ڈیلر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک پیپر بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو..... گن لو پورے ایک لاکھ دس ہزار ڈالر ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی کار میں واپس جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ اور کہے سے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ وزڈم شدید حیرانی سے دشمن کو دیکھتا رہا۔ اس سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے دروازہ بند کر کے رقم گنی۔ وہ پوری تھی۔

وہ شدید حیرانی سے خلا میں نکلتے ہوئے بولا۔ ”اے بھائی! کون ہو تم؟ واقعی جادو گر ہو۔ اس نے سچ مجھ میرے دروازے پر آکر میٹ کی ہے۔“

اسے اپنے دماغ کے اندر آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں بے نام بے شناخت مجھے ان نون کہہ سکتے ہو۔ میرا کمال دیکھو۔ ابھی جہاں ہو، وہاں سے ایک انچ بھی ہل نہیں سکو گے۔“

اس نے فوراً ہی ہلنے کی کوشش کی۔ یوں لگا جیسے دماغ پتھر ہو گیا ہے۔ اس کی نہیں سن رہا ہے۔ اس کی مرضی سے ذرا سی بھی جنبش نہیں کر رہا ہے۔

پھر آواز سنائی دی۔ ”تم اچھل پڑو گے۔“ وہ یکبارگی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ان نون نے کہا۔ ”تم یہودی ہو۔ بائبل نہیں پڑھتے۔ ابھی اس کی ایک لائن پڑھو گے۔“

”مائی گاڈ! تم ٹیلی پتھی جانتے ہو؟“

”آج سے تم میرے آلہ کار بن کر رہو گے۔ میرے کام آتے رہو گے اور مفادات بھی حاصل کرتے رہو گے۔“

”میں حاضر ہوں۔ یہ تو سر اسر منافع کا سودا ہے۔“

”میں آئندہ چند دنوں کے بعد تمہیں پرنس عابد علی منگی کے خلاف استعمال کروں گا۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”ایں..... پرنس عالی کے خلاف؟“

”ہاں، کیا اس سے ڈرتے ہو؟“

”فی الحال پرنس کا بہت چرچاں رہا ہوں۔ اس سے پہلے اس کے باپ کو کئی بار ٹریپ کرنے میں ناکام رہا ہوں۔“

”آئندہ ناکام نہیں رہو گے۔“

”کیا تم نے کبھی اسے زیر کیا ہے؟ تم تو آسانی سے اس کے اندر جا کر اسے اپنا آلہ کار بنا سکتے ہو۔“

وہ ذرا چپ رہا پھر جلدی سے بولا۔ ”میں کیا نہیں



لوگ تمہیں جہاں لے جا رہے ہیں وہاں پرنس ہوگا۔ تم ان دونوں سے باتیں کرو۔ میں ان کی آواز اور لہجوں کو اپنی گرفت میں لوں گا۔“

وہ ان باتوں کو لے لگا لگا کر جہاں لے جاتا چلا جاتا تھا وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان میں آئے تھے۔ اسے ایک کمرے کے اندر دھکا دے کر باہر سے بند کر دیا۔ وہ سہا ہوا تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”تم موجود ہونا؟ ان سے نمٹتے کیوں نہیں ہو؟“

”کیوں جان نکل رہی ہے؟ میں موجود ہوں۔ انتظار کرو۔ یہاں شاید عابی آئے گا۔“

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اس بار دو مسلح افراد جو آئے وہ چہروں پر ماسک پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے وزڈم کو ایک سیاہ کپڑے کی ٹوپی سر سے گردن تک پہنائی۔ وہ عارضی طور پر اندھا ہو گیا۔ کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے آنے والوں سے پوچھا۔ ”میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟“

کسی نے جواب نہیں دیا۔ ان نون ان دو افراد میں سے ایک کے اندر پہنچا جو اسے وہاں لائے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسے وہاں لانے والے اب ایک کار میں بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ ان کی سوچ نے بتایا کہ ان کا کام ختم ہو چکا ہے۔ وہ وزڈم کو اس مکان میں بند کر کے اپنے گھر جا رہے ہیں۔

ان نون نے غصے سے کہا۔ ”مجھے دھوکا دے کر بھاگ رہے ہو۔ واپس وزڈم کے پاس چلو۔“ دونوں گن مینوں کے دماغ اس کے ٹھکنے میں آ گئے۔ وہ اپنی کار کو یوٹرن دے کر پھر اسی مکان کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچے تو دیر ہو چکی تھی۔ مکان کھلا ہوا تھا۔ خالی تھا۔ وزڈم کا وجود لاپتا ہو گیا تھا۔

ان نون نے ان سے پوچھا۔ ”وزڈم کہاں ہے؟“ ایک نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے۔ ہم نے وزڈم کو صرف اس مکان تک پہنچانے کا سودا کیا تھا۔“

”سودے بازی کس سے ہوئی تھی؟“ ”کسی خفیہ ایجنسی نے ہم سے کام لیا ہے۔ ہمیں بڑی رقم ملتی ہے تو ہم کسی خفیہ ایجنسی کا نام پتا معلوم نہیں کرتے۔ کام کرتے ہیں، دام لیتے ہیں پھر چھٹی کر لیتے ہیں۔“

ایسا جرائم کی دنیا میں اکثر ہوتا ہے۔ ان نون ان واردات کرنے والوں سے معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ماسک پہن کر آنے والے اسے کہاں لے گئے ہیں؟

کسی وقت بھی تمہاری طرف آنے والا ہے۔“ ”میں اپنے اطراف سخت سکیورٹی رکھوں گا۔“ ”ایسی حماقت نہ کرنا۔ اسے شبہ ہوگا کہ میں نے تمہیں اس کی طرف سے محتاط کر دیا ہے۔ تم معمول کے مطابق سکیورٹی کے بغیر رہا کرو گے۔ میں خاموشی سے تمہارے اندر موجود رہا کروں گا۔“

”کیا تم دن رات موجود رہو گے؟“ ”یہ ضروری نہیں ہے۔ میری غیر موجودگی میں جیسے ہی خطرہ محسوس کرو، اسی وقت مس کال دو۔ میں فوراً آ جاؤں گا۔“

وزڈم مطمئن ہو گیا۔ ان نون ایک نظر نہ آنے والا باڈی... گاڑا تھا۔ مسلح سکیورٹی گارڈ سے زیادہ معتبر تھا۔ وہ دوسری رات کلب میں رہی کھلتا رہا اور خوب پیتا رہا پھر باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ بڑے موڈ میں میڈونا کا ایک گیت گاتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔

تھوڑی دور جاتے ہی ایک ریوالور اس کی گردن سے آگیا۔ پچھلی سیٹ اور اگلی سیٹ کے درمیان سے دو شخص ابھر آئے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”تمہیں یقیناً اپنی زندگی سے پیار ہوگا۔ ہم جدھر کہتے ہیں، ادھر گاڑی موڑتے رہو گے تو زندہ رہو گے۔“

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ان کے حکم کے مطابق رفتار بڑھانے لگا۔ اپنے دماغ میں کہنے لگا۔ ”مسٹر ان نون! کہاں ہو؟“

وہ پریشان ہو گیا۔ شراب کی مستی پانی ہونے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ”کون ہو تم لوگ؟ مجھ سے جتنی رقم وصول کرنا چاہتے ہو، یہاں ادا کر دوں گا۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم جان لینا چاہتے ہیں۔ یہاں ادا کرو گے تو ہم پھنس جائیں گے۔ کہیں جا کر آرام سے لین دین کریں گے۔“

وہ لوگ مارڈالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ تھوک نکل کر اپنے اندر بولا۔ ”کہاں ہو تم؟ یہ لوگ مجھے مارڈالیں گے۔“ وہ کار کے عقب نما آئینے میں دشمنوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک کال کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز ایک مس کال ہی کرنے دو۔“

ایک نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر اس کے لباس سے ایک فون اور ایک پستول نکال لیا۔ ایسے ہی وقت ان نون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں آ گیا ہوں۔“

وہ اطمینان کی سانس لے کر بولا۔ ”ان کتوں کو مارڈالو۔“ ”مجھے ان کتوں سے نہیں پرنس سے نمٹنا ہے۔ یہ



وہ دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ جہاں حاضر ہوا وہاں گہری تاریکی تھی۔ وہ لائٹ آن کر سکتا تھا لیکن گھپ اندھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

”وہ ایسی گہری تاریکی میں کیوں تھا؟ اس کی ایک پراسرار بنیادی وجہ تھی۔ آگے کسی مرحلے پر اس کی ہسٹری معلوم ہونے والی تھی۔ وہ ان لمحات میں سوچ رہا تھا کہ پرنس نے اپنی ماں پر ظلم کرنے والے وزڈم کو ہلاک کیوں نہیں کیا؟ اسے اغوا کیوں کرایا ہے؟ وہ کیا گیم کھیل رہا ہے؟ اور کیسی زبردست چال چل رہا ہے۔ میری ٹیلی پیٹھی کا راستہ کاٹ دیا ہے۔ مجھے اس کے کسی بھی کارندے کے دماغ میں پہنچنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ کیا اسے شبہ ہو گیا ہے کہ میں اس کی ماں سے ہمدردی کرنے کی آڑ میں اس سے کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا ہوں؟“

اس نے ماریہ کے نمبر پر کال کی۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ”ہیلو پرنس! روڈنی وزڈم کہاں ہے؟ کیا تم ماں کا انتقام لینے کے لیے اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتے؟ یہ کیا کر رہے ہو؟ اسے کہیں لے جا کر کیوں چھپا دیا ہے؟“

عابی نے کہا۔ ”کیوں بکواس کر رہے ہو؟ میں نے ابھی تک وزڈم کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی رہائش گاہ میں نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کل اس سے نمٹ لوں گا اور تم کہہ رہے ہو کہ میں نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ میں کیوں چھپاؤں گا؟ کیا وہ بیش بہا خزانہ ہے؟ کیا اس مجرم قاتل سے مجھے کسی طرح کا فائدہ حاصل ہونے والا ہے؟“

وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولا۔ ”او گاڈ! تم نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے اور وہ کہیں قیدی بنا ہوا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کس نے کیا ہوگا؟“

”مجرموں کے ایک نہیں کئی دشمن ہوتے ہیں۔ جاؤ ان سب کے دماغوں میں ٹیلی پیٹھی کی چھلانگیں لگاؤ۔ تم تو آسانی سے معلوم کر سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ اور اسے کس طرح وہاں سے لاسکتے ہو؟ اور مجھے نادان نہ سمجھنا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ مجھ سے ڈبل گیم کھیل رہے ہو۔ اسے کہیں چھپا کر ایسی چال چل رہے ہو جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں تم دو غلے ہو۔ بہتر ہے دفع ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

عابی نے فون بند کر دیا۔ اس نے جیسی سختی سے باتیں سنائی تھیں، ان سے ان نون کو کسی حد تک یقین ہو گیا کہ عابی نے وزڈم کو اغوا نہیں کرایا ہے۔ کوئی تیسرا ان کے درمیان

وہ وزڈم کے دماغ میں آیا۔ پتا چلا وہ کسی فور وکیل میں ستر کر رہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میں کیسے بتاؤں؟ میری آنکھیں میز چوڑھ کن ٹیبلٹ میں چھپا ہوا ہے۔ تم تو آزاد ہو۔ کہیں بھی دماغ میں پہنچ کر معلوم کر سکتے ہو۔“

”ان ماسک مینوں سے باتیں کرو۔ میں انہیں سن کر ان کے دماغوں میں پہنچ سکوں گا۔“

”میں نے کئی بار انہیں آواز دی ہے۔ وہ کچھ بولتے نہیں ہیں۔ ایسے چپ ہیں جیسے موجود نہ ہوں۔“

”ان سے جھگڑا کرو۔ انہیں بولنے پر مجبور کرو۔“

وہ جھگڑا کرنے لگا۔ ”اے! تم دونوں گونگے بہرے کیوں بن گئے ہو؟ مجھ سے بات نہیں کرو گے تو چیخنا شروع کر دوں گا۔“

جواباً اس کے سر پر ایک چیت پڑی۔ ایک گن کی نال اس کے منہ میں گھس کر حلق سے آکر لگ گئی۔ وہ سہم کر سوچ کے ذریعے بولا۔ ”اے بھائی! کہاں لا کر پھنسا دیا؟ یہ مجھے مار ڈالیں گے مگر کبھی نہیں بولیں گے۔“

ان نون نے کہا۔ ”ان کی خاموشی کا مطلب ہے یہ میرے بارے میں جانتے ہیں کہ میں تمہارے دماغ میں چھپا ہوا ہوں۔ یہ بولنے کی غلطی نہیں کریں گے۔“

وزڈم نے کہا۔ ”یہ غلطی نہیں کریں گے تو میرا کیا بنے گا؟“

”مجھے سوچنے دو۔ سچویشن میری توقع کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔“

”ارے وہ مراد علی منگی کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو کبھی تمہارے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ میں اب تک دیکھتا آرہا ہوں پرنس عابی کے کسی معاملے میں مراد نے مداخلت نہیں کی ہے۔ وہ مصلحتاً ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔“

”مسٹر ان نون! وہ باپ بیٹے بظاہر دور ہوں گے لیکن در پردہ قریب رہتے ہوں گے۔ تم ان کے دماغوں میں جا کر حقیقت کیوں معلوم نہیں کرتے؟ تعجب ہے تم نہ بیٹے کے اندر نہ باپ کے اندر جاتے ہو۔ کیا بات ہے؟ کیوں نہیں جاتے ہو؟ میری یہ بات لکھ لو کہ تم ٹیلی پیٹھی جیسی طاقت رکھتے ہوئے بھی دھوکا کھا رہے ہو۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ پرنس سے نمٹ رہے ہو جبکہ اس کا باپ تم سے نمٹ رہا ہے۔“

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”مجھے ایسی باتوں میں نہ الجھاؤ۔ سوچنے سمجھنے دو۔ میں جا رہا ہوں پھر آؤں گا۔ اطمینان رکھو تمہیں ان کے شکنجے سے نکال کر لے جاؤں گا۔“



کو پڑا ہے۔

ہے۔ لہذا پہلے اپنی مکمل ہسٹری بیان کرو۔“

وہ سوچنے لگا کہ وہ جو تیسرا ہے، اسے معلوم ہے کہ کسی ٹیلی میٹھی جاننے والے سے مقابلہ ہے۔ اسی لیے اس کے کارندے گونگے بہرے بنے ہوئے تھے۔ کوئی اسے اپنے اندر آنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

ان نون پھر وزڈم کے دماغ میں آیا۔ اب وہ کسی چار دیواری میں تھا۔ اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے کن ٹوپ ہٹا دیا گیا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں سے ان نون صرف بند دروازوں کو اور کھڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے کہاں لاکر قیدی بنایا گیا ہے۔

اس نے وزڈم سے کہا۔ ”میں آگیا ہوں۔ کسی کو آواز دو۔“ اس نے کہا۔ ”جب وہ ماسک پوش میرے سامنے تھے تب نہیں بولتے تھے۔ اب دور سے کیا بولیں گے۔“

پھر بھی اس نے پکارا۔ ”کوئی ہے؟ یہاں کوئی ہے؟“ اس نے کھڑکیوں اور دروازوں کے پاس جا کر کہا۔ ”فارگاڈ سیک، مجھے رہائی نہ دو۔ کم از کم بات تو کرو۔ مجھ سے عداوت کی کوئی وجہ معلوم تو ہو۔“

جواباً کوئی آواز کوئی آہٹ بھی نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا اسے کسی دیرانے میں لاکر قیدی بنایا گیا ہے۔ وزڈم نے دیوار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اے مسٹر ان نون! تم نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔ یہاں سے کیسے نکلوں گا؟“

وہ فرش پر پاؤں مارتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری ٹیلی میٹھی بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکے گی۔ یہ یقین کرو کہ تم نے مجھے مراد علی منگی کے جال میں پھنسا دیا ہے۔“

”بکو اس مت کرو۔ صبر کرو۔ جو تم سے دشمنی کر رہا ہے اس نے تمہیں یہاں لاکر پھینکنے اور بھول جانے کے لیے انگو انہیں کرایا ہے۔ وہ تم سے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔ وہ ابھی نہ سہی کل صبح تک ضرور آئے گا۔“

اس کمرے میں ٹی وی اور کمپیوٹر کے علاوہ اٹھنے بیٹھنے اور سونے کا بھی سامان تھا۔ ایسے ہی وقت میز پر رکھا ہوا کمپیوٹر آن ہو گیا۔ وزڈم نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا۔ کسی نے باہر سے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اسے آن کیا ہوگا۔

اس نے روشن دان کی طرف منہ کر کے چیختے ہوئے کہا۔ ”باہر کوئی ہے۔ پلیز! فارگاڈ سیک مجھ سے بات کرو۔“ وہ کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسکرین پر تحریر ابھری۔ ”ہم کون ہیں، تم نہیں جانتے۔ تم کون ہو، ہم نہیں جانتے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونا ضروری

وہ فوراً کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر کی بورڈ پر انگلیاں دوڑانے لگا۔ تحریر کے ذریعے کہنے لگا۔ ”میں اپنے بارے میں بتا رہا ہوں پھر تم اپنے متعلق بتاؤ گے پھر امید کرتا ہوں ہمارے درمیان سمجھوتا ہوگا۔ دوستی ہوگی۔ شکریہ۔“

اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ وہ رہائی پانے کی جلدی میں تیزی سے اپنے بارے میں بہت کچھ لکھ رہا تھا۔ ان نون نے کہا۔ ”محتاج رہو۔ میرے بارے میں کچھ نہ لکھنا۔“

اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”میں نہ لکھوں تب بھی وہ جانتے ہیں کہ تم میرے اندر گھسے رہتے ہو۔“ ”جانتے ہیں تو جاننے دو لیکن انہیں یہ نہ معلوم ہو کہ میں پرنس عالی سے ملے کر رہا ہوں۔“

وہاں سے دور مراد ایک کار کی پچھلی سیٹ پر لیپ ٹاپ سے ملے کر رہا تھا۔ اس نے وزڈم کی مختصری ہسٹری پڑھنے کے بعد لکھا۔ ”ہماری دلچسپی یہ ہے کہ کوئی ٹیلی میٹھی جاننے والا تمہارے پاس آتا ہے۔ ہمیں اس کے متعلق بتاؤ۔“

اس نے جواباً لکھا۔ ”وہ بہت پر اسرار ہے۔ اپنا نام اور پتا نہیں بتاتا ہے۔ ان نون کہلاتا ہے۔ وہ مجھ سے ضرورت کے مطابق کام لیتا ہے۔ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔“

”ہمیں بتاؤ کہ وہ تم سے کیا کام لے رہا ہے؟“ ”تم سمجھ سکتے ہو۔ جرائم کی دنیا میں کوئی نیک کام تو ہوتا نہیں ہے۔ جو بھی ہوتا ہے، کوئی اسے تحریر میں لا کر قانون کی گرفت میں آنے کی حماقت نہیں کرتا۔“

مراد نے لکھا۔ ”میں تمہیں اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ لہذا ان نون کے لیے جو کر رہے ہو اسے وضاحت سے لکھو۔“

”میں رہائی پانے کے لیے تمہارے شکنجے میں رہ سکتا ہوں۔ بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن میرا دماغ ان نون کی مٹھی میں ہے۔ یہ مجھے لکھنے نہیں دے گا۔ میری مجبوری کو سمجھو۔“

”پھر تو وہ ان نون تمہیں یہاں سے کبھی نہیں لے جاسکے گا۔ تم یہاں بھوکے پیاسے مرتے رہو گے۔ اس دیرانے میں کوئی تمہیں پوچھنے نہیں آئے گا۔“

”یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف مجھے کوئی بات لکھنے نہیں دے گا اور تم مجھے جینے نہیں دو گے۔ میں دونوں طرف سے مارا جا رہا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔“ ”اسے تمہاری ضرورت ہوگی تو رحم کرے گا۔ مجھے تم



یہ ہوتی ہے ذہانت اور حکمت عملی۔ مراد کی حاضر دماغی نے ہی اسے اب تک ناقابل شکست بنا رکھا تھا۔ فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔۔۔ دو ماسک پوش ایک ہیناٹزم کے ماہر کو وزڈم کے پاس لے آئے۔ اس قیدی کو اپنی سلامتی کی ضمانت مل گئی۔

ان نون نے اب سے پہلے کبھی دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ وزڈم کا دماغ کبھی اس کے شکنجے سے نکل نہیں پائے گا۔ وہ بڑے اعتماد سے کہیں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وزڈم دوسری صبح تنوکی نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھل گئے تھے۔ ایک ملازمہ اور دو ملازم اس کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی رات اس پر تنوکی عمل کیا گیا تھا۔ یہ یاد آتے ہی وہ خود کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا پھر فون کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ اس کا اپنا فون سرہانے کی میز پر رکھا تھا۔

اس نے فون کو اٹھا کر کال اٹینڈ کی۔ آواز سنائی دی۔ ”تم آزاد ہو۔ ان نون تمہارے دماغ میں نہیں آ سکے گا۔ چلو فریش ہو کر ناشتے کی میز پر آ جاؤ۔“ یہ ایسی خوش خبری تھی کہ وہ خوشی سے جھوم گیا۔ ”مینی مینی تھینکس مسٹر.....! ابھی آرہا ہوں۔“

وہ فریش ہو کر ڈائننگ روم میں آیا۔ وہاں مراد بیٹھا ہوا تھا۔ حماد کے روپ میں تھا اس لیے پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کوئی رسمی گفتگو نہیں ہوگی۔ ناشتا شروع کرو اور ان نون کے متعلق جو جانتے ہو وہ بولتے جاؤ۔“

وہ مراد کے قد و جسامت سے، اس کی شخصیت اور بھاری بھر کم آواز سے متاثر ہو گیا تھا۔ کھانے سے پہلے ہی بولنا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پہلے رزق قبول کرو اور خدا کا شکر ادا کرو۔“

اس نے اپنے گاڈ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک لقمہ منہ میں رکھا پھر اسے چباتے ہوئے بولنے لگا۔ ”وہ ان نون اجانک ہی ایک دن میرے دماغ میں گھس آیا تھا۔ یہ ٹیلی چیٹھی بڑا خطرناک علم ہے۔ میں اپنی مرضی کے خلاف اس کا غلام بن گیا۔ اس نے کہا تھا، میں اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہوں گا تو مجھے بھی اس کی ذات سے فائدہ پہنچتا رہے گا۔ اور واقعی اس نے اسی وقت مجھے فائدہ پہنچایا۔ میری ایک لاکھ دس ہزار کی ہیمنٹ رکی ہوئی تھی۔ وہ ہیمنٹ روکنے والا خود ہی رقم لے کر میرے دروازے پر آ گیا تھا۔

سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کل کسی وقت آؤں گا۔“ مراد نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ چیخ کر بولا۔ ”مسٹر ان نون! واقعی اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ وہ مجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دے گا۔ میں تمہارے کام کا آدمی ہوں۔ مجھے بچاؤ۔ اس سے سمجھوتا کرو گے تب ہی مجھے یہاں سے نکال سکو گے۔“

وہ پریشان ہو گیا تھا۔ بے بسی سے بولا۔ ”ہتا نہیں وہ کون ہے؟ مجھ سے براہ راست نہیں بول رہا ہے اور اپنے دماغ میں آنے کا راستہ بھی روک رہا ہے۔ شاید ڈرتا ہے کہ ایک بار مجھے راستہ مل جائے گا تو میں اسے بھی اپنا تابعدار اور آلہ کار بنالوں گا۔“

”وہ کیا سوچتا ہے کیا کرنا چاہتا ہے، یہی معلوم کرنے کے لیے اس سے بات کرو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔“

وہ جھڑکنے کے انداز میں بولا۔ ”زیادہ نہ بولو۔ جلدی نہ کرو۔ چپ چاپ یہ رات گزارو۔ کل دیکھا جائے گا۔“ وہ چلا گیا۔ وزڈم نے اسے آواز دی۔ جواب نہیں ملا۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ اس کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ ان نون اگر اسے ضروری نہیں سمجھے گا تو مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دے گا۔

وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ سر تھام کر سوچنے لگا کیا کرے؟ ایک خیال یہ آرہا تھا کہ انجانے دشمن کو چپ چاپ ان نون کے بارے میں بتا دے اور وہاں سے رہائی حاصل کر لے لیکن ایک دماغ میں آنے والے سے اس کی چوری اور دھوکے بازی چھپی نہ رہتی۔ وہ اسے ذہنی مریض بنا کر مار ڈالتا۔

پھر اس نے سوچا۔ ”میری چال بازی چھپی رہ جائے اور ان نون کو کبھی معلوم نہ ہو، بات کسی اور طرح بن جائے تو میں یہاں بھوکا پیاسا نہیں مروں گا۔“

اس نے فوراً ہی کمپیوٹر آن کیا۔ یہ پورا یقین تھا کہ ان نون اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ اس نے میسج لکھا۔ ”وہ ان نون ابھی میرے اندر نہیں ہے۔ میں ابھی حقائق بیان کروں گا تو اسے بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ میں کیا کروں؟“

مراد سونے جا رہا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ ماسٹر کے ایک معتمد خاص کے پاس تھا۔ اس نے فون پر وزڈم کی تحریر پڑھ کر سنائی۔ مراد نے کہا۔ ”فوراً جواب لکھو۔ وہ سچ بولے گا تو ابھی ہیناٹزم کا ماہر وہاں آئے گا اور تنوکی عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو مقفل کر دے گا۔ ان نون پھر کبھی اس کے اندر نہیں آ سکے گا۔“



وہ اپنی ٹیلی پتھی کے ذریعے آئندہ بھی میرے دشمنوں کے خلاف کام آسکتا تھا۔ میں بڑی خوشی سے اس کا غلام بن گیا۔ وہ مجھے پرنس عابد علی منگی کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے، اس کی ماں کی آنکھیں دل اور گردے فروخت کیے گئے ہیں۔ فروخت کرنے والے ایک ڈیلر کا نام روڈنی وانز تھا۔ وہ یہودیوں کا بہت ہی قابل اعتماد کارندہ تھا۔ ان نون پرنس کو یہودیوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے روڈنی وانز کے پیچھے لگانا چاہتا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ مرچکا ہے۔ میرا نام روڈنی وزڈم ہے۔ پھر میرا بھی تعلق انسانی اعضا کے دھندے سے رہا ہے۔ ان نون نے پرنس کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس سے جھوٹ کہا گیا ہے کہ میں نے ہی اس کی ماں کے اعضا فروخت کیے ہیں۔ وہ چاہتا ہے پرنس مجھے ہلاک کرنے کی کوششیں کرتا رہے۔ یہودیوں سے بھی نفرت کرتا رہے۔ میں اسی دوران میں کسی موقع پر پرنس کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔“

مراد نے پوچھا۔ ”وہ خود پرنس کے دماغ میں کیوں نہیں جاتا؟ اپنے دشمن کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیوں نہیں کرتا؟“

”میں نے اس سے یہی سوال کیا تھا۔ اس نے بے شک سا جواب دیا تھا۔ کہتا ہے اس نے کبھی ایک چیونٹی کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں مارا ہے۔ وہ پرنس کو میرے ہاتھ سے یا کسی دوسرے کے ذریعے ہلاک کرائے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ اپنی کمزوری چھپا رہا ہے۔ اس کے سامنے ایسی رکاوٹیں ہیں جو اسے پرنس تک پہنچنے سے روک رہی ہیں۔“

”جی ہاں۔ جس طرح آپ نے اسے میرے اندر آنے سے روک دیا ہے، اسی طرح پرنس کا دماغ بھی شاید قدرتی طور پر مقفل ہوگا۔ کوئی زبردست رکاوٹ ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے ذرائع سے پرنس کو مات دینے کی فکر میں ہے۔“

”اب وہ تمہارے دماغ کو پھر جکڑنے کی کوشش کرے گا۔ کسی دوسرے آلہ کار کے ذریعے تمہیں ٹریپ کرے گا۔ کسی ہتھکنڈے سے تمہیں کمزور بنا کر تم پر کیے ہوئے پناٹزم کے عمل کو ختم کر کے پھر تمہیں غلام بنالے گا۔“

”میں اس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا۔ پلیز میری مدد کرو۔“

”کچھ عرصے کے لیے رازداری سے یہ ملک چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔ اپنا نام اپنی شناخت بدل لو۔ ہم اس سے جلد از جلد نمٹنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ جب کامیاب ہو جائیں گے تو تم اصلی چہرے کے ساتھ واپس آ جانا۔“

”میں یہی کروں گا۔ تم بہت مہربان ہو۔ میرے کام

آ رہے ہو اور مجھ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہو۔“

”اس دنیا میں کچھ لوگ ہیں جو نیکی کرتے ہیں اور اس کا صلہ بندوں سے نہیں خدا سے چاہتے ہیں۔“

”تم صرف مجھ سے ہی نہیں پرنس عابد علی سے بھی نیکی کر رہے ہو۔ اگر اسی طرح رکاوٹیں بنتے رہے تو ان نون پرنس کو کبھی چھو بھی نہیں سکے گا۔“

”خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔“

”ایک بات کہوں؟“

”جو کہنا چاہتے ہو کہو۔“

”تم مسلمان ہو۔ پرنس عابد علی منگی بھی مسلمان ہے۔“

تم دونوں ایک دوسرے کو ضرور جانتے ہو گے۔“

”پرنس کو ساری دنیا جانتی ہے۔ اسی طرح میں بھی جانتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی مجھے جانتا ہو۔“

”تم نے اس کی بہتری کے لیے ان نون سے ٹکری ہے۔ مجھے انکارایا ہے۔ اسے بری طرح مات دی ہے۔“

میرے دل میں پلچل سی ہو رہی ہے۔ میرا دل بار بار کہہ رہا ہے۔ پرنس سے تمہارا کوئی گہرا رشتہ ہے۔“

”ایک مسلمان کو تحفظ اور سلامتی دینے کا گہرا رشتہ پرنس عابد علی سے ہے۔ آئندہ بھی اس کے کام آتا رہوں گا۔“

وہ ناشتے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ مراد نے پوچھا۔ ”تمہارے اندر بے چینی سی کیوں ہے؟“

وہ پیالی کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ان نون سے کہا تھا کہ تم نے پرنس عابد علی کو نہیں اس کے باپ مراد علی منگی کو چھیڑا ہے۔ تم ٹیلی پتھی جاننے کے باوجود دھوکا کھا رہے ہو۔ اگر دھوکے میں انجانے میں مراد سے ٹکرا رہے ہو تو توقع کے خلاف اچانک ہی ناکامی کا منہ دیکھو گے۔“

وہ مراد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور وہ تم سے ٹکرا کر بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم مراد علی منگی ہو۔“

وہ ہنستے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ”تمہارا اندازہ اس حد تک درست ہے کہ میں مراد صاحب کا خاص ماتحت ہوں۔“

ابھی ان کا ہی کام کر رہا ہوں۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں مراد صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ان نون کی غلامی سے رہائی دلائی ہے۔ کیا میں ان سے دو باتیں کر سکتا ہوں۔“

”سوری۔ وہ ضروری سمجھیں گے تو گفتگو کریں گے۔“

تم اپنی حفاظت اور سلامتی کی فکر کرو۔“

2016 اگست

210

سپینس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ اک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 ایسٹینٹ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

مراد وہاں سے اٹھ کر اس مکان سے باہر آیا پھر اس  
سے مصافحہ کر کے اپنی کار میں بیٹھ کر جانے لگا۔ ان نوں کن بار  
ماریہ کے فون پر عابی سے باتیں کر چکا تھا۔ اس کا فون نمبر مراد  
کے پاس بھی تھا۔ وہ ابھی اس سے باتیں کرنے والا تھا۔  
اس وقت ان نوں وزڈم کے دماغ میں پہنچ نہیں پارہا  
تھا۔ جیسے ہی سوچ کی لہریں اس کے اندر جاتی تھیں، وہ  
سانسیں روک لیتا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ ٹیلی پیٹھی کی لہریں کسی  
انجانی رکاوٹ سے ٹکرا کر واپس آتی رہیں۔ آخر یہ سمجھ میں  
آ گیا کہ اس کے دماغ کو تنویمی عمل کے ذریعے لاکڈ کر دیا  
گیا ہے۔

وہ شدید حیرانی سے تاریکی میں ٹکتا رہ گیا۔ وہ اپنی  
عادت کے مطابق دن کے وقت بھی ایک بند کمرے کی گہری  
تاریکی میں تھا۔ وہ ایسی گہری تاریکی میں کیوں تھا؟ اس کی  
ایک پر اسرار بنیادی وجہ تھی۔ آگے کسی مرحلے پر اس کی  
ہسٹری معلوم ہونے والی تھی۔

وہ ان لمحات میں جھنجھلا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس نے  
تنویمی عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو لاکڈ کیا ہے؟ کس  
نے ایسی چال چلی ہے؟ اس کا ذہن چنچ رہا تھا۔ ”کوئی بہت  
ہی شاطر مجرم ہے۔ ٹیلی پیٹھی کو کمزور بنانے والی چالبازیاں  
جانتا ہے۔ میں اب معلوم نہیں کر سکوں گا کہ وزڈم کہاں  
ہے؟ وہ اس شاطر کو بتا چکا ہوگا کہ میں عابی کو کیسی چالوں میں  
الجھا کر ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ اوگاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا  
تھا۔ پلک جھپکتے ہی عابی کے مقابلے میں کمزور ہو گیا  
ہوں۔ کیا عابی نے ایسی چال چلی ہے؟ اس کے متعلق یہی  
سننا اور دیکھنا آرہا ہوں کہ وہ عجوبہ ہے۔ عجیب و غریب  
صلاحیتوں کا مالک ہے۔ ذہانت بھی غیر معمولی رکھتا ہوگا۔“

ایسے وقت اسے وزڈم کی باتیں یاد آئیں۔ ایک بار  
اس نے مراد علی منگی کے متعلق کہا تھا۔ ”مسٹر ان نوں! وہ باپ  
بیٹے بظاہر ایک دوسرے سے دور نظر آتے ہیں لیکن دیر پردہ  
قریب رہتے ہوں گے۔ تم ان کے دماغوں میں جا کر حقیقت  
معلوم کرو۔ میری یہ بات لکھ لو کہ تم ٹیلی پیٹھی جیسی طاقت رکھتے  
ہوئے بھی دھوکا کھا رہے ہو۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ پرنس سے نمٹ  
رہے ہو جبکہ اس کا باپ تم سے نمٹ رہا ہے۔“

وہ بے یقینی سے سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”کیا میں  
مراد علی منگی سے ٹکرا رہا ہوں؟ مراد کے لائن آف ایکشن اور  
چالبازیاں کے سب ہی قائل ہیں۔ وہ صرف خطرناک فائٹر ہی  
نہیں، خطرناک پلان میک بھی ہے۔ ایسی چالیں چل جاتا ہے  
کہ دشمن حیران رہ جاتے ہیں۔ اور میں حیران ہو رہا ہوں۔“



جو سوچا بھی نہیں تھا وہ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ مجھے مان لینا چاہیے۔ نہ مانوں تب بھی ماننا پڑے گا کہ لاعلمی میں مراد سے مات کھا چکا ہوں۔ بائی گاڈ! کوئی اور ایسا شاطر ہو ہی نہیں سکتا۔ ویسے وزڈم کا دماغ میری گرفت سے نکلا ہے۔ اس کا وجود تو اسی شہر میں رہے گا۔ وہ اپنے گھر میں رہے گا۔ اسے کاروباری معاملات میں منظر عام پر رہنا ہوگا۔ مجھ سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ میں پھر اسے دماغی طور پر کمزور کر کے تابعدار بناؤں گا تو اس کا دماغ بے اختیار بتائے گا کہ میرے مقابلے میں شاطر کون ہے؟

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اسکرین پر نئے انجانے نمبر تھے۔ اس نے بشن کو دبا کر اسے کان سے لگایا لیکن خاموش رہا۔ پہلے کال کرنے والے کی آواز سننا چاہتا تھا۔

مراد نے کھٹکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اونو مسٹر وزڈم! میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کسی کا باپ بھی میرے دماغ میں نہیں آسکے گا۔ میں یوگا کا ماہر ہوں۔ پرانی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک کر انہیں بھگا دیتا ہوں۔“

ان نون چپ رہ کر کسی اجنبی کے چیلنج کو سن رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”نہیں مسٹر وزڈم! وہ ابھی تک خاموش ہے۔ سوچ رہا ہے کہ میرے اندر تشریف لانا چاہیے یا نہیں؟“ ان نون نے مراد کی آواز اور لہجے کو گرفت میں لے کر خیالی پرواز کی۔ پھر نامعلوم رکاوٹ سے ٹکرا کر واپس آ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”آیا رے آیا۔ ماں کا لعل ابھی آیا تھا پھر کوشش کرے گا۔“

ایک ہی ناکامی نے اسے سمجھا دیا کہ کال کرنے والا بوسے کا چنا ہے چبا نہیں سکے گا۔ اس نے غرانے کے انداز میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“ ”کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم کون ہو؟“

”تم مجھ سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟“ ”میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم پرنس عابد علی منگی سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟“

”میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں تم کون ہو؟ تم پرنس عابد علی منگی ہو۔“

”تم مجھے اپنا بھی باپ سمجھ لو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر مجھے جوڑ کا توڑ سمجھتے ہو تو بولو دوستی کرو گے؟“

”ہاں۔ میں جوابی حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ دوستی سے

بات بن جائے تو راضی ہوں۔“ ”تو پھر ہاتھ ملانے کہاں آرہے ہو؟“ ”دوستی ہوگی لیکن رو برو ملاقات کبھی نہیں ہوگی۔“ ”میں کسی منہ چھپانے والے پر کبھی اعتماد نہیں کروں گا۔ انتظار کرو۔ کسی دن کسی وقت تمہاری شہ رگ تک پہنچنے والا ہوں۔“

مراد نے فون کا بشن دبایا۔ دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

ان نون کہلانے والا واقعی ایسا پراسرار اجنبی ایسا گم نام تھا کہ مراد اور عابدی کبھی نہ اس کا نام معلوم کر سکتے تھے نہ کبھی اس کے سائے تک پہنچ سکتے تھے۔ وہ بازی گرجو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی کے بھی دماغ میں پہنچ جاتا تھا، وہ بھی فی الحال باپ بیٹے کے سامنے مجبور ہو گیا تھا اور مجبور کیوں ہو گیا تھا؟ یہ وہی جانتا تھا۔

اس کی یہ کمزوری ہمیشہ چھپنے والی نہیں تھی۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہونے والی تھی۔ خدا کے سوا کوئی راز راز نہیں رہتا جو رہتا ہے ایک دن کھل جاتا ہے۔ ابھی مراد سے فون پر باتیں کر کے اسے کسی حد تک پہچان لینے کے باوجود نہ اس کے اندر جاسکتا تھا، نہ پوری طرح یقین ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دشمن پرنس عابدی کے باپ سے باتیں کرتا رہا ہے۔

مراد نے اس اعتماد اور چیلنج کے ساتھ فون کو بند کر دیا تھا کہ وہ جلد ہی ان نون کی شہ رگ تک پہنچ جائے گا۔ فی الحال اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔

ان نون اپنے گونگے فون کو دیکھ رہا تھا۔ فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مراد وزڈم کو اغوا کر کے اسے ٹیلی پیٹھی کی گرفت سے نکال کر یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ آئندہ بھی اس... خیال خوانی کرنے والے پر بھاری پڑنے والا ہے۔

وہ خاموش فون کو ہاتھ میں لیے گہری تاریکی میں بیٹھا تھا۔ یہ عجیب سی تجسس میں مبتلا کرنے والی بات تھی کہ وہ اندھیرے میں کیوں رہتا ہے؟ کیا روشنی میں دیکھ نہیں سکتا تھا؟ معلوم نہیں کیا تھا۔ ابھی تو بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کی بے تابی تھی کہ کس نے وزڈم جیسے اہم مہرے کو اس سے چھین لیا ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے؟

اس نے مار یہ کے نمبر شیخ کیے۔ اسی کے فون پر عابدی سے رابطہ ہوتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی عابدی نے پوچھا۔ ”کیا وزڈم واپس آ گیا ہے یا پھر فضول باتیں کرنے آئے ہو کہ میں نے اسے اغوا کر دیا ہے؟“



وہ بولا۔ ”ابھی معلوم ہوا ہے کہ اسے تم نے نہیں تمہارے باپ نے اغوا کر دیا ہے۔“  
عابی نے کہا۔ ”یہ ناقابل یقین معلومات مبارک ہو اور کیا معلوم ہوا ہے؟“  
”تمہارے باپ نے تمہاری عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو لاک کر دیا ہے۔ وہ میری خیال خوانی کا راستہ کاٹ چکا ہے۔“

”تمہیں کوئی شکایت ہے تو بابا جانی سے بولو۔ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں دوستی کرنا چاہتا ہوں اور تم دشمنی کر رہے ہو۔ میں نے تمہاری ماں سے دشمنی کرنے والے یہودی کی نشان دہی کی۔ ایک کرائے کی ماڈل کے ذریعے تمہاری مام کی ویڈیو بنا کر تمہیں دھوکا دیا گیا لیکن اتنے بڑے فراڈ پر تمہیں غصہ نہیں آیا۔ تم اب تک ان یہودیوں کی گود میں بیٹھے ہو۔“

”یہ میری بہت بڑی قوت ہے کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ اگر آتا تو تم پر بھی آتا کیونکہ تم بھی دھوکا دے رہے ہو۔ جس شخص نے میری مام کے اعضا فروخت کیے تھے، وہ روڈنی وائز مرچکا ہے۔ تم اس کی جگہ روڈنی وزڈم کو پیش کر رہے ہو۔ تم اپنے آلہ کاروں کے ذریعے مجھے گھیر کر پتا نہیں کب اور کیسے ہلاک کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو اچھی طرح یقین ہو گیا کہ براہ راست میرے پاس آ کر مجھے چھو بھی نہیں سکو گے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم اسی خوش فہمی میں رہو۔ یہی سنتے رہو کہ شیر آرہا ہے۔ شیر آرہا ہے۔ ایک دن سچ سچ آجائے گا اور چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔“

”دبھی آ جاؤ“ کب تک نئی دلہنیا کی طرح شرماتے رہو گے۔ آج سے تین دن بعد ماریہ میری تنہائی کی ساتھی بننے والی ہے۔ میں جشن منانے والا ہوں۔ یہ تمہارے لیے اچھا موقع ہوگا۔ مجھے چیرنے پھاڑنے کے لیے آ جانا۔ تمہیں اپنی حسرت پوری کرنے کے لیے میری ایک یادگار رات ملے گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ عابی نے اپنے فون کو دیکھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ ساری دنیا کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایک محبت کرنے والی ایلی دوشیزہ اس کی زندگی میں آگئی ہے۔ وہ سب ہی کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنا چاہتا تھا۔

اس نے فون پر مراد سے کہا۔ ”بابا جانی! یہ اعلان کر دیں کہ آج سے جو تھے دن ارض اسلام میں دعوت عام ہے۔ عام تعطیل ہوگی اور ہمارے چاہنے والے میری اور

ماریہ کی کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے دعا کریں گے۔“  
مراد نے ہم زاد بشری اور بلے سے کہا۔ بشری نے خوشی سے اچھل کر کہا۔ ”میں تو آج ہی اپنے عابی اور اپنی بہو کے پاس جاؤں گی۔ وہاں جشن مناؤں گی۔“  
بلے نے کہا۔ ”میں کب پیچھے رہوں گا۔ میں بھی اپنے بھتیجے اور بہو سے ملنے جاؤں گا۔“

زیب النساء نے کہا۔ ”میرا بھی جی چاہتا ہے لیکن سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”اور میں مراد کی غیر موجودگی میں یہاں کی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکوں گا لیکن ہم آج ہی سے یہاں جشن منانے کی تیاریاں کریں گے۔“

ماسٹر کو بویو نے سنا تو کہا۔ ”آج سے سن سٹی میں بھی ناچ گانے اور دھوم دھڑاکے شروع ہوں گے۔ عابد علی منگی کی پہلی خوشی کو یادگار بنایا جائے گا۔“

کیا دوست اور کیا دشمن جو بھی سن رہا تھا، وہ خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے بڑی اپنایت کا اظہار کر رہا تھا۔ دشمن اس لیے بھی خوش ہو رہے تھے کہ اکثر خوشیوں کے میلے میں ہی جھیلے ہوتے ہیں۔ عابی جنگل میں منگل مناتا تو ان نون وہاں بھی ڈنگل کے لیے آ جاتا۔

سپر پاور اس کے اتحادی اور جرائم کی دنیا میں رہنے والے بھی شریک ہو کر دیکھنا چاہتے تھے کہ ان نون اس میلے میں دکھائی دے گا یا نہیں؟

دونوں زبردست حریف تھے۔ جشن طرب میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دو میں سے کوئی جیتا کوئی مرتا۔ بلا سے کسی کی جان جاتی تماشا تو سب ہی دیکھ لیتے۔

یہودی اکابرین بھی جشن منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ درپردہ دشمنی کرنے والے اور بظاہر واری واری جانے والے حکمران بھی اپنے اپنے ملک میں چراغاں کرنے لگے۔

پیرس کے اس علاقے میں میلوں دور تک جشن منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سیاست کی اور جرائم کی دنیا کی تمام تنظیموں کے سربراہ اور اکابرین ان باپ بیٹے کو یہ دکھا رہے تھے کہ وہ انہیں کس قدر چاہتے ہیں؟

تمام چاہنے اور جشن منانے والے ماریہ اور عابی کو وہاں ہر سمت لگی ہوئی بڑی بڑی اسکرینز پر دکھ رہے تھے۔ ٹی وی چینلز کے کمرے انہیں دنیا کے ہر ملک میں دکھا رہے تھے۔ ان لاکھوں افراد کی بھیڑ میں ان نون بھی موجود تھا۔ کوئی اسے صورت شکل سے پہچانتا نہیں تھا اور وہ کسی سے جان پہچان رکھنے والا نہیں تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق



کسی ایسے وی آئی پی کے دماغ میں پہنچ جانا چاہتا تھا جو عالی کے قریب ہوتا۔  
عالی کے اطراف دور تک سخت سکیورٹی تھی۔ سکیورٹی گارڈز بھی فون کے اور اسکا پ کے ذریعے اجازت لے کر اس کے سامنے آتے تھے۔ وہ ایسے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود کسی گارڈ کے دماغ میں رہ کر عالی کے قریب پہنچ جاتا تھا پھر ناکام کیوں ہوتا تھا؟ یہ فی الحال... وہی جانتا تھا۔

عالی پر کامیاب حملہ کرنے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ ان ٹون وہ راستہ جانتا ہوگا۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ کسی دن کسی خاص ہتھکنڈے سے عالی کو ختم کر دے گا۔ اسی لیے وہ اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

شمالیہ جینیوا کے اسپتال میں زخمی پڑی تھی۔ عالی نے اسے وہاں پہنچا کر نئی زندگی دی تھی۔ اس خطرناک عورت نے اسے داماد بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ اب بھی اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اب اسے معلوم ہو رہا تھا کہ عالی نے اس کی بیٹی جمانک کو ٹھکرا کر ماریہ کو دلہن بنالیا ہے۔ وہ اسپتال کے بیڈ پر پڑی ٹی وی پر جشن منانے کی دھوم دھام دیکھ رہی تھی۔ اندر ہی اندر انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس کے پاس سونے کا اتنا ذخیرہ تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے ملک کو خرید سکتی تھی۔ اب بھی وہ جس ملک کے جس علاقے میں بھی رہتی تھی وہاں کی بے تاج ملکہ بن کر اپنی چھوٹی سی آرمی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کے بے حساب سونے کے ذخیرے کو سنبھالنے کے لیے عالی اس کا داماد بن جائے۔ اس وقت ٹی وی اسکرین پر عالی کے ساتھ نظر آنے والی ماریہ اس کی جان جلا رہی تھی۔ نہ طاقت، نہ وسیع ذرائع اور نہ سونے کا ذخیرہ کام آ رہا تھا۔ ایسے وقت صرف خوش نصیبی ہی کام آتی ہے۔ اچانک ہی اس کے نصیب خوش ہو گئے۔ ان ٹون اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے کام کے لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ شمالیہ کا چرچا سن کر اس کے اندر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی کام آنے والی بلا ہے۔ لہذا چھالنے والی درندہ صفت ضدی عورت ہے اور بے حساب سونے کا ذخیرہ رکھتی ہے۔

شمالیہ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس نے جھنجلا کر ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا تھا۔ ایسے وقت فون کی رنگ ٹون نے اسے پکارا۔ اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ اس نے مٹن کو دبا کر اسے کان سے لگا یا پھر پوچھا۔ ”ہیلو کون ہے؟“

ایک بھاری بھر کم آواز سنا کی دی۔ ”لوگ خوابوا خدا کو تقدیر کا مالک کہتے ہیں۔ تقدیر تو انسان ایک دوسرے کی بگاڑتا اور بناتا ہے۔ پتا نہیں تم نے اپنی دولت سے طاقت سے اور درندگی سے کتنوں کو موت دی ہے اور اپنے مفادات کی خاطر کتنوں کو زندہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ درست ہے نا؟“  
شمالیہ نے ناگواری سے کہا۔ ”کام کی بات کرو۔“  
”تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ آج سے میں تمہاری تقدیر کا مالک بن گیا ہوں۔“

وہ غصے سے اور بڑی حقارت سے بولی۔ ”کون ہے رے تو؟ پاگل کے.....“  
وہ آگے نہ بول سکی۔ یکھت زبان چپ ہو گئی۔ ہونٹ بند ہو گئے۔ وہ فون پر کھد رہا تھا۔ ”اب اگر گستاخی کرو گی ادب سے نہیں بولو گی تو سزا پادگی۔“

وہ سمجھ نہیں پائی کہ بولتے بولتے کیوں چپ ہو گئی تھی پھر جھنجلا کر بولی۔ ”تو مجھے سزا دے گا؟ نوڈرٹی ڈاگ.....“  
اتنا کہتے ہی وہ چیخ مار کر تلملانے لگی۔ اس کی زبان دانتوں تلے آگئی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ”میں نے کہا نا تمہاری تقدیر کا مالک بن چکا ہوں۔ میں جو چاہوں گا وہ تمہارے ساتھ ہوگا۔ تم میری مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکو گی۔ تم نے فون کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے لیکن یہ تمہارے ہاتھ سے گر جائے گا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر آ گیا۔ اس بار اسے اپنے دماغ کے اندر آواز سنا کی دی۔ ”فون ضروری نہیں ہے۔ میں تمہارے اندر بول رہا ہوں۔“  
اس کا منہ شدید حیرانی سے کھل گیا۔ وہ بولا۔ ”تم نے مجھے گالی دی۔ مجھے ڈرٹی ڈاگ کہا۔ اپنے منہ کو سزا دو۔“

اس نے مراد کے کہنے سے تھوک کر نہیں چاٹا تھا۔ کوئی اس سے اپنی بات نہیں منوانا سکتا تھا لیکن دماغ اس کے اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ مارنے لگی۔ تین گھونٹے مارتے ہی ہونٹ پھٹ گئے۔ باجھوں سے لہو بہنے لگا۔

وہ پریشان ہو کر کہنے لگی۔ ”پلیز مجھے چھوڑ دو۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ میرا دماغ تمہارے شکنجے میں ہے۔ میں تمہارے حکم کے بغیر مل بھی نہیں سکوں گی۔ میں مانتی ہوں تم زبردست ہو۔ تم میری تقدیر کے مالک بن گئے ہو۔“

”تم نہ مانو، تب بھی میرے قدموں تلے رہو گی۔ تم نے گالی دی۔ اس لیے سزا پا رہی ہو۔ آئندہ میری موجودگی میں غرور اور غصہ نہیں دکھا سکو گی۔ میں جسے اپنا محکوم اور



اور ہلاک کرنا رہوں گا۔ دنیا کو دکھاؤں گا کہ وہ خود ہی کمزور ہوتے ہوتے میرے سامنے جھک رہا ہے۔ دراصل میں عالی جیسے شہ زور کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔“

”جو کام ابھی ہو سکتا ہے اس میں دیر کیوں کرنا چاہتے ہو؟“

”وہ ناقابل شکست کہلاتا ہے۔ میں اسے رفتہ رفتہ توڑتا رہوں گا تو دوسرے تمام خطرناک شہ زوروں پر میرا خوف طاری ہوتا رہے گا۔ دنیا دیکھتی رہے گی کہ میں کس طرح ٹیلی پتھری کے ہتھکنڈوں سے عالی کو بے بس اور مجبور بنا رہا ہوں۔ اس شہ زور کے پیچھے مراد علی منگی جیسا شہ زور باپ ہے۔ انہیں مات دینے میں کچھ وقت لگے گا۔“

وہ بولی۔ ”ماریہ نے میری بیٹی کا حق چھین لیا ہے۔ آج سے تین دن بعد اسے سہاگ رات نہ منانے دو۔ عالی کو ابھی نہ سہی ماریہ کو تو ابھی ختم کر سکتے ہو؟“

”یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں اپنی پلاننگ کے مطابق ماریہ کو بھی ہلاک نہیں کروں گا۔ اس کی موت ضروری نہیں ہے۔ میں اسے عالی کی زندگی سے نکال دوں گا۔“

”میں یہی چاہتی ہوں۔ ہر حال میں اسے اپنا داماد بنانے کی قسم پوری کرنا چاہتی ہوں۔ جس دن قسم پوری ہوگی، اس دن اس پر تھوک دوں گی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم میری طرح کمینی اور حرام زادی ہو۔ ہم اپنے یہ فطری تقاضے ضرور پورے کریں گے۔“

پیرس میں جشن مسرت شروع ہو چکا تھا۔ مسرتوں کے اس میلے میں عالی کے دوست کم تھے، دشمن زیادہ تھے اور تمام دشمن یہ جانتے تھے کہ ان نون بھی وہاں ہے۔

سب ہی اسے ڈھونڈ لیتا اور پہچان لیتا چاہتے تھے۔ سب ہی کو عالی سے زیادہ اس سے دلچسپی تھی۔ عالی کے دشمنوں کے لیے ایک ٹیلی پتھری جاننے والا ہیرو آ گیا تھا۔ اگرچہ اب تک اسے نقصان نہیں پہنچا سکا تھا پھر بھی ایک زبردست چیلنج بنا ہوا تھا۔

وہ یہی کہتا رہتا تھا۔ ”انتظار کرو۔ عابد علی منگی کی موت بہت ہی عبرت ناک ہوگی اور میں اسے غلام بنا کر دنیا والوں کے سامنے زندہ بھی رکھ سکتا ہوں۔ مجھے یہ تماشا دکھانے کی جلدی نہیں ہے۔“

تماشا تو وہ واقعی دکھانے والا تھا۔ وہ خیال خوانی کی چھلانگ لگا کر ارض اسلام میں پہنچ گیا۔ ادھر بے بشری اور کئی جاں باز مراد کے ذاتی طیارے میں وہاں سے پیرس آنے

تا بعد ار بناتا ہوں اسے ذلیل نہیں کرتا۔ اسے فائدہ پہنچاتا ہوں۔ اس کے بگڑے ہوئے کام بناتا ہوں۔ میں نے تمہارے مختصر خیالات پڑھ کر معلوم کیا ہے کہ تم میرے دشمن کی دشمن ہو اور سونے کا بے حساب ذخیرہ رکھتی ہو۔ میں چپ چاپ تمہارے خیالات پڑھتا رہا تھا۔ تمہارے دماغ نے بتایا ہے کہ وہ ذخیرہ کہاں ہے؟ کس تہ خانے میں ہے؟ چور دروازہ کہاں ہے اور کن نمبروں کی ترتیب سے کھلتا ہے۔“

وہ تہ خانے کا پتا اور مقفل دروازے کو کھولنے کے خفیہ نمبر بتانے لگا۔ وہ شدید حیرانی سے منہ کھولے سن رہی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ وہ اس کے تمام خزانے پر قبضہ جما چکا تھا۔

اس کی تو آدمی جان نکل گئی۔ وہ بیٹھے بٹھائے آدمی کنگال اور پوری طرح محکوم ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ ایسے سفید پڑ گیا جیسے بدن کا تمام لہو چوس لیا گیا ہو۔

وہ بول رہا تھا۔ ”اتنے بڑے نقصان کا ماتم نہ کرو۔ وہ تمام سونا تمہارے ہی پاس رہے گا۔ میں ضرورت کے وقت خرچ کروں گا اور کبھی بھی اس ذخیرے میں اضافہ بھی کرنا

رہوں گا۔ جب بھی چور بازاری سے اور اسمگلنگ کے ذریعے سونا حاصل کرنا چاہوگی، میں مخالفین کی کھوپڑیوں پر قبضہ جما کر تمہاری تمام مشکلات کو آسان بناتا رہوں گا۔“

یہ ماننے والی بات تھی، وہ ایسا کر سکتا تھا۔ شامکے کے اندر پھر سے جان پیدا ہوئی۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”کیا تم میرے تمام مخالفین کے دماغوں کو لاکھڑ کر کے ان کا تمام سونا

میرے ذخیرے میں لاسکو گے؟“

”میرے نہیں ہمارے کہو۔ اب سونے کا بڑھتا ہوا ذخیرہ ہمارا ہوگا۔ تم مکار اور خود غرض ہو۔ تم نے اپنے شوہر کو حصے دار بن کر رہنے نہیں دیا۔ اسے مار ڈالا۔ مجھے مار ڈالنے کے خواب ہی دیکھتی رہ جاؤ گی۔“

”جب وہ سونا میرے ہی پاس رہے گا اور اس میں اضافہ ہوتا رہے گا تو میں تمہارے خلاف کبھی غلط نہیں سوچوں گی۔ ہمیشہ تمہاری وفادار بن کر رہوں گی۔“

”میں نے تمہارے خیالات پڑھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ پرنس عالی کو اپنا داماد بنانے میں ناکام رہی ہو۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”تم تو اس کی کھوپڑی میں کھس کر اسے میرے قدموں میں جھکا سکتے ہو۔ اوگا ڈاٹم اسے میرے تلوے چاٹنے والا داماد بنا سکتے ہو؟“

”میں جب چاہوں گا تمہاری یہ حسرت پوری کر دوں گا لیکن اپنی پلاننگ کے مطابق جلدی نہیں کروں گا۔ ایک طویل عرصے تک عالی سے دور رہ کر اسے پریشان



والے تھے۔ ہم زادے طیارے کی روانگی سے پہلے کہا۔  
”بلے.....! اپنی بشری اور جاں نثاروں کے ساتھ بہت محتاط  
رہو۔ اس ان نون نے میرے اور زیب النساء کے دماغوں  
میں آنے کی کوششیں کی تھیں۔ ہم نے سانس روک کر اسے  
بھگا دیا ہے۔ وہ تمہارے اندر بھی آنا چاہے گا۔“

بلے نے کہا۔ ”وہ کمبخت آیا تھا۔ میں نے کہا۔ خوش  
آمدید ضرور آؤ مگر پہلے یہ دیکھ لو کہ کسی وقت بھی تمہیں بھگا سکتا  
ہوں۔ پھر میں نے سانس روکی تو خیال خوانی کی لہریں  
واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد وہ نہیں آیا۔“

بشری اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”انیم آل  
رائٹ، وہ میری طرف نہیں آیا ہے۔ آئے گا تو میں اس کا  
مذاق اڑاؤں گی۔“

وہ سب ہنسنے لگے۔ ہم زادے نے مطمئن ہو کر انہیں  
وہاں سے رخصت کیا۔ وہ شاہی طیارہ پیرس کی طرف پرواز  
کرنے لگا۔

بشری نے بلے اور ہم زادے سے جھوٹ کہا تھا۔ وہ  
جھوٹ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ خلاف توقع اس کی سوچ  
اور اس کی ذہانت ان نون کے شکنجے میں آ گئی تھی۔

ویسے تو وہ بہت ہی مضبوط قوت ارادی رکھتی تھی۔  
ایسی حاضر دماغ اور زبردست فائٹر تھی کہ دشمنوں کے چھکے  
چھڑا دیتی تھی۔ ایک فائٹر کی حیثیت سے دیر تک سانس  
روکنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ سانس  
روک کر اسے بھگانے میں ناکام رہی تھی۔

ناکامی کی ایک وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ پچھلے چار  
دنوں سے بیمار تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”آج سے یہ جان لو  
کہ جہاں تپاکی ہوتی ہے وہاں میری سوچ کی لہریں آسانی  
سے پہنچ جاتی ہیں۔ تم سانس روک کر بھی مجھ سے پیچھا نہیں  
چھڑا سکو گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں تمہارے جیسے دشمنوں سے مات  
نہیں کھاتی، یہ عارضی شکست ہے۔ جلد تمہارے شکنجے سے  
نکل جاؤں گی۔“

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نادان نہیں ہوں کہ  
تمہیں نکلنے دوں گا۔ اگر سفر کے دوران طیارے میں موقع  
نہ ملتا تو پیرس پہنچتے ہی تم پر تو بمباری عمل کر کے تمہیں اپنا تابعدار  
بنالوں گا۔ تم میرے شکنجے سے نکلنا ہی بھول جاؤ گی۔“

وہ چپ رہی۔ سوچنے لگی کہ موجودہ حالات میں کیا  
کر سکے گی۔ اس نے کہا۔ ”سوچتی رہو۔ تمہاری کوئی سوچ  
مجھ سے چھپی نہیں رہے گی۔ میری مرضی کے بغیر اپنی کسی

تدبیر پر عمل کر کے رہائی حاصل نہیں کر سکو گی۔“  
وہ دیکھ رہی تھی کہ کتنی مجبور ہو گئی ہے۔ دن رات ساتھ  
رہنے والے بلے کو بھی ان نون کے متعلق کچھ بتا نہیں پا رہی  
تھی۔ کسی چالاکی سے کوئی اشارہ بھی نہیں دے رہی تھی۔

بشری نے پوچھا۔ ”کب تک جکڑ کر رہتھو گے؟ کیا  
تمہاری اور دوسری مصروفیات نہیں ہیں؟ کسی بھی ضرورت  
کے لیے مجھے چھوڑ کر جانا ہی ہوگا۔ بعد میں پھر آؤ گے پھر مجھ  
پر قبضہ جماؤ گے، تب تک میں اپنے تمام ساتھیوں کو تمہاری  
طرف سے ہوشیار کر دوں گی۔“

وہ بولا۔ ”بے شک میری یہ مجبوری ہے۔ میں دیر تک  
تمہارے اندر نہیں رہ سکوں گا۔ میری اور بھی مصروفیات  
ہیں۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ میرے جانے کے  
بعد اپنے لوگوں کو میرے بارے میں کچھ بھی بتاؤ گی تو میں  
واپس آ کر تمہارے دماغ میں زلزلے پیدا کر دوں گا۔ خیال  
خوانی کے ایسے جھٹکے دوں گا کہ تم دماغی مریضہ بن جاؤ گی۔“

وہ ایسا کر سکتا تھا۔ بشری پریشان ہو گئی۔ اس نے  
کہا۔ ”سوچ لو۔ جس کی خوشیوں میں شریک ہونے جا رہی  
ہو وہ پرنس اور اس کا باپ بھی تمہیں دماغی مریضہ بننے سے  
اور میرے ہاتھوں مرنے سے بچا نہیں سکے گا۔“

وہ سفر کے دوران اسے دھمکی دے کر چلا گیا۔ اس کا  
دماغ عارضی طور پر خیال خوانی کے شکنجے سے نکل گیا۔ وہ  
پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کرے؟

طیارہ اپنی مخصوص بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس نے  
کن انکھیوں سے پاس بیٹھے ہوئے بلے کو دیکھا۔ اس کا ایک  
ذرا سا اشارہ پا کر وہ سمجھ لیتا کہ وہ کسی پرابلم میں ہے۔

اس وقت ان نون نہیں تھا۔ وہ کھل کر بول سکتی تھی لیکن  
وہ کسی وقت بھی واپس آ کر اس کے دماغ کے چیتھڑے  
اڑا دیتا پھر وہ دماغ کے بغیر ایک پاگل عورت بن کر رہ جاتی  
اور اگر چپ رہتی تو ان نون اس کے ذریعے مراد اور عالی کو  
کمزور بنانے کا موقع حاصل کرتا رہتا۔

وہ باپ بیٹے مشکل میں پڑ جاتے۔ کبھی یہ نہ چاہتے  
کہ بشری ان نون کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔ وہ اس کی  
سلامتی کی خاطر واقعی ان نون کے آگے کمزور اور کمتر  
ہو جاتے۔

وہ ایسی خود غرض نہیں تھی کہ اپنی سلامتی کی خاطر اپنے  
مہربانوں کو پرنس عالی کو اور مراد علی منگی جیسے پہاڑوں کو  
گرا دیتی۔ وہ ان کی خاطر جان دینے والی تھی۔ ابھی تو  
صرف سوچ ہی رہی تھی کہ ان نون کی دشمنی مول لیے بغیر کس



منانے نہیں دے گا۔ اپنے دشمن کی سب سے پہلی خوشی کو ماتم میں بدل دے گا اور ایسا کرنے کے لیے بشری اس کی گرفت میں آگئی تھی۔

وہ ارض اسلام کے شاہی طیارے میں پیرس پہنچ گئی۔ بلے کے اور اپنے جاں بازوں کے ساتھ لگج ہال سے باہر آئی۔ عالی اپنی پھوپھی ماں کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ بشری نے اسے گلے سے لگا کر چوما۔ ایسے ہی وقت ان نون اس کے اندر پہنچا ہوا تھا۔ بڑی خاموشی سے اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔

اسے معلوم ہوا کہ بشری اس کے خلاف سوچتی رہی ہے۔ وہ طے کر چکی ہے کہ کسی بھی حال میں ان نون کی تابعدار بن کر اسے عالی تک پہنچنے نہیں دے گی۔ اس سے پہلے ہی یہ انکشاف کر دے گی کہ دشمن ٹیلی پیٹھی جاننے والا اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

ان نون نے حقارت سے کہا۔ ”بھتیجے کو گلے لگا رہی ہو۔ یہ بھید کھولنا چاہتی ہو کہ میں تمہارے اندر چھپا ہوا ہوں۔ لو میں ہی دھماکا کرتا ہوں۔ اب تماشا بنا اور تماشا دیکھو۔“

اس نے سوچ کی لہروں سے ایک زور کا دماغی جھٹکا اسے پہنچایا تو وہ تکلیف کی شدت سے حلق پھاڑ کر چیخ پڑی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فولادی حوصلہ رکھنے والی یوں کمزور عورت کی طرح چلائے گی۔

وہ دماغی تکلیف کی شدت سے بری طرح لرزتی ہوئی فرش پر گرنے والی تھی۔ بلے نے اسے تھام لیا۔ عالی نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔ ”پھوپھی اماں! کیا ہوا.....؟“ آپ اس طرح کیوں لرز رہی ہیں؟“

وہ انک انک کر بولی۔ ”وہ..... وہ ان نون.....“ وہ سب محتاط ہو گئے۔ مسرتوں کے ہجوم میں سب ہی بھول جاتے ہیں کہ شامت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ دماغی جھٹکا ایسا تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کئی ڈاکٹر دوڑتے ہوئے آگئے تھے لیکن وہ علاج کیا کرتے؟ دماغ کی اندرونی تکلیف کو کم کرنے کے لیے کوئی دوا دے رہے تھے۔

ایسے وقت دوا دینے والے ڈاکٹر کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ فرش پر گر کر ترپنے لگا۔ دوسرے ڈاکٹر زہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ گویا یہ خاموش وارننگ تھی کہ بشری سے ہمدردی نہ کی جائے۔ ورنہ اس کا علاج کرنے والے بھی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

عالی نے بے بسی سے اپنی پھوپھی اماں کو دیکھا پھر

طرح اس کی ٹیلی پیٹھی کے عذاب سے خود کو بچا سکے گی؟ ان نون کی یہ ایک اہم کمزوری معلوم ہوگئی تھی کہ جو پاک و صاف اور عبادت گزار ہوتے ہیں ان کے دماغوں میں وہ پہنچ نہیں پاتا ہے۔ اسی لیے وہ مراد عالی، ہم زاذیب النساء، بلے اور بشری تک پہنچ نہیں پاتا تھا۔

ادھر بیماری کے باعث بشری عبادت سے محروم ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ شیطان دماغ میں گھس آیا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ جلد نماز پڑھنے کے قابل ہو سکتی تھی اور تب ہی شیطانی سوچ کی لہریں اس کے دماغ میں آنے سے معذور ہو جاتیں۔ اس نے سوچا ابھی ذرا انتظار کرے گی۔

ان نون کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ اسے دشمنی کرنے کا موقع نہیں دے گی۔ ہو سکتا ہے آپ ہی آپ اس کا راستہ رک جائے۔ ایسا نہ ہوا تو وہ آئندہ شکنجے میں آنے سے پہلے چیخ کر بلے کو خطرے سے آگاہ کر دے گی۔

عالی ماریہ کے ساتھ ایک وسیع و عریض پیلس میں تھا۔ اس پیلس کے تیس ہزار گز کے اطراف میں صرف لی وی چینلوں کے عملے کو آکر لائیو پروگرام پیش کرنے کی اجازت تھی۔ وہ سب مسلح گارڈز کی نگرانی میں تھے اور مسلح گارڈز بھی فون کے یا اسکا پ کے ذریعے اجازت لے کر پیلس کے اندر جاسکتے تھے۔

ایسی سخت سکیورٹی میں رہنے کے باوجود وہ دونوں تمام دنیا والوں کو دکھائی دے رہے تھے۔ شہر کے چوراہوں اور شاہراہوں کے کنارے بڑی بڑی اسکرینز پر انہیں دیکھا جا رہا تھا۔ ماریہ اور عالی اپنے چاہنے والوں سے کبھی بھی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

جدید الیکٹرونک سکیورٹی کے انتظامات بھی ٹیلی پیٹھی کی لہروں کو نہیں روک سکتے تھے۔ ان نون کسی بھی گارڈ کی کھوپڑی میں گھس کر پیلس کے اندر آسکتا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ عالی کو چیلنج کر سکتا تھا۔ اس پیلس کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا۔ وہ کیا نہیں کر سکتا تھا؟ اس کے قریب رہنے والے گارڈز کو ہلاک کر دیتا۔ اس محل میں آگ لگا سکتا تھا لیکن عالی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک بار سکیورٹی افسر کے ذریعے اس پر گولی چلانے کا نتیجہ دیکھ چکا تھا۔

وہ فی الحال مجبوراً تماشا بننا ہوا تھا۔ عالی کے گارڈز کو ہلاک کرتا یا پیلس میں آگ لگا تا تو سب یہی کہتے کہ کھسانی جلی کھمبانوچ رہی ہے۔ وہ کچھ اور کر نہیں پا رہا ہے۔

اسے یقین تھا کہ وہ ایک دن اسے اپنے قدموں میں ضرور گرائے گا اور یہ ارادہ تھا کہ دلہا دلہن کو سہاگ رات



بھی ایسے تماشے دکھاتا رہوں گا۔ تم سب کے سامنے پرنس کو لگنی کا ناچ نچاتا رہوں گا۔“

پھر وہ ڈینگیں مارنے لگا۔ ”لوگو!..... میں چاہوں تو ابھی پرنس کی کھوپڑی میں گھس کر زلزلہ پیدا کر دوں۔ میں چشم زدن میں اسے دماغی مریض بنا سکتا ہوں۔“

وہ جو نہیں کر سکتا تھا وہ کرنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ ”یقین کر لو کہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں لیکن نہیں..... میں پوری دنیا کے سامنے اسے اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں اسی لیے اس کے ساتھ تماشے کرتا رہوں گا۔ اسے اچھی طرح ذلیل اور دو کوڑی کا بنا کر فیصلہ کروں گا کہ اسے مار دیا جائے یا چھوڑ دیا جائے۔“

وہ بڑی دیر تک بولتا رہا پھر بولتے بولتے یککھٹ چپ ہو گیا۔ فی وی اسکرین پر جو نیوز کاسٹر بولتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا اور کہنے لگا۔ ”او گا ڈ.....! وہ شاید جا چکا ہے۔ مجھے بولنے پر مجبور نہیں کر رہا ہے۔ ابھی میں کسی طرح کی جگڑ بندی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔“

ان نون بڑی اہم باتیں کر رہا تھا۔ ڈینگیں مارتے ہوئے لاکھوں ناظرین کو یقین دلارہا تھا کہ وہ پرنس عابی کی ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنی انگلیوں پر نچاتا رہے گا۔ ایسا دعویٰ کرنے والا بولتے بولتے یککھٹ خاموش ہو گیا تھا۔

یہ وہی جانتا تھا کہ وہ کیوں خاموش ہو گیا تھا اور کہاں چلا گیا تھا؟ اس کے اپنے معاملات تھے۔ اس کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ بشری کو آرام آ گیا تھا۔ وہ پیلس کے ایک بیڈروم میں گم صم سی لیٹی ہوئی تھی۔ بلے اور عابی پریشان تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ دشمن کہیں جا کر مصروف ہو گیا ہے۔ کسی وقت پھر بشری کو نار چر کرنے آئے گا اور وہ بے بسی سے دیکھتے رہیں گے۔

عابی کو پہلی بار ایسا تجربہ ہو رہا تھا کہ دشمن موجود ہو کر نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ اسے حملہ کرنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ بشری کو اس سے بچانے کی کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ پریشانی کے باعث ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

بشری بیڈ سے اتر کر اٹیچی سے ایک لباس نکال کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ بلے نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”یا اللہ! یہ تیری نیک بندی ہے۔ دشمن کو اس سے دور کر دے۔ اس نے بھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہے، یا میرے اللہ.....! دشمن اسے تکلیف نہ پہنچائے، اب اور اس

اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اپنی گاڑی کی طرف جانے لگا۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی اچانک ہی اچھل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ ہنستے ہوئے تپتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں نے تیری آنٹی کی کھوپڑی ہلا دی ہے۔ تو بڑا شہ زور ہے۔ آ..... اور مجھے ایک چنگی میں مسل دے۔“

کئی چیئمنز کے کمرے آن تھے۔ ایک دنیا وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ حیران ہو رہی تھی کہ ایک شخص جو ہڈیوں کا ڈھانچا ہے اور جو پھونک مارنے سے اڑ جائے گا وہ شہ زور پرنس کو چیلنج کر رہا تھا۔ ڈنکے کی چوٹ پر سب کے سامنے کہہ رہا تھا کہ اس نے بشری کے دماغ میں زلزلہ پیدا کیا ہے۔

لاکھوں دیکھنے والے حیرانی سے سوچ رہے تھے۔ کیا وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہی ان نون ہے؟ وہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مسل گارڈ اس کی پتلی گردن کو دبوچ کر جھٹکے دیتے ہوئے اسے دھکے دیتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگا۔ عابی بشری کو اٹھائے پھر اپنی گاڑی کی سمت جانا چاہتا تھا لیکن پھر رک گیا۔

ایک خسرانا چتا ہوا سامنے آ کر بولا۔ ”اے ہے ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ ہمیں بھی گود میں اٹھالے۔ ہم نے تیری آنٹی کی کھوپڑی ہلا دی اور تو انتقام نہیں لے رہا ہے۔ کیوں میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے؟“

تب دیکھنے والے سمجھ گئے کہ ان نون ایسے تماشے کر رہا ہے۔ وہ مضحکہ خیز لوگوں کو آلہ کار بنا کر ناقابل شکست کہلانے والے پرنس کو زنج کر رہا ہے۔ تماشے کر کے اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ ایک ہی حملہ کر کے ثابت کر رہا تھا کہ اس نے پرنس کو مجبور اور لاچار بنا دیا ہے۔ آئندہ بھی اس پر بھاری پڑتا رہے گا۔

گارڈز اس خسرے کو بھی وہاں سے کھینچ کر لے گئے۔ عابی بشری کو اٹھائے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ بلے اور جاں بازوں کے ساتھ اپنے پیلس کی طرف جانے لگا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ ان نون کی ایسی چیئر جھاڑ کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ نہ اسے دیکھ سکتا تھا، نہ پکڑ سکتا تھا۔ ان حالات میں اسے اپنی پھولی ماں کی سلامتی کی فکر تھی۔

ان نون مختلف چیئمنز کے نیوز کاسٹروغیرہ کے دماغوں میں جا رہا تھا اور لاکھوں ناظرین سے کہہ رہا تھا۔ ”لوگو!.....! میں ان نون بول رہا ہوں۔ ان نون کے معنی ہیں جسے کوئی نہیں جانتا مگر تم سب جانتے گئے ہو کہ میں کتنا پراسرار اور پاورفل ہوں۔ دیکھتے رہو کہ میں کیسے کھیل رہا ہوں۔ آئندہ



حاصل کرو۔ اب مجھے دور ہی دور سے دیکھ کر تلملاتے رہو گے۔ اپنی بہتری چاہو..... مجھ سے دشمنی سے باز آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میں یہی مشورہ تمہیں دوں گا۔ اپنی بہتری چاہو تو میرے تابع دار بن جاؤ۔ یہ فاصلہ جو میں نے تم سے رکھا ہے، اسے چشم زدن میں ختم کر سکتا ہوں۔ تم پلک جھپکتے ہی اپنے دماغ کو میری گرفت میں پاؤ گے پھر تمہاری خوش نصیبی لکھنے والا کاتب تقدیر بھی میرے شکنجے سے تمہیں نہیں نکال سکے گا۔ تم دیکھ چکے ہو کہ میں نے بشری کے ذریعے کس طرح تمہارے ہوش اڑا دیے تھے۔ اب ایک اور حملہ کروں گا۔ میں ابھی چینلز کے ذریعے یہ اعلان کرنے جا رہا ہوں۔ اسے سنو تمہارا یہ تمام جشن طرب دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔“

اس نے یہ چیلنج کرتے ہی رابطہ ختم کر دیا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والا اور کیا کرنے والا تھا؟ اگرچہ وہ جان لینے والا حملہ نہیں کر سکتا تھا تاہم پھر ایک بار جان کا عذاب بن سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مختلف چینلز کے ذریعے خصوصی خبریں جاری ہونے لگیں۔ نیوز کا سٹر کہہ رہے تھے۔ ”ان نون کی جانب سے ہمارے لیے احکامات جاری ہو رہے ہیں۔ وہ جو کہہ رہا ہے وہی ہم ناظرین سے کہہ رہے ہیں۔“ اور وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں ان نون تمام ناظرین سے مخاطب ہوں۔ تم سب نے دیکھا ہے میں نے پرنس عالی کی آنٹی بشری کو اپنی خیال خوانی کے شکنجے میں لے لیا تھا۔ پرنس بے بس ہو گیا تھا۔ اپنی ماں بیسی آنٹی کو میری گرفت سے نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے کئی گھنٹوں تک پوری دنیا کو یہ حقیقت دکھائی ہے اور سمجھائی ہے کہ پرنس کو جب چاہوں بے بس اور مجبور بنا سکتا ہوں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس ناقابل شکست شہ زور کو ہلاک کرنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اسے صرف شکست دینا اور توڑ دینا چاہتا ہوں۔ اسے قدموں میں جھکا کر جوتوں کی طرح پھین کر رہنا چاہتا ہوں اور یہ دنیا دیکھے گی۔ لوگو! میرا کھیل تماشا دیکھو۔ ایسے وقت جبکہ پرنس بے بس اور مجبور ہو گیا ہے۔ اپنی آنٹی کو رہائی نہیں دلا سکتا ہے۔ میں اس پر رحم کھا رہا ہوں۔ میں نے اس کی آنٹی بشری کو خیال خوانی کے شکنجے سے رہا کر دیا ہے۔“

وہ بڑی مکاری سے جھوٹ بول کر اپنی ناکامی کو چھپا رہا تھا۔ اپنے دشمن پر مہربان ہونے کی نیکی اور شرافت کا اور اپنی حکمت عملی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”لوگو! میں آئندہ بھی پرنس کو ٹھوکریں مار کر اسے سنبھلنے اور اپنے آگے جھکنے کے مواقع دیتا رہوں گا۔ اگلے

کے دماغ میں نہ آئے۔“

مصائب یا بیماریاں لاعلاج ہوں، ساری دوائیں بے اثر ہو جائیں تو صرف دعا ہی رہ جاتی ہے۔ بشری پاک و صاف ہو کر مصلے پر آگئی تھی۔ عبادت میں گم ہو گئی تھی۔ تقدیر کے کھیل ہیں۔ ان نون اچانک ہی اس کے راستے سے پھسل کر دور چلا گیا تھا۔ کسی مسئلے نے کسی مجبوری نے اسے کہیں روک رکھا تھا۔ جب وہ دماغ میں آیا تو بشری کے سانس روکتے ہی ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

کامیاب ہونے کے بعد اچانک ناکامی کی لات پڑی تو وہ جھنجھلا گیا۔ یقین نہیں ہوا کہ پرنس عالی کا ایک بہت اہم مہرہ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ اس نے پھر خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ بشری کے اندر پہنچا تو وہ بولی۔ ”آخ تھو.....“

پھر اسے یہی لگا کہ وہ تھوک کی طرح اس کے منہ سے نکل آیا ہے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ کیا ہو گیا؟“

بشری نے خوش ہو کر مصلے پر سے کہا۔ ”بلے..... اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں نے رہائی پالی ہے۔ میں نے اسے بھگا دیا ہے۔ وہ مردود و بارنا کام ہو کر گیا ہے۔“

بلا دوڑتا ہوا عالی کے پاس آیا۔ اسے یہ خوش خبری سنائی۔ وہ سب جہاں تھے وہیں سجدے میں چلے گئے۔ اس شیطانی گرفت سے نکلنا ناممکن تھا۔ پاکیزگی اور دعاؤں نے ممکن بنا دیا تھا۔ ان سب کے ذہنوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

پھر بشری کے فون سے رنگ نون ابھرنے لگی۔ مات کھا کر جانے والا انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ فون پر چیخ پڑا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو مجھ سے رہائی مل گئی ہے؟ میں کسی بھی آلہ کار کے ذریعے تمہیں زخمی کر کے تمہیں کمزور بنا کے پھر تمہیں اپنا تابعدار بنالوں گا۔“

بشری نے کہا۔ ”یہ تو ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ میرے بھتیجے عالی پر اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ وہ معبود عالی کے ایسے تمام چاہنے والوں کو تمہارے شر سے محفوظ رکھتا ہے جو جسمانی اور باطنی پاکیزگی کے ساتھ صوم و صلوة کے پابند رہتے ہیں۔ دیکھ لو کہ تم آج تک اپنے کسی آلہ کار کے ذریعے ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچانے میں ناکام ہو رہے ہو۔ ہم نہیں جانتے ہمارا معبود تمہیں کس طرح مجبور کر دیتا ہے۔ ہمیں اپنے پاک پروردگار پر کامل اور مستحکم اعتماد ہے۔ تم دیکھ رہے ہو وہ تمہیں عزت اور تمہیں ذلت دے رہا ہے۔“

عالی نے وہاں آ کر بشری سے فون لے کر کہا۔ ”مرد ہو مردوں سے باتیں کرو۔ ایک عورت سے پنچہ لڑا کر سبق



ایک گھنٹے تک انتظار کروں گا۔ وہ میری طاقت کو اور غیر معمولی صلاحیت کو تسلیم کر لے گا تو میں اسے اپنا تابع بنا کر دشمنی کا یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ ورنہ کیا کروں گا، یہ ایک گھنٹے بعد بتاؤں گا۔“

بلے نے فون پر مراد سے کہا۔ ”یار! میں سمجھ رہا تھا وہ کمبخت مات کھا کر تملار ہا ہوگا۔ آئندہ عالی سے منہ چھپائے گا لیکن اس نے تو ڈھٹائی کی حد کر دی۔ ناکامی کو اپنی کامیابی بنا رہا ہے۔“

مراد اور ہم زاد مختلف چینلز کے ذریعے لاکھوں ناظرین سے کہنے لگے۔ ”یہ ان نون جھوٹا اور فریبی ہے۔ یقین کریں اس نے کوئی مہربانی نہیں کی ہے۔ میری بہن بشری نے اسے لات مار کر اپنے دماغ سے نکالا ہے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ہمارے رب نے بشری کو اس کے شکنجے سے رہائی دلائی ہے۔ وہ ایک عورت سے مات کھا کر تملار ہا ہے۔ میرے بیٹے کو دھمکیاں دے رہا ہے کہ آئندہ اسے کسی اور طرح سے نقصان پہنچانے والا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟ اور آپ حضرات بھی دیکھیں گے کہ ہم کیا کر گزریں گے۔“

عالی کی خوشیوں میں سب ہی شریک تھے۔ بڑی زندہ دلی سے رقص و موسیقی اور کھیل تماشوں سے دل بہلا رہے تھے۔ ایسے وقت یہ ٹینشن یہ تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

پھر ان نون نے مختلف چینلز کے ذریعے کہا۔ ”سنو کہ میں حاکم مطلق ہوں۔ نہ مجھ سے کوئی اوپر ہے نہ کوئی مجھ سے زیادہ قوی ہے۔ میرا حکم پتھر کی لکیر ہے۔ اس حکم کی تعمیل ہر حال میں کی جائے گی اور یہ اٹل حکم ہے کہ پرنس عالی سہاگ رات نہیں منائے گا۔ اب یہ جشن مسرت یہ کھیل تماشے ختم کرو۔ عالی!..... اب سے بارہ گھنٹے بعد تم اپنی دلہن کے کمرے میں جاؤ گے۔ میں کہتا ہوں نہیں جاسکو گے۔ بھی نہیں جاسکو گے۔“

عالی نے ایک چینل کے ذریعے پوچھا۔ ”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ یہ تو دیکھ چکے ہو اور اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ میرے آس پاس رہنے والی ہستیوں کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہتے ہو۔ ماریہ تک بھی نہیں پہنچ سکو گے پھر کیا کرو گے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں جشن مسرت کو ماتم میں بدل دوں گا۔ جب خوشیوں کے میلے میں جگہ جگہ بم دھماکے ہوں گے تو سب ہی اپنی سلامتی کے لیے بھاگ جائیں گے

اور بھاگنے سے پہلے مارے جائیں گے پھر بولو تمہاری سہاگ رات کتنی لاشوں کا بوجھ اٹھائے گی؟“

یہ تو ہوش اڑا دینے والی دھمکی تھی۔ ماریہ اور عالی اپنی پہلی جذباتی اور فطری خوشیاں پوری کرنے کے لیے پیلس کے باہر بے گناہوں کی لاشیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ان نون نے کہا۔ ”میں چھ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ ماریہ سے دور ہو جاؤ یا اسے پیلس سے دور کہیں بھیج دو۔ تمہاری یہ دوری عارضی نہیں دائمی ہوگی۔ آئندہ اپنی دلہن کے پاس جانا چاہو گے تو میرے ایک اور حکم کی تعمیل کرنی ہوگی، اس کے بعد ہی ماریہ کو چھو سکو گے۔“

”تم فرعون بن چکے ہو۔ دشمنی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ تم مجھ سے عداوت کرو لیکن میرے چاہنے والوں نے، ان خوشیاں منانے والوں نے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ ان کی زندگیوں سے کھیلنے کی بات نہ کرو۔“

اس نے کہا۔ ”تم اپنے چاہنے والوں سے محبت کرو۔ میں تو عداوت کرنا جانتا ہوں۔ تمہیں بے دست و پا بنانے کے لیے ہر طرح کے حربے آزماؤں گا۔ مان لو کہ میں نے اس وقت تمہیں طاقت سے خالی اور کھوکھلا کر دیا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”لاکھوں ناظرین اور سامعین تمہاری یہ باتیں سن رہے ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ تم مجھ سے براہ راست دشمنی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہو۔ اس لیے بے گناہوں کی جان لینے کی دھمکی دے رہے ہو۔ میری شرافت اور میرے ایمان کو مجبور کر رہے ہو کہ انہیں زندہ سلامت رکھنے کے لیے اپنی سہاگ رات کو ہار جاؤں۔“

”فی الحال ناظرین کچھ بھی سمجھیں، جب تم میرے احکامات کی تعمیل کرو گے تو میرے محکوم کہلاؤ گے اور یہی میری جیت ہوگی۔“

”یہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں سہاگ رات منانے کے لیے ایک چوٹی کی بھی ہلاکت نہیں چاہوں گا۔ ہاں تم سے سمجھتا کروں گا۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ میں تمہارے ایک اور حکم تعمیل کروں گا تو اپنی ماریہ کے ساتھ رہ سکوں گا؟“

”بے شک ماریہ کے ساتھ رہ سکو گے لیکن اس سے پہلے میری پسند کی ایک لڑکی سے شادی کرو گے۔ پہلی سہاگ رات اس کے ساتھ منائے گے۔“

عالی نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ لڑکی؟“

”وہ مشہور و معروف سونے کی ایک بہت بڑی تاجر شامکہ شانی کی بیٹی جمائلہ ہے۔“

عالی نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ ”تم اس سونے



## 450/- انسان اور دیوتا

ہندی سامراج کے ظلم و برکت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راول عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

## 300/- پاکستان سے دیوارِ حرم تک

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفر نامہ حجاز

## 450/- آخری چٹان

سید خواجہ جلال الدین خواجہ زکی کی داستانِ شجاعت جو تاجرانوں کے سب روایں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

## 225/- سوسال بعد

گاندھی جی کی مہاتما نہایت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مظالم کی مہم یوٹی تصویر

## 325/- سفید جزیرہ

بحرالکالمی کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

## 475/- شاہین

انڈس میں مسلمانوں کے شہب و فراز کی کہانی

## 475/- معظّم علی

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظّم علی کی داستانِ شجاعت

## 550/- خاک اور خون

سکھ، برہمن، انیسیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستانِ خوفناک

## 450/- کلیسا اور آگ

فروری 1947 کی عید کی مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوطِ برطانوی انڈس میں مسلمانوں کی کھست کی داستان

## 599/- قافلہ حجاز

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

## 425/- محمد بن قاسم

عالم اسلام کے 17 سالہ بھائی کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کنڈیریں ڈال دیں

## 300/- پورس کے ہاتھی

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں شیوں اور برصغیر کے سامراجی عناصر کی کھست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر مہم کی کہانی پڑی

## 550/- اورنگزادہ گئی

شیر شاہ (شیخ سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جادو جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

## 500/- گمشدہ قافلہ

انگریز کی اسلام دشمنی، شیخ کی عیاری و مکاری اور مسکوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لڑائی خیر خیر داستان

## 300/- داستانِ مجاہد

فتحِ جبل کے بعد راجہ دہرے راجوں مہاراجوں کی مد سے دوسو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی تیغ و تلوار سے لیس فوج سندھ کی معرکۃ الامارہ داستان

## 450/- پروسی درخت

اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور مسکوں کے گھ جڑی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

## 500/- یوسف بن تاشفین

انڈس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے اکام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قدحیں بلند کرنے والے گناہ ساری کی داستان

## 550/- آخری معرکہ

جب سومات کے بڑے دست کوڑے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کھانہ ان کے ذہن کے برابر سونپ دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا پھر ہٹنے سے جتن لگایا اور اس نے جواب دیا "میں ہر وقت غرض نہیں، بہت کم کھانا کھاتا ہوں" "سیم جادی کی ایک جگہ گھر خیر

## اندھیری رات کے مسافر

انڈس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، یو یو یو یو اور تلوں اور جوانوں کی داستان و رسوائی کی الم ناک داستان

## 475/- ثقافت کی تلاش

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تجربہ، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو کھیلوں کی تھاپ، محققوں کی چھٹا چھٹن کے ساتھ پامال کیا

## 625/- قیصر و کسریٰ

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرقہ وارانہ اسلام کے ابتدائی لغزش کی داستان

سبق آموز کتب سلسلہ  
دورنگی طباعت اور تصویریری خاکوں سے مزین

165/- اقوال حضرت علی المرتضیٰ

165/- اقوال آئمہ کرامؑ

195/- حکایات گلستان سعدیؒ

140/- اقوال شیخ سعدیؒ

180/- حکایات رومیؒ

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایات بوستان سعدیؒ

150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں

180/- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات

165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات

جہانگیر  
ادولفت  
(جامع ترین)

عقلمند طریقے سے نقطہ کے انداز کے ساتھ اردو زبان سے کاپر بلاؤٹ

042-35757086 022-2780128  
021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو



کی اسٹاک سے میرا رشتہ کیوں جوڑنا چاہتے ہو؟“  
”مجھ سے سوال نہ کرو۔ میرے اس سوال کا جواب  
دو کہ تمہارا وہ گرو گھنٹال وہ پیر و مرشد حماد کون ہے جو شامک کو  
تھوک کر چائے پر مجبور کر رہا تھا؟“  
یہ باتیں چیلنجز کے ذریعے ہو رہی تھیں۔ حماد بن کر  
رہنے والا مراد بھی سن رہا تھا۔ عالی نے کہا۔ ”میرے  
پیر و مرشد کچھ عرصہ پہلے تک گوشہ نشین رہے تھے۔ شامک مجھے  
داماد بنانا چاہتی ہے تو ان کے حکم کے مطابق اسے تھوک کر  
چائے ہوگا۔“

ان نون نے کہا۔ ”ایسے کسی حکم کی تعمیل نہیں ہوگی۔ تم  
جمائلہ سے شادی کرو گے۔ پہلے اس کے ساتھ سہاگ رات  
گزارو گے، اس کے بعد ماریہ کو ہاتھ لگا سکو گے۔“  
شامک اور اس کی بیٹی جمائلہ بھی ان نون کی باتیں سن  
رہی تھیں اور خوشی سے کھل رہی تھیں۔ دل ہی دل میں اس  
ٹیلی پیٹھی جاننے والے پر قربان ہو رہی تھیں۔ وہ ان ماں  
بیٹی کو سیاست کی اور جرائم کی دنیا میں بہت اہم بنا رہا تھا۔  
عالی نے کہا۔ ”سوری۔ میری شادی ہو چکی ہے۔  
میں جمائلہ سے تو کیا دنیا کی کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں  
کروں گا۔“

ان نون نے کہا۔ ”تو پھر چھ گھنٹے کے اندر ماریہ سے  
دور ہو جاؤ ورنہ بے گناہ مارے جائیں گے۔“  
”میں کسی کو ہلاک نہیں ہونے دوں گا۔ چھ گھنٹے کے  
اندر ماریہ کو کسی محفوظ پناہ گاہ میں بھیج دوں گا۔“  
”یہ یاد رکھو کہ آئندہ کبھی ماریہ سے باتیں بھی نہیں  
کر سکو گے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تمہیں جمائلہ کے  
ساتھ میرج سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوگا۔“

چیلنجز کے ذریعے ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد ہم  
زاد بشری اور بلے سب ہی پریشان ہو گئے۔ وہ سب فون  
کے ذریعے ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ حالات ایسے  
ہو گئے تھے کہ وہ صرف بول سکتے تھے۔ ان نون سے منٹ  
نہیں سکتے تھے۔

ماریہ روتی ہوئی آکر عالی سے لپٹ گئی تھی۔ ابھی چھ  
گھنٹے تک وہ اسی چھت کے نیچے اسی چار دیواری کے اندر  
رہنے والے تھے۔ اگلے چھ گھنٹے بعد سہاگ رات شروع  
ہونے والی تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ عالی  
صدے سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اسے تھپک رہا تھا۔  
وہ تڑپ کر بولی۔ ”ہائے عالی.....! تم سے دور کیسے  
رہوں گی؟ میں مرجاؤں گی۔“

وہ گردن میں بانٹیں ڈال کر متناطیس کی طرح چپک  
مٹی تھی۔ وہ کوئی غلطی یا گناہ کرنے والے نہیں تھے۔ شرعاً  
رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے تھے۔ وہ شریعت پرست تھا جو  
شریعت کے خلاف حکم صادر کر رہا تھا۔ جائز کو ناجائز قرار  
دے رہا تھا۔ ان حالات میں یہ بڑی عجیب اور افسوس ناک  
بات تھی کہ وہ جائز لمحات گزارنے کے لیے چوروں کی طرح  
ازدواجی فرائض ادا کرنے لگے۔

وہ انسانی کھوپڑیوں میں ٹھس آنے والا یقیناً بے خبر  
ہوگا۔ کیونکہ ماریہ اور عالی کے دماغوں میں نہیں آ رہا  
تھا۔ ابھی ان سے دور تھا۔ اس وقت وہ اس خوش فہمی میں ہوگا  
کہ اس نے عالی کو سہاگ رات کی سریتیں حاصل کرنے  
سے روک دیا ہے۔

چوری کے متعلق کہا جاتا ہے اور یہ دیکھا بھی گیا ہے  
کہ یہ اچانک پکڑی جاتی ہے جبکہ کہیں سے کسی پہلو سے  
گرفت میں آنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔  
ایسے ہی وقت قدرتی تماشے دیکھنے میں آتے ہیں۔

خواب گاہ کی خاموشی بڑی پراسرار اور بڑی ہی  
مستوتوں بھری تھی۔ ایسے ہی وقت یکبارگی ماریہ کے حلق  
سے چیخ نکلی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے دیدے پھیل کر  
ساکت ہو گئے۔ سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی پھر اس نے  
دوسری سانس نہیں لی۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا؟ جو بات بھی  
سوچی بھی نہیں جاسکتی وہ ہو گئی تھی۔

عالی فوراً ہی سمجھ نہ سکا کہ کیا ہو گیا ہے؟ اس نے تڑپ  
کر اس کے بازو کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ”ماریہ.....! کیا  
ہوا.....؟ سانس لو ماریہ..... سانس لو۔“

وہ اس کی آواز سے بہت دور جا چکی تھی۔ موت اسی کو کہتے  
ہیں۔ آنا فنا آتی ہے اور اپنا سامان لے جاتی ہے پھر سوچتے رہو کہ  
کیا ہو چکا ہے؟ ایسا تو نہیں ہونا تھا پھر کیسے ہو گیا ہے؟

یہ ابھی اپنے شہ زور کے مضبوط بازوؤں میں کھیل  
رہی تھی۔ کسی بھی صدمے کا کسی بھی ایسے کا تصور نہیں کیا  
جاسکتا تھا۔ پھر یہ اچانک موت کا جھٹکا کیسے لگ گیا تھا؟ کیا  
دشمن کی ٹیلی پیٹھی کام کر گئی ہے؟ وہ غصے سے لرز گیا۔ اس نے  
مٹھیاں بھینچ لیں۔ ایسی اچانک موت اور کہیں سے آ نہیں  
سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے عالی کو ذہانت اور حاضر دماغی دی تھی۔  
وہ اپنے غصے پر قابو پانے لگا۔ ایسے وقت اس کی ذہانت  
اسے سمجھاتی تھی کہ انسان کا پہلا اور آخری دشمن غصہ ہے۔  
نازل رہنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی



قاتل سمجھا جا رہا تھا اس کے ہاتھوں پر ماریہ کا لہو نہیں تھا اور دوست ہوں یا دشمن، سب ہی پورے یقین کے ساتھ ان تون کو قاتل سمجھ رہے تھے۔

اس نے فون پر عالی کو مخاطب کیا پھر کسی تمہید کے بغیر فوراً ہی بولا۔ ”میں نے ماریہ کو ہلاک نہیں کیا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”دشمنی کرنے کے بعد موت سے ڈر رہے ہو۔ جانتے ہو کہ آج سے میں تمہارا جینا حرام کر دوں گا۔“

”تمہارے فرشتے بھی میرے سائے تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ میں ڈرتا نہیں، مارنا اور مرنا جانتا ہوں۔ میں تم پر برتری حاصل کرنے کے لیے دنیا والوں کے سامنے اعتراف کروں گا کہ میں نے تمہیں بہت بڑی پہلی مات دی ہے جبکہ ماریہ کو میں نے ہلاک نہیں کیا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”تمہارا بچ یا جھوٹ تم جانو۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے حقیقت معلوم ہو جائے گی۔“

حقیقت کچھ بھی ہو، مراد اور عالی کے دشمن خوش تھے۔ انہیں اب تک یہ شکایت تھی کہ ان تون عالی کے مقابلے میں کمزور ہے۔ اسے نقصان پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ شکایت دور ہو گئی تھی۔ اس نے پہلی بار صرف عالی ہی کو نہیں، مراد علی منگی کے پورے خاندان کو ہلاک کر رکھا تھا۔

تمام دشمن بھی عجیب الجھن میں رہتے تھے۔ وہ عالی جیسے بارہ برس کے بچے کی برتری برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مجبوراً دوستی اور سمجھوتا کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی تیسری طاقت آکر اسے مات دے اور ان کی برتری پھر سے بحال ہو جائے۔

ایسے میں ان تون آ گیا تھا۔ اس نے ایک طویل انتظار کے بعد عالی کو نقصان پہنچا کر اپنی برتری منوائی تو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ عالی کی جگہ وہ آئے گا تو سب ہی کے دماغوں میں بیٹھ کر حکومت کرے گا اور وہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے غلام بن کر رہیں گے۔

پہلے تو صرف عالی ہی تھا۔ کسی حد تک قابل قبول تھا لیکن ان تون آئندہ ان سے سوچتے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لینے والا تھا۔ صرف وہی ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا دماغ پوری دنیا پر حکومت کرنے والا تھا۔

سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک اور جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والی خطرناک تنظیمیں دو طاقتوں کے درمیان دو پاٹوں کے بیچ تھے۔ اپنے اوپر کسی کا مسلط ہونا منظور نہیں تھا لیکن اقتدار کے کھیل میں سب کچھ اپنی منظوری سے نہیں ہوتا۔ آخری منظوری کا تپ تقدیر کی ہوتی ہے۔

طاقت و زبانتدار اور باختیار وہ دشمن سے فوراً انتقام نہیں لے سکتا۔ فوری کارروائی نہیں کر سکتا۔ لہذا طیش میں آنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ غصے کی آگ اپنی ہی ذہانت کو جلا دیتی ہے۔ جب یہ طے ہے کہ غصہ حرام ہے تو پھر حرام ہے۔ وہ اسی وقت وہاں سے اٹھ کر ہاتھ روم میں آ گیا فوراً ہی طہارت لازمی تھی۔ وہ شاور کو کھول کر غسل کرتے لگا اور.... تریتر ہونے لگا۔

ماریہ کی آخری چیخ بیڈ روم کے باہر دور تک گئی ہوگی۔ تمام سکیورٹی گارڈز مستعد ہو گئے لیکن خاموش اور منتظر رہے کہ کوئی پریشان کرنے والا معاملہ ہوگا تو پرنس انہیں کال کرے گا۔

اس نے پاک و صاف ہو کر مراد کو فون پر کہا۔ ”بابا جانی! آپ کا بیٹا صدمات سے ٹوٹ رہا ہے۔“

باپ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟ تم اور صدمات.....؟“

”ہاں بابا جانی! زندگی میں پہلی بار دل کو اور دماغ کو دھچکا لگا ہے۔ میری ماریہ..... آپ کی بیوا چانک ہی وفات پا چکی ہے۔“

یہ ایسی خبر تھی کہ مراد ہل کر رہ گیا۔ ”میرے بیٹے! یہ کیا بول رہے ہو؟ یہ اچانک کیسے ہو گیا؟ وہ صحت مند تھی کوئی مرض نہیں تھا، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے؟“

”بابا جانی! حادثہ نہیں..... عداوت۔“

”کیا.....؟“ مراد نے چونک کر کہا۔ ”یا خدا..... میں اس ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان کو بھول گیا تھا۔ میں..... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“

”پلیز آپ طیش میں نہ آئیں۔ ہم اس کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ میں ماریہ کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کے بعد ان تون سے نمٹنا چاہوں گا۔“

پھر یہ خبر آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی، لپکتی اور پھیلتی چلی گئی کہ عشرت کدہ اچانک ماتم کدہ بن گیا ہے۔

شمالہ ثانی نے فون پر ان تون سے کہا۔ ”میں صدقے میں داری، میں تم پر قربان..... تم نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ بس اسی طرح کسی دن عالی کو میرے قدموں میں جھکا دو۔ میری بیٹی بھی تمہاری، سونے کا ذخیرہ بھی تمہارا.....“

ان تون چپ تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماریہ اچانک کیسے مر گئی ہے؟ وہ چپ چاپ اس کی ہلاکت کا سہرا اپنے سر لے رہا تھا۔

یہ ایک نئی اور عجیب سی سچویشن پیدا ہو گئی تھی۔ جسے



پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ عابد علی منگی عرف عالی کی زندگی میں حیران کر دینے والے واقعات پیش آرہے تھے۔ خلاف توقع اس میڈیکل رپورٹ نے بھی حیران کر دیا۔ ماریہ کی موت دشمنی سے نہیں دوستی سے ہوئی تھی۔ نفرت سے نہیں محبت سے کھیلے کھیلے ہوئی تھی۔ پیار کے مراحل میں ایسی گھڑی آئی تھی جو ماریہ کے لیے ناقابل برداشت ہوئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ عالی کے دماغ کو زبردست جھٹکا پہنچا۔ اب سے پہلے اس نے پیدا ہوتے وقت ماں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی محبوبہ کو چھلنی کر چکا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ادھر سے ادھر پاؤں چٹختے ہوئے جانے لگا۔ ”یا میرے خدا! کیا میں ظالم ہوں؟ کیا مظالم ڈھانے کے لیے پیدا ہوا ہوں؟ میں تو دشمنوں سے بدتر ہوں۔ دشمن دشمنی سے مارتے ہیں۔ میں نے ماں کو اور محبوبہ کو محبتوں سے مارا ہے۔“

”نہیں.....!“ وہ حلق پھاڑ کر چیخ پڑا۔ تیزی سے باہر جانے لگا۔ بلے نے فوراً ہی دروازے کو بند کر دیا۔ اس طوفان کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ جو بھی اسے روکنے آتا وہ اٹھا کر اسے پھینک دیتا اسی لیے بلا سامنے نہیں آیا۔ اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔

لیکن وہ دروازہ تو ایک روبوٹ کے لیے کاغذ جیسا تھا۔ اس کی ایک لات پڑتے ہی ٹوٹ کر ایک طرف جھول گیا۔ وہ دروازے سے گزرتا ہوا فرش پر دھماکے کرتا ہوا آگے جانے لگا۔

بشری نے چیخ کر کہا۔ ”رک جاؤ عالی.....! اپنی پھوپھی ماں کی بات سن لو۔ تم کہتے ہو نا کہ غصہ حرام ہوتا ہے۔ آخر تمہیں کس پر غصہ آ رہا ہے؟“

اسے اپنی ماں کے دشمن پر اپنی محبوبہ کے دشمن پر یعنی..... اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جا رہا ہے اور کیا کرنے والا ہے؟ اور بشری ایسی نہیں تھی کہ اسے جنون کی حالت میں کہیں جانے دیتی۔ اس نے فوراً ہی ایک لکڑی اٹھا کر اس کے پیروں میں پھنسا دی تو وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی وہ بھی جھکتی ہوئی اس کے قدموں سے آکر لپٹ گئی۔ ”تو اپنی پھوپھی ماں کو لات مار کر ہی جاسکے گا۔ اگر تو نے لات مار دی تو سمجھ لیتا کہ غصہ تجھے ایمان سے اور اخلاق سے دور لے گیا ہے۔ آج تیری آزمائش ہے۔ رشتے کو

جلادے یا غصے کو رکھ کر دے۔“

وہ فرش پر سے اٹھ نہ سکا۔ بالکل ساکت رہ گیا۔ پھوپھی ماں بھولا ہوا سبق یاد دلارہی تھی۔ جب آگ لگتی ہے، بدن جلتا ہے اور جرنی کی طرح پگھلتا ہے تب برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کسی کی نصیحت کام نہیں آتی۔ غصے کی آگ ایسی ہی ہوتی ہے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ہوتا ہے جو ایسی جلن کو برداشت کر لیتا ہے۔

عالی کمال قوت ارادی سے برداشت کرنے لگا۔ ایسے وقت اپنے حالات کو اور اپنے آپ کو بھلا دینے کا ایک آسان راستہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو خود پر حاوی کیا جائے۔ اور وہ یہی کر رہا تھا۔ وہ آیت الکرسی کی گہرائی میں ڈوب رہا تھا اور آیت کہہ رہی تھی۔

”پوری دنیا میں اور پوری کائنات میں جو ہو چکا ہے جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے، ان کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معلومات کا احاطہ کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ معبود جسے چاہتا ہے، اسے علوم عطا کرتا ہے.....“

اور ان لمحات میں عالی کو علم ہو رہا تھا کہ انسان سے جانے انجانے میں جو غلطیاں ہوتی ہیں وہ اس وقت معلوم ہوتی ہیں جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں۔

وہ ماریہ کو چاہنے کی لگن میں بھول گیا تھا کہ وہ صنف نازک تھی اور وہ فولاد ہے۔ کسی پہلوان کو ایک ہاتھ سے مارتا ہے تو وہ اپنا جج بن جاتا ہے۔ کسی بڑا ایک پاؤں رکھ دیتا ہے تو وہ پھڑ پھڑا کر مر جاتا ہے۔ اس کی اٹلی ایک خنجر کی طرح دشمنوں کے اندر پیوست ہو جاتی ہے۔

چند روز پہلے یہ قدرتی اشارہ ملا تھا کہ ماریہ اسے برداشت نہیں کر پائے گی۔ اس کی ایک کلی کی دھار ماریہ کی ہتھیلی کی پشت پر تیر کی طرح آکر لگی تھی۔ ہتھیلی کا وہ حصہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس ایک دھار نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا لیکن اکثر اشارے کنایے سمجھ میں نہیں آتے۔ آخر میڈیکل رپورٹ نے سمجھا دیا کہ ماریہ کس طرح زخمی ہو گئی تھی۔

اور اللہ کا کلام سمجھا رہا تھا کہ اس نے ماں پر اور نہ ہی ماریہ پر کوئی ظلم کیا ہے۔ لوگ قضائے الہی سے زلزلے میں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ سیلاب میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ماریہ کو عالی نے نہیں اس کی غیر معمولی قدرتی قوت نے مارا تھا۔ جو بھی ہوا، وہ مشیت ایزدی سے ہوا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اگست 2016ء

سپنس ڈائجسٹ





منظرِ راما

# آگ کا دیا

شاعروں نے عشق کو آگ کے دریا سے تشبیہ دی ہے... شاید وہ سب اس دریا سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنے کا تجربہ کر بیٹھے ہوں... مگر وہ نہ تو شاعر تھانہ مصوّر پھر بھی اس دریا میں چھلانگ لگا دی اور ثابت کر دیا کہ چاہت کے لیے صرف خلوص اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے باقی قسمت کا کرشمہ... اور قسمت کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو گئی تھی کیونکہ عشق کے نام پر صحیح کو غلط سمجھنا درست ہو گز نہیں ہوتا۔

عشق میں سر بلند کرنے والے ایک معصوم عاشق کی کار فرمائیاں

مغرب کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ یہ معمول تھا۔ مغرب کی ہر نماز کے بعد مولوی صاحب گاؤں کے چند افراد کو لے کر بیٹھ جاتے اور مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے، انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے۔ یہ افراد گاؤں کے وکاتدار

مولوی صاحب کے سامنے تین چار افراد بیٹھے تھے۔ یہ گاؤں کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کا محن تو پختہ تھا لیکن دیواریں کچی تھیں۔ اس مسجد میں ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ سو، سو اسو افراد کی منجائش تھی۔

اگست 2016ء

225

سپینس ڈائجسٹ



کے لیے ہوتی ہے نا جس سے بے پناہ محبت کی جائے۔“  
”جزاک اللہ..... سبحان اللہ۔“ ہر طرف سے  
آوازیں آنے لگیں۔

”مولوی صاحب! یہ تو عشق اور محبت کا بہت اعلیٰ  
مقام ہے۔“ اسلم نے کہا۔ ”میں تو اس محبت کی بات کر رہا  
ہوں جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔“

”نو جوان، میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ مولوی  
صاحب مسکرائے۔ ”اب ایک بات یہاں یہ جان لو کہ محبت  
کوئی اختیاری فعل نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی کے سر  
پر ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی کی طرف اشارہ کر کے  
کہو کہ اس سے محبت کرو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور ایسا بھی  
نہیں ہو سکتا کہ تم کسی سے یہ کہو کہ فلاں سے محبت نہ کرو۔ یہ  
ناممکن ہے۔ محبت کی نہیں جاتی بلکہ یہ تو ہو جاتی ہے۔ محبت  
فطرت کا ایک روپ ہے۔ اس روپ میں ہر حال میں  
سلامت رہنا چاہیے۔“

”تو پھر ہمارے یہاں بہت سے لوگ اس محبت کو برا  
کیوں سمجھتے ہیں؟“ اسلم نے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ ایک تو وہ محبت کی حقیقت کو نہیں سمجھتے  
اور دوسری طرف اس جذبے کی پاکیزگی کو نہیں سمجھ پاتے۔  
وہ محبت کا اظہار اپنے جسم سے کرنا چاہتے ہیں اور یہیں سے  
خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔“

”اور اگر محبت میں کسی قسم کا جسمانی اظہار نہ ہو تو؟“

”پھر تو..... ایسی محبت بہت مبارک ہوتی ہے۔“  
مولوی صاحب نے کہا۔

”مولوی صاحب! گستاخی معاف..... کیا آپ نے  
بھی کسی سے محبت کی ہے؟“

مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسرے  
لوگ بھی پہلو بدل کر رہ گئے۔ ویسے ان سبھی کو آج کی باتوں  
میں بہت مزہ آرہا تھا۔

آج تک کسی نے بھی مولوی صاحب سے اس قسم کی  
باتیں کرنے اور اس قسم کے سوالات کرنے کی جرأت نہیں  
کی تھی۔ وہ بے چارے تو مولوی صاحب کی باتیں سن کر  
صرف گردنیں ہلا کر رہ جاتے۔ ان میں اتنی ہمت کہاں تھی  
کہ وہ مولوی صاحب سے ایسی باتیں پوچھیں۔

”ہاں، میں نے بھی محبت کی ہے۔“ کچھ دیر بعد  
مولوی صاحب کی آواز گونجی۔ ”محبت تو انسان کی ضرورت  
ہے۔ وہ محبت نہ کرے تو گھٹ کر مر جائے۔“

☆☆☆

تھے، کسان تھے، مزدور تھے۔ سیدھے سادے لوگ جن  
کی زندگی سیدھی سادی تھی، کسی ریا اور منافقت سے پاک۔  
آج ان لوگوں کے حلقے میں ایک ایسا نو جوان دکھائی  
دے رہا تھا جس کو مولوی صاحب نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔  
اس کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ وہ نو جوان شہر سے آیا ہوا  
ہے۔ چلنے پھرنے اور بیٹھنے اٹھنے کا انداز بہت کچھ بتا دیا کرتا  
ہے۔ اچانک اس نو جوان نے ایک سوال کیا۔

”مولوی صاحب! محبت کسے کہتے ہیں؟“

سب لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس  
نے مولوی صاحب سے یہ کیا سوال کر دیا تھا۔ لیکن مولوی  
صاحب کے ہونٹوں پر بڑی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

”بیٹا، پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام اسلم ہے مولوی صاحب۔“ اس نے بتایا۔

”میرا باپ وڈیرے کا منشی ہے..... رب نواز۔“

”اوہ..... تو تم اب نواز کے بیٹے ہو؟“

”جی مولوی صاحب! اب سے تقریباً سات آٹھ

سال پہلے میرے باپ نے مجھے پڑھائی کے لیے شہر بھیج دیا  
تھا۔ میں کل ہی واپس آیا ہوں۔ یہاں کے لوگوں نے بتایا  
تھا کہ آپ ہر مغرب کی نماز کے بعد مجلس کرتے ہیں تو میں بھی  
کچھ حاصل کرنے کے لیے چلا آیا ہوں۔“

اسلم نے بڑی شائستگی کے ساتھ اپنا تعارف بھی کروا  
دیا تھا اور اپنا مدعا بھی ظاہر کر دیا تھا۔

”ہاں تو بیٹے..... کیا تھا تمہارا سوال؟“ مولوی

صاحب نے پوچھا۔

”یہ بتائیں کہ محبت کیا ہوتی ہے؟“ اسلم نے اپنا  
سوال دہرایا۔ ”کیا یہ انسان کے اندر ہوتی ہے یا باہر کہیں  
پائی جاتی ہے؟“

”جزاک اللہ۔ بہت اچھا سوال ہے تمہارا۔“ مولوی  
صاحب نے کہا۔ ”تم نے جو سوال کیا ہے، وہ اس جذبے کے  
بارے میں ہے جس جذبے کی وجہ سے یہ کائنات بنی ہے۔“

”مولوی صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ گاؤں  
کا ایک شخص جربز سا ہو گیا۔ ”یہ تو کوئی اچھی چیز نہیں ہے  
اور یہ کائنات اور یہ دنیا تو ہمارے نبی ﷺ کی وجہ سے  
بنائی گئی ہے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ نبی کی وجہ سے اس لیے بنائی  
گئی کہ مالک کائنات نے نبی سے بے پناہ محبت کی ہے اور اپنے  
محبوب ﷺ کے لیے اس نے پوری کائنات، پھولوں،  
دریاؤں، پہاڑوں اور آبیاریوں سے سجادی۔ اتنی سجاوٹ تو اس



”تم.....تم ناجو ہوتا؟“ اسلم نے پوچھا۔

”اور تم اسلم ہوتا؟“

”ہاں، میں اسلم ہی ہوں۔“

گاؤں میں یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی دکان پر، کبھی پرانے کنویں کے پاس، کبھی کھیتوں کے درمیان..... اور کبھی کسی درخت کے نیچے۔

وہ اس بات کو تو جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک ایسی محبت کا کھیل شروع ہو چکا ہے جس میں آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں اور خوابوں کو زندگی سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ جس ماحول میں محبت کی روایت تازہ کر رہے ہیں، اس ماحول میں محبت اتنی مضبوط روایت نہیں ہے بلکہ پرانے سخت اور بے رحم قسم کے اصولوں کی اہمیت ہے۔ وہ جب ایک دوسرے سے ملتے تو وقت کی روانی میں تیزی آ جاتی۔ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کتنے لمبے گزار دیے ہیں۔

وہ صرف ایک دوسرے کی محبت کو محسوس کرتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہتے۔ اس وقت انہیں ہر طرف سے ہواؤں کی سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ یہ ہوائیں مبارک باد دیتیں کہ انہوں نے محبت حاصل کر لی ہے۔ محبت جو ایک مضبوط جذبہ ہے۔ ایک اعلیٰ وارفج جذبہ ہے۔ ان دونوں کا تعلق دو مختلف خاندانوں اور برادری سے تھا اور پرانی روایتوں اور رسومات کے مطابق یہ خاندان آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔ ان کے یہاں محبت اور پیار وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دونوں کو ہر وقت بچھڑ جانے کا دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر ناجو کو..... وہ بہت پریشان رہتی۔ اس کے برعکس اسلم بہت پُر امید تھا۔ نہ جانے کیوں، اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ جلد یا بدیر ناجو کو حاصل کر لے گا۔ مگر کس طرح..... اس بات کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ ناجو سے یہی کہا کرتا۔ ”نہ جانے کیوں مجھے اطمینان ہے کہ ہم ایک ہو جائیں گے۔“

”لیکن کس طرح ہمارا خاندان تو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔“

”بالکل سب کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے باوجود کوئی میرے کانوں میں کہتا ہے کہ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور اس کے بعد مجھے سکون سا مل جاتا ہے۔“

محبت کے لیے دو باتیں ضروری تھیں۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ محبت انسان کی ضرورت تھی۔ وہ اگر محبت نہ کرتا تو گھٹ کر مر جاتا اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ محبت کے لیے جسمانی اظہار ضروری نہیں تھا۔

اسلم نے اپنی محبت میں ان دونوں کا خیال رکھا تھا۔ اس نے شہر میں تعلیم پائی تھی۔ وہ جس ماحول میں تھا، وہاں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ لڑکیاں اس کے ارد گرد رہا کرتیں لیکن اس نے نہ جانے کس کے لیے اپنے آپ کو اور اپنی محبت کو بچا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر کیوں؟ وہ شہر میں رہ کر کسی سے انوالو کیوں نہیں ہوا؟

یہ بات گاؤں واپس آ کر پتا چلی تھی وہ آٹھ برسوں کے بعد واپس آیا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور وہ بھی بدل چکی تھی جس کو قدرت نے اس کی محبت کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ دین محمد کی بیٹی تھی..... ناجو۔

دین محمد گاؤں کا دکاندار تھا۔ اچھی خاصی بڑی دکان تھی اس کی۔ اسلم کو یاد تھا کہ جب وہ چھوٹا سا تھا اس وقت بھی وہ دین محمد کی دکان کو دیکھا کرتا۔ اس وقت بھی وہ دکان بہت چلتی تھی اور آج بھی اس کی دکان میں رش لگا رہتا تھا۔

اسلم کو دین محمد کی دکان سے زیادہ اس کی شوخ سی بیٹی ناجو یاد تھی جو گاؤں کی گلیوں میں اچھلتی کودتی پھرا کرتی اور اسلم کو چھیڑا کرتی۔ اسلم اس زمانے میں بہت بدلتا اور سیدھا سادہ ہوا کرتا تھا لیکن یہ باتیں آٹھ برس پہلے کی تھیں۔

جانے کیوں ان آٹھ برسوں میں وہ ناجو کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ شہر کے ہنگاموں میں بھی وہ اس کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں گونجا کرتی اور جب وہ آٹھ برسوں کے بعد واپس آیا تو ناجو کو دیکھ کر رنگ رہ گیا۔ وہ تو کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ پہلے وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی اور اب وہ ایک بڑی سی بے بی ڈول تھی۔

ہو سکتا تھا کہ گاؤں کے نوجوانوں نے اس کو دیکھ کر آہیں بھی بھری ہوں۔ اس کو اشارے بھی کیے ہوں، اس کے قریب ہونے کی کوشش بھی کی ہو لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو بچا کر رکھا تھا۔ شاید اسلم کے لیے.....

ہو سکتا ہے کہ اسلم اسے یاد ہی نہ ہو۔ اتنے دنوں تک کوئی کیسے یاد رکھتا ہے۔ لیکن جب آٹھ برسوں کے بعد دونوں ایک دوسرے کے سامنے آئے تو انہیں تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔

سپنس ڈائجسٹ



قدم رہو کہ تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔ قدرت کا فیصلہ گاؤں والوں کے فیصلے سے بالکل مختلف ہے۔“

اس کو مارتے پیٹتے ہوئے لانے والے یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ ویسے تو وہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا لیکن اس کے وجہ میں تو اتنی موجود تھی۔

اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا لیکن اسے اپنے آپ سے زیادہ ناجو کی فکر تھی۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ کس طرح سب کے سامنے کھڑی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی غیرت کے نام پر اس کا خون ہی کر دے۔ ان علاقوں میں اس قسم کی وارداتیں تو بہت عام تھیں۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا تھا۔ کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ کسی کو کوئی سزا نہیں ہوتی تھی۔ کچھ بھی نہیں ہوتا اور دو محبت کرنے والوں کی کہانی خاموشی سے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ رات اسلم کے لیے بہت کرب کی رات تھی۔ جو کسی نہ کسی طرح گزر رہی تھی۔

☆☆☆

دوسری شام کو وہ بہت سے لوگوں کے درمیان تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کی اور ناجو کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں گاؤں کے بزرگوں کے علاوہ، بھڑکے ہوئے ایسے نوجوان بھی تھے جو ناجو کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہوں گے۔ گاؤں کا بڑا آدمی تھا۔ یہ وہ آدمی تھا جس نے خود کبھی محبت نہیں کی تھی اور وہ دوسروں کو بھی اس کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس آدمی نے نفرتوں کے درمیان آنکھیں کھولی تھیں اور اس نے انہی نفرتوں کو اپنا سا بہ بنا رکھا تھا اور بس کچھ ایسے لوگ تھے جو تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

جرم یہ سنا دیا گیا تھا..... گناہ یہ تھا کہ اسلم نام کے ایک نوجوان نے ناجو نام کی ایک لڑکی کے ساتھ نفرتوں کے ماحول میں پیار کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سے پہلے کہ فیصلہ سنایا جاتا اسلم بول پڑا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ مجھے تم لوگوں نے مجرم سمجھ لیا ہے لیکن اگر تم لوگ واقعی سچے دل سے انصاف کرنا چاہتے ہو تو میری ایک بات کا جواب دو۔ اس کے بعد تم جو بھی سزا دو گے، مجھے منظور ہوگی۔“

ایسا شاید پہلی بار ہوا ہوگا کہ کسی مجرم نے پنچایت سے کوئی سوال کرنے کی ہمت کی ہوگی۔ ورنہ عام طور پر تو ایسے مجرم روتے اور گڑ گڑاتے ہی رہتے تھے۔ اس لیے لوگوں کے لیے یہ بھی دلچسپی کا سبب بن گیا تھا کہ مجرم کیا پوچھنا چاہتا ہے۔

گاؤں میں آنے کے بعد اسلم نے ایک نئے مولوی کی خبر سنی۔ وہ اس گاؤں کی مسجد میں نیا نیا آیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں بتاتے تھے کہ وہ بہت قابل انسان ہے۔ اس کی باتیں دل میں اتر جاتی ہیں۔ وہ دوسرے مولویوں سے بالکل الگ ہے وغیرہ وغیرہ.....

اسلم کو ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ یہ بے چارے سیدھے سادے لوگ کسی کی علیست کا کیا اندازہ لگا سکتے تھے۔ ایک بار مغرب کی نماز کے وقت وہ خود مسجد میں پہنچ گیا۔ اس دن مولوی صاحب عشق اور محبت کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے اور اس دن اسلم کو احساس ہوا کہ یہ مولوی صاحب کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔

مولوی صاحب نے محبت کی بات کی تھی کہ یہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ کوئی جرم نہیں تھا۔ خدا نے انسان سے محبت کی تھی اس لیے اس نے پوری کائنات کو سجا دیا۔

سجاد تو اس کے لیے کی جاتی ہے جس سے محبت ہوتی ہے۔ جن سے نفرت یا بیزاری ہو ان کے لیے سجاد کہاں ہوتی ہے۔ اس لیے اسلم اور ناجو کوئی گناہ نہیں کر رہے تھے بلکہ محبت کے راستے اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہے تھے۔ کوئی گناہ نہیں تھا۔ کوئی جرم نہیں تھا تو پھر یہ سب کیا تھا؟ یہ خوشخوار غصے بھری آنکھوں والے لوگ کون تھے جنہوں نے ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ناجو کو زبردستی اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیا گیا تھا جبکہ اسلم کو بری طرح مارا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں سے، پھٹروں سے، گھونسوں سے۔

اس وقت بھی وہ دونوں اپنے ماحول سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ جب کسی نے گاؤں والوں کو خبر دے دی اور کچھ ہی دیر میں بہت سے لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

”ماروان کو..... بکڑے کر دو۔“

”بہیں مار کر کھیٹ میں دبا دو۔“

طرح طرح کی آوازیں تھیں۔ پھر کسی کے کہنے پر ناجو کو اس کے گھر پہنچا دیا گیا اور اسلم کو ایک کٹھری میں بند کر کے پہرے لگا دیے گئے۔

یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ یہ دونوں کاروکاری ہیں اور پنچایت میں ان کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسلم اگرچہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اس کے باوجود ہوائیں سرگوشیوں میں اسے بتا رہی تھیں۔ ”مبارک ہو کہ تم اپنی منزل کے قریب ہو۔ ثابت



## معاوضہ

مصنف بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ایک نوجوان نے ایک روز اپنے دوست کے پاس پہنچ کر خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔  
”آخر کار مجھے اپنی ایک کہانی ”دل ناداں“ کے عوض ایک ہزار روپیہ مل ہی گیا۔ قلم کے ذریعے یہ میری پہلی کمائی ہے۔“  
”کس رسالے نے دیا ہے یہ معاوضہ؟“  
دوست نے حیرت سے پوچھا۔

”رسالے نے نہیں، یہ پیسے کوریئر سروس والوں نے ہر جانے کے طور پر دیے ہیں۔ انہوں نے میری کہانی کا مسودہ گم کر دیا ہے۔“ نوجوان نے بتایا۔

☆☆☆

## تھیٹر

قلم شو کے دوران ہیر وٹن نے اچانک ہیر وٹن کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا اور ہیر وٹن نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ سنائے سے کسی بچے کی آواز ابھری جو اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔ ”امی! یہ بھی کیوں نہیں چاہتا مار دیتی جیسا آپ کرتی ہیں۔“

☆☆☆

اس سے محبت نہیں کرتے۔“

”میں اس کی قسم کبھی نہیں کھاؤں گا کیونکہ اس سے محبت کرتا ہوں۔“ اسلم نے جواب دیا۔  
ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگوں کے چہروں کی سختیاں اور بڑھ گئی تھیں۔

”تو بات وہی ہوئی نا۔“

”نہیں۔ بات یہ نہیں ہوئی۔“ اسلم نے کہا۔ ”کیونکہ میں برملا کہہ رہا ہوں کہ میں نے اس سے محبت کی ہے اور محبت کوئی جرم نہیں ہے۔“

”بکو اس نہیں کرو۔“ کسی نے چلا کر کہا۔ ”یہ ہمارے یہاں جرم ہے۔“

اس آواز میں اور آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ اسلم

”ہاں، بتا کیا بات ہے..... کیا پوچھنا ہے تجھے؟“  
گاؤں کا بڑا آدمی بول پڑا۔

”مجھے جو لوگ پکڑ کر لائے ہیں، ذرا ان سے یہ پوچھو کہ انہوں نے ہم دونوں کو کس حال میں پکڑا تھا۔ کیا ہم ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے یا ہم ایک دوسرے سے الگ الگ بیٹھے تھے۔“

”چلو بتاؤ۔“ بڑے نے پکڑ کر لانے والوں سے پوچھا۔

”الگ الگ بیٹھے تھے۔“ ان میں سے ایک نے بتایا۔

”اور اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا گاؤں کی ہر لڑکی پردہ کرتی ہے؟“ اسلم نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی پردہ نہیں کرتی۔“

”کیا لڑکا اور لڑکی، مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے سامنے نہیں آتے ہیں؟ گلیوں میں، بازاروں میں، دکانوں پر، بلکہ کھیتوں میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟“

”ہاں ہوتا تو ایسا ہی ہے۔“ کسی نے کہا۔

”پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس گاؤں کا ہر آدمی کا روادار ہر عورت کا رے ہے۔“

گاؤں کا بڑا اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نوجوان نے کیسی بات کہہ دی تھی۔ واقعی یہاں کے مرد اور عورتیں تو ایک دوسرے کے سامنے آتے ہی رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے۔ سلام دعا کرتے۔ اس کا مطلب یہ کہاں سے ہوتا تھا کہ وہ گناہ گار بھی ہیں۔

اچانک گاؤں کا ایک نوجوان بول پڑا۔ ”بات سن..... یہ ہم سب گاؤں والوں کی آپس کی بات ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اسی لیے اگر راستے میں بات بھی کر لیں تو بھی انسی کوئی کہانی نہیں ہوتی۔“

”شاید تم یہ بھول گئے کہ میرا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے۔“ اسلم نے کہا۔ ”میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا اور صرف آٹھ برس پہلے ہی یہاں سے باہر گیا ہوں۔ تم لوگوں نے جس لڑکی کے لیے مجھ پر الزام لگایا ہے، میں اس کو بچپن سے جانتا ہوں۔ اگر میں نے راستے میں اس سے ملاقات کر لی یا اس سے باتیں کر لیں تو کیا اس میں کوئی برائی ہے؟“

وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ اسلم نے بہت خوب صورتی سے اپنا اور اپنی محبت کا دفاع کیا تھا۔

”چلو مان لیا کہ تم یہاں کے لیے اجنبی نہیں ہو۔ تم اس لڑکی کو اس کے بچپن سے جانتے ہو..... تو قسم کھا کر بتاؤ کہ تم



نے اب تک جو بھی کہا تھا، اس کا اثر زائل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تھے ہوئے سخت چہرے، شعلے اگتی ہوئی آنکھیں۔ ان خونخوار آنکھوں میں دو آنکھیں نا جو کے باپ کی بھی تھیں جو کھا جانے والی نگاہوں سے اسلم کو دیکھ رہا تھا اور اسی وقت بالکل سی میچ گئی۔ مولوی صاحب مسجد سے نکل کر اس پنجائیت میں آگئے تھے۔ پہلا موقع تھا کہ مولوی صاحب اس طرح کسی گھر میں آئے ہوں۔ ورنہ وہ اپنی مسجد سے باہر کہاں نکلتے تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں دیکھ کر ادب سے خاموش ہو گئے تھے۔

انہوں نے ایک نظر سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں بھائی، کیا ہو رہا ہے یہاں؟“

”مولوی صاحب یہ بہت سنگین مسئلہ ہے۔“ کسی نے کہا۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“

”مولوی صاحب! یہ آدمی گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت کی بات کرتا ہے۔“ کسی نے اسلم کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیوں بھائی، کیا سن رہا ہوں میں؟“ مولوی صاحب نے اسلم سے پوچھا۔

مولوی صاحب کو وہاں دیکھ کر اسلم کو شاید حوصلہ مل گیا تھا۔ ”جی جناب! میں نے اس لڑکی سے محبت کی ہے۔“ اسلم نے بتایا۔ ”اور اس محبت میں جسم کے اظہار کو شامل نہیں ہونے دیا ہے۔“

”اور یہ محبت کتنے دنوں کے لیے ہے؟“ مولوی صاحب نے پوچھا۔ ”زندگی بھر کے لیے ہے جناب۔“ اسلم نے کہا۔ ”کیونکہ کچھ محبتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے آسمانوں پر فیصلے ہو جاتے ہیں۔“

”مبارک ہو۔“ مولوی صاحب نے اپنی گردن ہلائی۔ ”خدا کرے تم اپنے ارادوں پر قائم رہو۔“

”مولوی صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ نا جو کا باپ کھڑا ہو گیا۔ ”یہ تو بالکل الٹی بات ہے۔“

”الٹی بات نہیں ہے بے وقوف..... سیدھی بات ہے۔“ مولوی صاحب نے کہا۔ ”جتنے لوگ بھی یہاں بیٹھے ہیں، ان سے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں..... صرف ایک بات۔“

”جی پوچھیں، کون سی بات؟“

”کسی کی جب شادی ہوتی ہے تو اس وقت نئے جوڑے کے لیے کون سی دعائیں مانگی جاتی ہیں؟“ مولوی

صاحب نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مولوی صاحب! یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کیا دعائیں ہوتی ہیں۔“ نا جو کے باپ نے کہا۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا دعائیں ہوتی ہیں؟“

”یہی کہ اللہ دونوں کے درمیان محبت پیدا کرے۔“

”مبارک ہو کہ تمہاری آدمی دعا تو شادی سے پہلے پوری ہو چکی ہے۔“ مولوی صاحب نے کہا۔ ”کیونکہ دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ ایک مضبوط محبت کیونکہ میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں سچائی دیکھ لی ہے۔ اب صرف شادی ہونا باقی ہے۔ محبت والی دعا مولا سائیں نے قبول کر لی ہے۔ کیا مولا سائیں کے فیصلے پر کسی کو اعتراض ہے؟“

مولوی صاحب نے چاروں طرف دیکھا۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ تھے ہوئے چہرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اسی وقت مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔

”یہ لو بھائی، میرے اذان دینی شروع کر دی ہے۔“

مولوی صاحب نے کہا۔ ”تم لوگ! اپنے ایمان اور انصاف کی روشنی میں خود فیصلہ کر لو اور رسم و رواج پر مت جاؤ کیونکہ تم اگر اپنے نبی ﷺ کو ماننے والے ہو تو یاد رکھو وہ ایسی ہی رسوں کو مٹانے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اب یا تو ان کی اور مولا سائیں کی بات مانو یا پھر اپنے پرانے اور جہالت والے اصولوں کی بات کر لو۔ میں تو چلتا ہوں..... اور ہاں، ایک بات اور میں نے ایک بار تم لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ میں نے بھی محبت کی ہے۔ تو چلو، آج یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کس سے محبت کی ہے۔ میری محبت اس مولا سائیں سے ہے جو اپنی عبادت کے لیے مجھے مسجد کی طرف بلا رہا ہے۔ تم میں سے بھی جو میرے ساتھ آنا چاہے تو آ جائے۔“

نا جو کے باپ نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اسلم کی طرف بڑھا دیا۔ ”چلو بیٹے، مسجد کی طرف چلتے ہیں۔“

اسلم نے نا جو کے باپ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب بہت سے لوگ مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ مولوی صاحب سب سے آگے تھے اور ان کے پیچھے وہ لوگ تھے جن کی گردنیں کچھ دیر پہلے تھیں ہوئی تھیں لیکن اب وہ سب جھکی گردنوں اور تیز قدموں کے ساتھ مسجد کی طرف جا رہے تھے اور ان کے درمیان اسلم چل رہا تھا..... جس کا ایک ہاتھ نا جو کے باپ نے تھام رکھا تھا۔



# شیخ نجیب الدین متوکل

ضیائیں بلکرامی

کچھ لوگ زمین پر اتنے خوش قسمت اتارے گئے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ جیسے کہ بی بی قرسن خاتون... جن کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا جن کے تین بیٹے تھے اور تینوں اللہ کے برگزیدہ بندے... سبحان اللہ... انہی میں شیخ نجیب الدین بھی شامل تھے جو تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہوئے اپنے منجھلے بھائی بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہوئے اور متوکل کا خطاب پایا۔ وہ کتنی خوش قسمت ماں تھیں جن کے بیٹوں کے نام سلسلہ بزرگان دین میں ستاروں کے مانند روشن ہوئے۔

اللہ پر توکل کرنے والے ایک متوکل ولی کی مستقل مزاجی



کابل پر فرخ شاہ کی حکومت تھی۔ شب و روز شان و شوکت سے گزر رہے تھے۔ شاہی خاندان اپنے اقتدار اور جاہ و ثروت کو اپنے لیے دائمی سمجھتا تھا مگر کارکنان قضا و قدر نے غزوی خاندان کو اقبال اور اقتدار کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ فرخ شاہ سے زمام حکومت چھین کر سیکٹکین کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ فرخ شاہ اپنے خاندان کے ساتھ گننامی میں چلا گیا۔ ان حالات میں عام طور پر لوگ جلا وطن ہو جانا اپنی تقدیر سمجھتے ہیں لیکن فرخ شاہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے خدا کے فیصلے کو خندہ پیشانی سے



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                   |                 |                  |
|---------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد    | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو    | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ       | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



قبول کر لیا اور کابل ہی میں رہائش برقرار رکھی۔ سابق شاہی خاندان اپنی قسمت پر شاکر رہا۔ یہاں تک کہ غزنویوں کا اقتدار بھی چھن گیا اور چنگیز خان نے صحرائے کوہ کو عبور کر کے مشرق اور مغرب کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ کابل بھی اس سے متاثر ہوا اور ہر طرف تباہی و بربادی نے ڈیرا ڈال دیا۔ وہ خاندان جس کو غزنویوں کا اقتدار متزلزل نہیں کر سکا تھا، چنگیز خانی سیلاب نے ہلا کر رکھ دیا۔ ان لوگوں نے کابل سے ہجرت کی اور لاہور چلے آئے۔ لاہور کچھ دن رہے اور پھر قصور کا رخ کیا۔ قصور کا قاضی اس خاندان کی عظمت اور شاندار ماضی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اس خاندان کی سفارش برصغیر کے بادشاہ سے کی اور بادشاہ نے اس خاندان کے قاضی شعیب فاروقی کو ٹیسوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب فاروقی نے یہیں شادی کی اور ان سے خاندان کا سلسلہ چل نکلا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام شیخ جمال الدین سلیمان تھا۔ جب شیخ جمال بن شعور کو پہنچا تو ان کے باپ نے ان کی شادی مولانا وجیہ الدین بجنوری کی صاحبزادی بی بی قرن خاتون سے کر دی۔ بی بی قرن خاتون کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا، لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

شادی کے بعد شیخ جمال الدین سلیمان نے اپنی بیوی میں کیا دیکھا؟ شاید ان کی زبان اس کے بیان پر قادر نہ تھی۔ شوہر نے اپنی بیوی کو صوم و صلوة کا حد درجہ پابند دیکھا۔ وہ ہر وقت با وضو رہتیں اور اپنی زبان کی حفاظت فرماتیں۔ اندھیری رات تھی، رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ پورا محلہ بلکہ پورا قصبہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں صاف آرہی تھیں۔ اسی عالم میں ایک چور نے بی بی قرن خاتون کے گھر کا انتخاب کیا۔ آپ اس وقت بھی محو عبادت تھیں۔ آپ جس حصے میں نماز تہجد ادا فرما رہی تھیں، چور اس طرف گیا اور جھانک کر آپ کو دیکھنا چاہا مگر اس کو اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا اور پینائی جواب دے گئی۔ اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر بصارت کام نہیں کر رہی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے مگر ناکام رہا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور پورے وجود میں دہشت دوڑ گئی۔ جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ”اے خانہ! میں نہیں جانتا کہ یہ کس کا گھر ہے اور اس میں کس اللہ والے نے اپنے تقدس کا سایہ ڈال رکھا ہے۔ میں اس گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا لیکن میں اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اب میں کسی نادیدہ غیر مرئی عظمت اور تقدس کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری پینائی چلی گئی اور میں اس لائق بھی نہیں رہ گیا کہ راستہ تلاش کر کے مکان سے باہر جاسکوں۔ بھگوان کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میری پینائی واپس آگئی تو میں چوری کے پٹے سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو جاؤں گا۔“

آپ نے چور کی آواز سنی مگر آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ نے چور کے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”مولا! یہ شخص بشریت کا شکار ہو گیا ہے، اس پر رحم فرما دے اور اس کی پینائی واپس فرما دے۔ میں اس وقت تک سجدے میں پڑی رہوں گی، جب تک تو میری درخواست پر توجہ نہیں فرمائے گا۔“ مٹی اور پرہیزگار تیرے الطاف و اکرام کے مستحق ہوتے ہی ہیں، یہ گناہ گار کہاں جائیں اے اللہ! ان پر رحم فرما۔“

آپ سجدے میں پڑی گڑ گڑا رہی تھیں۔ چور نے اپنی پینائی کو بحال ہوتے محسوس کیا، ذرا سی دیر میں وہ اس لائق ہو چکا تھا کہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی اتنا خوفزدہ اور مرعوب تھا کہ بہ آواز بلند عرض کیا۔ ”صاحبان خانہ! میں نہیں جانتا کہ میری پینائی کیوں چلی گئی تھی اور پھر واپس کیونکر آگئی لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت تو میں جا رہا ہوں لیکن بھگوان نے چاہا تو صبح پھر حاضری دوں گا اور اپنی توبہ کا ایک بار پھر اعلان کروں گا۔“

اس وقت تو چور چلا گیا لیکن دوسرے دن صبح دوبارہ آگیا اور آپ کے در پر دستک دی۔

آپ نے آڑ سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

چور نے جواب دیا۔ ”میں ہوں گنگا پرشاد۔ میں رات کو چوری کی نیت سے اس گھر میں داخل ہوا تھا مگر میری پینائی چلی گئی تھی۔ میں اسی وقت کسی حد تک اس راز سے واقف ہو چکا تھا پھر میری پینائی واپس آگئی اور اب میں حسب وعدہ واپس آچکا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تیرا توبہ کر کے ارادنا یہاں تک آ جاتا ہی بہت اچھا ہے، میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تیری اصلاح کرے اور تجھے سچ راستے پر ڈال دے تاکہ تو کل قیامت کے دن لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔“

چور نے پوچھا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں اپنی رات والی حرکت پر بہت زیادہ نادم ہوں۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں، کیسے کیا حکم ہے؟“



آپ نے اس چور کو اس کے خاندان کے ساتھ مسلمان کر لیا اور اس کے حق میں بڑی دعا کی۔ ان خاتون کو خدا نے تین بیٹے دیے۔ ایک کا نام رکھا گیا اعز الدین محمود۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دوسرے کا نام رکھا گیا فرید الدین مسعود۔ یہ پٹھلے تھے اور بعد میں بابا فرید الدین گنج شکر ہو گئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام رکھا گیا نجیب الدین، یہ بعد میں نجیب الدین متوکل ہو گئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر بن الخطابؓ سے مل جاتا تھا۔ یہ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہوئے اپنے پٹھلے بھائی بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہو گئے۔ ان دنوں دہلی میں دور دور سے بزرگان دین اور صوفیائے کرام تشریف لایا کرتے تھے۔ ان میں بابا فرید گنج شکر کا نام بھی شامل تھا۔ ان کے ساتھ نجیب الدین بھی ہوتے تھے۔ ان دنوں کو دہلی آئے ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ آخر بابا فرید الدین نے واپسی کے لیے اپنا سامان سنبھالا۔ نجیب الدین بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ بابا فرید نے انہیں تیار جو دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔ ”نجیب الدین! کہاں..... کیا ارادے ہیں؟“

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ”بھائی! میرا کیا ارادہ؟ میں تو آپ کا تابع ہوں۔ جہاں لے جائیں گے، چلا جاؤں گا۔“ بابا فرید نے فرمایا۔ ”نجیب الدین! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دہلی ہی میں رہو، تم یہیں رک جاؤ۔“ نجیب الدین نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ”جیسا آپ کا حکم، مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔“ بابا فرید مسکرائے، فرمایا۔ ”بھائی نجیب الدین! تم دہلی میں کس طرح رہو گے؟ یہاں تمہارا ذریعہ معاش کیا ہوگا؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں کیا جانوں کہ میرا ذریعہ معاش کیا ہوگا۔“ بابا فرید نے فرمایا۔ ”پھر بھی..... یہ دہلی ہے، ایک بڑا شہر ہے یہاں جب تک ذریعہ معاش قابل اطمینان نہ ہو، آدمی کس طرح عزت و ارزنگی گزارے گا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! میں نے اللہ پر توکل کیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔“ بابا فرید نے دعائیہ انداز میں فرمایا۔ ”خدا تمہیں متوکل کرے۔“ اس طرح نجیب الدین متوکل ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے متوکل کہلائے۔ آپ نے دہلی میں جس جگہ قیام فرمایا تھا، وہیں اتر نامی ایک ترک رہتا تھا۔ اس ترک نے یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور مسجد کے پہلو میں ایک مکان بھی تعمیر کرا دیا۔ جب یہ سارا کام مکمل ہو گیا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپ اس پر توجہ فرمائیں گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر وہ اس لائق ہوئی کہ اس پر توجہ دی جائے تو میں ضرور توجہ دوں گا۔“ اتر ترک نے عرض کیا۔ ”حضرت! میری خواہش ہے کہ اس مسجد کی امامت آپ فرمائیں۔ مسجد سے ملحقہ مکان آپ کی رہائش کے لیے حاضر ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس نیک کام سے میں کس طرح انکار کر سکتا ہوں، مجھے منظور ہے۔“ ترک نے کہا۔ ”مسجد کی طرف سے میں ماہانہ ہدیہ بھی پیش کر دیا کروں گا۔“ آپ کے معاملات طے پا گئے اور آپ مسجد والے مکان میں منتقل ہو گئے اور مسجد میں فرائض امامت انجام دینے لگے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ ترک آپ سے بے حد خوش تھا اور علاقے کے لوگ بھی بہت زیادہ مطمئن نظر آتے تھے۔ اسی دوران اتر نامی ترک ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ”بابا! عنقریب میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے، میری خواہش ہے کہ اس میں آپ بھی شرکت فرمائیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”واہ! میں اس میں شرکت کیوں نہیں کروں گا؟ میں اس میں ضرور آؤں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“ شادی کا دن آیا، براتیوں کا ہجوم ایسا تھا کہ پورا علاقہ میلے کا میدان بن گیا۔ آپ بھی وقت پر پہنچ گئے اور برات کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آپ نے ہزاروں آدمیوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ جن برتنوں میں کھانا کھا رہے تھے، وہ برتن بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ یہ سارے برتن چاندی کے تھے۔ آتش بازی نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔ نجیب الدین متوکل جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتر ترک کو ایک کونے میں لے جا کر سوال کیا۔ ”میاں اتر! میری ایک بات کا جواب دو گے؟“

اتر ترک نے جواب دیا۔ ”آپ جواب کی بات کر رہے ہیں، میں نے چاندی کے برتن تک براتیوں کو دے دیے۔“



آپ نے پوچھا۔ ”اس تقریب پر کل کتنا خرچہ آیا ہوگا؟“

اسمٰر ترک نے جواب دیا۔ ”تقریباً ایک لاکھ بائیس ہزار تک۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میاں اسمٰر! تمہارا مال ہے جس طرح چاہو خرچ کرو لیکن مومن کامل وہ ہے جس کی دوستی خدا سے ہو۔ ایسی دوستی کہ اس پر اولاد کی محبت بھی غالب نہ آسکے۔ تم نے ایک لاکھ بائیس ہزار تنکے لڑکی کی شادی پر خرچ کر دیے حالانکہ یہ شادی نہایت سادگی سے بھی انجام پاسکتی تھی اور اس خطیر رقم کو خلیق خدا کی خدمت میں صرف کیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

اسمٰر ترک نے گھور کر آپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”اس وقت تو میں شادی میں مشغول ہوں۔ میں صبح اس موضوع پر بات کروں گا۔“

آپ اپنے گھر چلے گئے۔ صبح نماز فجر کے بعد اسمٰر ترک آپ کے پاس پہنچا، بولا۔ ”ہاں جناب..... تو کل رات آپ کیا فرما رہے تھے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ مومن کامل وہ ہے جو خدا سے دوستی کرے۔ یہ رقم جو تم نے اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کی ہے

اگر اسے یا اس میں کچھ اور ملا کر تم خدا کی مخلوق کی خدمت میں صرف کر دیتے تو اس سے مخلوق بھی خوش ہو جاتی اور اللہ بھی راضی ہو جاتا۔“

اسمٰر ترک نے پوچھا۔ ”تمہیں جو کچھ بھی کہنا تھا کہہ چکے یا ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، مجھ کو اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کہنا۔“

اسمٰر ترک نے جواب دیا۔ ”اچھا اب میری سنو! اب تم میری مسجد سے نکل جاؤ اور میرا گھر بھی خالی کر دو، تم حاسد معلوم

ہوتے ہو۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں حاسد نہیں ہوں اسمٰر! میں نے جو کچھ کہا ہے نصیحت اور ہدایت کے طور پر کہا ہے۔“

اسمٰر نے سختی سے کہا۔ ”لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حکماً کہہ رہا ہوں۔ تم مسجد اور گھر اسی وقت خالی کر دو ورنہ مجھے سختی

کرنا پڑے گی۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

اسمٰر نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تم اسی وقت دفع ہو جاؤ۔“

آپ نے اسی وقت مکان خالی کر دیا اور مسجد سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ فرصت پاتے ہی آپ نے اجدوہن کا رخ کیا

کیونکہ ان کے بڑے بھائی بابا مسعود گنج شکر کا اجدوہن ہی میں قیام تھا۔ آپ اجدوہن پاک روانہ ہو گئے اور وہاں اپنے بھائی

مسعود گنج شکر کے پاس قیام فرمایا۔

بابا فرید نے پوچھا۔ ”ہاں بابا نجیب الدین! کہو، دہلی سے بال بچوں سمیت کیوں آ گئے؟“

بابا نجیب نے حسرت بھری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا اور پورا واقعہ بتا دیا۔ بابا مسعود نے قرآن پاک کی ایک

آیت پڑھی جس کا ترجمہ تھا۔ ”ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کرتے ہیں مگر اس سے

بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔“

نجیب الدین متوکل نے پوچھا۔ ”بھائی! میں کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

بابا مسعود نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم فکر نہ کرو۔ اللہ کوئی دوسری صورت پیدا کر دے گا۔ یہ اسمٰر تھا، خدا

اسمٰر کو منسوخ کر کے کوئی ایسا پیدا کر دے گا۔ وہ بڑا سبب الاسباب ہے، تم ایسا کرنا انتظار کرو۔“

نجیب الدین نے عرض کیا۔ ”بھائی! میں ان باتوں سے بالکل نہیں گھبراتا۔ اپنی معیشت کے بارے میں، میں ذرا بھی

پریشان نہیں ہوتا۔ مجھے تو اسمٰر کا رویہ برا لگا اور کچھ نہیں۔“

نجیب الدین نے اجدوہن سے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ دہلی میں داخل ہوئے تو ان کے کئی جاننے والوں نے انہیں

خوش آمدید کرتے ہوئے کہا ”بابا! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ اسمٰر مر گیا، ایک نیا ترک ایسا آ گیا ہے۔ وہ معلوم نہیں کیوں آپ

کے بارے میں پوچھتا پھرتا ہے۔“

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ”میں ان امراء سے گھبرانے لگا ہوں، میں ایسا کر سے نہیں ملوں گا۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ترک سردار ان کے پیچھے آکھڑا ہوا، اس نے کہا۔ ”بابا متوکل! میری طرف



دیکھئے..... ادھر، میں آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔“

نجیب الدین نے جیسے مڑ کر دیکھا اور کہا۔ ”شاید تیرا ہی نام ایتھر ہے؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ہی ایتھر ہوں۔“

متوکل نے پوچھا۔ ”مجھ سے کوئی کام؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کا ارادت مند ہوں۔ میں نے آپ کی عدم موجودگی میں ایک مکان تعمیر کرایا ہے۔ آپ اس میں قیام فرمائیں اور مجھے اپنا مرید بنالیں۔“

نجیب الدین متوکل نے کہا۔ ”میں تیرے مکان میں کس طرح رہوں کیونکہ میں جب بھی تجھ کو کوئی نصیحت کروں گا تو تو ناراض ہو کر مجھے اپنے مکان سے نکال باہر کرے گا۔“

ترک سردار تلملا گیا، بولا۔ ”ایسا نہیں ہوگا پیر و مرشد..... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔“

آپ اس کے اصرار پر نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس شخص نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دن آپ کے پڑوس سے ایک نوجوان آپ سے ملنے آیا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”بابا متوکل! میرا نام نظام الدین ہے۔ میں بدایوں سے آیا ہوں اور آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے اس نوجوان کو بڑے تپاک سے لیا اور دیر تک مزے مزے کی باتیں کرتے رہے اور آخر میں فرمایا۔ ”نظام الدین! تم اسی طرح میرے پاس آتے رہو۔“

نظام الدین کو آپ سے کچھ ایسی عقیدت ہوئی کہ اپنا بیشر وقت آپ کی صحبت میں گزارتا۔

ایک دن نظام الدین نے تخلیہ میں آپ سے کہا۔ ”بابا متوکل! آپ میرے حق میں دعا کیجئے کہ میں کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”قاضی..... کیا قاضی بہت بڑا ہوتا ہے؟“

نظام الدین نے عرض کیا۔ ”بہت بڑا بھی ہوتا ہے اور عزت والا بھی ہوتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نظام الدین! تم قاضی ہرگز نہ بننا کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو جو کچھ بھی بنے گا، وہ بادشاہوں سے بڑا مرتبہ ہوگا۔ لوگ عقیدت اور احترام سے تیرا نام لیں گے اور تیری جگہ ادنیٰ اور اعلیٰ کے دلوں میں ہوگی، بادشاہوں کی وہ عزت نہ ہوگی جو تیری ہوگی۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”یعنی..... یعنی میں کیا بنوں گا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”تم اللہ کے محبوب اور انسانوں کے اولیاء بن جاؤ گے۔“

بعد میں دنیا نے یہ دیکھا کہ نظام الدین شیخ المشائخ محبوب الہی نظام الدین اولیاء بن گئے اور ان کا مقام ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا دل قرار پایا۔

بابا مسعود نے اجودھن میں قیام کے دوران آپ سے فرمایا۔ ”نجیب الدین! تم ٹیسوال چلے جاؤ اور والدہ کو اجودھن لے آؤ۔“

نجیب الدین ٹیسوال چلے گئے اور والدہ کو اپنے ساتھ لیا اور اجودھن روانہ ہو گئے۔ راستے میں دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں آپ نے قیام کیا۔ ماں نے کہا۔ ”بیٹے نجیب الدین! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ کیا یہاں کہیں ٹھنڈا پانی مل جائے گا؟“

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ”پانی کیوں نہیں ملے گا، میں ابھی لاتا ہوں۔“

نجیب الدین کو پانی کی تلاش میں کافی دور جانا پڑا۔ جب وہ پانی لے کر واپس آئے تو ماں کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگے مگر گھنٹوں کی تلاش اور جستجو کے بعد بھی ماں کا پتا نہ چلا۔ جب وہ ہر طرح سے مایوس ہو گئے تو اپنے بھائی مسعود منج شکر کے پاس گئے اور انہیں پورا واقعہ سنا دیا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ نجیب الدین کو قرار نہ تھا۔ انہوں نے چشم تصور سے ایک بار پھر پورے جنگل کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کا کچھ حصہ دیکھنے سے باقی رہ گیا ہے۔ دوبارہ اسی جنگل میں پہنچے اور ایک بار پھر پورا جنگل کھنگال ڈالا۔ آخر ایک جگہ جھاڑی میں



انہیں بہت ساری ہڈیاں پڑی ملیں۔ یہ ان ہڈیوں کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان کی ماں کو کوئی درندہ کھا گیا ہے۔

نجیب الدین نے ساری ہڈیاں ایک کپڑے میں باندھ لیں اور بھائی مسعود سمجھ شکر کی خدمت میں پہنچے۔ ہڈیوں والی پوٹلی ان کے سامنے رکھ دی اور عرض کیا۔ ”بھائی! مجھ کو یہ ہڈیاں ایک جھاڑی سے ملی ہیں۔ میرا خیال ہے والدہ ماجدہ کو کسی درندے نے.....“

بابا مسعود نے پوٹلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس پوٹلی میں کیا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں نے عرض جو کیا غالباً والدہ مرحومہ کی ہڈیاں۔“

بابا مسعود نے فرمایا۔ ”پوٹلی کھول کر ہڈیاں دکھاؤ۔“

نجیب الدین نے پوٹلی جو کھولی تو اس میں ہڈیاں نہیں تھیں۔ وہ حیرت سے خالی کپڑے کو دیکھنے لگے۔

بابا مسعود نے پوچھا۔ ”کہاں ہیں وہ ہڈیاں؟“

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ”شاید خداوند تعالیٰ والدہ محترمہ کو اس طرح رسوا نہیں کرنا چاہتا۔“

بابا مسعود نے کہا۔ ”اس سانچے کو بھول جاؤ اور دہلی واپس جاؤ۔ اپنا کام جاری رکھو۔“

نجیب الدین متوکل دہلی چلے گئے۔

☆☆☆

عسرت اور تنگدستی پر آپ فخر کیا کرتے تھے۔ عید کا دن تھا اور گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ آپ نے عید گاہ میں عید کی نماز ادا کی۔ راستے میں آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو گھیر لیا۔ وہ آپ کے ہاتھوں کو بو سے دے رہے تھے۔ اس ہجوم میں قلندروں کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ یہ قلندر خراسان سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کسی شخص سے پوچھا۔ ”بھائی! یہ کون ہے جس کی پرستش کی جا رہی ہے؟“

قلندر کو جواب ملا۔ ”شیخ نجیب الدین متوکل، انہیں متوکل اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے توکل کا کوئی جواب نہیں۔“

قلندروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک نے کہا۔ ”ہمیں بھی ان سے ملنا چاہیے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”لیکن یہاں سربراہ نہیں۔“

کسی قلندر نے پوچھا۔ ”اگر یہاں نہیں تو پھر کہاں؟“

دوسرے قلندر نے جواب دیا۔ ”ہمیں ان کے گھر چلنا چاہیے۔“

چنانچہ قلندروں نے یہ طے کر کے ان کے گھر کا رخ کیا۔ جب یہ سب ان کے گھر پہنچے تو دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر نکلے اور قلندروں کو اپنے سامنے دیکھ کر پوچھا۔ ”حضرات آپ؟ آپ لوگوں نے کیوں زحمت کی؟“

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ”بھائی! ہم سب نے لوگوں کو دیکھا کہ لوگ آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو بے تحاشا بو سے دے رہے ہیں، پھر ہم نے آپ کے گھر کا انتخاب کیا۔ اب ہم کھانا یہیں کھائیں گے پھر کہیں جائیں گے۔“

متوکل کو معلوم تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں۔ قلندروں کی باتیں سن کر اندر گئے اور بیوی سے پوچھا۔ ”نیک بخت! چند مہمان آگئے ہیں اور یہ مہمان قلندر ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”آپ تو گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ گھر میں کچھ بھی نہیں، پھر یہ اس قسم کی باتیں کیوں؟“

متوکل نے کہا۔ ”تمہارے پاس دو پٹا وغیرہ تو ہو گا ہی، وہی دے دو۔ بازار میں بیچ دوں گا اور جو رقم ملے گی اس سے قلندروں کے لیے کھانا آجائے گا۔“

بیوی نے پیوندوں سے آراستہ دو پٹا شوہر کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”یہ دو پٹا بازار میں کس طرح اور کتنی قیمت میں بکے گا۔ اس کا حلیہ خود ہی ملاحظہ کر لو، اب میں کیا عرض کروں؟“

آپ نے دوپٹے کو دیکھا تو شرمندہ ہو گئے، فرمایا۔ ”واقعی یہ تو بازار میں بک ہی نہیں سکتا۔“

آپ ایک بار پھر قلندروں کی صحبت میں تشریف لے گئے۔

قلندروں نے آپ کو دیکھا اور طنز آ پوچھا۔ ”کیا ہوا بھائی؟“



آپ نے جواب دیا۔ ”مہمانو! مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔“  
قلندروں نے کہا۔ ”ہم تو تمہارے مہمان ہیں، ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔“  
آپ دوبارہ اندر گئے اور وہاں سے واپس آئے تو بھرا ہوا لونا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خالی پیالہ لیے ہوئے تھے۔  
آپ نے اس حلیے میں نمودار ہو کر قلندروں سے کہا۔ ”صاحبان! میں آپ کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا ہوں، آپ یہ سادہ پانی نوش فرما سکتے ہیں، پانی حاضر ہے۔“  
قلندروں نے پانی لیا اور نہایت ادب و احترام سے باری باری پینے لگے۔ اس کے بعد آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسے دیے اور باہر نکل گئے۔

آپ اپنے اوپری حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ بہت ملول تھے۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے اور خدا سے کہہ رہے تھے۔ ”خدا یا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ عید کا دن ہے، دنیا خوش و خرم ہے اور میرے گھر میں بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ تو کئی وقتوں کے بھوکے ہیں، ان پر رحم فرما! خدا یا! میرے لیے یہ کیسی شرمناک بات ہے کہ مہمان آئیں اور نامراد واپس جائیں۔“

آپ انہی خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آپ نے زینے پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ محسوس کی۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا شخص ان کے سامنے آکھڑا ہوا، آپ نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ کون ہیں؟ آپ کی تعریف؟“  
اس بوڑھے نے ایک شعر پڑھا۔

بادل گفت مرا خضر را بنی  
دل گفت اگر مرا نماید بینم

(میں نے اپنے دل سے کہا کیا تو خضر کو دیکھتا ہے؟ دل نے جواب دیا اگر وہ مجھے دکھائی دیں تو ضرور دیکھوں)  
آپ نے فرمایا۔ ”آپ کا تعارف تو ابھی باقی ہے۔“

بزرگ نے پوچھا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے آپ زیر لب کس کا شکوہ کر رہے تھے؟“  
آپ نے جواب دیا۔ ”میں شکوہ کسی کا بھی نہیں کر رہا تھا، میں اپنے رب سے یہ کہہ رہا تھا کہ آج عید کے دن بھی میرے بچے بھوکے ہیں اور مہمان نامراد واپس جا رہے ہیں۔“  
بزرگ نے فرمایا۔ ”متوکل! عرش پر فرشتے آپ کے توکل کی تعریفیں کر رہے ہیں اور آپ دنیا داری میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے، میں دنیا داری کی باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ دوستوں کی ضروریات نے مجھ کو اس طرف مائل کر دیا۔“  
اتنے میں آپ کسی ضرورت سے نیچے تشریف لے گئے۔ وہاں صحن میں کھانے کا خوان رکھا ہوا دیکھا۔ آپ نے بیوی سے پوچھا۔ ”یہ کون لایا؟“

بیوی نے لاعلمی ظاہر کی۔ ”مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں غیر مردوں کے سامنے نہیں جاتی۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا تم آج صبح سے باہر نہیں نکلیں؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں آج صبح سے باہر نہیں نکلی۔“

آپ دوبارہ اوپر تشریف لے گئے تاکہ ان بزرگ سے پوچھیں کہ کہیں آپ تو یہ خوان نہیں لائے۔

اوپر پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بزرگ کا کہیں پتا نہ تھا، انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ یہ بزرگ نیچے بھی نہیں اترے، پھر یہ کہاں اور کدھر سے چلے گئے؟

کچھ دیر بعد انہوں نے کسی کی آواز سنی، کوئی سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ ”متوکل! کیا تم نے خضر کو نہیں پہچانا؟“

آپ نے زیر لب فرمایا۔ ”تو یہ تھے خواجہ خضر۔ خوب!“

☆☆☆

آپ کے ایک بھائی بدایوں میں رہتے تھے۔ آپ ہر سال ان سے ملنے کے لیے بدایوں جایا کرتے تھے۔ بدایوں میں قیام کے دوران دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چلو آج شیخ علی سے ملاقات کریں۔



شیخ علی ایک بزرگ تھے اور ان کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ دونوں بھائی جب ان بزرگ کی صحبت میں پہنچے تو کچھ خالی فرش پر چلے اور اس کے بعد وہاں بچھے ہوئے بورے پر پاؤں رکھ دیے۔ شیخ علی داویلا چپانے لگے، بولے۔ ”تم دونوں نے یہ کیا غنیمت کر دیا۔ یہ بوریا نہیں مصلیٰ ہے۔“

دونوں بھائیوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور ذرا سے کھسک گئے۔ وہاں مصلے پر ایک کتاب بھی رکھی تھی۔ آپ نے شیخ علی سے پوچھا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو پڑھ لوں؟“ شیخ علی نے جواب دیا۔ ”تمہیں روکا کس نے ہے، پڑھ لو۔“ آپ نے جیسے ہی کتاب کو کھولا، اس میں نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا۔

”ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ اس دور کے مشائخ شہائی میں تو گناہ کریں گے اور جب یہ لوگوں کے سامنے ہوں گے تو اگر ان کے سامنے کوئی بورے پر اپنا پاؤں رکھ دے گا تو یہ قیامت کھڑی کر دیں گے۔“ شیخ علی نے پوچھا۔ ”شیخ کیا پڑھ رہے ہو؟“

انہوں نے کتاب کا مذکورہ صفحہ ان کے سامنے کر دیا، فرمایا۔ ”پڑھ لیجئے، کچھ آپ ہی کی بابت لکھا گیا ہے۔“ شیخ علی نے وہ حصہ پڑھا تو شرم سے زمین میں گڑ گئے، بولے۔ ”شیخ! میں نادم ہوں، مجھے معاف کر دو۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں نے معاف کیا، میری دعا ہے کہ میرا خدا بھی معاف کرے۔“

ایک روز آپ اپنے مریدوں سے فرما رہے تھے۔ ”لوگو! جب دنیا تمہارے پاس آئے تو خوب خرچ کرو کیونکہ ایسا کرنے سے کمی نہیں آئے گی اور اگر یہ چلی جائے تو اس کا غم نہ کرو اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو کیونکہ یہ پائیدار نہیں ہوتی۔“

آپ اپنے بھائی بابا فرید منج شکر کی صحبت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، دوران گفتگو پوچھا۔ ”بھائی! میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ آپ جب مناجات میں ’یارب‘ کہتے ہیں تو آپ کو اس کا جواب ’لیک یا عبدی‘ (اے میرے بندے میں حاضر ہوں) ملتا ہے۔“

بابا فرید نے فرمایا۔ ”نہیں۔“ پھر قدرے تامل کے بعد فرمایا۔ ”الار جاف مقدمہ الکون (لوگوں کی زبان پر کسی بات کا مشہور ہو جانا اس چیز کے ہو جانے کا مقدمہ) واقعہ ہے۔“ آپ نے نہایت معصومیت سے ایک سوال اور کیا۔ ”بھائی! میں نے لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ حضرت خضر آپ کے پاس تشریف لاتے ہیں؟“

بابا فرید نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“ آپ نے مزید سوال کیا۔ ”لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ابدال آپ کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔“ بابا فرید نے جواب دیا۔ ”یہ درست ہے کیونکہ تم ابدال ہو۔“

نجیب الدین نے اپنا سر جھکا دیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

☆☆☆

غیاث پور کے نزدیک اندر پت میں بی بی فاطمہ سام نامی ایک بزرگ خاتون رہتی تھیں۔ یہ نجیب الدین متوکل کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ ان کی ایک کنیز تھی۔ وہ محنت مزدوری کر کے بی بی فاطمہ سام کا خرچہ پورا کرتی تھی۔

نجیب الدین متوکل کا حال غیر تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہو رہا تھا۔ بظاہر فاقہ ٹوٹنے کا کوئی امکان بھی نظر نہ آتا تھا۔ صابر و شاکر بیوی اور بچے خاموش اللہ پر توکل کیے ہوئے تھے۔ آپ اپنے بالائی حجرے میں اللہ پر توکل کیے سجدے میں پڑے تھے۔

اتنے میں ایک مرید آیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے تاکہ میں کسی کام آؤں۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں چپ رہوں گا کیونکہ میرا جو حال ہے اس سے میرا رب آگاہ ہے اور میرے رب نے میری بہن بی بی فاطمہ سام کو بھی اس سے آگاہ کر دیا ہے۔“

مرید نے تعجب سے کہا۔ ”لیکن پیر و مرشد ابی بی فاطمہ سام تو یہاں سے دور رہتی ہیں۔ انہیں آپ کا حال کیا معلوم؟“ آپ نے فرمایا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ اللہ کے بعد بی بی فاطمہ سام ہی میرے حال سے باخبر ہیں۔“



شیخ نجیب الدین متوکل  
مرید کو پھر بھی یقین نہ آیا، بولا۔ ”آپ فرماتے ہیں تو میں مانے لیتا ہوں ورنہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“  
ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ کسی شخص نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے مرید سے فرمایا۔ ”دیکھ بی بی فاطمہ سام کا پیغام آ گیا۔“

مرید باہر گیا تو دیکھا، دروازے پر ایک شخص کھانے پینے کا وافر سامان لیے کھڑا ہے۔ اس نے کہا۔ ”پیر و مرشد سے کہہ دو کہ ان کی بہن بی بی فاطمہ سام نے انہیں یہ سامان بھیجا ہے کیونکہ انہیں اپنے کشف سے معلوم ہوا ہے کہ ان کے بھائی اور بیوی بچے بہت پریشان ہیں اور یہ سارا کچھ حلال کی کمائی کا ہے۔“

جب یہ سامان آپ کو ملا تو آپ نے مرید سے کہا۔ ”تو نے میری بہن کے کشف کا حال دیکھا اور سنا۔“ اس کے بعد فرمایا۔ ”لوگو! میرے فقر کا حال اس نیک خاتون پر جس طرح عیاں اور روشن ہے اگر خلیفہ وقت پر اپنی رعایا کا حال اس طرح روشن اور عیاں ہو جائے تو اندرونِ حدودِ خلافت کوئی تنگا بھوکا نہ رہے۔“

ایک دن آپ اندر پت تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا وہ مصلے پر سر بسجود تھیں اور ان کے سامنے دو روٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ بی بی فاطمہ کی کنیز ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔ ”بی بی! یہ کیا معاملہ ہے؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”کیا عرض کروں، معلوم نہیں بی بی میں کون سی قوت ہے جو غذا کے بغیر بھی انہیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میں ہر روز دو روٹیاں اسی طرح سامنے رکھ دیتی ہوں۔ یہ دن بھر روزہ رکھتی ہیں۔ شام کو دو لقموں سے روزہ افطار کرتی ہیں اور بقیہ روٹیاں کسی بھوکے کو دے دیتی ہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“  
کنیز نے جواب دیا۔ ”کئی ماہ سے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میری بہن رابعہؓ دوراں ہے، اس عہد کی رابعہ بھری۔“  
کافی دیر بعد جب بی بی فاطمہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو بے آواز بلند متوکل سے پوچھا۔ ”بھائی! آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں یہ کیا سن رہی ہوں؟“

متوکل نے جواب دیا۔ ”بہن! میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی، جس پر آپ فکر مند ہوں۔“  
بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”میں اور رابعہ بھری۔ اس پاک طینت اور جید ترین ہستی کا مجھ گناہ گار سے موازنہ اور مقابلہ کرتے ہیں۔ میں تو شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی ہوں۔“

شیخ متوکل نے جواب دیا۔ ”بہن! یہ آپ کا عجز و انکسار ہے جو آپ اس طرح باتیں کر رہی ہیں ورنہ ایک زمانہ آپ کے مرتبہ و مقام سے واقف ہے۔“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”بھائی متوکل! یہ غیر متوقع تشریف آوری کا مطلب؟“  
آپ نے جواب دیا۔ ”بہن! میرا دل گھبرایا تو چلا آیا۔ اندر دل ایک آواز کافی دنوں سے سن رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے، متوکل جا اپنی بہن سے ملاقات کر لے، پھر پتا نہیں کہ ملاقات ہو بھی یا نہ ہو۔“

بی بی فاطمہ نے ٹھنڈی سانس بھری، کہا۔ ”تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو بھائی متوکل! زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ اس کا انحصار دوسانوں پر ہے۔ ایک اندر جاتی ہے دوسری باہر آتی ہے۔ معلوم نہیں کب کوئی سانس بے وفائی کر جائے۔“  
شیخ متوکل نے کہا۔ ”میں کچھ عرصہ یہیں رہوں گا۔“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”کچھ عرصہ! ارے آپ پوری زندگی یہاں رہ سکتے ہیں۔“  
شیخ متوکل نے بات چیت کا سلسلہ بند کر دیا۔ بی بی فاطمہ بھی چپ ہو گئیں۔ رات کو کنیز سے کہا۔ ”کیا تو جانتی ہے کہ بھائی متوکل میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”بی بی جی! میں کیا جانوں؟“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”اگر نہیں جانتی تو کچھ دنوں بعد جان جائے گی۔“  
کنیز چپ ہو گئی۔ چند دنوں کے اندر ہی کنیز نے یہ بات محسوس کر لی کہ بی بی فاطمہ نے کھانا چھوڑ دیا ہے اور عبادت گزاری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ پوری پوری رات سر بسجود رہنے لگیں، وہ اس طرح گڑ گڑا کر الحاح و زاری کرتیں گویا وہ خدا سے مخاطب ہیں۔



رات کے پچھلے پہر آپ نے بی بی فاطمہ کی سسکیوں کی آواز سنی، وہ رو رہی تھیں اور اپنے رب سے کہہ رہی تھیں۔ ”اے اللہ العالمین! میری کنیز مجھ سے کہتی ہے کہ میں روئی کھاؤں اور پانی پیوں لیکن میں تیری جدائی سے پریشان ہوں۔ تو کب تک مجھے دور دور رکھے گا۔ کیا میں خوب کھاپی کر خود کو تندرست و توانا کر لوں اور جدائی کے لمحات کو طول دیتی رہوں۔ میں جسم کی قید سے عاجز ہوں، خودکشی نہیں کر سکتی، بس تجھ سے یہی درخواست کر سکتی ہوں کہ میری مشکل آسان کر دے۔“

اس خطرناک صورت حال میں بی بی فاطمہ نے چالیس دن گزار دیے۔ شیخ متوکل نے پوچھا۔ ”بی بی فاطمہ! کیا آپ دنیا سے اتنی ہی بیزار ہو چکی ہیں جو اس طرح اپنے خالق حقیقی سے ملنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”بھائی متوکل! اب میں یکسانیت اور تنہائی سے تنگ آ چکی ہوں۔ وہ جس کی مجھے تلاش ہے جسم کی قید میں موجود روح اس کو نہیں پاسکتی۔ پھر کیوں نہ زندگی کو داؤ پر لگا کر میں جیت کا مزہ حاصل کر لوں۔“

ادھر بات چیت بند ہوئی، ادھر بی بی فاطمہ نے ایک نورانی چہرہ انسان کو گھر کے صحن میں کھڑا دیکھا۔ آپ کو ذرا شرم سی آئی، پوچھا۔ ”اے شخص! تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بی بی فاطمہ! میں عزرائیل ہوں۔ آپ کی روح قبض کرنے آیا ہوں۔“

بی بی فاطمہ مسکرانے لگیں، بولیں۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ میرے اللہ نے میری سن لی۔ میں کس زبان سے اس کا شکریہ ادا کروں اور کس طرح ادا کروں؟“

عزرائیل نے کہا۔ ”بی بی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”میں آپ سے زیادہ وقت مانگوں گی بھی نہیں۔ میں ان آخری لمحات میں تجدید و وضو کرنا چاہتی ہوں۔ تجدید وضو کے بعد میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کروں گی۔ دو رکعت شکرانہ کے بعد دو رکعت مزید پڑھوں گی۔“

عزرائیل نے جواب دیا۔ ”آپ کو یہ وقت دیا گیا، میں انتظار کر لوں گا۔“

شیخ متوکل نے پوچھا۔ ”بھن! یہ تم کس سے باتیں کر رہی تھیں؟“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”خدا کے ایک بندے سے، جو نوری ہے اور جسے ہر ذی روح کے پاس جانا پڑتا ہے۔“

شیخ متوکل نے کہا۔ ”تو گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہاری دعا قبول ہو گئی۔“

بی بی فاطمہ نے وضو کیا اور دو رکعت شکرانہ ادا کرنے لگیں۔ نماز شکرانہ کے بعد دو رکعت مزید ادا کیں۔ جب آپ دوسری رکعت میں سجدے میں گئیں تو عزرائیل نے کہا۔ ”بی بی فاطمہ! میں نے آپ کی خواہش پوری کر دی تھی۔ اب میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔“

چنانچہ سجدے ہی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ کنیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنا فانیہ خبر پھیل گئی اور لوگ جمع ہونے لگے۔ جب جنازہ تیار ہو گیا تو لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ ان کی نماز جنازہ کون پڑھائے گا۔

اچانک شیخ متوکل اٹھے اور اعلان کیا۔ ”بی بی فاطمہ سام میری عزیز ترین بہن تھیں۔ اب اگر ان کی نماز جنازہ میں نہیں پڑھاؤں گا تو پھر کون پڑھائے گا۔“

شیخ متوکل نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے، لوگوں نے کہا۔ ”پیر و مرشد! کیا اس طرح رونا جائز ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں لیکن دل پر موجود غبار کو میں آنسوؤں ہی کے ذریعے بہا سکتا تھا۔“

جیمیز وٹکین کے بعد آپ نے بی بی فاطمہ کو خواب میں دیکھا، پوچھا۔ ”بھن! آپ کا کیا حال ہے؟“

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ”کم از کم میں تو بہت خوش ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ”ذرا ادھر میری طرف دیکھو۔“

شیخ متوکل نے اس طرف دیکھا تو پتا نہیں کیا دیکھا کہ دل پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ اس وقت بی بی فاطمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔

انہوں نے پوچھا۔ ”بھن! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد جواب دیا۔ ”بھائی متوکل! میں یہاں عرش پر نماز پڑھتی ہوں۔ خدا نے مجھ پر مہربانی



کی جو میں نے یہ مقام حاصل کر لیا۔  
آپ اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔

☆☆☆

نکلتش نامی ایک ترک آپ کی خدمت میں بہت پابندی سے آیا کرتا تھا۔ یہ شخص نہایت خوش عقیدہ، متقی اور صالح تھا۔ ایک دن اس شخص نے خواب میں دیکھا، اللہ تعالیٰ اس کے سامنے موجود ہے اور وہ اللہ سے باتیں کر رہا ہے۔ نکلتش کو اس خواب نے پریشان کر دیا، وہ شخص جس سے بھی یہ کہتا کہ اس نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، وہی نکلتش سے ناخوش، بلکہ برہم ہو جاتا۔ اس نے اپنا یہ خواب شیخ متوکل کے سامنے بیان کر دیا اور درخواست کی کہ جب تک میں زندہ ہوں، اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کیجیے گا۔ آپ نے وعدہ فرمایا۔ نکلتش چالیس سال زندہ رہا مگر آپ نے یہ خواب کسی کو بھی نہیں بتایا۔ جب اس کا آخری وقت آیا تو آپ اس کی عیادت کو گئے اور اس کا حال پوچھنے لگے۔ نکلتش نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد! میرا حال بہت اچھا ہے اور میں اس وقت بھی اپنے اندر ایک کیف محسوس کر رہا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”خدا تیری اس حالت کو برقرار رکھے۔“ نکلتش نے پوچھا۔ ”پیر و مرشد! میں نے چالیس سال پہلے ایک خواب دیکھا تھا، کیا آپ کو یاد ہے؟“ آپ نے فرمایا۔ ”خوب اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تو نے مجھ سے اس کا عہد لیا تھا کہ میں اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کروں۔“ نکلتش نے کہا۔ ”پیر و مرشد! اب میں اپنے خالق حقیقی کے پاس جا رہا ہوں لیکن میں نے جو خواب چالیس سال پہلے دیکھا تھا اس کی لذت اور اس کا سرور آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔“ اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا، آپ نے فرمایا۔ ”یہ دولت... کسی کسی خوش نصیب کو اچانک مل جاتی ہے۔ اللہ ہم سب پر کرم فرمائے، آمین۔“

آپ کے دو بیٹے تھے۔ آپ نے ایک کا نام احمد رکھا تھا اور دوسرے کا محمد۔ آپ ان دونوں ناموں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپ اپنے مریدوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے کہ کسی بات پر ان دونوں سے ناراض ہو گئے۔ آپ نے اسی وقت ان دونوں کو آواز دی۔ ”اے خواجہ احمد اور محمد!“ کسی مرید نے پوچھا۔ ”آپ ان دونوں سے بے حد ناراض ہیں مگر آواز اس طرح دے رہے ہیں گویا درمیان میں ادب اور تکلف آڑے آ رہا ہے۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”کیا تم ان دونوں کے ناموں میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کر رہے کہ جن کا ادب اور احترام کیا جائے؟ میں انہیں احمد اور محمد کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتا، اسی لیے لفظ خواجہ نام کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔“

☆☆☆

آپ دہلی سے اجودھن پاک بڑی پابندی سے جایا کرتے تھے۔ اجودھن پاک میں بابا فرید گنج شکر انہیں بڑی محبت اور شفقت سے رکھتے تھے۔

جب آپ پہلی بار اجودھن تشریف لے گئے تھے تو واپسی سے پہلے عرض کیا۔ ”بھائی! میں دہلی واپس جا رہا ہوں۔“ بابا فرید نے فرمایا۔ ”فی امان اللہ۔ اللہ تجھے حفظ و امان میں رکھے۔“ شیخ متوکل نے فرمایا۔ ”کیا آپ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تاکہ میں آپ سے پھر ملنے آؤں۔“ آپ نے فاتحہ پڑھی اور شیخ متوکل پر دم کیا، فرمایا۔ ”نجیب الدین! تم بے فکر ہو، تم اگلے سال پھر آؤ گے بلکہ بار بار آؤ گے۔“

آپ دہلی چلے گئے اور دوسرے سال پھر آئے۔ آپ نے اس بار پھر وہی درخواست کی۔ ”بھائی! کیا آپ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تاکہ میں اگلے سال پھر شرفِ ملاقات حاصل کروں۔“

بابا فرید نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، میری دعا ہے کہ تم بار بار اجودھن آؤ اور میں جانتا ہوں کہ تم اسی طرح آتے



جاتے رہو گے۔“

تیسری بار، چوتھی بار، پانچویں بار..... یہاں تک کہ شیخ متوکل نے بابا فرید کی خدمت میں انیس بار حاضریاں دیں۔  
وقت رخصت آپ بابا فرید کے سامنے مؤدب کھڑے ہو گئے۔

بابا فرید نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں دہلی جا رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ ایک بار پھر فاتحہ پڑھیں اور مجھ کو اگلے سال آنے کی خوش خبری سنائیں تاکہ میں بیسویں بار بھی شرفِ ملاقات کروں۔“

بابا فرید نے فرمایا۔ ”میں جو کچھ بھی کہتا ہوں بحکمِ ربی کہتا ہوں۔ اس بار میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔“  
شیخ متوکل نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

بابا فرید نے جواب دیا۔ ”طبیعت نہیں چاہ رہی۔“

شیخ متوکل نے کہا۔ ”کیا میں یوں ہی چلا جاؤں؟“

بابا فرید نے فرمایا۔ ”ہاں، تم یوں ہی چلے جاؤ۔“

شیخ متوکل کچھ دیر پس و پیش میں ڈوبے رہے پھر کہا۔ ”اچھا پھر یہی کہہ دیجئے کہ تم بار بار آؤ گے۔“

بابا فرید نے فرمایا۔ ”افسوس کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔“

شیخ متوکل بہت بے چین ہو رہے تھے، پوچھا۔ ”مگر بھائی کیوں؟ ایسا کیوں؟“

بابا فرید نے جواب دیا۔ ”خدا کے لیے ان باتوں کو طول نہ دو۔ میں مشیتِ ایزدی کے خلاف کوئی کام کس طرح کر سکتا ہوں۔“

شیخ متوکل اپنے گھر دہلی چلے گئے۔ اسی دوران حضرت محبوب الہی نظام الدین اولیاء اجدہن تشریف لے گئے، بابا فرید ان سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ ”بابا نظام! میں تمہیں سندِ خلافت دینا چاہتا ہوں۔“

محبوب الہی نے کہا۔ ”پیر و مرشد! یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں سندِ خلافت اور دستارِ خلافت حاصل کر لوں۔“  
چنانچہ انہوں نے محبوب الہی کو سندِ خلافت دی اور دستارِ خلافت سر پر باندھ دی اور آخر میں فرمایا۔ ”اب تو اگر دہلی جانا چاہے تو چلا جا، میری طرف سے اجازت ہے۔“

جب محبوب الہی دہلی جانے لگے تو بابا فرید نے فرمایا۔ ”دیکھو نظام الدین! یہ خلافت نامہ جو میں نے تمہیں عطا کیا ہے، راستے میں ہانسی پڑے گا۔ تم ہانسی میں حضرت مولانا جمال الدین ہانسوی کو میرا خلافت نامہ ضرور دکھا دینا۔ پھر جب تم دہلی میں داخل ہو جاؤ تو وہاں قاضی منتخب کے پاس چلے جانا اور میرا خلافت نامہ انہیں بھی دکھا دینا۔“  
محبوب الہی نے دہلی زبان میں پوچھا۔ ”اور پیر و مرشد! بابا متوکل کی بابت کیا ارشاد ہے۔ کیا انہیں یہ خلافت نامہ نہیں دکھانا ہے؟“

بابا فرید نے جواب دیا۔ ”وہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔ میں مشکل کام نہیں پتا تا۔“  
حضرت محبوب الہی ہانسی ہوتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے تو انہیں پہلی خبر یہ ملی کہ حضرت نجیب الدین متوکل کا 19 رمضان 671ھ کو انتقال ہو گیا۔

محبوب الہی آپ کے مزار پر تشریف لے گئے اور سر ہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔  
”میں نے اس شہر میں آپ جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ آپ کو کبھی بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آج دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے؟ آپ کو کبھی یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ غلہ کس بھاؤ بکتا ہے یا گوشت کا نرخ کیا ہے..... کیوں؟ صرف اس لیے کہ آپ ہر وقت یادِ الہی میں مستغرق رہتے تھے۔“  
دہلی میں آپ کا مزار شیخ نجیب الدین شیر سوار کے نام سے مشہور ہے۔

### ماخذات

سید الاولیاء، امیر خورد۔ سید العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث فوائد القواد، امیر حسن سنجر۔ گلزارِ ابرار، محمد غوث ماندوی۔ خیر المجالس، ملفوظات چراغ دہلی





## ڈھونگ

سلیم انور

یہ حقیقت ہے کہ قانون کہیں کا بھی ہواگر... اس کا نفاذ مکمل دیا ننداری سے کیا جائے تو معاشرے میں بہت نمایاں تبدیلی آتی ہے... معاشرہ افراد کے اجتماع کا نام ہے اور وہ بھی اسی معاشرے کی ایک کڑی تھا جس کا ہر فرد اپنی ذمہ داری کو بخیر خوبی نبھانا جانتا تھا اور اسی وجہ سے جب ڈراڈھونگ سے کام لیا تو اس مجرم کے چہرے پر بڑی نقاب بھی باسانی اتر گئی۔

مجرمانہ بساط پر قانون کی چالیں چلنے والے کچھ ذمہ دار افسران کا قصہ

پولیس کی بڑی سی اسپورٹ یوٹیلیٹی ویکل سبک رفتاری سے چلتی ہوئی گھوسٹ ٹاؤن سروس اسٹیشن کے ڈرائیو سے پر آ کر رک گئی۔ ایس یو وی کا ڈرائیور آفیسر ولبرٹ گاڑی سے نیچے اترتا تو اس کی مڈ بھیڑ سروس اسٹیشن کے مالک سے ہو گئی۔ کچھ دیر بعد آفیسر ولبرٹ پلٹ کر واپس گاڑی کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”اس کے خیال میں گاڑی کی ٹرانسمیشن میں کچھ خرابی ہے۔ اسے ٹھیک کرنے میں ایک دو دن لگ



جائیں گے۔ گاڑی کے ساتھ ہمیں بھی کچھ وقت کے لیے یہاں گھوسٹ ٹاؤن میں رکنا پڑے گا۔“

یہ اتوار کا دن تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کار میں سوار افسران کو گرمی کی شدت کا احساس نہیں تھا کیونکہ کار کا ایئر کنڈیشنر صحیح کام کر رہا تھا۔ کار سے باہر موجود آفیسر ولبرٹ .... اپنی پیشانی سے پسینا پونچھنے لگا۔ وہ کلین شیو اور دراز قامت آدمی تھا۔ اس نے گرے رنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر ویسٹرن اسٹائل کا ایک ہیٹ تھا۔

پولیس اسپورٹ یوٹیلیٹی ویکل کی عقبی نشست پر تین افراد موجود تھے۔ آفیسر جونسن اور آفیسر ٹرولر۔ ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا شخص زیویر بلی تھا جس کے چہرے پر افسردگی طاری تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”اس کا کیا کریں گے؟“ آفیسر جونسن نے اپنے قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جیل سڑک کے اس پار ہے۔ وہاں چل کر اس بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔“ آفیسر ولبرٹ نے جواب دیا۔

آفیسر جونسن اور آفیسر ٹرولر دونوں ہی نے پولیس کی مخصوص گرے رنگ کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ دونوں کی مونچھیں تھمتھمتھیں اور کم روشنی میں انہیں الگ الگ شناخت کرنا دشوار تھا۔ انہوں نے جھجے دار ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔

ان کا قیدی زیویر بلی جو کہ بوجہ بلی کے نام سے بھی شہرت رکھتا تھا، نیلے رنگ کی میلی پچیلی پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی۔

وہ چاروں افراد مین اسٹریٹ کر اس کر کے گھوسٹ ٹاؤن کے جیل کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر جیل کی تین کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جو خالی دکھائی دے رہی تھیں۔ دروازے کے قریب شاہ بلوط کی پائیدار لکڑی کی ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس میز پر ایک بھاری بھر کم شخص بیٹھا کاغذات پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا ایک سوٹ پہنا ہوا تھا جس کی رنگت مدھم پڑ چکی تھی۔ یہ سوٹ اس کے جسم پر چھوٹا لگ رہا تھا۔ اس کی جیکٹ کے اوپر ایک گن بیلٹ بندھا ہوا تھا جس کے ہولسٹر میں ایک ریوالتور نمایاں تھا۔

ان چاروں کی آمد پر اس شخص نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ویل؟“ اس کا سوال ان چاروں

میں سے کسی خاص سے نہیں تھا۔

”ہمیں اس شخص مسٹر بلی کو یہاں ٹھہرانے کے لیے

جگہ درکار ہے..... اتنے وقت کے لیے جب تک ہماری کار ٹھیک نہ ہو جائے۔“ آفیسر ولبرٹ نے کہا۔ کمرے میں چلنے والے ایئر کنڈیشنر کے شور میں اس کی آواز دب سی گئی تھی۔

”ہم اسے صحرا کے پار ویلینچیا لے جا رہے ہیں اور راستے میں کار کے خراب ہونے کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ کیا تم اسے..... عارضی طور پر یہاں ٹھہرا سکتے ہو؟“

بھاری بھر کم شخص نے قیدی زیویر بلی کا سر تاپا چاڑھ لیا اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اوہ اس شخص کو..... ہاں، میں یہ کر سکتا ہوں۔“

پھر بغیر کسی تردد کے اس نے فوری طور پر اپنے ہولسٹر میں سے اینٹار یوالتور نکالا اور پولیس افسران پر تانتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص کی بیڑیاں کھول دو۔“ بوجہ تحکمانہ تھا۔ ”تم سب اپنے ہتھیار میز پر رکھ دو اور اندر کال کوٹھریوں میں چلے جاؤ۔“

یہ سن کر پولیس افسران حیرت زدہ رہ گئے لیکن اب ان کے پاس حکم بجالانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بھاری بھر کم شخص نے تینوں پولیس افسران کو کوٹھریوں میں بند کرنے کے بعد ان کے دروازوں پر تالے ڈال دیے۔

قیدی زیویر بلی مبہوت کھڑا تھا۔ حالات کے اس طرح پلٹا کھانے پر وہ سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔

”میں میسر ایڈم گورڈن ہو۔“ بھاری بھر کم شخص نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور چیف آف پولیس بھی۔“

یہاں گھوسٹ ٹاؤن میں میرا ہی قانون چلتا ہے۔“ وہ بھاری بھر کم ہونے کے ساتھ ساتھ لمبا چوڑا اور

کمرے میں موجود تمام افراد پر حاوی دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس شخص نے اپنی توجہ قیدی زیویر بلی کی جانب مبذول کر لی۔ ”جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اخبارات میں تمہارے

جارحانہ انداز اور آپے سے باہر ہونے کے بارے میں سب کچھ پڑھا ہوا ہے اور تمہاری باتدبیری اور حاضر دماغی کے حوالے سے میں کسی حد تک تمہاری قدر بھی کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک قاتل ہو لیکن مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ انصاف کے سلسلے میں جلد بازی سے کام لیا گیا ہے۔

اس ملک میں ہر کوئی بے گناہ اور معصوم ہے تاوقت کہ جرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس سے قبل کہ یہ منخرے تم سے نمٹنے کے لیے تمہیں صحرا پار لے جائیں، میں تمہیں آزادی کے



آخری چند کھٹے دے رہا ہوں۔“

زیو یو بیلی ابھی تک حیران کھڑا تھا۔

”میرے لیے تم صرف اور صرف بوجہ بنی ہو۔“

ایڈم گورڈن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس ٹاؤن میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو تمہاری طرف ہیں۔ تمہیں ان کی رفاقت میں لطف اندوز ہونے کا چانس مل رہا ہے۔ ہم تمہیں کھلائیں گے، پلائیں گے، تمہیں تفریح فراہم کریں گے اور گھوسٹ ٹاؤن سیلون کی دوسری منزل کے لکڑی کوارٹرز میں رہائش دیں گے لیکن یہ خیال مت کرنا کہ تمہیں بھاگ نکلنے کا کوئی موقع ملے گا۔ ہمارے پاس یہاں اچھے شہریوں کی ایک سوچوراسی آنکھیں ہیں جو تمہاری ہر ایک حرکت پر نظر رکھے رہیں گی۔ یہ تمام شہری مہمان نواز ہیں اور تمہاری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے لیکن ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں اور وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان ہتھیاروں کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے باوجود بھی اگر تم نے ان پرانی کھٹارا کاروں میں جو لوگ اس ٹاؤن میں چلاتے ہیں، صحرا عبور کرنے کی کوشش کی تو تم صحرا کی تیش میں جل بھن کر رہ جاؤ گے اور یوں تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس دروازے سے باہر واقع صحرا کے مقابلے میں ڈیڑھ ویلی، نوم الاسکا کے مانند محسوس ہوگی۔“

گھوسٹ ٹاؤن میں ہر قسم کا ضروری کاروبار موجود تھا، ایک ریسٹورنٹ، بیوٹی پارلر، بار برشاپ حتیٰ کہ اخبار بھی!

ریسٹورنٹ میں اسٹیک سے لطف اندوز ہونے کے بعد زیو یو بیلی نے رات سرائے کی اوپری منزل پر واقع کمرے میں بڑے اطمینان سے گزاری۔ وہ رات بھر بے فکر سوتا رہا۔

پیر کی صبح اس نے ناشتے سے پہلے چل پھر کر ٹاؤن کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ میئر ایڈم گورڈن نے فرار کی کوشش کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ سچ تھا۔ لہذا اس نے خود کو ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار کر لیا تھا کہ وہ اس ٹاؤن کے باشندوں کو پس اپنے رویتے سے متاثر کرنے کی کوشش کرے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکے گا، اپنی اس نئی آزادی سے بھرپور لطف اٹھائے گا اور کیا پتا حالات کچھ اس طرح پلٹا کھا جائیں کہ اسے یہاں سے فرار ہونے کا موقع بھی مل جائے۔ یہ خیال بھی اسے حوصلہ دے رہا تھا۔

وہ بار برشاپ میں داخل ہو گیا۔ عمر رسیدہ پستہ قد باربر تیزی سے اس کی جانب آیا اور ہمدردانہ لہجے میں

## رانگ نمبر

ایک شخص نے تھیر والوں کو فون کیا کہ اسے دو افراد کے لیے بکس چاہیے۔

فوراً جواب ملا۔ ”معاف کیجیے جناب ہم دو افراد کے لیے مشترکہ بکس کا انتظام نہیں کر سکتے۔“

”عجب بات ہے! کیا آپ گلوب تھیر سے بول رہے ہیں؟“

”نہیں جناب یہ تو تابوت ساز کمپنی کا دفتر ہے۔“

## ڈس مس

ماسٹر لڑکوں کو سمجھا رہا تھا۔ جب میں ”ڈس۔ مس“ کہوں تو تمام لڑکے بھاگ جائیں۔ ابھی ماسٹر نے صرف ڈس ہی کہا تھا تمام لڑکے بھاگ گئے صرف ایک لڑکا وہیں کھڑا رہا۔

ماسٹر نے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔“ لڑکے نے بڑی محسوسیت سے جواب دیا۔

”جناب میں آپ کی مس کا انتظار کر رہا ہوں۔“

## ازدواجیات

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”دیکھو تم ہمیشہ کتنے اداس اور پریشان رہتے ہو۔ اس بلبل کو دیکھو ہمیشہ خوش رہتی ہے۔“ شوہر نے کہا۔

”وہ اس لیے خوش رہتی ہے کہ اس کی شادی نہیں ہوئی اس پر کوئی قرضہ نہیں۔ اسے کام کرنے کے لیے دفتر نہیں جانا پڑتا اور نہ ہی اس کے دانتوں میں درد ہوتا ہے۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

## سردار جی

سردار ہوٹل میں سوپ پی رہا تھا۔ کسی نے کہا۔ ”سردار جی سوپ میں مکھی ہے۔“

سردار۔ ”اوئے کا کے دل بڑا ہونا چاہیے۔ مکھی کونسا سارا سوپ پی جائے گی۔“

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں



مخاطب ہوا۔ ”سٹریٹ بلی، سر آپ یقین نہیں کر سکتے کہ ہم آپ کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں۔ اب تک کے تمام کلاسک قانون شکنوں میں آپ سب سے زیادہ تخلیقی صلاحیت کے حامل ہیں۔ ہمیں اسی پر عمل کرنا ہے جیسا کہ میٹر ایڈم گورڈن نے کہا ہے لیکن یقین کریں اگر ہمیں آپ کو فرار کرانے کا موقع ملا تو ہم آپ کو ضرور فرار کرادیں گے۔“

”میں اس کے لیے ممنون ہوں۔“ بلی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ برابر میں واقع بیوٹی پارلر کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس نے کھڑکی سے اندر نگاہ ڈالی۔ اسے اندر خواتین کا رش دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ بلی کو دیکھ کر وہ خواتین پر جوش انداز میں ہاتھ لہرانے لگیں۔

جواب میں بلی نے بھی ہاتھ ہلا کر خیر سگالی کا جواب دیا پھر وہ سوچنے لگا کہ آیا وہ کچھ دیر بعد پلٹ کر دوبارہ یہاں آجائے۔ ہو سکتا ہے وقت گزاری کے لیے کوئی خاتون اس کا ساتھ دینے اور تھوڑا سا معاشرے لڑانے پر رضامند ہو جائے۔

گھوسٹ ٹاؤن ڈائننگ سڑک کے آخر میں واقع تھا۔ بلی کو اب بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ڈائننگ کے شیشے کے وزنی دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اس کے کانوں میں جو آواز سب سے پہلے پڑی، وہ تالیوں کی تھی جو ہر طرف سے بج رہی تھیں۔ کسی نے پہلے تالی بجائی تھی پھر دیگر اس کے ہم تال ہو گئے۔

میزبان سنہری زلفوں والی ایک نوجوان عورت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بلی کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ ایک بوتھ میں لے گئی۔ وہ میز پر اس کے مقابل بیٹھ گئی اور اونچی آواز میں بولی۔ ”میں تمہیں اپنا کہنے کا دعویٰ کر رہی ہوں۔“ پھر گھوم کر کک کو پکارنے لگی۔ ”مینولا نے کی زحمت مت کرنا، نکلسن! میرے اور زیویئر کے لیے جو کچھ بھی دستیاب ہے وہ لے آؤ۔“

زیویئر بلی شپٹایا ہوا تھا۔ اس عورت نے کہا۔ ”تم برا تو نہیں مانو گے اگر میں تمہیں تمہارے اولین نام سے پکاروں..... کیوں؟“

زیویئر بلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں!“

زیویئر بلی شدت جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اسے اس درجہ توجہ کی توقع بالکل بھی نہیں تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے اور اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دے۔

تھوڑی دیر میں نکلسن نے ان کی میز کھانوں سے سجادہ کی۔ کھانا کھانے کے دوران وہ عورت بولی۔ ”میرا نام کلارا ہے۔ اس قصبے کے کچھ لوگوں کو یقین نہیں ہے کہ ہارلینڈ کا کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حاضر دماغی اور باتدبیری کی تمہاری شہرت بلا جواز ہے لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری طرف ہوں۔ ہارلینڈ میں موجود ان پانچوں کا گروپ غالباً اس بات کا حق دار تھا جو کچھ ان کے ساتھ ہوا لیکن ملک کی بیشتر پولیس اور بے شمار اخبارات نے کھلے بندوں یہ واویلا مچا دیا کہ تمہیں گرفتار کیا جائے اور فی الفور انصاف کا فیصلہ کیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے یہاں میٹر ایڈم گورڈن جیسا شخص موجود ہے جو کہ روایت کا مخالف ہے اور اس نے تمہارے ساتھ عزت و احترام کا وہی برتاؤ کیا ہے جس کے تم مستحق ہو۔“

”میں فطری طور پر جھوٹا نہیں ہوں، کلارا۔“ زیویئر بلی نے کہا۔ ”میرے وکیل نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مطمئن اور پرسکون رہوں۔ اس بات سے مجھے دکھ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ میرے بارے میں وہ احساسات رکھتے ہیں جیسا کہ تم نے کہا ہے لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ ہارلینڈ کے اخبار والے نے جو کچھ اندازہ لگایا تھا کہ کیا ہوا ہوگا، وہ کم و بیش درست تھا۔ اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ میں نہیں تھا تو یہ ان کا مسئلہ ہے۔ میں مختلف باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”تم نے بہت خوب صورت بات کہی ہے، زیویئر۔“ کلارا نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”سنو، میرے پاس ایک عمدہ جگہ ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں زیادہ شور شرابا اور کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہم کچھ دیر بعد وہاں جا سکتے ہیں تاکہ کچھ میٹھا ہو جائے اور تم بھی اس بارے میں وضاحت کر سکتے ہو کہ یہ کیسے کیا گیا اور یقیناً کسی قسم کے اعتراف کے بغیر۔ پھر میں تمہیں ایک الوداعی تحفہ دوں گی جو تم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکو گے۔“

”وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ زیویئر بلی نے پوری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بے ساختہ جواب دیا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ صرف تم اور تم ہو جو مجھے سمجھ سکی ہو۔ یہ اندازہ کوئی بے حد ذہین ہی لگا سکتا ہے کہ ان تمام لوگوں کو ایک وقت میں ایک جگہ کس طرح اکٹھا کیا گیا ہوگا۔ وہ تمام کے تمام نجوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اخبار کے بندے نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ ان لوگوں کو ایک جعلی پڑھنے کا مواد بھیجا گیا



تھا جس کی وجہ سے وہ سب ایک مقام پر ایک ہی وقت میں یکجا ہو گئے تھے۔ پھر باقی سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا۔  
 ”تو پھر وہ واقعی تم تھے؟“ کلارا نے حیرانی سے کہا۔  
 ”ہاں، وہ میں ہی تھا۔ میں تمہیں یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم سچ کچھ کھری ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں تم پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے پاس کوئی کیمرا نہیں دیکھ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔ ”اور تم نے ریکارڈ کرنے والے کسی آلے کا تار بھی نہیں پہنا ہوا ہے۔ ہے نا؟ جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو میں خود ذاتی طور پر اسے تمہارے جسم پر تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جو گھامڑا باہر موجود ہیں ان کو بتا دینا کہ تم جانتی ہو وہ سب کچھ میں نے ہی کیا تھا۔ لیکن یہ مست بتانا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے۔ وہ اگر یہی خیال کرنا چاہتے ہیں کہ میں ذہنی طور پر تیز ہوں تو ٹھیک ہے اور سچ بھی یہی ہے۔ اب میں کھانے سے فارغ ہو چکا ہوں۔ تمہاری رہائش گاہ پر چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ہاں، میں بھی تیار ہوں، زیویئر..... لیکن تھوڑی دیر میں چلیں گے۔ مجھے اچانک سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔ فرض کرو کہ اگر ہم ایک گھنٹے بعد دوبارہ یہیں پر ملیں تو کیا رہے گا... ہئی؟ کیا یہ ٹھیک ہے؟“ کلارا نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔  
 زیویئر نیلی کو یہ سن کر مایوسی ہوئی۔  
 ”او کے!“ اس نے بادل ناخواستہ ہامی بھر لی۔  
 پھر وہ ڈاسٹر سے باہر نکل آیا اور بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ایک گھنٹا گزارنے میں اسے ایک سال بیت جائے گا۔  
 ایک گھنٹے بعد جب زیویئر نیلی واپس ڈاسٹر پہنچا تو وہاں باہر خاصی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ درجنوں مرد اور عورتیں مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ وہ چھوٹے بڑے کئی ٹرکوں میں سامان لا رہے تھے۔ کچھ گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو رہی تھیں۔

جو پولیس افسران اسے اس گھوسٹ ٹاؤن میں لائے تھے، وہ جیل سے باہر سڑک پر ایڈم گورڈن کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے۔ زیویئر نیلی کو کلارا کہیں دکھائی نہیں دی۔

جب آفیسر ولبرٹ کی نگاہ زیویئر نیلی پر پڑی تو وہ اپنا ریوالتور تانے زیویئر کے پاس چلا آیا۔ اسی اثنا میں آفیسر جونسن اور آفیسر ٹرولر بھی ان کے پاس آگئے اور انہوں نے

نورانی نیلی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔  
 ”ہم چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔“ آفیسر ولبرٹ نے کہا۔

زیویئر نیلی مبہوت کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا کھیل تماشا ہے۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ہم اس گھوسٹ ٹاؤن کو واپس ویران بستی بنانے جارہے ہیں۔“ آفیسر ولبرٹ نے بتایا۔ ”جو تمام لوگ تم یہاں دیکھ رہے ہو وہ پولیس فورس کے آدمی ہیں۔ اس ویران بستی میں گزشتہ پچاس سال سے کوئی گہما گہما، کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر آباد بستی تھی۔ اب جبکہ تم نے ہارلینڈ میں ہونے والی انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ قتل و غارت گری کرنے کا اعتراف کر لیا ہے تو ہم اس بستی کی ویران حیثیت کو دوبارہ بحال کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد یہاں مکمل سناٹا ہوگا اور کوئی ذی روح یہاں دکھائی نہیں دے گا۔ البتہ تمہاری حیثیت اب ایک مووی اسٹار کی سی ہوگئی ہے۔ تم اس فلم کے مرکزی کردار اور ہیرو ہو جو تمہارے مقدمے کے دوران جیوری کو دکھائی جائے گی۔ وہ لوگ تمہارے اس جیلے پر خاص طور پر دلچسپی لیں گے..... ہاں، وہ میں ہی تھا۔“

زیویئر نیلی یہ سن کر سناٹے میں آگیا۔ اس پر کچھ دیر کے لیے سکتے کی سی کیفیت طاری رہی پھر وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”تو یہ سب ڈھونگ مجھ سے اعتراف جرم کرانے کے لیے رچایا گیا تھا؟“

آفیسر ولبرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 ”اور کلارا؟“

”اوہ، تمہارا مطلب آفیسر کلارا ویلز سے ہے! ہاں وہ بھی اس ڈھونگ کی ایک کردار تھی۔ ایک جیتا جاگتا کردار!“  
 زیویئر نیلی بھونچکا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کلارا اسے دھوکا دے سکتی ہے۔ وہ اسے حقیقت میں اچھی لگی تھی۔ جیسی تو اس نے اس پر اعتبار کرتے ہوئے سب کچھ سچ اگل دیا تھا۔ اس کے دل کو ایک ٹھیس پہنچی تھی اور وہ رنجیدہ ہو گیا تھا۔

”بائی داوے آفیسر کلارا نے تمہارے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق وقت پر نہ آنے پر معذرت خواہ ہے کیونکہ اس کے سر کا درد اب بھی باقی ہے۔“



# Downloaded From Paksociety.com

معاشرتی رشتوں اور قانونی اداروں کے مابین زخمی مسافتوں کی پراثر داستان

اسرار  
خیال

کاشف زبیر

جب سر پر کوئی سایا نہ ہو اور راہ میں کوئی چھایا نہ ملے... دل دھڑکتا تو پولیکن اس میں کوئی گیت نہ ملے... آنکھیں منظر دیکھ رہی ہوں مگر منظر میں کوئی رنگ نہ ہو... پیروں میں مسافت بچھی ہو لیکن منزل کا کچھ پتا نہ ہو... ایسے میں اگر کوئی انسان ہمت کرے اور آنکھوں میں کوئی خواب سجالے تو اس کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے۔ کہتے ہیں جب انسان پیدا ہوتا ہے تو بالکل کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ وہی کورا کاغذ پلٹ کر دیکھو تو تقدیر کا پورا قصہ اس پر درج ہوتا ہے۔ وہ بھی اکثر تنہائیوں میں یہی سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا تقدیر میں پہلے سے رقم تھا یا بعد میں زندگی نے خود کہانی ترتیب دے ڈالی۔ جو بھی تھا زندگی کا منظر نامہ اسے قدم قدم پر چونکا رہا تھا۔ زندگی کے نشیبوں سے لڑھکتے لڑھکتے جب وہ موت کی آغوش میں پہنچا تو اسی تقدیر نے اپنی دشمنی ختم کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اب جانے یہ ستم تھا یا کرم کہ قیمتی متاع چھین کر قسمت نے اس کی جھولی میں چند سچی محبتوں کی سوغات ڈال دی تھی۔ اگرچہ اسے اب ان کی نہ ضرورت تھی، نہ ہی پہچان... تو قدر کیسے کر لیتا۔ وہ تو شب و روز کی تلخیوں میں خزاں رسیدہ چاہتوں کا غم منا رہا تھا۔ ایسے میں صحرا کے آسمان پر تاروں کے جھرمٹ سے ایک تارہ جیب اس پر مہربان ہوا تو جیسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کی روح تک کو سرشار کر گیا۔

اگست 2016ء

248

سپینس ڈائجسٹ



قیصر جمال اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ صحن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ مختلف پھول دار بلیس لگی تھیں اور ان پر کھلے پھول ال کر سحر انگیز خوشبو بکھیر رہے تھے جبکہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے اوپری پتھجے پر





چھ سال کی عمر میں اسے سرکاری اسکول میں داخل کر دیا گیا جبکہ اس کے کزن پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ وہ اس پر بھی خوش تھا کہ اسکول جائے گا۔ اسکول میں اس کا جو وقت گزرتا وہی اس کے لیے سب سے اچھا وقت ہوتا۔ بے شک اسکول سرکاری تھا اور وہاں اساتذہ اور بچوں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا مگر وہ غیر تھے۔ اگر اس سے برا سلوک کرتے یا اسے نظر انداز کرتے تو اسے اتنا برا نہیں لگتا تھا۔ اسکول سے گھر آنے کے بعد رات سونے تک اس کا ایک ایک لمحہ مصروف گزرتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اسی لحاظ سے اس پر بوجھ بھی بڑھتا رہا۔ خاص طور سے دادا، دادی کا ہر کام اس کی ذمہ داری تھی اور وہ خوشی سے یہ ذمہ داری اٹھاتا۔

اگرچہ ان کے انداز میں قیصر کے لیے رکھائی ہوتی تھی مگر حقارت نہیں ہوتی تھی۔ جو گھر کے دوسرے افراد کے انداز میں واضح دکھائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ حیران ہوتا کہ وہ ایک متوسط طبقے کے گھر میں رہتا تھا یہاں سہولتیں تھیں مگر آسائشیں نہیں تھیں۔ دس سال کی عمر میں اسے الگ کھانا دینا شروع کر دیا گیا تھا مگر اب یہ ہوتا کہ دونوں چچا، چچیاں اور ان کے بچے تو ایک جگہ کھاتے تھے۔ دادا اور دادی کو ان کے کمرے میں کھانا دیا جاتا تھا اور یہ ذمہ داری قیصر کی تھی۔ جب گھر کے تمام لوگ کھا چکے ہوتے تو وہ کچن میں بیٹھ کر کھاتا اور اس کے بعد تمام کچن صاف کرنا بھی اس کے ذمہ تھا۔ پکانے اور برتن دھونے کے کام چچیاں کرتی تھیں۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی۔ جب وہ رات سونے کے لیے لیٹا تو تھک کر چور ہو چکا ہوتا تھا۔

اس دو منزلہ گھر میں اوپر والا پورشن پہلے قیصر کے ماں باپ اور چھوٹے چچا کے پاس تھا لیکن جب قیصر اکیلا رہ گیا تو بڑے چچا نے اس پورے پورشن پر قبضہ کر لیا کہ ان کی فیملی بڑی تھی اور چھوٹے چچا جو پہلے ہی للچا رہے تھے مجبوراً نیچے آ گئے۔ حالانکہ یہ پورشن بڑا تھا اور اس میں بھی انہیں اتنے ہی کمرے ملے جتنے کہ اوپر تھے۔ اصل بات آزادی کی تھی۔ نیچے ساس سر کے ساتھ رہنا پڑتا تھا اور ان کی آزادی میں خلل پڑتا تھا۔ کچن اگرچہ مشترک تھا مگر اوپر رہنے والے باقی معاملات میں آزاد تھے۔ ننھے قیصر کو دادا دادی کے کمرے میں جگہ ملی اور وہ فرش پر اپنا بستر بچھا کر سوتا تھا۔ پھر یہی جگہ اس کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ وہ بڑا ہوتا چلا گیا مگر اس کے لیے ایک سنگل بیڈ تک نہیں آیا۔ وہ گیارہ سال کا ہوا تو پہلے دادی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ دادی کے

چڑھی بوگن ویلیا کی بیل الگ ہی تاڑ دے رہی تھی۔ اس کے سامنے پلاسٹک کی گول میز اور کرسیاں تھیں۔ چھٹی کے دن اور گرمیوں میں جب دن لمبے ہوتے ہیں اور وہ دفتر سے جلدی آ جاتا تو وہ ہمارے ساتھ ہی شام کی چائے پیتا تھا۔ اس وقت روما اگر گھر میں ہوتی تو ان کے آس پاس کھیل رہی ہوتی تھی۔ سات سال کی روما اس کے اور ہمارے گھر کی رونق تھی۔ اگر یہ گھر جنت تھا تو وہ اس کی حور تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب تک ہمارا کچن سمیٹی اور اس کے اور اپنے لیے الاٹھی والا قبوہ تیار کرتی، وہ اس چھوٹے سے کچن میں ٹہکتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس نے اسے یہ چھوٹا سا گھر اور اپنا خاندان دیا تھا۔

قیصر نے اکیلے پن میں ہوش سنبھالا تھا، یوں تو وہ جس گھر میں پلا بڑھا تھا وہاں بہت سے رشتے موجود تھے۔ جیسے دادا، دادی، اس کے دو چچا، ان کی بیویاں اور بچے، اس کی ایک پھوپھی بھی تھیں اور اس نے سنا تھا کہ اس کی ایک خالہ بھی ہیں لیکن کبھی ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہاں وہ رشتے جنہیں انسان اپنا کہتا اور سمجھتا ہے وہ ان سے محروم تھا۔ ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن بائیکس پر جاتے ہوئے آئل میٹکر کے نیچے آ گئے۔ بہن کی طبیعت خراب تھی۔ ماں باپ اسے ڈاکٹر کو دکھانے لے جا رہے تھے۔ وہ روتا رہ گیا کہ وہ بھی جائے گا۔ اس وقت وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے یاد بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ چار سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ البتہ اس گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو رویہ رکھا گیا وہ اسے آج تک یاد تھا۔

اس گھر میں تمام ہی افراد سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ وہ ایک ہی تھے لیکن صرف ماں باپ نہ ہونے سے وہ کسی لاوارث کی طرح پرورش پاتا رہا۔ چچا اور چچیاں اس سے امتیازی سلوک کرتے تو سمجھ میں آتا کہ وہ اس سے اپنے بچوں جیسا سلوک نہیں کر سکتے تھے مگر دادا اور دادی بھی اس سے امتیازی سلوک کرتے تھے۔ دوسرے پوتوں کے لیے ان کا جو رویہ اور پیار ہوتا تھا اس کی رمت بھی اسے اپنے لیے نظر نہیں آتی تھی۔ تو دس سال کی عمر میں اس کا کردار گھر کے فرد سے زیادہ گھر کے نوکر کا سا ہو گیا تھا۔ ہر کام کے لیے اسے آواز دی جاتی۔ جب دوسرے بچے ہوتے تب بھی اسے ہی کام کے لیے کہا جاتا۔ حد یہ کہ وہ سویا، کھا رہا یا اسکول کا کام کر رہا ہوتا تھا تب بھی اسے ہی کام کے لیے پکارا جاتا اور اگر وہ آنے میں ذرا تاخیر کرتا تو کام کا کہنے سے پہلے اسے خوب سنایا بھی جاتا۔



## ثبوت

وکیل۔ ”مائی لارڈ قانون کی کتاب کے صفحہ نمبر 15 کے مطابق میرے موکل کو باعزت رہا کیا جائے۔“

جج نے آرڈر دیا کہ کتاب پیش کی جائے۔ جب جج نے صفحہ 15 کھولا تو اس میں پانچ ہزار کے چار نوٹ رکھے ہوئے تھے۔

جج۔ ”آرڈر آرڈر اس کے تین ثبوت اور عدالت کو پیش کیے جائیں۔“

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

اسے دادا کے مرنے کی خوشی تھی اس لیے وہ رویا نہیں۔ سوئم کے بعد پورا گھر جرمہ بنا کر بیٹھا اور اس پر فرد جرم عائد کی گئی۔ چچاؤں نے اسے بتایا کہ اب اس گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ یہاں صرف ایک صورت میں رہ سکتا ہے کہ وہ یہاں کام کرے۔ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ وہ کام تو پہلے ہی کر رہا تھا اس لیے وہ اسی طرح رہنے لگا۔ اسکول جانے کی آس باقی نہیں رہی تھی مگر زندگی اس کے لیے اتنی مشکل کر دی جائے گی اس نے سوچا نہیں تھا۔ پہلے وہ دادا کے کام کرتا تھا اور پھر باقی گھر والوں کے کام نمٹاتا تھا مگر اب اسے صبح سے رات گئے تک اوپر اور نیچے کے گھروں میں کاموں کے لیے دوڑنا پڑتا تھا۔ ابھی نیچے ایک کام کر رہا ہوتا تھا کہ اوپر سے آواز آ جاتی اور جب اوپر جاتا تو نیچے سے آوازیں آنا شروع ہو جاتیں۔ جانے میں دیر ہوتی تو باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ صبح سے شام تک وہ بے شمار بار ذلت آمیز مراحل سے گزرتا رہتا۔

دادا کے مرتے ہی ان کے کمرے پر چھوٹے چچا نے قبضہ کر لیا اور اسے دوسری منزل پر اسٹور روم میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں پورے گھر کا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ وہ بھی رات کو چند گھنٹے کے لیے یہاں پڑ جاتا۔ صبح چھ سے رات بارہ بجے تک وہ یہاں نہیں آتا تھا، ابھی نہیں سکتا تھا۔ اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اگر کوئی کام نہیں ہوتا تو صرف اسے مصروف رکھنے کے لیے اس کے ذمے کوئی ایسا ہی کام لگا دیا جاتا جیسے ڈسٹنگ یا جالے صاف کرنا۔ سامان اوپر دھوپ میں لے جاؤ۔ دونوں چچیاں کام کرانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی تھیں مگر جب کھانے کا وقت

تہائی اور بڑھاپے نے انہیں وقت سے پہلے موت کے پاس پہنچا دیا۔ وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بستر سے... بہ مشکل ہی اٹھ پاتے تھے اور ان کے سارے کام قیصر کو کرنے پڑتے تھے۔ ان دنوں وہ آٹھویں جماعت میں تھا۔ قیصر پڑھنے میں اپنے کزنز سے تیز تھا جو پرائیویٹ اسکولوں میں بھی بس پاسنگ مارکس لاتے تھے اور اس نے دو بار ڈبل پروموشن لیا۔ صرف تیرہ سال کی عمر میں آٹھویں میں آگیا تھا۔ وہ اور بڑھنا چاہتا تھا اس لیے جب گھر میں یہ بات ہوئی کہ دادا کی دیکھ بھال کے لیے اسے اسکول سے اٹھایا جائے تو وہ ششدر رہ گیا اور پھر اس نے زندگی میں پہلی بار احتجاج کیا۔ ”مگر کیوں..... میں دادا جی کی خدمت تو کرتا ہوں۔“

”تم صبح سے دوپہر تک اسکول میں ہوتے ہو اس وقت اباجی کو کون دیکھے گا؟“ بڑے چچا نے کہا۔

”گھر میں چچیاں ہوتی ہیں۔“

”وہ اپنے کام کریں یا اباجی کو دیکھیں۔“ چھوٹے چچا نے کہا۔

”میں باقی سارا دن دیکھتا ہوں اس وقت کوئی اور دیکھ لے۔“

”کوئی تمہاری طرح بیکار نہیں ہے۔“ بڑی چچی نے حقارت سے کہا۔

”تم نے پڑھ کر کرنا ہی کیا ہے؟“ چھوٹی چچی بولیں۔

”بس اب تم اسکول نہیں جاؤ گے۔“ بڑے چچا نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

وہ احتجاج کرتا رہ گیا اور کسی نے اس کی سنی نہیں۔ دادا اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان کی کوئی سزا وہ تو خود اب دوسروں کے رحم و کرم پر گئے تھے۔ قیصر نے ان سے کچھ کہنا بیکار سمجھا۔ اسے اسکول جانے سے روک دیا گیا۔ اس کے امتحان ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ بہت مشکل سے اس نے پیپرزدنے کی اجازت حاصل کی مگر اس کے بعد اسے ایک دن بھی اسکول جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے گھر میں تیاری کر کے امتحان دیا۔ نتیجہ نکلا تو وہ کلاس میں دوسرے نمبر پر آیا تھا مگر اس کے بعد اسکول بند ہو گئے اور دو مہینے بعد دادا بھی دنیا سے گزر گئے۔ پورے گھر نے آنسو بہائے مگر اکثر کے آنسو دکھاوا تھے۔ اسے دادا کے مرنے کا دکھ تھا مگر اس سے رویا نہیں گیا۔

شاید اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے مگر دکھاوے کے آنسو بہانے والوں نے اسے بھی اس کا جرم بنا دیا کہ



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف      ایڈفرس لنکس  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ      ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ      ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

**All Done**

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow



حملہ کر دیا اور جب اس نے شور مچا دیا تو وہ کباڑ خانے کی چیزیں توڑنے اور پھینکنے لگا۔ چچاؤں نے اسے پکڑ کر یہاں پاگل خانے میں داخل کرادیا تھا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے آج باہر زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔“ ہما نے اندر سے جھانک کر کہا۔ ”اندر نہیں آئیں گے؟ قبوہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

قیصر چونکا اور اندر کی طرف بڑھا۔ ”ہاں، آج مجھے باہر زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔“

روما اندر سے دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ ”بابا! کل ہم آئیں کریم کھانے جائیں گے نا؟“

”ضرور بیٹا۔“ قیصر نے جھک کر اس کا سر چومنا۔ ”میں اپنی بیٹی کو ضرور لے کر جاؤں گا۔“

”اور ہم اوپر پہاڑی پر بھی جائیں گے۔“ ہما بولی۔ ”اگر میں کل جلدی آ گیا تو۔“ قیصر بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”قبوہ لے آؤ۔“

وہ عام طور سے آٹھ بجے رات کا کھانا کھا لیتے تھے اور دس بجے تک وہ اپنے کام نمٹا کر اور اگلے دن کی تیاری کر کے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ اس دن بھی وہ چائے، مٹی دی اور واش روم سے فارغ ہو کر دس بجے تک لیٹ گیا تھا۔ روما کا کمر الگ تھا اور وہ ساڑھے نو بجے بیڈ پر چلی جاتی تھی۔ ہما کچھ دیر اس کے پاس رہ کر اپنے کمرے میں آتی اور آخری کام وہ یہ کرتی کہ قیصر اور روما کے کپڑے پریس کرتی تھی۔ ہما تقریباً آئیس برس کی خوب صورت اور صحت مند عورت تھی۔ اپنی مناسب جسامت اور بے داغ جلد کی وجہ سے وہ پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ قیصر سے ایک سال چھوٹی تھی اور اسے شکوہ تھا کہ وہ دیکھنے میں اس سے کم عمر لگتا ہے۔ قیصر کسی قدر طویل قامت اور چھریرے جسم کے ساتھ لڑکوں جیسے نقوش کی وجہ سے چوبیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ ہما قد میں اس سے خاصی چھوٹی تھی مگر ان کی جوڑی اچھی لگتی تھی۔

قیصر نہ ایکسر سائز کرتا تھا اور نہ کھانے پینے میں احتیاط کرتا تھا، بس رات کے کھانے کے بعد آدھ پون گھنٹے صحن میں چہل قدمی کر لیتا تھا۔ ہما کھانے پینے میں احتیاط کرتی تھی۔ سارا دن چل پھر کر خود گھر کے سارے کام کرتی تھی اس کے باوجود ذرا سی بے احتیاطی سے اس کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ جب ایسا ہوتا وہ میٹھا اور مٹی ہوئی چیزیں کھانا چھوڑ دیتی تھی۔ اسے فٹنگ والے کپڑے پسند نہیں تھے مگر اسی

آتا تو اس سے یوں انجان بن جاتیں جیسے اس کے ساتھ پیٹ ہی نہ لگا ہو۔ اس کے کھانے کے دن بانٹے ہوئے تھے۔ دادی کے مرتے ہی بچن الگ ہو گئے تھے اور دونوں فیملیز اب اپنے اپنے پورشن میں پکاتی اور کھاتی تھیں۔ کھانا لگتا اور سب بیٹھ کر کھاتے مگر اس کی طرف سے بے نیاز ہو جاتے حتیٰ کہ چچاؤں کو بھی اس کا خیال نہیں آتا تھا۔ پھر چچی احسان عظیم کرتے ہوئے اسے بچا کچھا کھانے کو دے دیتی تھی۔

اسے کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا مگر صبح سے شام تک وہ جس ذلت سے گزرتا تھا، وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ بات بات پر اسے سناٹا اور اس کے مرے ہوئے ماں باپ کو بگھارنا جو خود تو مر گئے تھے اور اپنی بلا ان کے سر چھوڑ گئے تھے۔ زہر میں ڈوبے جملے اور طعنے اس کی روح پر لگتے تھے اور کبھی نہ بھرنے والے زخم کی طرح رہ جاتے تھے۔ رات کو وہ تھکن سے چور ہو کر لیٹتا تو بجائے اس کے فوراً بعد سو جائے یہ جملے اور طعنے اس کے ذہن کے گنبد میں گونجتے رہتے تھے اور اسے لگتا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔ ایک رات وہ سویا تو اس کا جسم اور ذہن دونوں ٹوٹ رہے تھے۔ اس کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ ایک بند جگہ پر تھا اور یہاں سے باہر جانے کا ایک ہی دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا، اس نے گھبرا کر دروازہ پینا تو کسی نے اسے درشت لہجے میں بتایا کہ وہ شور نہ کرے ورنہ اسے انجکشن لگا دیا جائے گا۔ اس نے پوچھا۔

”میں کہاں ہوں؟“

”پاگل خانے میں۔“ جواب ملا۔

”مگر کیوں؟“ وہ چلا یا۔

”تو پاگل جو ہے۔“ باہر موجود شخص ہنسا۔

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ اس نے زیادہ زور سے چلا

کر کہا تو جواب میں قہقہہ سنائی دیا۔ وہ چلاتا رہا اور باہر موجود شخص کو بتاتا رہا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آخری قہقہے کے بعد کوئی جواب نہیں آیا۔ پہلا دن بہت عذاب میں گزرا اور یہ ایسا عذاب اور کرب تھا کہ اسے اپنے چچاؤں کا گھر اچھا لگنے لگا، اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل کر واپس اس گھر میں چلا جائے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا تھا اور بعض اوقات تو اسے لگتا کہ اس کی سانس واپس نہیں آئے گی۔ اسے سانس لینے کے لیے زور لگاتا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے معلوم ہو گیا کہ اس پر دورہ پڑا تھا اور وہ قابو سے باہر ہو کر مارنے پینے اور شور مچانے پر آمادہ تھا۔ صبح چھوٹی چچی اسے اٹھانے آئیں تو اس نے ان پر بھی



لیے وہ فننگ کے کپڑے پہنتی کہ وزن بڑھتے ہی اسے پتا چل جائے۔ قیصر اس سے محبت کرتا تھا اور اسے پروا نہیں تھی کہ اس کی بیوی حسن کے مروجہ پیمانوں پر بھی پورا اترتی ہے یا نہیں مگر ہاں اس کی فکر رہتی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ عورت اگر اور ویٹ اور زیادہ عمر کی ہو تو اپنے شوہر سے بڑی لگتی ہے۔ قیصر اس کی فکر پر ہنستا تھا۔ آج بھی ہمانے اس کے اور روما کے کپڑے استری کیے اور پھر ویٹ مشین پر اپنا وزن چیک کیا۔ اس نے قیصر کو مطلع کیا۔ ”میرا وزن پچھلے ایک ہفتے میں ایک کلو گرام بڑھا ہے۔“

”اب کتنا ہے۔“ قیصر نے اپنا تکیہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

”دفنی سیون کے جی۔“ ہمار پریشانی سے بولی۔

قیصر ہنسا۔ ”حالانکہ یہ تمہاری ہائٹ اور عمر کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔“

”ابھی فکر نہیں کروں گی تو یہ بے قابو ہو جائے گا۔“ ہما نے جواب دیا۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا۔ وہ قد میں قیصر سے پورے سات انچ چھوٹی تھی۔ قیصر کا وزن بہتر کلو گرام تھا مگر اپنی طویل قامتی کی وجہ سے وہ چھریرا لگتا تھا۔ ہمار لائٹ بند کر کے بستر پر آئی اور ایک منٹ میں وہ سو چکی تھی۔ آج اس نے خاصے کام نمٹائے تھے۔ کپڑوں کی مشین لگائی اور چھت صاف کی تھی۔ پچھلے دنوں گرد کی آندھی آئی تھی جس نے پوری چھت مٹی مٹی کر دی تھی۔ اس کے بعد ہونے والی بارش نے اگرچہ درختوں اور پودوں کو دھو دیا تھا مگر چھت پر مٹی جمی تھی، اسے پانی مار کر صاف کرنا پڑا تھا۔ معمول کے کام اس کے علاوہ تھے۔ قیصر جاگ رہا تھا۔ صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے آج اسے اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔ اب اسے اپنا ماضی بہت کم یاد آتا تھا مگر نہ جانے کیوں آج اسے وہ سب یاد آیا جو اس پر گزرا تھا۔

سرکاری پاگل خانے میں وہ سچ پانچ پاگل ہو جاتا مگر اس کی خوش قسمتی کہ اس کا کس ڈاکٹر عزیز خان نے لے لیا۔ ڈاکٹر عزیز ہمدرد اور انسان دوست شخصیت کا مالک تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی مگر سب سے یوں پیش آتا جیسے وہ بزرگ ہو۔ اس نے قیصر کے کیس میں محسوس کیا کہ اس کا معاملہ نفسیاتی نہیں بلکہ کل دینے والی شخصیت کا تھا اور اسے علاج کے ساتھ ساتھ مدد کی بھی ضرورت تھی۔ اسے اس بے سہارا لڑکے سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ قیصر کے چچا اسے یہاں داخل کر کے اسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہیں آئے۔ انہوں نے اپنا پتا تک نہیں لکھوایا تھا۔ جب ڈاکٹر عزیز نے اسے دماغی لحاظ

سے صحت مند قرار دیا تو اسے اسپتال سے ڈسچارج کرنا پڑا۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس موقع پر بھی ڈاکٹر عزیز اس کے کام آیا۔ اس نے اسے اپنے کلینک پر ملازم رکھ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس نے اسے اپنے بچنے کے سرورٹ کو ارٹھر میں جگہ دی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عزیز کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس نے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ڈاکٹر نے اس کی پرائیویٹ رجسٹریشن کرا دی۔ ان ہی دنوں اسے ڈرائنگ بنانے کا شوق ہوا۔ کلینک میں فارغ اوقات میں بیٹھا وہ ڈرائنگ بناتا رہتا۔ ڈاکٹر عزیز کا ایک دوست سبحان علی جو اپنی آرکیٹیکٹ اور سول انجینئرنگ کی فرم چلا رہا تھا، وہ کبھی کبھی ملنے کلینک آ جاتا تھا۔ اسے قیصر کے بارے میں معلوم تھا اور وہ اسے پسند بھی کرتا تھا۔ جب آتا تو سلام دعا کے علاوہ بھی اس سے گپ شپ کرتا تھا۔ اس نے ایک دن قیصر کو ڈرائنگ بناتے دیکھا اور اسے مشورہ دیا۔ ”تم ڈرائنگ اچھی بناتے ہو۔ ایسا کرو کہ سول ڈرائنگس کا کورس کر لو۔“

”یہ کیا ہوتا ہے جناب؟“ قیصر نے سادگی سے پوچھا۔

سبحان نے اسے سمجھایا کہ سول ڈرائنگس میں کیا کام کرتا ہے تو اسے اچھا لگا اور اس نے ڈاکٹر عزیز سے پوچھا۔ اس نے بھی حوصلہ افزائی کی اور اس کا داخلہ ایک ٹیکنیکل کالج میں کرا دیا جہاں سول ڈرائنگس میں کاتین سالہ ڈپلوما ہوتا تھا۔ ڈپلوما کے دوران ہی سبحان نے اسے اپنی فرم میں بطور اپرنٹس رکھ لیا۔ اب وہ صبح کالج جاتا۔ دوپہر میں وہاں سے سبحان کے دفتر چلا جاتا اور شام کو کلینک آتا۔ یہاں بھی اسے صبح چھ سے رات دس گیارہ بجے تک مستقل مصروف رہنا پڑتا تھا مگر وہ خوش تھا، اسے معلوم تھا کہ یہ محنت اور مصروفیت اسے مستقبل میں فائدہ دے گی۔ وہ پڑھ رہا تھا سیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی نوکری بھی کر رہا تھا۔ ڈاکٹر عزیز اس کے تمام اخراجات اٹھانے کے ساتھ اسے کچھ رقم بھی دیتا تھا۔ چھ مہینے بعد سبحان بھی اسے تنخواہ دینے لگا۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر اس کے لیے وہ عزت نفس اور اعتماد تھا جو اسے یہاں سے ملا تھا۔

ان تین سالوں میں اس نے تینوں جگہوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ڈپلوما مکمل ہونے کے بعد سبحان نے اسے اپنی فرم میں فل ٹائم جاب دے دی۔ ڈاکٹر عزیز نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر وہ اپنی لائف خود بنائے تو اسے زیادہ خوشی ہوگی۔



قیصر نے دوسری صورت کو ترجیح دی۔ اس نے ڈاکٹر عزیز کا کلینک اور اس کے بچکے کی رہائش چھوڑ دی۔ شروع میں تنخواہ زیادہ نہیں تھی اور اسے دفتر کے ہی دو لڑکوں کے ساتھ ایک کمرے کا قلیٹ شیئر کرنا پڑا تھا۔ اس میں اخراجات کم ہوتے تھے اور شروع کے دو سالوں میں اس نے خاصی بچت کر لی۔ سبحان نے اسے پھر مشورہ دیا کہ وہ صرف ڈپلوما کو کافی نہ سمجھے بلکہ آگے بھی پڑھے۔ اس نے بی ٹیک میں داخلہ لیا۔ وہ ایک ایوننگ کالج جانے لگا۔ دو سال بعد وہ بی ٹیک ہو گیا۔ انہی دنوں ہمارے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ فرم میں ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر آئی تھی اور پہلی نظر میں قیصر کو اچھی لگی تھی۔

سادہ سے حلیے میں اور لیے دیے رہنے والی ہمارے شروع میں قیصر پر بھی توجہ نہیں دی تھی مگر جلد اس نے محسوس کر لیا کہ قیصر دفتر میں کام کرنے والے دوسرے افراد سے مختلف ہے۔ اگر وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں ہمارے لیے پسندیدگی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس میں ہمارے لیے احترام و خلوص بھی ہوتا تھا۔ غیر محسوس انداز میں وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور تب قیصر کو پتا چلا کہ اس کی اور ہمارے کہانی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی ماں زندہ تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کر لینے کے بعد سے وہ اپنے اور ماں کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔

ہمارا بارہ سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور دو بڑے بھائیوں نے گھر پر قبضہ کر لیا اور جب ماں نے ہمارا حق مانگا تو اسے ہمارے سمیت گھر سے نکال دیا۔ ایک سال تک رشتے داروں کے پاس دھکے کھانے کے بعد ان ماں بیٹی نے ایک چھوٹی کوٹھری کرائے پر لے لی۔ ہمارے ماں ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرنے لگی۔ وہ سلائی میں آنے والے اضافی دھاگے کاٹتی تھی۔ ہمارے میٹرک کے بعد اسی فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ وہ ریسپشن پر تھی۔ انٹر کے بعد اس نے یہاں سے جاب چھوڑ دی اور ٹیلی فون آپریٹر لگ گئی۔ انٹر پرائیویٹ کیا تھا پھر گریجویشن بھی کر لیا اور سبحان علی کی فرم میں اسے پہلی بار مناسب تنخواہ ملی تھی۔ اس کی ماں نے چند سال پہلے صحت کی خرابی کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ایک بار اسے نمونیا ہوا اور اس کا اثر پھیپھڑوں پر آ گیا، اس کے لیے موسم سرما ذیت لے کر آتا تھا۔

قیصر نے ملازمت کے دوران میں اتنا جمع کر لیا تھا کہ ایک گھر کا سامان کر سکتا تھا لیکن اس نے پہلے ہمارے

بات کی اور اس کی رضامندی کے بعد اس کی ماں سے ملا۔ ہمارے ماں کی تو اولین خواہش یہی تھی کہ مرنے سے پہلے بیٹی کو اس کے گھر کا کر دے۔ اسے بھی قیصر اچھا لگا۔ قیصر نے اسے اپنے بارے میں سب صاف بتا دیا تھا، کوئی بات نہیں چھپائی۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ چند ہفتے پاگل خانے میں رہا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی انہوں کی مہربانی کا زیادہ دخل تھا۔ ہمارے ماں نے ہاں کی تو اس نے ایک تین کمروں کا مکان کرائے پر لیا اور اسے مناسب سامان سے آراستہ کر کے سادگی سے ہمارے کو بیاہ کر اس کی ماں سمیت گھر لے آیا۔ اسے دوسرا کمرہ دے دیا تھا۔ ہمارے اس کی زندگی میں آئی تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی حسین بھی ہوتی ہے۔ ہمارے جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خوب سیرت بھی تھی۔ اس نے آکر قیصر اور اس کے گھر کو یوں سنبھال لیا جیسے وہ ہمیشہ سے یہی کام کرتی آئی ہو۔ جواب میں قیصر نے اپنی ساری محبت اور اعتماد اسے دے دیا جیسے اس نے ہمارے لیے یہی سنبھال رکھا تھا اس سے پہلے اس نے کسی سے محبت نہیں کی تھی۔

ہمارے شادی کے بعد جاب نہیں چھوڑی۔ اگرچہ قیصر نے اس سے کہا تھا کہ اس کی تنخواہ کافی ہے مگر دور اندیش ہمارے نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن ہم کچھ بچائیں گے تو اپنا گھر بنا سکیں گے۔“

اس کا کہا درست ثابت ہوا۔ قیصر کی تنخواہ میں سے بھی وہ بچت کر لیتے تھے لیکن ہمارے اس کی ساری تنخواہ ہی بچ جاتی تھی۔ اس سے انہوں نے کمیٹی ڈال لی۔ اس کی رقم نکلی تو انہی دنوں مالک مکان ضرورت کی وجہ سے اپنا مکان فروخت کرنے لگا۔ انہیں پتا چلا تو انہوں نے مالک سے بات کر لی۔ مکان مناسب علاقے میں اور مین روڈ سے ایک ٹکڑی اندر تھا۔ نزدیک ہی بس اسٹاپ اور مارکیٹ سمیت تمام سہولیات تھیں۔ یہاں نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے مگر انہیں لوگوں سے کیا لینا دینا تھا۔ انہوں نے مالک مکان سے کہا کہ وہ آدھی قیمت ابھی لے لے اور باقی وہ دو سال میں ادا کر دیں گے۔ خوش قسمتی سے وہ مان گیا۔ وہ بیوی سمیت حج پر جا رہا تھا اور اس میں کچھ رقم کم پڑ رہی تھی، اس لیے مکان فروخت کر رہا تھا۔ آدھی قیمت ادا کر کے انہوں نے کرائے میں ہونے والی بچت سے مزید کمیٹی ڈال لی اور پھر دو سال کے اندر پوری ادائیگی کر کے مکان حاصل کر لیا۔

ان دو سالوں میں رومادینا میں آئی اور جب وہ ڈیڑھ سال کی تھی تو ہمارے ماں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ماں کی موت ہمارے لیے دکھ کا باعث تھی مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی کیونکہ ڈاکٹر



## خالی ہاتھ

فضل الباری صاحب جو اپنے پیسے ہم سے گنواتے ہیں اور ہانگ کا نگ کی کر لسی سے ابھی تک سمجھوتا نہیں کر سکے۔ وزیر خزانہ ہوں نہ ہوں۔ کامرس منسٹر بہت عمدہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے جوہر آج کھلے۔ ویسے تو وہ کوئی چیز خریدنے کے قائل نہیں اور ہم ان کی حب الوطنی کو قابل تقلید جانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں، کوئی چیز مت خریدو۔ پاکستان میں مہنگی سستی مل ہی جاتی ہے۔ کیوں اپنا زرمبادلہ گنواتے ہو، ملک کو اس کی ضرورت ہے لیکن آج ہم انہیں بازار کھینچ لے ہی گئے۔ فرمانے لگے۔ چیزیں پسند تم کرو۔ بھاؤ تاؤ ہم پر چھوڑ دو۔ جانے کوئی چیز تھی۔ دکاندار نے اس کے ٹوے ڈالر مانگے۔ ہم نے باری صاحب سے اردو میں کہا کہ پچاس سے شروع کرنا چاہیے لیکن انہوں نے چالیس ڈالر دام لگائے۔ دکاندار نے بہت زور مارا کہ یہ ساٹھ کر دیں۔ پچاس کر دیں۔ پینتالیس کر دیں، اکتالیس کر دیں لیکن باری صاحب نے کہا، چالیس سے ایک دھیلا زیادہ نہیں۔ آخر اس نے ہتھیار ڈال دیے تو باری صاحب نے کہا ایسے بد معاملہ لوگوں سے چیز خریدنی ہی نہیں چاہیے اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے۔

سنگاپور کے بازاروں سے ہم واقف تھے۔ وہاں چیزیں اچھی خاصی مل جاتی ہیں بلکہ کپڑا زیادہ اچھا وہاں ملتا ہے لیکن باری صاحب نے کہا ہانگ کا نگ سے لینا۔ ہانگ کا نگ میں قیمتوں کا تعین اپنے ذمے لے لیا تو ہمارے کچھ خریدنے کا سوال ہی نہ رہا۔ ایک روز ضرور جب وہ آرام کر رہے تھے ہم چوری چھپے بازار سے چند چیزیں مول لے آئے ورنہ ان کا تو کہنا ہے کہ ٹوکیو میں دیکھیں گے بلکہ ڈھاکا آنا، وہاں یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہم ہانگ کا نگ سے اسی شان سے جائیں گے جس طرح سکندر دنیا سے گیا تھا۔ یعنی خالی ہاتھ۔

ابن انشا کے سفر نامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

چند مہینے پہلے ہی اسے جواب دے چکے تھے کہ کسی وقت بھی اس کے پیچھے پڑے کام کرنے سے انکار کر سکتے ہیں اس بیماری کے عالم میں بھی وہ روما کو سنبھالتی اور ہانگ نوکری پر چلی جاتی تھی مگر ماں کی وفات کے بعد اس نے استعفا دے دیا۔ ان کا مکان ہو گیا تھا اور روما کو اور گھر کو اب کسی دیکھ بھال کرنے والے کی ضرورت تھی۔ روما تانی سے مانوس تھی وہ اس کی وفات پر بہت دن گم صدمی رہی۔ ان دو سالوں میں وقت اور واقعات بہت تیزی سے گزرے مگر پھر زندگی خود بہ خود معمول پر آگئی۔

مکان پرانا تھا۔ قیصر نے رفتہ رفتہ گنجائش کے مطابق اس کی مرمت کرا کے اسے ری نو کیا۔ ہما کو پھول پودوں کا شوق تھا۔ اس نے صحن میں کیاریاں بنائیں، بنیلیں چڑھائیں اور پھول دار پودے لگائے۔ گھر کے آگے پام ٹری لگایا۔ ان دنوں زمینوں اور جائیداد کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اچھا علاقہ ہونے اور پھر مین روڈ سے پاس ہونے کی وجہ سے یہاں قیمتیں بڑھیں تو نچلے طبقے کے لوگ اپنے مکان بیچ کر سستے علاقوں میں جانے لگے اور یہاں اوپری متوسط طبقے کے لوگ آنے لگے۔ ان کی وجہ سے چند سالوں میں یہ علاقہ ہی بدل کر رہ گیا۔ اب یہاں زیادہ تر اچھی فیملیز کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ہمانے آس پاس آنے والی اچھی فیملیز سے تعلق قائم کر لیا تھا۔ قیصر بھی چھٹی کے دن باہر نکلتا تو سب سے سلام دعا کرتا لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا اور اگر کسی کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی تو حتی الامکان مدد بھی کرتا تھا۔

ہما کے نوکری چھوڑنے سے قیصر کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ گھر مکمل طور پر اس کی آمدنی سے چل رہا تھا۔ ایک سال سے وہ سجان علی کی فرم چھوڑنے کا سوچ رہا تھا کیونکہ بی فیک کرنے کے بعد بھی وہ اب تک ڈرافٹس مین کے طور پر ہی کام کر رہا تھا اور تنخواہ بھی اس لحاظ سے نا کافی تھی۔ روما بڑی ہو رہی تھی اور اگلے سال اسے اسکول میں داخل کرانا تھا۔ اس نے دوسری نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ آغاز میں وہ اتنی تندہی سے تلاش نہیں کر رہا تھا مگر پھر دفتر میں کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ دل برداشتہ ہو کر اس نے فرم چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی کوششیں رنگ لائیں اور اسے دارالحکومت میں کام کرنے والی ایک بڑی آرکیٹیکٹ کمپنی میں سپروائزر کی جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ تھی اور دوسری سہولیات بھی اچھی تھیں۔ اس نے سجان علی کی فرم سے استعفا دیا اور یہاں جوائن کر لیا۔



جائے کیوں قیصر کو تار لیا۔ تعارف کے دوران ہی اس نے قیصر سے کہا۔ ”بہت تیار ہو کر آئے ہو..... تمہارا کیا خیال تھا کہ تمہیں یہاں پاس بنا دیا جائے گا؟“

قیصر حیران ہوا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ”نوسر! میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں، اس پوسٹ کے لیے تو بہت تجربے کار اور اعلیٰ ڈگری ہولڈر کی ضرورت ہے۔ میں کو ایفائی نہیں کرتا۔“

اس پر آغا نجم الدین نے بہت برا منایا بعد میں قیصر کو پتا چلا کہ اس کے پاس نہ تو مطلوبہ ڈگری تھی اور نہ ہی اسے کام کا زیادہ تجربہ تھا، اس کا واحد ہنر اس کی جوڑ توڑ کی صلاحیت تھی۔ رویے کے معاملے میں وہ اعلیٰ درجے کا خود غرض تھا۔ یعنی کسی سے کام ہوتا تو اس کے قدموں میں بچھ جاتا اور جب مطلب نکل جاتا تو پیچھاننے سے بھی انکار کر دیتا۔ دوسروں کی ناکامیوں پر اپنی کامیابی کی عمارت کھڑی کرنا اسے خوب آتا تھا۔ بعد میں سننے میں آیا کہ کمال ظفر کو فرم سے نکلوانے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ وہ اس ڈائریکٹر کا منہ چڑھا ہوا تھا جس سے اختلاف کی وجہ سے کمال ظفر کو نوکری چھوڑنا پڑی تھی۔ آغا نجم الدین نے آتے ہی اپنے جیسے نا اہل اپنے آس پاس جمع کر لیے ان کی مدد سے آغا نجم الدین نے سب سے پہلے شعبے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اسے پتا چل گیا کہ وہ کس کس سے کیا کام لے سکتا ہے۔ بد قسمتی سے یہاں بھی قیصر نمایاں تھا۔ اس سے جلنے والوں نے آغا نجم الدین کو اطلاع دی کہ کام میں قیصر سب سے تیز ہے۔

اس لیے اب سب سے زیادہ اور مشکل ترین کام اسے دیا جانے لگا مگر کافی ہوشیاری سے۔ کسی بھی کام کے مشکل ترین حصے اسے دیے جاتے اور جب وہ یہ کام کر لیتا تو آغا اس سے لے کر باقی رہ جانے والا آسان کام خود کر کے اسے آگے بڑھا دیا کرتا۔ یعنی کام قیصر کرتا اور نام آغا نجم الدین کا ہوتا تھا۔ جلد قیصر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا گیم کھیلا جا رہا ہے کیونکہ اکثر اس کا واسطہ اوپر والوں سے بھی پڑتا تھا اور وہاں اسے وہ کام آغا نجم الدین کے نام سے نظر آتا جو اصل میں اس نے کیا ہوتا تھا۔ ایک ڈائریکٹر میڈیم باسمن جو ایک فائبر اسٹار ہوٹل کا پروجیکٹ کر رہی تھیں اور کبھی کبھی مدد کے لیے اسے بلا لیتی تھیں۔ اس نے قیصر سے کہا۔ ”کیا بات ہے، اب تم نے ڈرائنگز پر اپنا نام لکھنا اور سائن کرنا بند کر دیے ہیں؟“

”میڈم! میرے پاس مکمل کام آتا ہی نہیں ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”آغا صاحب کچھ کام مجھ سے کراتے

اگلے سال روما کو اسکول میں داخل کرایا۔ وہ اب تک اکلوتی تھی حالانکہ ان کی خواہش بھی کہ اب ان کی مزید اولاد ہو اور وہ کوئی احتیاط بھی نہیں کرتے تھے مگر اوپر والے کی طرف سے دیر ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ بھول گئے کہ انہیں مزید اولاد کی خواہش تھی۔ اگرچہ یہ خواہش ختم نہیں ہوئی تھی لیکن کہیں دب ضرور گئی تھی۔ نئی کمپنی میں قیصر کا پاس کمال ظفر اچھا انسان تھا اور اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے قیصر کام کو بھی انجوائے کرتا کیونکہ وہ ماتحتوں کے ساتھ نہ صرف اچھا سلوک کرتا تھا بلکہ ان کے کام کو آسان بنانے میں ہر ممکن مدد بھی دیتا تھا۔ آفس میں ماحول اچھا تھا اس لیے قیصر اور دوسرے لوگوں کو زیادہ کام کرنے پر بھی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور سے جب انہیں اس کا اضافی معاوضہ اور پروجیکٹ کی کامیابی کے بعد بونس بھی ملتا تھا۔

گھر کے بعد قیصر کی خواہش بھی کہ ان کے پاس گاڑی بھی ہو بے شک چھوٹی سی ہو۔ اگرچہ اس کے پاس بائیک تھی۔ ہما اور روما کے ساتھ کہیں جانے میں بھی مشکل نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود وہ گاڑی چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ روما ساتویں سال میں لگ گئی تھی اور کچھ عرصے بعد ان تینوں کا بائیک پر آنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے ٹارگٹ کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی ان دنوں کمپنی میں اس کے شعبے میں ایسی تبدیلی آئی جس نے پورے شعبے کو اور خاص طور سے قیصر کو متاثر کیا۔ کمال ظفر کے کمپنی کے ایک ڈائریکٹر سے کچھ اختلافات ہو گئے تھے جو بتدریج اتنے بڑھے کہ کمال ظفر نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس نے خلاف قواعد نوٹس دیے بغیر آفس آنا بند کر دیا اور گھر سے ہی استعفا بھیج دیا۔

کمپنی نے کمال ظفر کے خلاف کارروائی شروع کر دی کیونکہ وہ چند اہم ترین پروجیکٹس پر کام کر رہا تھا اور وہ عام ملازم کی طرح جاب چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ اس سے پروجیکٹس کا کام متاثر ہوتا۔ اس کی جگہ کسی دوسرے آدمی کو کام سمجھنے میں خاصا وقت لگ جاتا اور اس کے بعد وہ آگے کام شروع کرتا۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں خاصا وقت گزر گیا اور ان کے شعبے میں نیا سربراہ تاخیر سے آیا۔ تمام ہی پروجیکٹس متاثر ہوئے تھے۔ ان کے سالانہ انکری منٹس اور بونس پروجیکٹس کی کامیابی تکمیل سے مشروط ہوتے تھے۔ اس لیے نئے سربراہ کی آمد پر سب نے اطمینان کا سانس لیا مگر بد قسمتی سے کمال ظفر کے بعد جو پاس آیا اسے کام سے زیادہ جوڑ توڑ اور سازشوں سے دلچسپی تھی اور اس نے آتے ہی نہ



”بونس شعبے کے سربراہ کی سفارش پر دیا جاتا ہے اور اس بار رپورٹ میں تمہارا نام نہیں تھا۔“

قیصر جانتا تھا کہ آغا سے بات کرنا بیکار تھا۔ وہ اسے ذلیل کرتا اور اس کی ذلت سے لطف اندوز بھی ہوتا۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں جلتا کڑھتا ہوا واپس آ گیا۔ اگر اسے بونس مل جاتا تو اس کا ٹارگٹ پورا ہو جاتا اور وہ کارلے لیتا مگر اب اسے مزید کچھ عرصے انتظار کرنا پڑتا۔ اس شام وہ گھر آیا تو ہانے اس کی صورت سے اندازہ لگا لیا۔ ”کیا ہوا؟“

آج پھر اس گھٹیا شخص نے کوئی حرکت کی ہے؟“

قیصر ہما کو دفتر میں ہونے والی باتوں سے باخبر رکھتا تھا۔ اسے آغا نجم الدین کے بارے میں معلوم تھا۔ قیصر نے ہما کو بتایا کہ اسے پہلی بار بونس سے محروم کیا گیا ہے اور یہ آغا کی حرکت ہے۔ ہما کو بھی غصہ آ گیا مگر جب قیصر نے اسے بتایا کہ اس بونس کی کمی سے وہ اب جلد کار نہیں لے سکے گا تو اس نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میرے پاس کچھ رقم ہے، وہ آپ لے لیں۔“

”تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“ قیصر نے حیرت سے کہا۔

”آپ جو میری پاکیٹ منی دیتے ہیں اس سے میں کوئی چھوٹی کمپنی ڈال لیتی ہوں، اکٹھے ملتے ہیں تو کہیں کام آ جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے ملی ہے، ابھی تک رکھی ہے۔“

قیصر خوش ہو گیا۔ اگرچہ کمپنی کی رقم زیادہ نہیں تھی مگر گزارہ ہو سکتا تھا۔ اس نے کار کی تلاش شروع کر دی اور یہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ ایک ڈاکٹر جو بیرون ملک شفٹ ہو رہا تھا، اپنی بہت سنبھال کر استعمال کی ہوئی کار فروخت کر رہا تھا۔ چند سال پرانی یہ کار تقریباً نئی جیسی تھی۔ مارکیٹ سے کم قیمت پر مل رہی تھی اور پھر کوئی کام نہیں تھا اس لیے قیصر نے ہمت کر کے لے لی۔ جس دن وہ کار لے کر آیا، بہت خوش تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی مگر اسے زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لیے سنبھل کر ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اس سے زیادہ ہما اور سب سے زیادہ رومانا خوش تھی۔ رومانے فوری فرمائش کی۔ ”بابا! ہم ہر دیک اینڈ پر کہیں گھومنے جائیں گے۔“

”اسی لیے توی ہے میری گڑیا۔“ قیصر نے کہا۔ رومانے خوش نظر آنے لگی۔ جب سے کار آئی تھی، وہ اس کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔

”بابا! میں اس کی صفائی کروں گی۔“

”صفائی میں کروں گا، آپ ہاتھ بٹانا۔ ابھی آپ

ہیں اور باقی خود کرتے ہیں۔ فائل وہی کرتے ہیں اس لیے سائن بھی ان ہی کے ہوتے ہیں۔“

میڈم حیران ہوئیں۔ ”یہ تو غلط ہے۔ ایک کام مکمل طور پر ایک فرد کو دیا جاتا ہے اور تمہارے شعبے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔“

قیصر جانتا تھا کہ باقی افراد کو پورا کام دیا جاتا تھا۔ اس نے میڈم سے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، سوائے میرے سب کو مکمل کام دیا جاتا ہے۔“

اسی شام اسے آغا نجم الدین نے بلا لیا۔ اس کا موڈ نہایت خراب تھا اور اس نے چھوٹے ہی کہا۔ ”تم یہاں کام کرنے کی تنخواہ لیتے ہو، شکایتیں کرنے کی نہیں۔“

قیصر سمجھ گیا کہ اس تک بات پہنچ گئی ہے، اس نے نخل سے کہا۔ ”میں نے کب اور کس سے شکایت کی ہے سر؟“

”تم نے میڈم یا سمین کے سامنے جو بکواس کی ہے، وہ مجھ تک پہنچ گئی ہے۔“ آغا نجم الدین نے نہایت خراب لہجے میں کہا۔ اس کے خراب لہجے پر قیصر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”سر! اول تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور دوسرے میں اس لہجے میں بات کرنے اور سننے کا عادی نہیں ہوں۔“

نجم الدین کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس نے غرا کر کہا۔ ”اب تم مجھ سے زبان چلاؤ گے۔“

”میں نے مؤدبانہ عرض کیا ہے۔“ قیصر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس روز اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے لیے مشکل حالات شروع ہو گئے ہیں۔ ایسے شخص کے ساتھ صبح سے شام تک کام کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنی اچھی کمپنی اور اتنی اچھی تنخواہ مارکیٹ میں بہت کم تھی۔ اسے قسمت سے یہ ملازمت مل گئی تھی، ورنہ یہاں آنے کے لیے لوگ بہت کوشش کرتے ہیں۔ ڈھائی سال اس نے یہاں بہت مزے سے جاب کی تھی مگر آغا نجم الدین کے آتے ہی ماحول یکسر بدل گیا اور اب شعبے میں کام سے زیادہ سازشیں اور جوڑ توڑ ہوتا تھا کہ کس طرح کام کرنے والوں کو نیچا دکھایا جائے اور اپنا قد بڑھایا جائے۔ انہی دنوں کمپنی نے سالانہ بونس کا اعلان کیا تو وہ حیران رہ گیا کہ اس کا نام ہی نہیں تھا اور اس کے شعبے کے دو افراد کا نام تھا جن کا کام صبح سے شام تک آغا نجم الدین کی خوشامدیں اور جی حضوری کرنا تھا۔ قیصر نے اس پر آغا نجم الدین کے بجائے اپنے شعبے کے ڈائریکٹر سے احتجاج کیا۔

”سر! میں نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی جس کی پاداش میں میرا بونس روک لیا جائے۔“



”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ اگر آپ نے کچھ اور نہیں کہنا تو میں جاسکتا ہوں؟“ قیصر نے کہا اور اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر آ گیا۔ عقب میں آغا نجم الدین حسب معمول بکواس کر رہا تھا۔ وہ دبے لہجے میں یوں گالی دیتا کہ لفظ تو واضح نہ ہو مگر دوسرے کی سمجھ میں آجائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ قیصر کا خون کھول رہا تھا مگر وہ مجبور تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس دن وہ دفتر سے آیا تو اس کا ذہن منتشر تھا اور شاید اسی وجہ سے اسے اپنا وہ تکلیف دہ ماضی یاد آ گیا جسے اس نے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا تھا۔ رات بھی یہی یادیں اس کے ذہن میں گردش کرتی رہیں، اس لیے وہ دیر سے سویا اور صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہمارے دو تین بار اسے آواز دی تو وہ ہمت کر کے اٹھا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے شاور لیا۔ شاور سے اس کی طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ ناشتے میں اس نے صرف جائے اور چند پاپے لیے تھے پھر دو الے کر وہ دفتر روانہ ہو گیا۔ جب وہ دفتر پہنچا تو اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آغا نجم الدین آج دفتر نہیں آیا ہے۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے اس شخص کی اپنی طبیعت خراب ہو گئی ہو جو دوسروں کی طبیعت خراب کر دیتا ہے۔

دو پہر تک وہ دل جمعی سے اپنا کام کرتا رہا، اگرچہ اس کے سر کا درد معمولی سا ہی کم ہوا تھا مگر آغا کے دفتر میں نہ ہونے سے وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ لُچ میں اس نے دو سینڈویچز لیے تھے۔ لُچ ہانا کر دیتی تھی کیونکہ اسے باہر کھانا پسند نہیں تھا۔ لُچ کے بعد اس نے دوبارہ کام شروع کیا تو اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ اس کا دل وحشت زدہ ہو رہا تھا اور کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ شام تک وہ بے دلی سے کام کرتا رہا۔ اس کے سر کا درد پھر عود آیا اور وہ شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ چھٹی ہو اور وہ گھر جاسکے۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے اس کا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا آج آغا نجم الدین نہیں آیا ورنہ وہ اسے کہاں بنشہ کام مکمل نہ ہونے پر۔ ساڑھے پانچ بجے اس نے اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔

پچھلے دنوں اس کی پیر نائف کم ہو گئی تھی تو اس نے نئی منگوائی تھی۔ شیخ مشتاق احمد آفیس انوینٹری انچارج تھے۔ یہ قول دفتر والوں کے ربر پنسل پر بھی ناگ بن کر بیٹھے رہتے تھے اور کوئی اپنی ضرورت سے جاتا تو بات سننے سے پہلے پھن کاڑھ لیتے تھے۔ ان سے کوئی چیز نکلوانا سانپ کے منہ

اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو۔“ صحن میں گنجائش تھی۔ وہ کار اندر ہی کھڑی کرتا تھا اور جب کہیں لے جانا ہوتا تب باہر نکالتا۔ اس نے ہمارے کہا کہ جب اس کا ہاتھ صاف ہو جائے گا تو وہ اسے بھی ڈرائیونگ سکھائے گا۔ گاڑی کی خوشی تھی مگر دفتر کی ٹینشن نے یہ خوشی ماند کر دی تھی۔ بونس والے واقعے سے قیصر کو اندازہ ہوا کہ آغا نجم الدین کس حد تک اس کے خلاف ہو گیا ہے اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ عرصے اس کے ساتھ کام نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ دوسری ملازمت تلاش کرنا شروع کرتا مگر اس کے ذہن میں یہ بات آگئی تھی کہ جلد یا بدیر اسے کہیں اور جاب تلاش کرنا پڑے گی۔ اتفاق کی بات ہے جب وہ کار خرید کر آ رہا تھا تو ایک دفتری کولیک نے اسے دیکھ لیا اور اس نے چند دن میں پورے دفتر میں یہ بات پھیلا دی۔ وہ دوسرے شعبے میں کام کرتا تھا اس لیے اس کے شعبے تک آنے میں ذرا تاخیر ہوئی تھی اور جیسے ہی آغا نجم الدین تک یہ خبر پہنچی، اس نے فوراً قیصر کو طلب کر لیا۔ اس وقت وہ ایک اہم ڈرائنگ پر کام کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آغا نے اسے کام کے سلسلے میں طلب کیا ہوگا مگر اس نے نہایت عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”تم نے نئی کار لی ہے؟“

قیصر چونکا۔ ”نئی تو نہیں لیکن نئی جیسی ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟“

وہ مسکرایا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ تم چھپاؤ گے اور بائیک پر آؤ جاؤ گے تو دفتر والوں کو پتا نہیں چلے گا۔“

”میں نے چھپایا نہیں ہے۔ ابھی گاڑی لی ہے، ہاتھ صاف نہیں ہے اور دوسرے میں نے گاڑی گھر کے لیے لی ہے، دفتر کے لیے نہیں..... میں روز دفتر گاڑی میں آنا جانا انور ڈ نہیں کر سکتا۔“

آغا نجم الدین نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”گاڑی انور ڈ کر سکتے ہو، آنا جانا نہیں کر سکتے۔“

قیصر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ ”سر! میں اس وقت انتہائی اہم ڈرائنگز پر کام کر رہا ہوں اور وہ آپ نے مجھ سے دو دن میں طلب کی ہیں۔ اگر آپ اسی طرح مجھے غیر متعلقہ باتوں کے لیے بلاتے رہے تو میں یہ کام وقت پر مکمل نہیں کر سکوں گا۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ آغا نجم الدین نے میز پر ہاتھ مارا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، یہاں صرف تم کام کرتے ہو اور باقی لوگ فارغ بیٹھے رہتے ہیں۔“



جب دفتر کے لوگوں نے آکر اسے قابو کیا تو وہ اس پر پے در پے وار کر رہا تھا اور ایک ہی جملہ کہہ رہا تھا۔  
”تم مجھے جاب سے نکالو گے۔“

☆☆☆

سلاخوں کے دوسری طرف ہما سہمی ہوئی روما کو ساتھ لگائے بیٹھی تھی اور سلاخوں کے اس طرف قیصر تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور چہرہ ستا ہوا تھا مگر اس کے چہرے اور جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے رضا کارانہ اعتراف جرم کر لیا تھا کہ اس نے اشتعال میں آکر آغا نجم الدین کو قتل کیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ آسان کیس تھا۔ اس کا صرف سات دن کا ریمانڈ لیا گیا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ ہر مرحلے میں قیصر نے اپنے جرم کا اقرار کیا۔ مگر پولیس نے بنا کی تفتیش کے اس کے خلاف بین سود کا مقدمہ بنا دیا۔ سیشن کورٹ نے اسے پھانسی کی سزا سنائی۔ ہمانے اس کے لیے جو وکیل کیا تھا، اس نے ہائی کورٹ میں درخواست کی مگر وہاں سے اپیل مسترد ہو گئی اور پھر سریم کورٹ نے بھی اپیل مسترد کر دی۔ آج اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کی اپیل صدر مملکت نے بھی مسترد کر دی تھی۔ ہما کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ قیصر نے کہا۔

”مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں اور روما کو اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“  
”پلیز ایسا نہ کہیں۔“ ہما بولی۔ ”آپ نے ہمارے لیے بہت کیا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد تمہیں کوئی مشکل نہ ہو اس لیے میں نے وصیت کی ہے کہ مجھے سرکاری طور پر دفن دیا جائے۔“

ہما اب شدت سے رو دی اور اس کی دیکھا دیکھی روما بھی رونے لگی۔ قیصر بھی رو رہا تھا مگر اس کے پاس تسلی کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بچی کو اس دنیا میں چھوڑ کر جا رہا ہے جہاں زندگی ہرگز آسان نہیں ہے۔ وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ڈیڑھ تھوڑا وارنٹ جاری ہو گیا تھا۔ یہ اس کی ہما اور روما سے آخری ملاقات تھی۔ دو دن بعد اسے پھانسی دی جانی تھی۔ اسے لگا جیسے یہ سب بہت تیزی سے ہو گیا ہو۔ آغا نجم الدین کے قتل سے لے کر پھانسی گھاٹ تک کا سفر اس نے جیسے منٹوں میں طے کر لیا تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا تو ہما اور روما بہ مشکل وہاں سے اٹھے۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ روتا رہا۔ اپنی زندگی کی آخری رات وہ جاگتا رہا۔ اسے رہ کر یہی خیال

سے زہر نکلوانے جتنا مشکل تھا۔ زیادہ تر اس بات پر کڑھتے کہ دفتر والے چیزوں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ کئی بار یاد دہانیوں کے بعد آج نیا پیر ٹائف ملا تھا اور وہ اس کی میز پر رکھا تھا۔ چھ بجے کے انتظار میں قیصر پیر ٹائف سے کھینچنے لگا۔ اچانک ہی اسے باہر سے آغا نجم الدین کی آواز آئی اور اس کا دل ڈوب گیا۔ اس نے تشویش سے سوچا کہ یہ اس وقت کہاں سے آ گیا؟ اس کے ساتھ ہی اس کے سر کا درد بڑھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ اسے طلب نہ کرے مگر اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ چند لمحے بعد آغا نجم الدین کی طرف سے بلاوا آ گیا اور وہ اٹھ کر اس کے کمرے تک آیا۔ آغا کا موڈ معمول سے زیادہ خراب لگ رہا تھا، اس نے قیصر سے پوچھا۔ ”کام ہو گیا؟“  
”کون سا سر؟“

”وہ زہریلے لہجے میں بولا۔“ کیا جواب صاحب کے سر بہت سے کام ہیں جو یوں پوچھ رہے ہیں۔ میں اس کام کا پوچھ رہا ہوں جو تمہیں کل دیا تھا۔“  
”وہ نہیں ہو سکا آج میری طبیعت.....“

”نہیں ہو سکا۔“ آغا اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ”میں صرف اس کام کی خاطر تیس میل دور سے ڈرائیو کر کے آ رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ مکمل نہیں ہوا۔“  
قیصر کے سر میں اب لہریں سی اٹھنے لگی تھیں۔ اس نے بہ مشکل کہنا چاہا۔ ”میری طبیعت.....“

”جہنم میں گئی تمہاری طبیعت۔“ آغا نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کے پاس آکر اس کے سینے پر انگلی رکھی۔ ”تم نے نا اہلی اور کام چوری کی انتہا کر دی ہے۔ خود کو آج اور اسی وقت جاب سے فارغ سمجھو۔“  
اس نے بے یقینی سے آغا کو دیکھا۔ ”کیا..... کیا کہا تم نے..... مجھے جاب سے نکال رہے ہو؟“

”ابھی اور اسی وقت۔ مسٹر قیصر جمال یو آر فائر۔“ آغا بولا اور لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور تب قیصر نے دیکھا اس کے ہاتھ میں موجود پیر ٹائف آغا کے سینے میں اترا ہوا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اسے یہ دیکھ کر کوئی پریشانی یا بوکھلاہٹ نہیں ہوئی بلکہ اسے یہ منظر اچھا لگا۔ اس نے پیر ٹائف واپس کھینچا اور فوراً کی طرح اچھلنے والے خون کی پروا کیے بغیر اسے دوبارہ آغا کے سینے میں اتار دیا اور اسے..... ایسا کرتے ہوئے بہت لطف آیا۔ دوسرے وار پر آغا کراہ کر نیچے گرنے لگا تو قیصر بھی اس کی طرف جھکا اور



آ رہا تھا کہ کاش کسی طرح وہ اپنی زندگی میں واپس جاسکے۔  
کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

جب اسے پھانسی گھاٹ لے جانے کے لیے کوٹھری سے نکالا اور گھاٹ تک لایا گیا تب اس نے دیکھا کہ وہاں موجود افراد میں ڈاکٹر عزیز خان بھی تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر عزیز یہاں کیوں آیا ہے کیا وہ اس سے آخری بار ملنے آیا ہے؟ مگر اس نے قیصر سے ملاقات یا بات نہیں کی بس دور سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے گھاٹ پر چڑھایا گیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر جلا دئے اس کے گلے میں رسا ڈالا پھر اس کے چہرے پر غلاف پہنا دیا۔ آنکھوں پر غلاف آنے سے پہلے اس نے آخری چہرہ ڈاکٹر عزیز کا ہی دیکھا تھا، وہ اٹھ کر پھانسی گھاٹ کی طرف آ رہا تھا۔ پھر اس نے جیلر کی ہلکی سی آواز سنی۔ لیور کھینچنے کی آواز آئی۔ اس کے پیروں تلے تختہ کھل گیا اور وہ خلا میں گرا۔ ایک جھٹکے کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ موت کا سا ابدی اندھیرا۔ اب میدانِ حشر میں ہی آنکھ کھلنا تھی۔

☆☆☆

وہ درختوں کے نیچے سے گزشتہ سرما میں خشک ہو کر گر جانے والے پتے جمع کر رہا تھا۔ سخت تنکوں والی جھاڑو جس کے ساتھ لمبا ڈنڈا تھا اور کچرا سمیٹنے والا اسکرپر بھی تھا۔ کچرا اٹھانے والی ٹرائی غلام چلا رہا تھا۔ اس کا نام تو غلام قادر تھا مگر سب اسے وہاں غلام ہی کہتے تھے۔ چھوٹے قد اور مختصر جسم کا یہ سولہ سترہ سالہ لڑکا بہت دبی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کسی سے نظر ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے چھوٹے سے وجود میں ہمہ وقت بے چینی کی لہریں امنڈتی رہتی تھیں۔ وہ بولتا تو اس کے لہجے میں لڑکھٹاہٹ ہوتی تھی۔ سردی کی مناسبت سے اس نے شلووار قمیص پر گرم اپر پہن رکھا تھا۔ البتہ وہ ورکر اچھا تھا۔ غلام اور اس کے ذمے یہاں کی بیرونی اور اندرونی صفائی تھی۔ یہ جگہ شہر سے کچھ دور پہاڑوں میں تھی اور شہر جانے والی ہائی وے یہاں سے کچھ فاصلے سے گزرتی تھی۔

دو رقبے پر پھیلی ہوئی یہ جگہ کئی عمارتوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک عمارت میں غلام اور اس جیسے لوگ رہتے تھے جو یہاں علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ علاج گاہ میں رہتا تھا مگر وہ علاج کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس کی رہائش لکڑی سے بنے ایک چھوٹے سے کیمپن میں تھی۔ عمارتوں، درختوں اور باغات کے گرد ایک بڑا سا احاطہ تھا اور کیمپن اسی احاطے کے ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ تھا۔ ڈیوٹی

کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا۔ وہ صبح ناشتے کے بعد کام میں لگ جاتا اور شام تک کام کرتا رہتا تھا۔ کھانا میس میں ملتا تھا۔ باقی سب وہیں کھاتے تھے لیکن اس کا دل چاہتا تو اپنے لیے پیک کروا کر لے آتا اور اپنے کیمپن میں کھاتا تھا۔ باقی سب میس میں کھانے کے پابند تھے۔ آٹھ بجے ان کی عمارت کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔

وہ آزاد تھا۔ جب دل چاہتا اپنے کیمپن سے نکل آتا اور احاطے میں موجود جنگل میں کھومتا پھرتا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو احاطے سے نکل کر قریبی پہاڑیوں اور چٹانوں تک بھی چلا جاتا۔ یہاں ایک وسیع چٹان تھی جس کے اوپر جانا آسان نہیں تھا مگر اس نے راستہ تلاش کر لیا تھا۔ چٹان کے اوپر سے سورج طلوع ہونے اور ڈوبنے کا نظارہ ایک ناقابل بیان تجربہ ہوتا تھا اور ہر بار جب وہ اس تجربے سے گزرتا تو اسے بالکل نیا سا لگتا تھا۔ یہ جگہ ڈاکٹر اطہر وقار... کی تھی۔ ڈاکٹر اطہر تقریباً ساٹھ سال کا، نرم چہرے اور ہمدرد طبیعت والا شخص تھا۔ وہ سائیکا ٹرسٹ تھا اور اس نے یہاں اپنی علاج گاہ قائم کی تھی۔ وہ یہاں آنے والے مریضوں کا پوری توجہ سے علاج کرتا تھا اور اس نے عام نفسیاتی علاج گاہوں کے مقابلے میں یہاں کا ماحول بالکل منفرد رکھا تھا۔ ویسے یہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ مشکل سے ایک درجن افراد تھے۔

عملے میں ڈاکٹر کے علاوہ دو اس کے نائب تھے اور دو ہی پیرامیڈک کے افراد تھے۔ ان کا اصل کام قابو سے باہر ہو جانے والے مریضوں کو قابو کرنا تھا۔ ڈاکٹر سیفی اور ڈاکٹر زین صبح آتے اور شام کو چلے جاتے تھے۔ البتہ پیرامیڈک سلطان اور رفیق یہیں رہتے تھے۔ ان کی رہائش مریضوں کی رہائشی عمارت کے ساتھ ہی تھی۔ اسپتال کی عمارت الگ تھی۔ ایک اور عمارت تھی جو دفتر کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر اطہر کی رہائش شہر میں تھی اور وہ ہفتے میں چار دن دو دو گھنٹے کے لیے یہاں آتا تھا۔ البتہ کسی ایمرجنسی میں اس کی ضرورت پڑتی تو وہ ایک گھنٹے میں آ جاتا تھا۔ احاطے کے گیٹ کے ساتھ چوکی میں گارڈز ٹمس رہتا تھا۔ اس کی بھی چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ باورچی شوکت اور اس کا نائب صبح آتے اور رات کو جاتے تھے۔ یہاں کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی اس کے اور غلام قادر کے سپرد تھی۔ کبھی کبھی کوثر نامی آدمی بھی آ جاتا مگر ہفتے میں ایک دو دن ہی اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی تھی۔ اسے لرزہ طاری رہتا تھا۔ اس کیفیت میں اس سے کھانا بھی نہیں کھایا جاتا تھا اور اسے کھانا کوئی اور



جوان اور خوب صورت شخص اکثر اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ جب اسے دورہ پڑتا تو وہ بہت مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ اسی بنا پر اسے بہت کم کمرے سے باہر آنے کی اجازت ملتی تھی۔ کن افراد کو باہر نکالنا ہے اور کن کو ان کے کمروں میں رکھنا ہے، یہ فیصلہ ڈاکٹر سیٹی اور ڈاکٹر زین کرتے تھے۔ وہ سلطان اور رفیق کو ہدایت دیتے اور وہ عمل کرتے تھے۔ جب مریض باہر ہوتے تو وہ ان کے آس پاس ہی موجود رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ میس میں موجود بہت چوکنا تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی بالکل... پُر سکون نظر آنے والا فرد اچانک ہنگامہ آرائی پر اتر آیا یا اسے دورہ پڑ گیا تو سلطان اور رفیق کو فوری طور پر حرکت میں آنا پڑتا تھا۔ وہ اور غلام اپنے لیے دال چاول اور منکر فرانی لے کر ایک میز پر آگئے۔

باورچی شوکت کھانا اچھا بناتا تھا۔ ڈاکٹر اطہر کا کہنا تھا کہ اچھی صحت کے لیے اچھی خوراک لازمی ہے۔ ناشتے میں انہیں ابلّا ہوا انڈا، دودھ کا گلاس اور شہد لگے سلاکس دیے جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے میں دال، چاول اور کوئی سبزی ہوتی تھی جبکہ رات کو چکن، بیف، مٹن یا فیش کی کوئی ڈش ہوتی تھی۔ ہفتے میں تین بار رات کو سوٹ ڈش بھی دی جاتی تھی۔ یہ متوازن خوراک مریضوں کی صحت کے لیے بہترین تھی۔ جب وہ یہاں آیا تو اس کی صحت بہت گری ہوئی تھی اور اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں مگر اب وہ تقریباً پہلے جتنا صحت مند تھا۔ غلام یہ ظاہر تو کھانے میں لگ گیا مگر اس کی اضطرابی کیفیت مزید بڑھ گئی تھی۔ اس نے اچانک دھیمی آواز میں کہا: ”وہ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں... کیا تم نے کبھی محسوس نہیں کیا؟“

”نہیں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر کہا اور پھر خاموشی سے کھانے لگا۔ کھانے کے بعد وہ میس سے نکلا اسے یاد آیا کہ دفتر والی عمارت کے کچھ حصے صاف کرنے تھے۔ پہلے اس نے غلام کو ساتھ لینے کا ارادہ کیا مگر پھر اس نے سوچا کہ چھوٹا سا کام ہے وہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ اس نے صفائی کا سامان لیا اور عمارت میں آیا۔ اس نے پہلے ان دو کمروں کی صفائی کی جہاں ڈاکٹر سیٹی اور ڈاکٹر زین بیٹھتے تھے۔ یہاں صرف فائلیں تھیں یا دفتری سامان تھا۔ اسپتال میں مختلف آلات اور مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ جب ان مشینوں اور آلات کو دیکھتا تو اسے عجیب سا خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتا کہ وہ مریض نہیں ہے ورنہ اسے بھی ان مشینوں اور آلات کی تھرپائی سے گزرنا پڑتا۔ اسے

کھلاتا تھا۔  
سرما ختم ہونے کے قریب تھا اور درختوں اور پودوں پر نئے پتے نمودار ہو رہے تھے مگر سردی ابھی برقرار تھی۔ گرم کپڑوں کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے چھ مہینے ہونے والے تھے۔ اس عرصے میں وہ یہاں کی ایک ایک چیز سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ کم سے کم وہ جہاں کام کرتا ان جگہوں کو جاننے لگا تھا۔ سوائے دفتر کی عمارت کی ایک راہداری کے جہاں اسے یا کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شروع میں اسے یہاں وحشت سے ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ اس کا دل لگ گیا۔ یا شاید اس نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ آج صبح ناشتے کے بعد اس نے غلام سے کہا کہ آج وہ عقبی باغ کی صفائی کریں گے۔ غلام کسی بات سے انکار نہیں کرتا تھا۔ وہ صفائی کے سامان کے لیے مخصوص اسٹور تک آئے اور وہاں سے سامان لے کر انہوں نے صفائی کا عمل شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ باغ کے آخری حصے تک چلے آئے۔ یہاں سے ہانکی وے اور اس کے ساتھ گزرتے بجلی اور فون کے کھمبے اور تار دکھائی دیتے تھے۔ غلام کن انکھیوں سے اسی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا کہ غلام نے کہا: ”وہ ہر وقت ہمیں دیکھتے ہیں۔“

”کون؟“  
مگر غلام نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے ٹرائی چلا رہا تھا۔ تب اس نے دیکھا دور ہانکی وے کے ساتھ ایک کھمبے پر ایک آدمی چڑھا ہوا ہے اور... یہ ظاہر وہ وہاں مرمت کا کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس اوزاروں والا بیگ بھی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا غلام نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا ہے مگر کوئی ان کی گمرانی کیوں کرے گا اور وہ بھی اس طرح سے۔ لُج کا وقت قریب تھا۔ اس نے غلام کے ساتھ مل کر کچرا احاطے میں موجود ایک گڑھے میں ڈالا۔ یہ کچرے کے لیے مخصوص تھا اور جب کچرا ایک حد سے زیادہ ہو جاتا تو وہ اسے آگ لگا دیتے تھے۔ اس میں جمع ہونے والی راکھ وہ پودوں اور درختوں میں ڈالتے تھے۔ واپسی میں اس نے غلام سے پوچھا۔

”تم نے یہ بات کیوں کی؟“  
اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں۔“  
انہوں نے سامان واپس اسٹور میں رکھا۔ وہ میس میں آئے وہاں دو افراد نہیں تھے اور اس کا مطلب تھا کہ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ انہیں ان کے کمروں سے باہر آنے کی اجازت ملتی۔ ان میں ایک رفیع زمان بھی تھا۔ یہ



ان کے منتشن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اس کے باوجود اسے ان سے خوف آتا تھا۔

کمرہ کی صفائی سے فارغ ہو کر وہ راہداری میں آیا اور ڈاکٹر اطہر کے دفتر کی طرف بڑھا جو راہداری کے سرے پر تھا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے پہلی بار اس دروازے کو کھلا دیکھا۔ یہ دھات کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے اوپری حصے میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے یہ دروازہ ہمیشہ مقفل دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازے کے اندر ایک طویل سرنگ نما راہداری تھی جو آگے جا کر دائیں طرف مڑ رہی تھی مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سرنگ کہاں جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ سرنگ نما راستہ اسپتال والی عمارت کو دفتر کی عمارت سے ملاتا تھا۔ جب اس نے پہلی بار صفائی کے دوران اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی اور وہ لاک ٹکا تو اس نے غلام سے وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا۔ ”یہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ یہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”تب یہاں کی صفائی کون کرتا ہے؟“

غلام کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیشہ اس دروازے کو مقفل دیکھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ جب اس نے یہ دروازہ کھلا پایا۔ وہ آگے آیا اور اس نے اندر جھانکا۔ اسے وہی منظر دکھائی دیا جو دروازے کے اوپر لگے شیشے سے جھانکنے پر نظر آتا تھا۔ یہ ایک چوکور سرنگ تھی۔ سرنگ کوئی چار فٹ چوڑی، سات فٹ اونچی اور کوئی تیس فٹ لمبی تھی۔ اس کے بعد یہ دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ سرنگ میں ہر دس قدم کے بعد ایک سیٹنگ لائٹ تھی۔ وہ ہچکچایا پھر اندر آیا۔ صفائی کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے محسوس کیا کہ سرنگ کی بہت کم صفائی ہوتی تھی۔ اندر گرد مٹی تھی اور دیواروں پر بھی جالے لگے ہوئے تھے۔ اس نے بالٹی رکھی اور جھاڑن لے کر ایک طرف دیوار پر لگے جالے صاف کرنے لگا کہ اچانک ڈاکٹر اطہر اندر سے نمودار ہوا اور اسے دیکھ کر رک گیا۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر نرمی سے بات کرتا تھا مگر اس وقت اس نے رکھائی سے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں صفائی کرنے آیا تھا۔ یہ دروازہ کھلا دیکھا تو رک گیا۔ یہاں بہت گندگی ہو رہی ہے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔

مگر ڈاکٹر نے اس کی وضاحت نہیں سنی۔ ”یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ دروازہ کھلا ہو تب بھی کوئی

یہاں نہیں آ سکتا۔“

ڈاکٹر اطہر کا اشارہ واضح تھا۔ اس نے سامان اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر بھی باہر آیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اسے چابی سے لاک کر دیا اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اسے ڈاکٹر کا رویہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر کو اس کا یہاں رک کر کھلے دروازے کو دیکھنا اور اندر جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے شانے اچکائے اور سامان لے کر عمارت سے نکل آیا۔ سامان رکھ کر وہ اپنے کیمین میں آ گیا۔ یہ ایک کمرے اور ایک واش روم پر مشتمل کیمین تھا۔ ایک تار کی مدد سے یہاں بجلی آرہی تھی۔ اندر آ کر اس نے روشنی کی اور ایک طرف لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کی شید کی قدر بڑھی ہوئی تھی۔ اب وہ ریزر نہیں پھیرتا تھا بلکہ ہفتے میں دو بار باریک مشین پھیر لیتا تھا۔ شروع میں اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں کے گرد حلقے ہوا کرتے تھے مگر اب وہ بہتر لگ رہا تھا۔

اسے پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے پانی پیا اور باہر کیمین کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ اسے یہ جگہ اچھی لگتی تھی کیونکہ اس کے سامنے چھوٹا سا جنگل تھا۔ اس میں یوکلپٹس اور چھوٹے سدا بہار کے درخت لگے تھے۔ درمیان میں پگ ڈنڈیاں تھیں۔ جنگل کے پار وہ راستہ تھا جو احاطے کے گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ گیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اچانک آسمان پر زور سے بادل گرے۔ اس نے اوپر دیکھا بادل دور مغرب میں تھے اور یہاں آسمان صاف تھا مگر بادلوں کو یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ دس منٹ میں آسمان کا لے بادلوں سے بھر گیا۔ پہلے ہلکی بوند باندی ہوئی اور اس کے بعد بارش تیز ہو گئی۔ پانی خاصا سرد تھا اس لیے اسے اٹھ کر اندر آنا پڑا۔ اسے بارش اور تاریک موسم اچھا نہیں لگتا تھا۔

اس نے سوچا کہ آج پچھلے باغ کی صفائی کر کے اچھا کیا اور نہ بھیگے پتے اور کچرا صاف کرنا مشکل ہو جاتا۔ شام تک وہ آرام کرتا رہا۔ چھ بجے بارش رک گئی مگر بادلوں کے گھنے پن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی دوبارہ بارش شروع ہو جائے گی۔ سات بجے بارش پھر شروع ہوئی مگر اس بار اس کا اندازہ دھیمہ تھا۔ رات کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کیمین سے نکلا اور اپنی جیکٹ کا ہڈ سر پر رکھ کے تیز قدموں سے میس تک آیا۔ وہ اندر آیا تو وہاں رقع موجود تھا۔ وہ اسی کی میز پر آ گیا۔ ”دوپہر میں تم نہیں آئے تھے؟“



پر در در پڑ جاتا۔ اس لیے اس نے اپنے اوپر قابو پایا ورنہ شاید اس کی زبان سے نکل جاتا۔ کھانے کے بعد اس نے شوکت اور اس کے نائب کی مدد کی اور کچن صاف کیا۔ رات میں چائے اور کافی بھی دی جاتی تھی۔ اس نے اپنے لیے پیک ہونے والے کاغذی کپ میں کافی لی اور اپنے کیمین کی طرف آیا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ خنک ہوا کے تیز جھونکے آرہے تھے۔ اس نے اندر آ کر اپنا کپ کھولا اور کافی کی گرمی اور خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اسے ہمیشہ سے کافی پسند تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے تو بہت کچھ پسند تھا مگر وہ سب اسے واپس نہیں مل سکتا تھا۔ کیوں نہیں مل سکتا تھا؟ یہ سوال اکثر اس کے ذہن میں آتا اور اس کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ دنیا کے لیے مرچکا تھا۔ کیمین کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے خنک ہوا کے جھونکے اچھے لگ رہے تھے اس لیے اس نے دروازہ بند نہیں کیا اور اسی لیے ڈاکٹر عزیز کو اندر آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کا لمبا کوٹ پانی میں شرابور تھا مگر وہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس نے اندر آ کر اپنا کوٹ جھاڑا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے تم اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں بروقت آیا نا؟“

”تم ہمیشہ بروقت آتے ہو۔“ قیصر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”یہ میرا فرض ہے کہ تمہیں غلط سوچوں اور غلط عمل سے محفوظ رکھوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے کیونکہ میں نے ہی تمہیں یقینی موت کے پھندے سے بچایا اور یہاں پہنچایا۔“

”کاش کہ تم ایسا نہ کرتے۔“

ڈاکٹر عزیز اس کے سامنے کرسی پر ٹک گیا۔ ”یہ ضروری تھا کیونکہ تم سزائے موت کے حق دار نہیں تھے۔“ قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے مجھے بتایا کہ یہ سب ایک خصوصی حکم نامے کے تحت ہوا۔ تم نے وہ حکم نامہ کیسے حاصل کیا؟“

”میڈیکل بنیادوں پر۔“ ڈاکٹر عزیز نے جواب دیا۔ ”تم بھول رہے ہو، میں شروع سے تمہارا ڈاکٹر رہا ہوں۔ میرے پاس تمہاری مکمل میڈیکل ہسٹری رہی ہے۔“

”لیکن اس طرح سے دنیا کو دھوکا دے کر مجھے یہاں بھیج دینا؟“

”یہ ضروری تھا ورنہ آغا نجم الدین کے لواحقین اسے پھر کوٹ تک لے جاتے۔ اسی وجہ سے تمہاری شناخت بھی بدلی گئی۔“

”ہاں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ رفیع زمان نے کہا۔ ”اب بھی میرے پاؤں میرے قابو میں نہیں ہیں۔“

”میں تمہارے لیے بھی کھانا لے آتا ہوں۔“ اس نے پیشکش کی اور اٹھ کر کچن تک آ گیا۔ شوکت نے آج مٹن کڑا ہی بنائی تھی۔ اس کے ساتھ روٹیاں اور سلا تھی۔ اس نے اپنے ساتھ رفیع کے لیے بھی کھانا لیا اور میز پر آ گیا۔ کھانے کے دوران رفیع زمان نے اسے آگاہ کیا۔

”میں زیادہ عرصے یہاں نہیں رہوں گا۔ جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”بس تم دیکھ لینا۔“ اس بار رفیع کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ ”یہ لوگ مجھے زیادہ دیر قید نہیں کر سکیں گے۔“

کچھ عرصے پہلے رفیع عمارت سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا اور وہ اس چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے بہت پسند تھی۔ سلطان اور رفیق نے عین موقع پر اسے جالیا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے قابو کیا تھا کیونکہ وہ صحت مند اور مضبوط آدمی تھا، بالکل قیصر کی طرح۔ اس نے دیکھا کہ سلطان اور رفیق اسے دیوچ کر لارہے تھے مگر وہ اتنی بری طرح چل رہا تھا کہ مجبوراً ڈاکٹر زین کو اسے باہر ہی بے ہوشی کا انجکشن دینا پڑا۔ اس نے سلطان اور رفیق کو زخمی کر دیا تھا۔ جب وہ بے ہوش ہوا تب وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور پھر اسے کئی ہفتے تک باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس نے رفیع کو سمجھایا۔ ”ایسی باتیں مت کرو ورنہ یہ تمہیں ایک بار پھر قید کر دیں گے۔“

”مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔“ رفیع کے لہجے میں حقارت آگئی۔ ”یہ مجھے نہیں روک سکتے اور مجھے اپنے پیاروں سے دور نہیں رکھ سکتے۔“

”تم اس چٹان پر کیوں جا رہے تھے؟“

”کیوں جا رہا تھا۔“ رفیع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ میں اپنے پیاروں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

وہ پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ وہ تھے کہاں؟ اسے یاد آیا اس نے کسی سے سنا تھا کہ اس نے کسی بات پر مشتعل ہو کر اپنے بیوی بچوں کو مار دیا تھا اور میڈیکل بورڈ نے اسے نفسیاتی مریض قرار دیا تھا۔ اسے سزا سنانے کے بجائے اسپتال بھیج دیا اور وہاں سے اسے سہاں بھیجا گیا تھا۔ رفیع تقریباً اس کے ساتھ آیا تھا۔ جب رفیع کو بتایا جاتا کہ اس کے بیوی بچے مر گئے ہیں تو وہ مشتعل ہو جاتا اور پھر اس



”تمہاری جان بچانے کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔“ ڈاکٹر عزیز نے ہمیشہ کی طرح حتمی جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ”یاد رکھنا اب ماضی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”یہاں مجھے کس حیثیت سے بھیجا گیا ہے کیونکہ یہاں کوئی مجھے قیصر جمال کے نام سے نہیں جانتا۔ سب مجھے جہانگیر احمد سمجھتے ہیں۔ میں یہاں مریض نہیں ہوں کیونکہ مجھے مریضوں والی عمارت میں پابند نہیں رکھا گیا اور میں یہاں ملازم بھی نہیں ہوں کیونکہ مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔ میں اپنی مرضی سے کام کرتا ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے یہاں؟“

”تم نے ٹھیک کہا۔ تم نہ مریض ہو اور نہ ملازم ہو لیکن تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور تم اسی وجہ سے بچے ہوئے ہو۔ سوچو اگر تمہاری حقیقت سامنے آجائے تو کیا تم کو دوبارہ تختہ دار پر نہیں چڑھا دیا جائے گا؟“

قیصر کو جھٹکا سا لگا۔ یہاں آنے کے بعد یہ ڈاکٹر عزیز سے اس کی دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب اسے ایک وین میں ہوش آیا اور ڈاکٹر عزیز اس کے پاس تھا۔ وہ سمجھا کہ یہ خواب تھا جو اس نے دیکھا تھا مگر ڈاکٹر عزیز نے اسے بتایا کہ نہ یہ خواب ہے اور نہ وہ خواب تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ اسے سچ سچ پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا تھا مگر ساتھ ہی ایسا بندوبست کیا گیا تھا کہ اس کی موت واقع نہ ہو۔ جیل کے ڈاکٹر کے بجائے ڈاکٹر عزیز نے اس کی موت کی تصدیق کی اور کسی نے شک نہیں کیا۔ اس نے آئینے میں اپنے گلے پر آنے والا رسی کا نشان دیکھا تو اسے یقین آیا۔ اس نے اس وقت بھی یہی سوال کیے تھے جو آج کیے تھے اور اس وقت بھی ڈاکٹر عزیز نے یہی جواب دیے تھے۔ پھر اس نے اسے ڈاکٹر اطہر کی علاج گاہ میں اس کے حوالے کیا۔

اس نے راستے میں ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اب وہ جہانگیر احمد ہے اور اسے یہاں یہ طور مددگار رکھا جائے گا۔ وہ اپنے بارے میں کسی سوال کا جواب نہ دے اور نہ ہی کوئی اس سے سوال کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر اطہر نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اسے اگلے ہی دن اس کیمین میں رہائش دے دی گئی۔ اس کے ذمے کوئی کام نہیں تھا۔ ڈاکٹر اطہر نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنے لیے جو ذمے داری چاہے چن لے اور اسے اپنی مرضی سے نبھائے۔ وہ کسی کا ماتحت نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی اسے کسی قسم کا حکم یا ہدایت دے گا۔ پھر سچ سچ ایسا ہی ہوا۔ آغاز میں وہ بہت جھجک رہا

تھا مگر رفتہ رفتہ اس نے ایک قسم کی آزادی محسوس کی۔ وہ جہاں چاہتا آجاسکتا تھا، کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ تین وقت اسے میس کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ اسے دن میں کئی بار جائے بیٹنے کی عادت تھی۔ اسے چائے بنانے کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ کیمین میں ایک برقی مشین تھی، وہ اس میں چائے بناتا تھا۔ اس کے پاس چند برتن تھے۔ جب وہ اپنا کھانا پیک کر کے لاتا تو ان برتنوں کو استعمال کرتا تھا۔ اسے ہر شے میسر تھی۔ اس کے علاوہ اسے جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ لکھ کر ڈاکٹر اطہر کو دے سکتا تھا اور اسے جلد ہی وہ چیز فراہم کر دی جاتی۔ شروع میں اسے یہاں رہنا کھانا پینا اور چیزیں لینا عجیب سا لگتا تھا مگر جب اس نے یہاں اپنی ذمے داری سنبھالی تو وہ مطمئن ہو گیا کہ اسے جو مل رہا تھا، وہ اس کا حق تھا۔ پہلے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اسے کبھی ضرورت محسوس ہوئی لیکن ایک دن ڈاکٹر اطہر نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر ایک لفافہ دیا۔ اس نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”کچھ رقم ہے۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

ڈاکٹر اطہر نے اصرار کیا۔ ”ممکن ہے تمہیں کہیں ضرورت پڑ جائے۔“

اس نے شکریہ ادا کر کے لفافہ لے لیا۔

اس کے باوجود وہ شروع دنوں میں بہت بے چین رہا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے اور ہمارے یہاں ایسا کب ہوتا ہے کہ کسی کو پھانسی کے پھندے سے اتار کر اس کی شناخت بدل کر کہیں بھیج دیا جائے۔ جب ڈاکٹر عزیز اسے یہاں چھوڑ کر گیا تو بہت دنوں تک اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ آزاد ہے۔ ایک بار وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکلا اور اسے کسی نے نہیں روکا۔ وہ ایسے ہی بلا مقصد آس پاس گھومتا رہا۔ اس کے بعد اس کا اعتماد کسی قدر بحال ہوا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو وہ آس پاس گھومنے چلا جاتا تھا۔ ہائی وے کے ساتھ چند گھر تھے اور یہاں سے گزرنے والوں کے لیے چند دکانیں تھیں۔ وہ وہاں چلا جاتا تھا۔ وہ لکڑی کی بیچ پر بیٹھ کر گزرتی گاڑیوں کو دیکھا کرتا تھا۔

اگلے دن موسم بہت صاف تھا اور تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا میں دھلی ہوئی تازگی تھی۔ ناشتے اور کام سے فارغ ہو کر اس نے باہر جانے کا سوچا اور احاطے سے نکل آیا۔ احاطے سے باہر جانے کے لیے نیم کپڑا راستہ تھا۔ اس میں ٹائروں والی جگہ کچی تھی۔ درمیان اور کناروں پر گھاس لگی



ہوئی تھی۔ وہ درمیانی گھاس پر چلتا ہوا ہائی وے تک آیا۔ موسم صاف ہونے کی وجہ سے ہائی وے پر ٹریفک رواں تھا۔ وہ اسٹور تک آیا اور اس کے آگے فٹ پاتھ پر لگی بیچ پر بیٹھ گیا۔ چند ایک گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء لے رہے تھے۔ ایک آدمی اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ جب سے قیصر یہاں آیا تھا، اس نے اخبار نہیں دیکھا تھا۔

اسٹور سے دو بچے اور ایک عورت نکلی۔ وہ اس گاڑی کی طرف آئے۔ آدمی نے اخبار تہ کر کے نزدیک موجود ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ جیسے ہی عورت اور بچے بیٹھے اس نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ پہاڑوں کی طرف تھا۔ کچھ دیر میں باقی کاریں بھی وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ قیصر کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ڈسٹ بن کی طرف بڑھا اور اس میں سے اخبار نکال لیا۔ اخبار تازہ تھا اور آدمی نے شاید راستے میں لیا تھا۔ قیصر نے اسے لپیٹ کر اپنے اپر کے اندر کر لیا۔ وہ واپس احاطے کی طرف چل پڑا۔ ہائی وے کسی قدر بلندی پر تھی مگر یہاں سے احاطے کی عمارتیں بہ مشکل ہی دکھائی دیتی تھیں۔ اسے غلام کی بات یاد آئی اور اس نے سر جھٹکا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی کھمبوں پر چڑھ کر صرف ہماری نگرانی کرے۔“

وہ ست قدموں سے راستے کے بیچ میں اگی نم گھاس پر چل رہا تھا کہ عقب سے ہارن کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سرخ کار تھی جس میں ایک سرخ چہرے والی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے ساکت پا کر لڑکی نے پھر ہارن دیا تو اس نے ایک طرف ہو کر راستہ دیا مگر لڑکی کار گزار کر لے جانے کے بجائے اس کے نزدیک آ کر رکی اور فرنٹ سیٹ کا شیشہ نیچے کر کے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”ایلیکسیوزی..... کیا یہ راستہ ڈاکٹر اطہر کی علاج گاہ تک جاتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ لڑکی نے جانے کے بجائے پھر سوال کیا۔ ”تمہارا تعلق بھی علاج گاہ سے ہے؟“ اس نے پھر سر ہلایا اور منہ سے اس بار بھی کچھ نہیں کہا۔ لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ ”آ جاؤ۔“

”نہیں شکریہ، میں چلا جاؤں گا۔“ اس نے کسی قدر جھجک کر کہا اور تب اس نے دیکھا بیچھے ایک سفید کوٹ اور بیگ رکھا ہوا تھا۔

لڑکی شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ ڈاکٹر تھی؟ وہ احاطے میں داخل ہوا تو کیمین کی طرف جانے

والے راستے پر مڑنے سے پہلے اس نے کار کو دفتر والی عمارت کے سامنے رکے دیکھا۔ اس نے اخبار لے جا کر کیمین میں اپنے بستر کے نیچے چھپا دیا۔ پھر وہ میس گیا۔ بیچ کے بعد وہ احاطے سے نکلا اور چٹان کی طرف آیا۔ چٹان شمال مغربی سمت میں تھی اور اس کے صرف ایک طرف سے راستہ تھا جس سے اوپر جایا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف چٹان بالکل عمودی اور گہری گھائی میں اتر رہی تھی۔ اس کا آخری حصہ ڈھلان جیسا تھا اور اس پر بہت احتیاط سے بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس پر بیٹھنے کے لیے آدمی کو خود طے کرنا پڑتا کہ اسے کتنا آگے جانا ہے۔ اندازے میں غلطی کی سزا خود اسے بھگتنا پڑتی۔ اوپر جانے والا راستہ بھی آسان نہیں تھا۔

وہ اوپر پہنچا تو سورج مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا۔ رات کی بارش نے چٹان کو دھو کر نکھار دیا تھا اور ڈھلان پر پھسل تھی اس لیے وہ بہت احتیاط سے آگے گیا اور جب اس نے محسوس کیا کہ آگے جانا خطرناک ہو سکتا ہے تو وہ وہیں بیٹھ گیا اسے خیال آیا کہ اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ گنوا چکا تھا۔ اپنی شناخت تک کھو بیٹھا تھا۔ اسے تعجب ہوا اس کے باوجود اسے زندگی کا اتنا خیال تھا کہ وہ اس چٹان پر احتیاط سے بیٹھ رہا تھا کہ کہیں حادثاتی طور پر نیچے نہ گر جائے کیا اپنا سب کچھ کھو کر بھی وہ زندہ رہنا چاہتا تھا؟ شروع دنوں میں جب وہ بہت مایوس ہوتا تھا تو ایک دن اس نے ڈاکٹر اطہر سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اگر آدمی کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے؟“

”زندہ رہنا چاہیے۔“ ڈاکٹر اطہر نے جواب دیا۔ ”کیونکہ زندگی اپنا جواز خود پیدا کر لیتی ہے۔“

”تب لوگ خود کشی کیوں کر لیتے ہیں؟“

”وہ اس مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اب زندگی میں ان کے لیے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔“

اس کے پاس جو تھا، وہ زندگی کے جواز کے لیے نا کافی تھا۔ اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ لیٹ گیا۔ چٹان کسی قدر گرم ہو گئی تھی اور یہ گرمائش اچھی لگ رہی تھی۔ اسے اونگھ آگئی۔ وہ چونکا تو گھڑی میں تین بج رہے تھے اور سورج اب مغرب کی طرف آگیا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے یہاں تھا۔ وہ چٹان سے اتر اور واپس آ رہا تھا کہ اسے اچانک نزدیک سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا تو اسے براؤن رنگ کا کسی قدر بڑے بالوں والا کتا دکھائی دیا۔ وہ اچھی نسل کا کتا تھا مگر اس کے گلے میں کوئی پٹا نہیں تھا۔ وہ بھونکا تو اس کا انداز دوستانہ تھا۔



قیصر اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھا تو کتا اس کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ اس نے محسوس کیا تو رک گیا اور بولا۔  
”جاؤ یہاں سے۔“

کتا بھونکا اور دم ہلانے لگا۔ قیصر پھر چل پڑا۔ کتا بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس بار اس نے اسے روکا نہیں۔ وہ احاطے میں داخل ہوا تو اسے وہاں پھیل محسوس ہوئی۔ وہ آگے بڑھا تو اسے سلطان اور رفیق تیز قدموں سے جنگل کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ ڈاکٹر سیفی کے ساتھ وہی لڑکی باہر موجود تھی اور اس نے سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔ قیصر کا اندازہ درست نکلا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ پہلے قیصر نے ان کی طرف جانے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر کے کہیں کی طرف بڑھ گیا۔ کتا یہاں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کہیں کے آس پاس خاموشی تھی مگر چند لمحے بعد یہ سناٹا ہنگامے میں بدل گیا۔ درختوں کی طرف سے شور اور چلانے کی آوازیں آئیں اور کچھ دیر بعد سلطان اور رفیق یوں نمودار ہوئے کہ انہوں نے رفیع زمان کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اس کے جملے لائینی تھے مگر اسے دیکھتے ہی اس نے تڑپنا اور چلنا بند کر دیا۔ وہ صاف لہجے میں بولا۔

”تم دیکھ لیتا میں ایک دن یہاں سے نکل جاؤں گا اور کوئی مجھے نہیں روک سکے گا۔ سنا تم نے.....“ جملہ مکمل کرتے ہی وہ پھر چلانے اور پھلنے لگا۔ سلطان اور رفیق بمشکل اسے قابو کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک طرف سے ڈاکٹر سیفی اور وہی لڑکی برآمد ہوئے۔ ڈاکٹر سیفی کے ہاتھ میں انجکشن تھا۔ اس نے آتے ہی انجکشن رفیع کے بازو میں اتار دیا۔ انجکشن گوشت میں لگا تھا، اس لیے اس کا فوری اثر نہیں ہوا مگر ایک منٹ بعد رفیع کی مزاحمت میں کمی آئی اور دو منٹ بعد وہ سلطان اور رفیق کے بازوؤں میں جھول گیا۔ وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور ڈاکٹر سیفی بھی ان کے پیچھے چلا گیا تھا البتہ لڑکی وہیں رکی رہی۔ اس کی توجہ رفیع کے بجائے قیصر کی طرف تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور بے تکلفی سے بولی۔

”میں شیماء ہوں، ڈاکٹر شیماء البصار۔“  
”جہانگیر احمد۔“ اس نے کسی قدر تاخیر سے جواب دیا کیونکہ وہ اپنا اصل نام بتانے جا رہا تھا۔  
”میں ڈاکٹر زین کی جگہ آئی ہوں۔“  
”ڈاکٹر زین کہاں گئے؟“

”ادارہ چھوڑ رہے ہیں، اب ان کی جگہ میں کام کروں گی۔“

وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر اطہر اور ڈاکٹر سیفی نے اس کے بارے میں اسے بتایا ہوگا۔ وہ مریض نہیں تھا مگر یہاں مقیم تھا۔ وہ چونکا شیماء کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے معذرت کی۔  
”سوری، میں نے سنا نہیں۔“

”میں کہہ رہی ہوں تمہارا کتا اچھا ہے۔“  
”یہ میرا کتا نہیں ہے۔“ اس نے کتے کی طرف دیکھا جو کہیں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ”نہ جانے یہ کہاں سے آ گیا ہے۔“  
شیماء کو تعجب ہوا۔ ”اچھا، انداز سے تو لگ رہا ہے جیسے تمہارا ہو۔ دیکھو کتنے بے تکلف اور نارمل انداز میں بیٹھا ہے۔“  
قیصر کو اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں دہرایا۔ ”یہ میرا کتا نہیں ہے۔“  
وہ کہتے ہوئے کہیں کی طرف بڑھا تھا کہ شیماء نے عقب سے کہا۔ ”پھر ملیں گے۔“

اس نے صرف سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ جو چیز اس کی نہیں تھی، اسے اس کا سمجھا جائے۔ وہ تاریکی چھانے سے پہلے باہر نہیں آیا۔ جب وہ باہر نکلا اور اس نے کہیں کے سامنے والی لائٹ روشن کی تو اس نے کتے کو وہیں پایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شاید واپس چلا گیا ہو۔ اس سے پہلے وہ کہیں رہتا ہوگا، کوئی اس کی دیکھ بھال اور اس کی خوراک کا انتظام کرتا ہوگا، کتا اسی کے پاس چلا جائے گا مگر وہ اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں قیصر نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بھونکا۔ اس کی آواز میں فریاد تھی۔ وہ بھونکا تھا اور کھانے کو مانگ رہا تھا مگر قیصر کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔  
”جاؤ یہاں سے..... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جہاں رہتے ہو وہیں چلے جاؤ۔“

مگر کتا بھونکا اور واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اس کا یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ شاید اس کا مالک اسے چھوڑ گیا تھا یا پھر وہ کسی گاڑی میں یہاں تک آیا تھا اور پھر یہیں رہ گیا تھا۔ کتا اچھی حالت میں تھا اور جب اسے ملا تب بھونکا بھی نہیں تھا مگر اب وہ بھونکا ہو رہا تھا۔ قیصر میس کی طرف آیا۔ ابھی ڈنر کی تیاری کا آغاز ہوا تھا۔ آج موسم کی مناسبت سے سوپ تیار ہوا تھا۔ غلام، شوکت کا ہاتھ بنا رہا تھا۔ آج سویٹ ڈش بھی تھی اور کام زیادہ تھا۔ قیصر میز پر بیٹھا تو غلام کچھ دیر بعد اس کے اور اپنے لیے سوپ لے آیا۔ آج اس کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ اس نے خوشی سے قیصر کو اطلاع دی۔ ”آج پورے چاند کی رات ہے۔ کیا تم میرے کمرے میں آؤ گے؟“



## بیاتیں داناؤں کی

☆ قائمے قوانین داناؤں اور جابروں نے  
کمزور دل رکھنے والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے  
بنائے ہیں۔

☆ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے  
وہ اس پر کبھی چڑھ نہیں سکتا۔

☆ سیانی بنی کتنی بھی چیتتی ہو، ماں باپ کی  
چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔

☆ غصہ جتنا کم ہوگا اس کی جگہ اداسی لیتی چلی  
جائے گی۔

☆ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں  
منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔

☆ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہوتا ہے جب  
اس کا سوار بزدل ہو جائے۔

☆ سانپ کا زہر کینٹلی میں، بچھو کا دم میں، بھڑکا  
زہر ڈنک میں ہوتا ہے اور پاگل کتے کا وہانے میں

..... انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا  
ہے۔

مرسلہ۔ عبد الجبار رومی انصاری، چوہنگ، لاہور

نے کھانا زیادہ مقدار میں دیا تھا۔ قیصر کو امید تھی کہ کتے کا  
پیٹ بھر جائے گا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ سویت ڈش اور کافی  
کے بعد وہ غلام کے ساتھ روانہ ہوا۔ سلطان کے ذمے دوسرا  
فلور تھا وہی سب کے کمرے بند کرتا تھا۔ اسے غلام کے  
ساتھ دیکھ کر وہ بولا۔ ”دروازہ کھولنے کب آؤں؟“  
”نوبچے کے بعد“ غلام بولا۔ ”ابھی تو چاند طلوع  
ہوا ہوگا۔“

”چاند طلوع ہو گیا ہے۔“ سلطان نے اطلاع دی  
اور ان کے کمرے میں جاتے ہی دروازہ باہر سے بند کر دیا۔  
غلام کے کمرے میں ایک بستر کے علاوہ ایک چھوٹی الماری  
اور ایک کرسی میز تھی۔ کھڑکی چھ فٹ سے زیادہ بڑی تھی اور  
اس میں فنکس شیشے کے پٹ لگے تھے۔ گرمیوں میں یہ پٹ  
کھول دیے جاتے تھے اور اندر کی طرف فلائی نیٹ لگا دی  
جاتی تھی۔ اس کی چوکھٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ چوڑی تھی  
اور وہ آرام سے اس پر بیٹھ سکتے تھے۔ قیصر اس کے ساتھ  
کھڑکی پر بیٹھا تو غلام نے دھیمے اور پراسرار لہجے میں کہا۔

غلام کا کمرہ دوسرے فلور پر تھا اور اس کی کھڑکی مشرق  
کی طرف کھلتی تھی اس لیے جب چاند طلوع ہوتا تو وہاں سے  
بہت صاف نظر آتا تھا۔ قیصر نہیں جانتا تھا کہ اسے چاند دیکھنا  
اتنا پسند کیوں تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”میں آؤں گا۔“

”ہم دونوں مل کر چاند دیکھیں گے۔“ غلام مزید خوش  
ہو گیا۔ ”تمہیں پتا ہے آج نئی ڈاکٹر آئی ہے اور وہ بہت  
خوب صورت ہے۔“

”میں لگاہوں۔ تم نے ٹھیک کہا وہ بہت خوب صورت ہے۔“  
”بالکل کسی تازہ کھلے گلاب کی طرح۔“ غلام نے سادگی سے  
شاعری کی۔ ”وہ مجھ سے بہت نرمی سے پیش آئی۔“

”اس کا مطلب ہے وہ سچ سچ بہت اچھی ہے۔“  
”مجھے ڈاکٹر زین پسند نہیں تھا۔ اچھا ہوا وہ یہاں سے  
چلا گیا۔“

”ڈاکٹر زین بھی اچھا آدمی تھا۔“  
”وہ اچھا نہیں تھا۔“ غلام نے اصرار کیا۔ ”وہ مجھ  
سے بہت برے انداز میں پیش آتا تھا۔“

قیصر جانتا تھا کہ غلام کو برداشت کرنا آسان نہیں  
ہے۔ اس کے وجود سے جیسے اضطراب کی لہریں پھوٹتی تھیں  
اور وہ دوسروں کو متاثر کر دیتا تھا۔ خود قیصر نے بڑی مشکل  
سے خود کو اس کا عادی بنایا تھا۔ وہ ایک بات بہت بار دہراتا  
تھا۔ اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اگلا آدمی سن سن کر پک چکا  
ہے۔ قیصر اس کی باتوں پر اتنی توجہ نہیں دیتا تھا مگر وہ ظاہر  
یہی کرتا کہ وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا ہے۔ سوپ  
کے بعد کھانا شروع ہوا۔ آج مشر آلو اور قیصر کی ڈش بنی تھی۔  
یہ قیصر کی فیورٹ تھی اور ہما بہت اچھا بناتی تھی۔ شوکت ویسا  
نہیں بناتا تھا مگر اس کا آلو مشرقیہ بھی مزے کا ہوتا تھا۔ جب  
وہ کھانا لے رہا تھا تو اس نے شوکت سے کہا کہ وہ بیچ جانے  
والا کھانا اسے کسی شاپر میں کر کے دے دیے۔ اس نے  
شوکت کو کتے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً مان گیا۔

”آج میں نے خاصی مقدار میں پکایا ہے۔ اکثر  
اوقات بیچ جاتا ہے، آج لازمی بیچے گا۔“ میں روٹی توڑ کر  
دے دوں گا۔“

جب اس نے کھانا کھالیا تو شوکت نے کاغذ کے ڈبے  
میں سالن اور توڑی ہوئی روٹی اسے دی۔ وہ کہیں تک آیا  
جہاں کتا بدستور اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ قیصر کی خوشبو محسوس  
کر کے وہ چوکنا ہو گیا۔ قیصر نے ڈبا کھول کر اس کے سامنے  
رکھا تو اس نے پہلے بھونک کر اس کا شکر یہ ادا کیا اور پھر بتابی  
سے کھانے لگا۔ وہ واضح طور پر کئی وقت کا بھوکا تھا۔ شوکت



ہے۔“ قیصر کھڑکی سے اتر آیا۔ ”یہ تمہارا وہم ہے کہ کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہے۔“

”میری بات کا یقین کرو۔“ غلام بھی کھڑکی سے اتر آیا اور اس نے ہتھی لہجے میں کہا۔ ”وہ ہماری نگرانی کرتے ہیں۔“ اس نے کہتے ہوئے قیصر کا بازو پکڑ لیا مگر قیصر نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور اسی لمحے سلطان نے باہر سے دروازہ کھول دیا۔ قیصر باہر آ گیا اور سلطان نے دروازہ بند کر دیا۔ عقب میں غلام مسلسل کہہ رہا تھا۔ ”وہ دیکھتے ہیں..... ہر وقت دیکھتے ہیں..... میری بات کا یقین کرو۔“

وہ چٹکی منزل سے گزر رہا تھا کہ اس نے رفع کے کمرے کے دروازے سے اسے جھانکتے دیکھا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر آواز نہیں آرہی تھی۔ قیصر بس اتنا سمجھ سکا۔ ”بہت جلد..... بہت جلد۔“ سلطان اس کے ساتھ تھا اس لیے وہ رک نہیں سکتا تھا اور وہ اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے عقب میں عمارت کا مرکزی دروازہ بند ہو گیا۔ وہ روشوں اور درختوں کے نیچے سے گزرتا ہوا کیمین تک آیا جہاں کتا برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کا ڈبا مکمل طور پر خالی کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھا اور برآمدے کی لکڑی کا کنارہ سوکھنے اور پنجوں سے کھرچنے لگا۔ اس نے اسے روکا۔ ”نہیں، ایسا مت کرو۔ اب جاؤ یہاں سے۔“

کتے نے منہ اٹھا کر اسے دیکھا اور ذرا آگے جا کر زمین کھودنے لگا۔ اس بار قیصر نے اسے سختی سے روکا۔ ”ایسا مت کرو، اگر کچھ آ رہا ہے تو وہاں جاؤ۔“ اس نے درختوں کی طرف اشارہ کر کے سخت لہجے میں کہا تو کتا رک گیا اور پھر سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ قیصر اندر آیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کا کیمین کھلا رہتا تھا، وہ آتے جاتے بس دروازہ بھیڑ جاتا تھا مگر اس وقت اس نے اندر سے دروازہ لاک کر دیا۔ آگے اور پیچھے کی کھڑکیوں پر پردے برابر کیے اور پھر بستر کے نیچے دبا ہوا اخبار نکالا۔ یہ چھ صفحے والا چھوٹا اخبار تھا۔ اسے لگا جیسے وہ نہ جانے کتنے عرصے بعد اخبار دیکھ رہا ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ یہاں چھ مہینے میں اس نے ایک بار بھی کوئی اخبار یا رسالہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ صفحے پلٹ رہا تھا۔ عام سی خبریں تھیں۔ جن سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی مگر اب وہ اسے اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے آخری صفحہ نکالا تو ایک تصویر پر وہ رک گیا۔

یہ شہر میں ٹریفک جام کی تصویر تھی۔ سڑک کے ایک طرف سے فوٹو گرافر نے یوں تصویر لی تھی کہ سڑک کے دوسری طرف کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری

”میں تمہیں چاند دکھانے نہیں لایا ہوں۔“

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر کیا دکھانے لائے ہو؟“

غلام کا لہجہ مزید پر اسرار ہو گیا۔ ”تم نے میری بات پر توجہ نہیں دی تھی کہ وہ نگرانی کرتے ہیں۔ آج میں تمہیں دکھاؤں گا کہ وہ نگرانی کرتے ہیں۔“

”کون ہیں وہ؟“

”میں نہیں جانتا لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ چوبیس گھنٹے ہمیں دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کو بھی ہمیں اکیلا نہیں چھوڑتے۔“

”میری کوئی نگرانی نہیں کرتا۔“

”کرتے ہیں لیکن تم جانتے نہیں ہو۔“ غلام نے یوں کہا کہ اسے غصہ آنے لگا وہ خود پر قابو پارہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”تم مجھے کچھ دکھانے کا کہہ رہے تھے؟“

”ہاں تبھی میں نے تمہیں نو بجے تک یہاں روکا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہو؟“ غلام نے دور ہائی وے کے ساتھ بنے ایک مکان کی اوپری منزل کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک کھڑکی روشن تھی۔ اوپر نظر آنے والی یہی واحد کھڑکی تھی۔

”یہاں کون ہے؟“

”وہ یہیں سے نگرانی کرتے ہیں۔“

”یہاں کوئی فیملی رہتی ہے اور وہ کیوں ہماری نگرانی کرنے لگے؟“

”ابھی تم دیکھ لو گے۔“ غلام نے کہا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے پیروں کے گرد سمیٹ کر بیٹھ گیا اور مسلسل مل رہا تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹی اضطراب کی لہریں جیسے شدید ہو گئی تھیں۔ قیصر نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس نے اکثر اس مکان کی بالکونی میں کسی عورت کو دیکھا تھا جو کبھی کپڑے لٹکا رہی ہوتی تھی اور کبھی کپڑے سینٹی تھی۔ بعض اوقات ایک مرد بھی نظر آتا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ رنگ رہا تھا۔ غلام کی نظر چاند اور قیصر کی نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ کبھی کبھی وہ چاند کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اسے بھی پورا چاند دیکھنا اچھا لگتا تھا مگر اس وقت اسے چاند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیسے ہی گھڑی نے نو بجائے تو کھڑکی سے آتی روشنی امد ہو گئی۔ غلام جو مل رہا تھا اور اس کی نظریں چاند پر مرکوز تھیں وہ اچھل پڑا۔ ”دیکھا..... دیکھا تم نے؟“

”ہاں۔“ قیصر کا لہجہ سرد تھا۔ ”میں نے دیکھا کہ روشنی بجھ گئی ہے۔“

”روز ٹھیک نو بجے یہ روشنی بند ہو جاتی ہے۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہاں جو رہتا ہے وہ نو بجے سو جاتا ہے یا پھر اس کمرے کی روشنی بند کر دیتا



”اٹھ گیا ہوں۔“

”میں غلام ہوں۔“ باہر سے آواز آئی۔ وہ اٹھا تو بھول گیا کہ اس کے سینے پر تصویر رکھی ہے۔ اخبار کا تراشا اڑا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتا وہ ہلکورے لیتا ہوا بستر کے برابر میں رکھے ریک کے نیچے مختصر سے خلا میں چلا گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر خلا کے نیچے انگلیاں ڈالنے کی کوشش کی مگر خلا بہت چھوٹا تھا اس میں انگلیاں جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس دوران میں غلام نے پھر دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ اب قیصر کو غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے چلا کر کہا کہ وہ آرہا ہے اور مزید دروازہ نہ بجایا جائے۔ غلام رک گیا مگر قیصر جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر موجود رہے گا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر ایک چچ اٹھا کر اس سے تصویر باہر نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر نہیں آئی۔ اس کے پاس فی الوقت ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے وہ تصویر باہر نکال سکتا۔ مایوس ہو کر وہ اٹھا، اس نے اپر پہنا اور باہر آ گیا۔ غلام سر جھکائے کھڑا تھا۔ قیصر کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

”میں رات دیر سے سویا تھا۔“ قیصر نے کہا۔ ”اس لیے میری آنکھ نہیں کھلی۔“

”ناشتے کا وقت نکل رہا تھا اس لیے میں تمہیں بلانے آ گیا۔ میں بہت دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔“

”آؤ۔“ قیصر نے ایک نظر کتے کو دیکھا، وہ ایک طرف لینا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ وہ اور غلام میس میں آئے جہاں ناشتے کا آخری دور چل رہا تھا۔ شوکت نے ان کا ناشتا نکالتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہارا کتا دیکھا ہے، اچھی نسل کا ہے۔“ قیصر اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا کتا نہیں ہے مگر اسے شوکت کے منہ سے یہ سن کر اچھا لگا اور اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ شوکت نے کہا۔ ”تم روز رات کو مجھ سے بچا ہوا کھانا لے جایا کرو۔ میرا خیال ہے، میں نے کل رات جو دیا تھا، وہ اس کے چوبیس گھنٹے کے لیے کافی ہوگا۔“

”ہاں، میں ابھی آیا تو وہ بھوکا نہیں تھا۔“ شوکت اپنے اندازے کی درستی پر خوش ہو گیا۔ ”آج میں اس کے لیے ہڈیاں بھی دوں گا۔ کتے ہڈیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ اس سے ان کے دانت اور جڑے بھی ٹھیک رہتے ہیں۔“

قیصر اس کا شکر یہ ادا کر کے میز پر آ گیا۔ اس نے غلام سے کہا۔ ”آج بارش کی نمی خشک ہو گئی ہوگی۔ ہم سامنے والا باغ اور جنگل صاف کریں گے۔“

طرف ایک عورت اور اس کے برابر میں ایک سات اٹھ سال کی بچی کھڑی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر نقین نہیں آیا۔ وہ ہما اور روما تھیں۔ وہ دوسری طرف کھڑی تھیں۔ رومانے سرخ رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کے شانوں پر اسکول بیگ کی اسٹریپ دور سے بھی نمایاں تھیں۔ یہ بیگ اسے قیصر نے لاکر دیا تھا۔ ہمانے سادہ سفید چادر پہن رکھی تھی اور وہ اپنے آپ پر چھائی سو گواریت سے بیوہ ہی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جانا پہچانا سیاہ ہینڈ بیگ تھا۔ وہ یقیناً روما کو اسکول سے لے کر آرہی تھی۔ قیصر کو سڑک اور اس کے پاس کے مناظر بھی جانے پہچانے لگے۔ گویا یہ اسی کا علاقہ تھا جہاں اس کا گھر تھا اور اس کا ایک مطلب تھا کہ ہما اور روما اب تک وہیں رہ رہے تھے۔

قیصر کے اندر طوفان سا اٹھا۔ اس نے اخبار ہاتھ میں دیوچ لیا۔ جب وہ یہاں آیا بلکہ لایا گیا تو اسے شروع میں ہما اور روما بہت یاد آتے تھے۔ ان کی یاد دل سے جاتی نہیں تھی۔ وہ خود کو نہ جانے کیسے قابو کرتا تھا کہ اب وہ واپس نہیں جاسکتا ہے۔ اگر وہ گیا تو بھی اس کا فائدہ نہیں ہوگا اور وہ پکڑا جائے گا اور لازمی سزائے موت پائے گا۔ رفتہ رفتہ اس نے خود کو پکا کر لیا کہ اب اسے اپنی باقی زندگی اسی احاطے میں بسر کرنی ہے اور باہر کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ مگر آج اخبار میں ہما اور روما کی تصویر دیکھ کر اسے لگا کہ وہ اب تک خود کو دھوکا دیتا آیا تھا۔ وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے اسی طرح بیٹھا رہا پھر وہ چونکا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ اس نے اٹھ کر منہ دھویا۔ پھر فیچر لی اور اخبار سے تصویر والا حصہ کاٹ لیا۔

اگرچہ یہاں کوئی نہیں آتا تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو پتا چلے کہ وہ یہاں اخبار لایا تھا۔ تصویر نکال کر وہ باقی اخبار لے کر باہر آیا اور درختوں کے درمیان اس نے اسے مارجس سے آگ دکھا دی۔ وہ ایسی جگہ تھا کہ آگ عمارتوں سے نہیں دیکھی جاسکتی تھی، خاص طور سے مریمضوں والی عمارت سے۔ وہاں سلطان اور رفیق تھے اگر ان تک آگ کی اطلاع پہنچ جاتی تو وہ تفتیش کے لیے آجاتے۔ لمحوں میں پورا اخبار راکھ ہو گیا۔ جب اس راکھ کی چنگاریاں بھی بجھ گئیں تو وہ اندر آ گیا۔ اس رات وہ دیر تک لینا تصویر دیکھتا رہا۔ پھر اسے سینے پر رکھے رکھے سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ تاخیر سے اور دسک سے کھلی۔ دسک خاصی دیر سے جاری تھی کیونکہ اس کی لے اب تیز تھی۔ اس نے آواز دی۔ ”ہاں،



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





صفائی سے روک دیا۔ اس نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”اس کی حالت فی الحال ایسی نہیں ہے کہ اسے کھولا جائے۔“

تب قیصر نے دروازے کے اوپری شیشے سے دیکھا۔ رفیع کو حفاظتی جیکٹ پہنائی گئی تھی تاکہ وہ خود کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہ ایک کونے میں سنا بیٹھا تھا اور اس کا سر مسلسل دائیں بائیں مل رہا تھا۔ قیصر نے دل میں افسوس محسوس کیا۔ اتنی اچھی پرسنالٹی والا شخص اس حال میں تھا۔ گہرے صدمے نے اسے ذہنی طور پر معطل کر دیا تھا۔ وہ خیالی دنیا میں جی رہا تھا اور دن رات اپنے مرجانے والے بیوی بچوں کے پاس جانے کا سوچتا تھا۔ جب اسے موقع ملا وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا تھا مگر اب تک اسے کامیابی نہیں ملی تھی۔ لُج تک اس نے اور غلام نے اسپتال کی بھی صفائی کر دی تھی۔ وہ تھک گیا تھا اس لیے اس نے سامنے والے باغ اور جنگل کی صفائی کا پروگرام اگلے روز تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ اسے کچھ ذاتی سامان کی ضرورت تھی۔ اس نے فہرست بنا کر ڈاکٹر اطہر کو دی اور وہاں سے نکل رہا تھا کہ ڈاکٹر شیماء سے سامنا ہو گیا۔ وہ سرنگ والے دروازے سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھنکی پھر جلدی سے بولی۔

”آج تم سے دوسری بار ملاقات ہو رہی ہے۔“

”میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کام سے آیا تھا۔“

قیصر نے کہا۔

”مجھے یہ جگہ اچھی لگی ہے۔“ شیماء اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اپنے شانوں سے نیچے آنے والے بال جھٹک کر چہرے سے ہٹائے۔ اس لمحے قیصر کو اس کی ہلکی سرمئی آنکھوں میں عجیب سا فسوں نظر آیا۔ وہ بلاشبہ حسین بھی اگر جانتی تو ماڈل بن سکتی تھی مگر اس نے ڈاکٹر بننے کو ترجیح دی تھی۔ سفید کوٹ بھی اس پر نچ رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر اس کے پاس نئے ماڈل کی کار تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی پریکٹس بہت اچھی چل رہی تھی یا پھر اس کا تعلق دولت مند خاندان سے تھا۔ قیصر کو دوسری بات درست لگی تھی۔ ورنہ اتنی سی عمر میں بہت زیادہ مالی کامیابی صرف بہت زیادہ خوش نصیبوں کو ہی ملتی ہے۔ قیصر نے کہا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں یہ جگہ پسند آئی۔“

”ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

قیصر ہنچکپایا پھر اس نے سر ہلایا۔ شیماء اسے اپنے دفتر میں لے آئی۔ سوائے ڈاکٹر اطہر کے تمام اسٹاف میس

غلام نے سر ہلایا پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے کل رات جنگل میں کچرا جلا یا تھا؟“

قیصر چونکا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”وہ..... میں نے وہاں راکھ دیکھی تھی۔“

”ہاں، میں نے کچھ کچرا جلا یا تھا۔“ قیصر نے دزدیدہ نظروں سے سلطان اور رفیق کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا۔ ”تم کسی سے ذکر مت کرنا۔ تم جانتے ہو جنگل میں آگ جلاتا منع ہے۔“

غلام نے صرف سر ہلایا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ آج دیر ہو گئی تھی۔ وہ پہلے عمارتوں میں آئے۔ دوپہر تک وہ وہیں مصروف رہے۔ وہ دفتر میں آیا تو وہاں ڈاکٹر شیماء اپنے کمرے میں موجود تھی۔ پہلے یہ کمر ڈاکٹر زین کے پاس تھا اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ”کیا تمہیں اس طرح کام کرنا اچھا لگتا ہے؟“

”ہاں، مجھے یہ کام اچھا لگتا ہے۔“

”حالانکہ یہ تمہاری حیثیت اور شخصیت سے کم ہے۔“

اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ میری حیثیت اور شخصیت کیا ہے لیکن یہ کام میں نے خود منتخب کیا ہے۔“

”تم پڑھ لکھے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”گریجویٹن کیا ہے۔“

”تب تم یہاں بہتر کام کر سکتے ہو۔“

وہ کچھ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”مجھے یہ کام پسند ہے۔“

ڈاکٹر شیماء میز کے پیچھے سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

”تمہیں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔“

قیصر نے سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ دفتری بلنڈنگ چھوٹی اور دو منزلہ تھی۔ یہاں کی صفائی سے وہ جلد نمٹ جاتے تھے۔ آج غلام کے حصے میں دوسرا فلور آیا تھا۔ قیصر نے اپنے فلور کا کام مکمل کر لیا۔ جب وہ راہداری کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو ایک لمحے کو رکا۔ پھر وہ باہر آیا اور بیچ پر بیٹھ کر غلام کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ڈاکٹر شیماء کی بات پر غور کر رہا تھا۔ اسے بھلا اس کی مدد کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی اور وہ خود یہاں ملازم بھی مگر اس کے انداز میں ذاتی دلچسپی تھی۔ قیصر جہاندیدہ آدمی تھا اور اسے سمجھتا تھا کہ شیماء اس میں کس انداز میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ورنہ ایک ڈاکٹر کو صفائی کرنے والے شخص سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ غلام اوپر والے فلور کی صفائی کر کے آیا تو وہ اسپتال والی عمارت کی طرف روانہ ہوئے آج مریضوں کے کمروں کی بھی صفائی کرنا تھی۔ سلطان نے اسے رفیع کے کمرے کی



میں ہی کھاتا تھا۔ وہ میس میں نظر نہیں آئی تھی۔ ”تم لُچ دفتر میں کرتی ہو؟“

”نہیں۔“ شیمانے کافی مشین میں کافی ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں لُچ نہیں کرتی اگر بھوک لگے تو بسکٹ لیتی ہوں۔“

شاید اپنا وزن ایک حد میں رکھنے کے لیے وہ لُچ نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ اس کا وزن کم ہی تھا۔ ہما کا بدن شادی کے بعد کسی قدر بھاری ہو گیا تھا مگر شیمانے جسم کی مالک تھی اور اس کے باوجود بھی اس میں نسوانی دل کسی موجود تھی۔ کافی بنانے کے دوران وہ اس سے بات کرتی رہی۔ اس سے اس کی دلچسپیوں اور کاموں کے بارے میں پوچھتی رہی۔ قیصر نے اسے بتایا کہ فارغ اوقات میں وہ ہائی وے کی طرف چلا جاتا ہے یا پھر چٹان پر جاتا ہے۔ چٹان کا سن کر شیمانے پر شوق انداز میں پوچھا۔ ”مشکل ہے یا عام آدمی بھی آسانی سے چڑھ سکتا ہے؟ مجھے بھی ہانکنگ کا شوق ہے مگر موقع نہیں ملتا ہے۔“

”اتنا مشکل نہیں ہے۔“ قیصر نے کہا۔ ”آج میرا جانے کا ارادہ ہے اگر تم چاہو تو چل سکتی ہو۔“

”میں چلوں گی۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”لیکن میں چار بجے آف کرتی ہوں۔“

”میں چار بجے باہر انتظار کروں گا۔“ قیصر نے کہا۔ شیمانے کافی کا گنگ اس کے سامنے رکھا۔ دوران گفتگو قیصر نے محسوس کیا کہ شیمانے کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ بہت مہارت سے سوال کر رہی تھی۔ قیصر کو سوچ سمجھ کر جواب دینے پڑ رہے تھے۔ کئی بار اسے جھوٹ بولنا پڑا حالانکہ اسے جھوٹ بولنے سے کوفت ہوتی تھی۔ کافی ختم کر کے وہ شیمانے کا شکریہ ادا کر کے باہر آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چٹان کی طرف جاتے وقت بھی اس نے اسی طرح کریدنا جاری رکھا تو اس کے لیے مشکل ہو جائے گی مگر اب وہ کہہ چکا تھا۔ وہ کمین کی طرف آیا تو کتا بے چین تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بھونکنے لگا مگر اس کا انداز کچھ طلب کرنے والا نہیں تھا۔ قیصر نے اسے چپ ہونے کو کہا مگر وہ بھونکتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے خبردار کرتا چاہ رہا ہو۔ مگر کس چیز سے؟ بھونکنے کے دوران میں وہ کبھی کبھی کمین کے سامنے زمین پر پہنچے بھی مارنے لگتا تھا۔

قیصر نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے اور اتارے ہوئے کپڑے لانڈری میں جمع کرادیے۔ سلطان لانڈری کا ذمے دار تھا۔ اس نے اپنی کاپی میں اس کے کپڑوں کا

اندراج کیا۔ قیصر نے اس سے پوچھا۔ ”جس کمین میں، میں رہتا ہوں، اس میں پہلے کون رہتا تھا؟“

”کوئی نہیں۔“ سلطان نے جواب دیا۔ ”یہ جگہ تھراپی کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی مریضوں کو یہاں رکھا جاتا تھا۔“

”کس قسم کی تھا۔ لی؟“

”پتا نہیں، میں کبھی وہاں گیا نہیں۔“ سلطان نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ قیصر نے سوچا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سلطان یا رفیق کسی تھراپی میں شامل نہ ہوں۔ بہت سے کام انہیں ہی کرنا پڑتے تھے مگر وہ اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔

”جب میں آیا تو مجھے یہ جگہ دے دی؟“

”سلطان نے سر ہلایا۔“ ہاں تم سے پہلے یہاں کوئی نہیں رہا۔ مریض بھی صرف تھراپی کی حد تک رکھے جاتے تھے۔“

چار بجنے والے تھے، وہ باہر آیا۔ احاطے کے گیٹ سے نکل کر وہ ہائی وے کی طرف جانے والے راستے پر وہاں تک آیا جہاں سے ایک چھوٹا راستہ چٹان کی طرف جاتا تھا۔ قیصر وہیں رک کر انتظار کرنے لگا۔ شیمانے کا کسی قدر تاخیر سے نمودار ہوئی۔ اس نے راستے پر ایک ایسی جگہ کار روکی جہاں سے آنے جانے والی گاڑیوں کا راستہ نہ نہ کرے۔ وہ نیچے اتری اور معذرت کی۔ ”سوری، ڈاکٹر سیفی نے روک لیا تھا کسی کام سے اس لیے دیر ہو گئی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ قیصر آگے بڑھا اور شیمانے کے ساتھ چلتے گئی۔ اس نے کوٹ اتار دیا تھا اور خالی شلوار سوٹ میں تھی۔ نیلی قمیض پر پیلے اور سرخ پھول پرنٹ تھے اور کسی قدر فنگ کا یہ لباس اس پر سج رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں سے دوپٹا بچا رہی تھی۔

”یہ جگہ کچھ سنسان نہیں ہے؟“

”کیا تمہیں خوف محسوس ہو رہا ہے؟“ قیصر چلتے چلتے رک گیا۔

شیمانے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہاں..... لیکن تم سے نہیں۔“

”انسان کو انسان سے ڈرنا چاہیے۔ باقی کوئی چیز اسے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”کیا اس میں انسان کی اپنی ذات بھی شامل ہے؟“

”انسان کو سب سے زیادہ خود سے ڈرنا چاہیے۔“

قیصر نے سر ہلایا۔ ”انسان کو سب سے زیادہ دھوکا خود اس کی اپنی ذات دیتی ہے۔“



یہ شعبہ چنا۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ آنے والے بارہ اپریل کو پورے پچیس کی ہو جاؤں گی۔ تنہائی پسند ہوں۔ بہت کم دوست ہیں۔ گھر میں بھی زیادہ تر گمن رہتی ہوں۔ صورت شکل کی کیسی ہوں، یہ دیکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔“

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں کوئی ناپسند نہیں کر سکتا۔“

وہ مسکرانے لگی۔ ”شکریہ، میں زیادہ گھلتی ملتی نہیں ہوں اس لیے گھر والے آدم بیزار کہتے ہیں۔“

”کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان بالکل بیزار نہیں ہو سکتا۔“ شیمانے اس کی بات کا بلا واسطہ جواب دیا۔

”میرا اندازہ تھا کہ تم دولت مند فیملی سے ہو۔“

”ہاں، ابھی میں نے زیادہ نہیں کمایا ہے۔ میرا اپنا کلینک ہے۔ میں شام پانچ سے رات آٹھ تک وہاں ہوتی ہوں۔ دو سال ہوئے ہیں، ابھی پریکٹس جمار ہی ہوں۔“

”اور یہاں؟“

”یہاں میں سیکھنے آئی ہوں۔ میری خوش قسمتی کہ ڈاکٹر اطہر نے میری درخواست قبول کی۔ میں ایک سال سے یہاں کام کرنے کی منتظر تھی۔“

قیصر حیران ہوا۔ وہ یہاں رضا کارانہ کام کر رہی تھی۔ یعنی اسے کوئی معاوضہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنی خوش قسمتی قرار دے رہی تھی۔ اس کی حیرت دیکھتے ہوئے شیمانے مزید وضاحت کی۔ ”ڈاکٹر اطہر کا شمار ملک کے نامور ترین ماہر نفسیات میں ہوتا ہے۔ وہ بین الاقوامی سطح پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔“

”یہاں ایسی کیا بات ہے؟ مجھے تو لگتا ہے یہاں بس کچھ لوگوں کو رکھا ہوا ہے۔“

”اس ادارے میں انہوں نے بہت خاص مریض رکھے ہیں۔ ہر ماہر نفسیات ان مریضوں کا علاج نہیں کر سکتا۔ علاج کرنا تو دور کی بات ہے، وہ ان کے مرض کی جڑ تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں میں جو سیکھوں گی، وہ مجھے یورپ یا امریکا میں سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔“

قیصر نے کہا۔ ”میں تو سمجھتا ہوں کہ یہاں کچھ خاص نہیں ہو رہا ہے۔“

”تم ڈاکٹر اطہر کے سیٹ اپ سے ناواقف ہو.....“ شیمانے بولتے بولتے رک گئی پھر اس نے کہا۔ ”اصل میں تمہارا تعلق ان چیزوں سے نہیں ہے۔ یقین کرو یہاں

”ہاں، انسان کو سب سے زیادہ دھوکا اپنی ذات سے ملتا ہے۔“ شیمانے تائید کی۔ وہ چٹان کے پاس آئے۔ شیمانے سر اٹھا کر دیکھا۔ ”بہت مشکل ہے۔“

”دیکھنے میں لگ رہی ہے اور پہلی بار مشکل ہوگی۔ ایک بار تم نے اسے سر کر لیا تو اس کے بعد یہ اتنی مشکل نہیں رہے گی۔“

”ہاں، مشکل ہمیشہ پہلی بار پیش آتی ہے۔“ شیمانے بولی تو قیصر اور پرچہ ہنسنے لگا شیمانے اس کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ جہاں کوئی مشکل جگہ آتی تو قیصر اسے سہارا دیتا۔ ایک پسٹل سے چھجے پر جو ایک فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا تھا، وہاں سے گزرنا شیمانے کو سب سے زیادہ مشکل لگا۔ آخری مرحلے پر اس کے قدم لڑکھڑائے مگر قیصر نے بروقت اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ قیصر کے سینے سے لگی کسی چیز کی طرح کانپ رہی تھی۔ بات ڈرنے کی تھی، اگر وہ نہ نہ بھلتی تو نیچے گہرائی کم سے کم پچاس فٹ تھی اور نیچے پتھر ہی پتھر تھے۔ پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ قیصر سے دور ہوئی تو اس کا چہرہ زیادہ سرخ ہو رہا تھا مگر قیصر کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر شیمانے کو اس کے بعد خلف محسوس نہیں ہوا۔ وہ چٹان کے اوپر پہنچے تو شیمانے ہانپ رہی تھی مگر قیصر کا سانس بالکل ہموار تھا۔ شیمانے کہا۔ ”تمہارا اسٹیمنا بہت اچھا ہے۔“

”میں عادی ہوں اور اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔“

قیصر نے کہا اور کنارے کی طرف بڑھا۔

”رک جاؤ۔“ شیمانے ساختہ بولی۔ ”یہ خطرناک ہے۔“

”نہیں ہے، میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔“

شیمانے محتاط قدموں سے آئی اور آخری دو قدم اس نے بیٹھ کر طے کیے۔ وہ قیصر کے برابر میں آئی۔ یہاں کسی قدر ہوا تھی اس کے بال اڑ رہے تھے۔ قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے میرے بارے میں سب پوچھ لیا مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

وہ مسکرانے لگی۔ ”تم نے محسوس کر لیا تھا؟“

”ہاں..... حالانکہ تم نے بہت مہارت سے سوالات کیے تھے۔“

”اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ مجھے سائیکلوسٹ بننے کا شوق تھا۔ اصل میں میرے آل فیملی ممبرز میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماما پاپا ڈاکٹر ہیں۔ میرے دو بھائی سرجن ہیں۔ ایک ہارٹ سرجن ہیں دوسرے نیورو سرجن ہیں۔ میری ایک سسٹر گانا کو لوجسٹ ہے اور میں نے



موجود ہر فرد چن کر لیا گیا ہے۔“

”میں نے کبھی اس بارے میں زیادہ سوچا نہیں۔“

”تم کس بارے میں زیادہ سوچتے ہو؟“

”پتا نہیں، شاید میں زیادہ سوچتا نہیں ہوں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان نہ سوچے۔“

”ہوسکتا ہے۔“ قیصر نے اس کی طرف

دیکھا۔ ”لیکن میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے زیادہ سوچنا

اچھا نہیں لگتا۔“

”اپنے ماضی کے بارے میں بھی نہیں؟“

”ماضی کے بارے میں سوچنا ہی تو اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“

”میں وضاحت نہیں کر سکتا۔“

شیمہ پاؤں کے انگوٹھے سے چٹان کی سطح کھرچنے

لگی۔ ”ایک پرسنل سوال کر سکتی ہوں؟“

”ہاں کرو۔“

”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

قیصر نے گہری سانس لی۔ ”ہاں کی ہے، اب بھی کرتا ہوں۔“

”وہ عورت.....“

”تم نے ایک سوال کا کہا تھا۔“ قیصر نے اس کی

بات کاٹی۔ اس نے بتا دیا کہ وہ اس موضوع کو ایک ہی

سوال تک محدود رکھے۔ قیصر کہہ کر لیٹ گیا تھا۔ مغرب کی

طرف جھک جانے والے سورج کی دھوپ مانند پڑ گئی تھی اور

اس کی ہلکی حرارت اب اچھی لگ رہی تھی۔ شیمہ نے دونوں

ہاتھ پیچھے کر کے چٹان پر ٹیک لیے۔ بدن خود ابھرا آیا تھا۔

اس کا یہ انداز اتنا نظر نواز تھا کہ قیصر بے اختیار نظر چرانے پر

مجبور ہو گیا۔ وہ شفاف آسمان دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر

بعد پوچھا۔ ”تم نے یہ سوال کیوں کیا؟“

”پتا نہیں۔“ وہ بولی اور اس کے پاس لیٹ

گئی۔ اگرچہ وہ اس سے کوئی گز بھر دور تھی مگر قیصر اس کی

قربت محسوس کر رہا تھا اور اسے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔

اس نے سر گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ وہ اپنی توجہ بٹانا چاہتا

تھا۔ اس کی نظر دور بجلی کے کھمبے پر چڑھے ٹیکنیشن پر گئی۔ وہ

کچھ کام کر رہا تھا مگر اس کا رخ ان کی طرف تھا۔ جس طرح وہ

اسے دیکھ رہا تھا، اسی طرح وہ بھی ان دونوں کو دیکھ رہا ہوگا۔

قیصر کو جھکنا سالگا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا انداز محسوس کر کے

شیمہ بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ قیصر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں

چلنا چاہیے۔“

شیمہ نے اس سمت دیکھا جس طرف قیصر نے دیکھا تھا

اور پھر اس نے بھی ٹیکنیشن کو دیکھ لیا۔ شاید وہ سمجھ بھی گئی۔ اس

نے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ شخص کام کر رہا ہے۔“

”میں نے وضاحت نہیں چاہی ہے۔“ قیصر کا لہجہ سرد

تھا۔ اس نے اپنا لباس جھاڑا اور اترنے والے راستے کی

طرف بڑھا۔ اس نے شیمہ سے چلنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ جلدی

سے اٹھ کر اس کے پیچھے لگی۔

”مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو؟“

قیصر جواب دیے بغیر نیچے اترنے لگا۔ وہ اس کی

طرف دیکھے بغیر نیچے جا رہا تھا اور اس نے شیمہ کی مدد کرنے

یا سہارا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا رویہ بالکل بدل گیا

تھا۔ وہ پہلے بھی کم بول رہا تھا اور اس کی طرف کم دیکھ رہا تھا

مگر اس کے انداز میں اس وقت ایک اجنبی سی رکھائی آگئی

تھی۔ جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ صرف پتلے پیچھے کے

پاس رکا۔ شیمہ نے یہ مشکل اسے پار کیا۔ ایک موقع پر اسے

ہلکا سا چکر آیا اور اسے لگا جیسے وہ گر جائے گی۔ وہ بے ساختہ

دیوار سے چٹ گئی اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو

خود کو دیوار کے ساتھ لگے پا کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

قیصر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اب اسے غصہ آ گیا

تھا۔ اس نے قیصر کا ہاتھ نظر انداز کر دیا اور خود دوسری طرف

آگئی۔ نیچے اترنے کے دوران اس نے کسی بھی مرحلے پر

قیصر کا سہارا نہیں لیا اور نہ اس سے بات کی۔ البتہ جب وہ

اپنی کار کی طرف جانے لگی تب اس نے قیصر کو تھینک یو کہا۔

قیصر کھڑا اسے جاتا دیکھ رہا تھا، جب اس کی کار نظروں سے

اوجھل ہو گئی تو وہ بھی احاطے کی طرف مڑ گیا۔ ابھی روشنی تھی

اور غلام بھی باہر موجود تھا۔ وہ بیخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ قیصر اپنا

دھیان بٹانا چاہتا تھا۔ اس سے کہا۔

”کیا خیال ہے، سامنے والا حصہ نہ صاف کر دیں؟“

”نہیں۔“ خلاف توقع اس نے انکار کر دیا۔

”لیکن کیوں؟“

غلام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر

باندھے مل رہا تھا۔ جب وہ یوں ہلتا تو قیصر سمجھ جاتا کہ وہ

اندر سے بہت مضطرب ہے۔ ایسے وقت وہ زیادہ بات کرنا

پسند نہیں کرتا تھا۔ قیصر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس

نے ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

”تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ میں نے صرف تمہیں

بتایا ہے۔“

”بات اعتماد کی نہیں ہے، میں اب تک سمجھ نہیں پایا



”دوستوں میں سوری نہیں ہوتی۔“ غلام نے جواب دیا۔ یہ ظاہر وہ جاہل اور کم عقل لگتا تھا مگر کبھی کبھی ایک جملے میں ایسی بات کہہ جاتا جو دوسرے ایک پراگراف میں بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ دوستی میں معذرت نہیں کی جاتی۔ خاموش رہا جاتا ہے یا رجوع کیا جاتا ہے مگر وہ اس کی ایسی بات کیسے مان لیتا جس پر اسے یقین نہیں تھا۔ غلام سے بحث کرنا بھی بیکار تھا۔ وہ اس بارے میں کہہ چکا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم اور اسے لگتا تھا کہ ایسا ہوتا ہے۔ اسے اپنے گمان پر یقین تھا اور وہ چاہتا تھا کہ قیصر بھی اس کے یقین پر یقین کر لے۔ قیصر خاموش ہو گیا۔ سورج ڈوب گیا اور اندھیرا ہونے لگا۔ اس سے پہلے ہی احاطے کی روشنیاں جل اٹھیں۔ یہاں بجلی کا ایسا نظام تھا کہ کبھی لائٹ نہیں جاتی تھی۔ اس احاطے سے باہر لائٹ جاتی تھی مگر یہاں ہمیشہ بجلی ہوتی تھی اور یقیناً یہاں کوئی بیک اپ سسٹم تھا مگر قیصر نے ایسا بیک اپ سسٹم دیکھا نہیں تھا۔ عمارتوں میں روشنی کا جدید ترین نظام تھا۔ اپنے وقت پر روشنیاں خود کار انداز میں جلتی اور بند ہوتی تھیں اور اس میں کبھی خلل نہیں آتا تھا۔

سات بجے وہ کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ میس میں کھانے کے بعد شوکت نے اسے دو شاپر دیے۔ ایک میں کتے کے لیے کھانا تھا اور دوسرے میں اس کے لیے ہڈیاں تھیں۔ اس نے قیصر سے پوچھا۔ ”تم نے اس کا کوئی نام رکھا؟“

وہ ہنسیا۔ ”نہیں، ابھی کوئی نام نہیں رکھا ہے۔“

”براؤن کیسا رہے گا؟“ شوکت نے کہا۔ ”اس کا رنگ بھی براؤن ہے۔“

”ہاں، اچھا نام ہے۔“

”اگر تم نے اسے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو اسے پناؤال دوور نہ یہ باہر گیا تو کوئی پکڑ کر لے جائے گا۔“

قیصر کا اسے مستقل رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ بڑے والی بات پر خاموش رہا۔ وہ باہر نکلا تو شمال کی طرف سے خنک ہوا چل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پہاڑیوں پر پھر برف باری ہوئی تھی۔ جاتی سردی ہمیشہ زور لگاتی تھی۔ اس نے اپنے اپر کا ہڈ اوپر کر لیا اور روش سے ہوتا ہوا کیمین تک آیا۔ کھانے کی خوشبو پہلے ہی کتے کی ناک تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ وہ اس سے کھانے کی التجا کر رہا تھا۔ بے ساختہ قیصر کو اس پر پیار آیا۔ اس نے جبک کر اس کا سر

کہ احاطے سے باہر کھبوں پر چڑھ کر کوئی شخص کس طرح ہماری نگرانی کر سکتا ہے۔“

غلام کا ہلکا کم ہو گیا۔ ”تم مت مانو لیکن ایک دن آئے گا جب تم مان جاؤ گے۔“

”کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟“

وہ عمر میں قیصر سے بہت چھوٹا تھا اور اس کا تعلق بھی بہت نچلے طبقے سے تھا۔ یہ بات اس کی زبان اور انداز سے بھی عیاں تھی۔ قیصر نے سر ہلایا۔ ”کیوں نہیں، میں تم سے دوستی کروں گا۔“

پہلی بار غلام کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی تھی۔ اس نے گرم جوٹی سے کہا۔ ”اب ہم دوست ہیں۔ مجھ سے آج تک کسی نے دوستی نہیں کی۔“

اس کے بعد سے آج غلام نے پہلی بار دوستی کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔ غلام نے اس کی بات سنی تھی تب بھی اس نے توجہ نہیں دی۔ وہ اپنی سوچ پر قائم تھا۔ ”ہم دوست ہیں اگر تم مجھ سے کہو گے تو میں آنکھ بند کر کے یقین کروں گا۔“

قیصر کو اندر سے شرمندگی ہوئی۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے غلام سے ایسے ہی کچھ کہہ دیا اور غلام نے اس کی بات کا پورا یقین کیا۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ اس کی بات غلط ثابت ہوئی مگر غلام نے اسے یاد نہیں دلایا کہ اس نے ایسا کہا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”دوست! اگر تمہیں میری بات سے تکلیف ہوئی ہے تو میں سوری کرتا ہوں۔“



سہلایا۔ ”صبر براؤن صبر..... ابھی دیتا ہوں۔“ اسے اچھا نہیں لگا کہ اس اچھی نسل کے کتے کو گلی کے کتوں کی طرح کھانا دے۔ اس کے پاس کیمین میں ایک اضافی پلیٹ تھی۔ وہ اسے لے آیا اور ڈبے سے روٹی اور سالن کا ملغوبہ اس میں ڈال کر براؤن کے سامنے رکھا۔ وہ بے تانی سے کھانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس کی بیتابی کم ہوئی تو اس نے بھونک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ آج قیصر اسے کھانا ڈال کر اٹھا نہیں بلکہ اس کے پاس بیٹھا اسے کھاتا دیکھتا رہا۔ آج بھی شوکت نے خاصی مقدار میں دیا تھا اور براؤن نے آخر تک کھایا۔ پلیٹ تک چاٹ کر صاف کر دی۔ قیصر نے دوسرا شاپر کھولا اور اس میں سے ہڈیاں نکال کر پلیٹ میں ڈالیں تو براؤن کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ وہ باقاعدہ چپک کر بھونکا مگر پھر اس نے عجیب حرکت کی۔ اس نے ہڈیاں دانتوں میں دبایں اور وہاں سے بھاگ گیا۔ قیصر حیران ہوا۔ براؤن نے گوشت، سبزی اور روٹی کا کھانا تو سکون سے کھایا مگر ہڈیاں یوں لے کر بھاگ گیا جیسے وہ ابھی اس سے چھین لے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا جانوروں کی بھی نفسیات ہوتی ہے؟ وہ ایک ہی چیز کے لیے مختلف رد عمل دیتے ہیں؟

ہوا میں تندہی آگئی تھی۔ وہ اندر آیا تو اسے تصویر کا خیال آیا۔ اس نے چیخ لے کر پھر سے ریک کے نیچے سے تراشا نکالنے کی کوشش کی مگر وہ پکڑ میں نہیں آ رہا تھا۔ اندر تار کی تھی۔ اس کے پاس ایک تارچ تھی۔ اس نے اس کی روشنی اندر ڈال کر دیکھا مگر اسے نیچے خلا میں کاغذ نظر نہیں آیا۔ بس تاریکی سی تھی۔ تنگ آ کر اس نے ریک دیوار سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ دیوار اور فرش میں فکس تھا۔ دونوں چیزیں لکڑی کی بنی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ریک کے نیچے فرش بنانے کے بجائے خلا چھوڑ دیا گیا ہو ورنہ تراشا کہاں جاسکتا تھا؟ البتہ جب وہ چیخ نیچے کرتا تو اسے لکڑی کا فرش محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپرا تار اور واش روم سے آکر وہ لیٹا تھا کہ اسے باہر کچھ کھرچنے جیسی آواز آئی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو براؤن ایک بار پھر برآمدے کے فرش کو بچوں سے کھرچ رہا تھا۔ قیصر نے اسے ڈانٹا۔ ”براؤن! مت کرو۔“

کتے نے اسے سراٹھا کر دیکھا اور پھر اس طرف چلا گیا جہاں وہ لیٹ کر آرام کرتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس آدمی کو اس کی حرکت پسند نہیں آئی ہے۔ وہ اندر آ کر لیٹا تو اس کے ذہن میں شیما آگئی۔ آج وہ جس طرح اس کے نزدیک آئی تھی وہ انداز بہت کچھ بتا رہا تھا مگر اس کا ذہن اس بات

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ قیصر خوش شکل تھا۔ اس میں ایسی کشش تھی جو لڑکیوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا مگر ہانے کئی بار اسے بتایا تھا۔ اس کی کشش مردانہ نہیں بلکہ لڑکوں والی تھی اور اس میں کڑھکی نہیں بلکہ خوش روئی اور معصومیت تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں اس پر اعتماد کر لیتی تھیں۔ ہمارے شادی سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اس کی طرف آئیں مگر اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ وہ ان کی طرف توجہ دیتا۔ ہمارے پہلی لڑکی تھی جس کی طرف وہ متوجہ ہوا اور اب شیما بھی جو اس کی طرف آئی تھی اور اتنے پر زور انداز میں آئی تھی کہ اس نے بنا کہے قیصر کو اپنے جذبات اور احساسات سے آگاہ کر دیا تھا مگر وہ اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا اور اس صورت میں اسے قبل از وقت روک دینا ہی مناسب تھا۔ قیصر نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اس سے فاصلہ رکھے گا۔ جلد یا بدیر وہ سمجھ جائے گی۔ یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گیا اور کچھ دیر میں اسے نیند آگئی۔ صبح اس کی آنکھ وقت پر کھلی۔ اسے لگا کہ باہر کوئی گاڑی رکی ہے۔ وہ اٹھ کر چپل پہنتا ہوا باہر آیا تو ڈاکٹر اطہر کی گاڑی کیمین کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ وہ فرنٹ سیٹ سے کچھ اٹھا رہا تھا پھر ایک شاپر لے کر آگے آیا۔ قیصر نے سلام کیا تو اس نے جواب دے کر شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”تم نے جو منگوایا تھا، اس میں ہے اور میری طرف سے بھی کچھ ہے..... اگر تمہیں پسند آئے تو۔“

”میں آپ کا احسان مند ہوں۔“ قیصر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے مجھے جیسے بے گھر اور بیکار شخص کو یہاں رکھا ہوا ہے، میری ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔“ ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ تم یہاں رہ رہے ہو کیونکہ یہ تمہارا گھر ہے اور تم اس کی دیکھ بھال ایسے کرتے ہو جیسے انسان اپنے گھر کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو تم



”صرف ساڑھے تین سو روپے سر۔“

اس نے ادائیگی کی اور باکس اٹھا کر اپریکی جیب میں رکھ لیا۔ وہ باہر آیا اور فٹ پاتھ پر لگی بج پر بیٹھ گیا۔ شام قریب تھی اور سرد ہوا میں اضافہ ہو رہا تھا مگر اس کا ابھی واپس جانے کا موڈ نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اپریکی جیبوں میں دیے بیٹھا تھا اس کا ایک ہاتھ چین والے باکس پر تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اسے کیوں لیا ہے؟ کیا شیما کے لیے؟ مگر اسے لیتے ہوئے اس کے ذہن میں دور دور تک شیما کا کوئی خیال نہیں تھا۔ پھر کیا اس نے ہما کا سوچ کر لیا تو یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ کیوں نہیں جاسکتا؟ اسے بس تیس پینتیس کلو میٹر ز دور جانا تھا۔ یہ کوئی فاصلہ نہیں تھا اور وہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہیں گیا۔ چھ مہینے سے وہ صرف سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے مشینی گنتناہٹ اور ہائڈرولک کے پریش کرنے سے چونکا یا۔ سامنے ایک بس رکی تھی۔ اس سے چند افراد اتر رہے تھے۔ اس کی توجہ بس کے سامنے شیشے پر لکھے علاقوں کے نام پر گئی۔ یہ نام اس بس کے روٹ میں آتے تھے اور تب ایک نام پر اس کا دل رک سا گیا۔

یہ اس کے علاقے کا نام تھا جو سب سے آخر میں تھا۔ بس وہاں بھی جاتی تھی جہاں اس کی بیوی اور بیٹی رہتی تھیں۔ جہاں اس کا گھر تھا۔ بس کے انجن کی آواز بدلی تو وہ بے ساختہ بج سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بلند کیا تو بس چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ وہ پاس آیا تو اس کا خود کار دروازہ کھل گیا اور وہ اندر آ گیا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہوا اور بس آگے روانہ ہو گئی۔ موسم یا روٹ کی وجہ سے بس میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسے شروع میں سیٹ مل گئی۔ اس نے کنڈیکٹر سے اپنے علاقے تک کا ٹکٹ مانگا اور ٹکٹ لے کر اسے مطلوبہ رقم دے دی۔ اس نے یہ سب بے ساختہ کیا تھا۔ اس کے ذہن میں کہیں خیال نہیں آیا تھا کہ اسے جانا چاہیے۔ وہ کسی روٹ کی طرح اٹھا اور اس بس میں سوار ہو گیا جو اسے اس کے گھر کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس کی فیملی کی طرف لے جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس سے کسی نے یہ سب کرایا ہے۔

بس میں بیٹھ کر اس نے سوچا کہ اس نے کیا کیا ہے اور پھر ٹکٹ لے کر اس نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی بہت تیزی سے تار کی چھائی تھی۔ باہر سڑک کے کنارے لگی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ بس ہر ایک ڈیڑھ کلو میٹر بعد آنے والے اسٹاپ پر رکتی تھی اور مسافر چڑھتے

جتنا کرتے ہو اس کے مقابلے میں تمہیں کم ملتا ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔“

قیصر نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ قیصر نے اندر آ کر شاہر دیکھا۔ اس میں اس کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ دو نئے ٹھنڈے ٹراؤزر اور ٹی شرٹس تھیں۔ چند دنوں بعد اسے ان کی ضرورت پڑتی۔ سب سے نیچے ایک لفافہ تھا۔ اس نے اسے کھولا تو اس میں دو ہزار روپے کے مختلف مالیت کے نوٹ تھے۔ اس نے انہیں بھی پرس میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر نے اسے پہلے جو رقم دی تھی، اس میں سے بھی بہت کم خرچ کیا تھا۔ اسے ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ہر چیز یہاں سے مل جاتی تھی اور جو نہیں ہوتی وہ کہہ دیتا تو اگلے دن آ جاتی تھی۔ اسے خیال آتا تھا کہ ڈاکٹر اطہر اس کے لیے یہ سب کیوں کر رہا ہے جبکہ وہ اس کا مریض بھی نہیں تھا؟ ڈاکٹر عزیز نے اسے کیا کہہ کر یہاں رکھوایا تھا؟ ایسا ممکن نہیں تھا کہ ڈاکٹر اطہر کچھ بھی نہ جانتا ہو لیکن اگر اسے قیصر کی حقیقت کا علم بھی تھا تب بھی اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔

دوپہر میں وہ کام نمٹا کر ہائی وے کی طرف روانہ ہوا۔ آج اس کا کچھ خریداری کا موڈ تھا۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہ کیا لے گا مگر اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ آج وہ کچھ رقم خرچ کرے گا۔ وہ صرف ایک بار ہائی وے کے ساتھ موجود ایک اسٹور میں گیا تھا۔ یہاں سے کھانے پینے کا سامان اور گروسری ملتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک گفٹ اور سوویتز شاپ بھی تھی۔ وہ اندر آیا۔ وہاں بہت کچھ تھا۔ جیولری آسٹم بھی تھے اور کھلونے بھی۔ اس کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی تحفے تھے۔ وہ بھٹکتی نظروں سے شیلف اور شوکیسوں میں دیکھ رہا تھا۔ جیولری والے شوکیس میں اس کی نظر رک گئی۔ اسے ایک نازک سی چین پسند آئی۔ یہ میٹلک گولڈ کلر کی تھی اور اس میں ہر چند کڑیوں کے بعد ٹیولپ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ چین بہت صفائی اور نفاست سے بنی ہوئی تھی۔ سیلز مین نے اس کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اسے شوکیس سے نکال کر اسے سامنے رکھ دیا۔

”بالکل نئی چیز ہے، آپ کی وائف کو پسند آئے گی۔“

”وائف۔“ اسے جھٹکا سا لگا مگر پھر اس نے کہا۔

”اسے نکال دو۔“

سیلز مین نے جلدی سے اسے ایک چھوٹے اور لمبے باکس میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے قیمت پوچھی۔ ”کتنے ہوئے؟“



اترتے اور بس آگے روانہ ہو جاتی۔ بس ایک اسٹاپ پر رکی تو وہاں سے صرف ایک شخص بس میں سوار ہوا۔ وہ اندر آیا اور قیصر کی سیٹ والی قطار کے برابر والی قطار میں پہلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قیصر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ باہر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس شخص نے کہا۔ ”بعض اوقات انسان غلط بس پکڑ لیتا ہے۔ وہ اس طرف جانا چاہتا ہے جو اس کی منزل نہیں ہوتی ہے۔“

قیصر نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی رگوں میں جیسے خون جم گیا وہ ڈاکٹر عزیز تھا۔ وہ حیران تھا کہ ڈاکٹر عزیز کو اس کی حرکت اور ارادے کا کیسے علم ہوا؟ ڈاکٹر عزیز اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ جیسے اسے اندر سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ ”انسان جو ذمے داری لیتا ہے، اسے پورا کرنے کے لیے اسے بعض اوقات بہت جان مارتی پڑتی ہے۔“

”کیا میں نے کسی سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ ذمے داری لے۔“ اس نے بھی دھیمے لیکن تلخ لہجے میں کہا۔ اتفاق سے ان کے آس پاس کوئی اور مسافر نہیں تھا اس لیے ان کی گفتگو صرف ان تک محدود تھی۔ جواب میں ڈاکٹر عزیز نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کہا۔

”انسان بہت سی چیزوں کی درخواست نہیں کرتا لیکن اسے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب کسی دوسرے انسان کا فرض اور ذمے داری بن جاتی ہے کہ اسے پورا کرے۔“

”میں تمہیں اس ذمے داری سے آزاد کرتا ہوں۔“

”اب یہ صرف تمہارا اختیار نہیں ہے۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس کام میں کتنے لوگ ملوث ہیں اور اگر بات کھل گئی تو کتنے لوگوں کو جواب دینا ہوگا۔“ ڈاکٹر عزیز کا لہجہ خبردار کرنے والا ہو گیا۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ قیصر نے کسی قدر ہذیبیائی انداز میں کہا۔ ”میں اب مزید اپنی بیوی اور بچی سے دور نہیں رہ سکتا۔ میں ان کے پاس جا رہا ہوں، کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔“

ڈاکٹر عزیز آج لمبے کوٹ کے بجائے چھوٹے اور سادہ کوٹ میں تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔ یہ فیصلہ انسان نے خود کرنا ہوتا ہے کہ اس کا اٹھایا جانے والا قدم ٹھیک ہے یا نہیں۔ اب یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بیکار میں مجھے روکا، جب میں اس بس پر

سوار ہوا تو میں فیصلہ کر چکا تھا۔“

”تم نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔“ ڈاکٹر عزیز ذرا جھک کر بولا۔ اسی لمحے بس رکنے لگی۔ اگلا اسٹاپ آ رہا تھا۔ ”تمہارے پاس وقت ہے۔ ابھی تم فیصلہ کر سکتے ہو۔“

بس رکی اور ڈاکٹر عزیز کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور نیچے اترنے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک بار قیصر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس نے ڈاکٹر عزیز کی نظروں کو واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کے اترتے ہی دروازہ بند ہو گیا اور بس آگے بڑھ گئی۔ ڈاکٹر عزیز کے آنے اور اس کی باتوں سے پہلے اس کے اندر جو اطمینان اور سکون تھا، وہ اب رخصت ہو گیا تھا اور... وہ مضطرب تھا۔ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے نہیں جانا چاہیے۔ کیا فائدہ ایسے جانے کا کہ وہ پھر اپنی بیوی بچی کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائے۔ وہ خود بھی نہیں ہوگا اور اس کی بیوی اور بچی پھر اسی اذیت سے گزریں گے جس سے وہ ایک بار پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اگلا اسٹاپ نزدیک آ رہا تھا۔ بس شہر میں داخل ہو چکی تھی اور اس کا علاقہ کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔ اسٹاپ آیا اور بس رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی کشمکش بڑھ گئی۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ اسے بس سے اتر جانا چاہیے اور دل کہہ رہا تھا کہ بس میں بیٹھے رہنا چاہیے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ سب اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ پھر وہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونکا اور بے اختیار کھڑے ہو کر کہا۔

”رک جاؤ..... بس روکو۔“

ڈرائیور نے بس روک دی۔ وہ آگے بڑھا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ نیچے اتر گیا۔ دروازہ بند ہوا اور بس آگے بڑھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپسی کی بس سے علاج گاہ کے اسٹاپ پر اترتا۔ وہ سڑک کر اس کر رہا تھا کہ اچانک بجلی کے کھمبے کی طرف سے ایک جھماکا سا ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے وہاں کھمبے پر ایک شخص چڑھا دکھائی دیا۔ قیصر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے قیصر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اپنا سامان سمینا اور تیزی سے کھمبے سے نیچے آیا۔ جب قیصر اس کے پاس پہنچا تو وہ اپنا بیگ موٹر سائیکل پر رکھ رہا تھا۔ اس سے کام میں کوئی غلطی ہوئی تھی جس سے جھماکا ہوا تھا مگر... یہ ظاہر بجلی کے جھماکے نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ قیصر نے اس سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“



ہے۔" واپسی کا فیصلہ غلط نہیں تھا، یہ فیصلہ ہی اس کے حق میں ہے۔ ہاں اس کی اور دوسرے لوگوں کی جو نگرانی ہو رہی ہے وہ غلط ہے۔ وہ اندر جا رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ نگرانی اصل میں اس کی نہیں بلکہ علاج گاہ کے مریضوں کی ہو رہی تھی۔ اسی نگرانی کی وجہ سے رنج زمانہ کئی بار فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا۔ یہ خیال آتے ہی اس کا اشتعال کم ہونے لگا اور جب وہ اندر آیا تو کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اسے کبھی احاطے سے باہر جاتے ہوئے نہیں روکا گیا۔ نہ ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ بات غلام نے محسوس کی کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے اور ان کی سچ سچ نگرانی ہوتی تھی۔ وہ سب نفسیاتی مریض تھے اور ان کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر عزیز کو کیسے پتا چلا کہ وہ بس میں بیٹھ گیا ہے اور اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے؟

اس کا مطلب تھا کہ کل وقتی تو نہیں لیکن کسی حد تک نگرانی کی جا رہی تھی۔ اسے احاطے اور آس پاس گھومنے پھرنے اور آنے جانے کی مکمل آزادی تھی مگر اس جگہ سے دور جانے کی آزادی نہیں تھی۔ وہ الجھنے لگا۔ کبھی اسے لگتا کہ اس کی نگرانی نہیں ہو رہی ہے اور کبھی لگتا کہ اس کی بھی نگرانی ہو رہی ہے۔ چونکہ اس نے اس سے معمول کی سلام دعا کی اور اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے لگے کہ اس کی کم شدگی محسوس کی گئی تھی۔ احاطے میں کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر زین اور شیمہ جاکے تھے کیونکہ پارکنگ میں ان کی گاڑیاں نہیں تھیں۔ دفتر اور اسپتال والی عمارت کی اندرونی روشنیاں بند تھیں۔ صرف میس اور رہائش والی عمارت کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ تقریباً آٹھ بجے واپس آیا تھا اور ڈنر کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ وہ میس میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا سوائے شوکت اور اس کے نائب کے اور وہ بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شوکت نے اسے دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "تم نے دیر کر دی ہے۔"

"کوئی بات نہیں..... مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں صرف براؤن کے لیے کھانا لینے آیا ہوں۔"

میس کے قواعد کے مطابق وقت گزرنے کے بعد کسی کو کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ شوکت نے براؤن کا شاہر تیار کیا ہوا تھا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ جاتے ہوئے تمہارے نمین پر دیتا جاؤں، ویسے آج آئے کیوں نہیں؟"

"میں ذرا مصروف تھا۔" قیصر نے اس سے شاہر لیا۔ "شکریہ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" شوکت نے کہا اور پھر

"ہاں۔" اس نے اپنا بیگ باندھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"تم مجھے اکثر یہاں کھبوں پر چڑھے دکھائی دیتے ہو، کبھی بجلی کے کھمبے پر اور کبھی فون کے کھمبے پر۔"

"میں نہیں سمجھ سکا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے زیر لب کہا۔ وہ غفلت میں اپنا بیگ باندھ رہا تھا۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم اکثر یہاں بجلی کے کھبوں پر دکھائی دیتے ہو جیکہ بجلی اور فون کے کھمبے الگ الگ ہیں۔ کیا دونوں کھمبوں نے تمہیں ملازم رکھا ہوا ہے؟"

اس بار وہ جواب دیے بغیر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"اے..... تم اس طرح نہیں جاسکتے۔" قیصر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میرے سوالوں کا جواب دو۔"

اس نے جو جواب دیا، وہ قیصر نے سوچا نہیں تھا۔ اس نے مخالف سمت میں ذرا جھک کر اچانک اس کے پیٹ پر

لات ماری اور قیصر لڑکھڑا کر ذرا دور جاگرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتا اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ایکسپریڈ دیا۔ جب تک قیصر کھڑا ہوتا، وہ خاصا آگے جا چکا تھا۔ قیصر نے چلا کر کہا۔ "تم ایسے نہیں جاسکتے۔"

اس نے ایک پتھر بھی اس کی طرف اچھالا مگر وہ اس کی زد سے دور جا چکا تھا۔ قیصر نے اپنے کپڑے جھاڑے۔

اس کے دماغ میں جیسے طوفان آیا ہوا تھا۔ اگر وہ شخص سچ سچ کوئی ٹیکنیشن تھا تو اسے یوں فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دال

میں کچھ کالا تھا۔ غلام ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان کی نگرانی ہوتی ہے۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ نگرانی اس طرح سے کیوں ہوتی

تھی۔ بے شک ان کھمبوں سے احاطے کے اندر کا بیشتر حصہ نظر نہیں آتا تھا مگر ان کھمبوں سے احاطے کے گیٹ اور سڑک

کی طرف آنے والے راستے کی نگرانی کی جاسکتی تھی اور اگر کوئی احاطے سے ٹکنا چاہتا تو کھمبے پر موجود فرد کو فوراً نظر

آ جاتا۔ جاسوسی کا یہ نظام اتنا تیز تھا کہ فوری طور پر اس کی شہر

روانگی کی خبر ڈاکٹر عزیز کو دے دی گئی اور وہ بس اسٹاپ پر اس کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اس کی بس آئی وہ اس میں سوار ہو

گیا۔ اس نے قیصر سے بات کی اور اسے مجبور کیا کہ وہ واپسی کا فیصلہ کرے۔ جیسے جیسے وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا،

اسے لگ رہا تھا کہ تصویر واضح ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے غصہ بھی آرہا تھا۔ اس نے سوچا۔

"مجھے واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔" مگر فوراً ہی اس نے خود سے کہا۔ "یہ الگ معاملہ"



”مجھے نہیں معلوم تھا۔“ اس نے سر دھجے میں

کہا۔ ”مجھے یہاں آئے ہوئے چھ مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں لیکن مجھے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی ٹھیک سے علم نہیں ہے تو دو دن میں اس براؤن کے بارے میں کیا جان سکتا ہوں۔“

شیمیا کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔ ”کیا کچھ ہوا ہے؟“ قیصر کو خیال آیا کہ اس سے کہے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش رہا۔ براؤن فریس بی لے کر اس کے پاس آیا اور مطالبہ کرنے لگا کہ اب فریس بی وہ پھینکے لیکن اس نے فریس بی براؤن سے لے کر شیمیا کو تھما دی اور پلٹ کر جانے لگا۔ شیمیا کا چہرہ بالکل بجھ گیا۔ وہ کچھ دیر اپنے نازک لب کاٹتی رہی پھر اس کے پیچھے لپکی۔ ”سنو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”اندر آ جاؤ۔“ قیصر نے کہا۔

”نہیں۔“ وہ ہچکچا کر بولی۔ ”میںیں کر لیتے ہیں۔“

قیصر پلٹ کر آیا۔ ”کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔“ اس کے روکھے لہجے اور انداز پر شیمیا کو غصہ آ گیا۔ ”تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟“

”میں خود کو کچھ نہیں سمجھتا۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”پھر میرے ساتھ یوں کیوں پیش آتے ہو؟“ شیمیا بولی تو اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ ”کیا تمہیں میری انسلٹ کرنا اچھا لگتا ہے۔“

”نہیں۔“ اس بار اس کا لہجہ دفاعی ہو گیا۔ ”میں نے یوں کبھی نہیں سوچا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم جیسی خوب صورت اور اعلیٰ خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی میری طرف متوجہ ہو۔“

”تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟“ وہ جذباتی ہو گئی۔

”تم میرے بارے میں جانتی ہو؟“

”صرف اتنا جتنا کہ یہاں موجود دوسرے لوگ جانتے ہیں۔“

”جب تم میرے بارے میں جانتی نہیں ہو تو میری طرف کیوں بڑھ رہی ہو؟“ قیصر نے ذرا کھل کر کہا۔ شیمیا کی نظریں جھک گئیں۔

”میں..... میں نہیں جانتی۔“

قیصر نے گہری سانس لی۔ ”شیمیا! میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنا سب کچھ چکا ہے اور میں کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔“

”تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ تم زندہ ہو، صحت مند ہو۔“

جو کھو یا ہے، کیا وہ دوبارہ نہیں مل سکتا؟“

”نہیں۔“ قیصر کا لہجہ پھر روکھا ہو گیا۔ ”میں نے جو

ذرا جھک کر بولا۔ ”اس میں الگ سے ایک پکیٹ ہے، اس میں دو سینڈ وچز ہیں تمہارے لیے۔“

قیصر نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ براؤن حسب معمول بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ قیصر نے پلیٹ میں اس کا کھانا ڈال کر دیا تو وہ ٹوٹ پڑا۔ قیصر نے اپنے لیے سینڈ وچز نکالے۔ یہ سیلوفین میں تھے اور وہ وہیں برآمدے کے کنارے بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس وقت ہوارک گئی تھی اس لیے سردی اتنی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ براؤن نے اپنا کھانا ختم کر کے بھونک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ آج اسے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر برآمدے کے کنارے تک آیا۔ قیصر نے بھانپ لیا کہ اب وہ پنجوں سے کنارہ کھرچے گا۔ اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ”براؤن۔“

وہ سمجھ گیا اور وہیں زمین پر لیٹ گیا اور دونوں پاؤں اوپر کر لیے۔ گویا وہ تھیل کر رہا تھا۔ قیصر نے خالی ڈبا اور اپنا سیلوفین شاپر میں ڈال کر اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ آج شوکت نے ہڈیاں نہیں دی تھیں۔ اس رات بھی وہ دیر سے سویا۔ واقعات اور خیالات اس کے ذہن میں گھومتے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اسے نیند آئی۔ رات کسی وقت بارش ہونے لگی اور موسم خاصا سرد ہو گیا۔ اسے اپنے گرم بستر میں بھی سردی لگ رہی تھی اور اسی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ سردیوں میں گرمائش کے لیے ہیٹر تھا مگر اس وقت اسے چلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ سردی لگی تو اسے خیال آیا کہ ہیٹر آن کر لے مگر بستر سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ لیٹا رہا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس کی آنکھ براؤن کے بھونکنے اور نسوانی ہنسی کی آواز سے کھلی۔ اس نے جیکٹ پہنی اور باہر آیا جہاں شیمیا گلابی رنگ کے سوٹ اور ہم رنگ سویٹر میں براؤن کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ اس کے لیے فریس بی لائی تھی اور اسے دور اچھالتی تو براؤن بھاگ کر لے آتا تھا۔ جب وہ اسے لاکر دیتا تو ساتھ ہی اچھل اچھل کر مطالبہ کرتا کہ وہ فریس بی اچھالے۔ شیمیا کو اس پر ہنسی آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے فریس بی زیادہ دور اچھال دی اور اس کی طرف آئی۔

”ہیلو۔“

قیصر نے سر ہلایا۔ ”کیسی ہو تم؟“

”فائن۔“ وہ بولی۔ ”تمہارا کتا تربیت یافتہ ہے۔ یہ

فریس بی سے کھیلنا جانتا ہے۔“



کھویا ہے وہ مجھے واپس نہیں مل سکتا۔“

”جہانگیر! شیمانے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا۔

”پلیز! میری التجا ہے اس موضوع پر مجھ سے بات

مت کرو۔ ہم صرف اچھے دوست بن سکتے ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے کے لیے۔ اس سے زیادہ کوئی تعلق درست نہیں ہوگا۔“

شیمانے سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہی تھی پھر وہ پلٹی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی چلی گئی۔ ایک بار اس نے یوں چہرے کی طرف ہاتھ کیا جیسے آنسو صاف کر رہی ہو۔ قیصر اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر اندر آ گیا۔ وہ پہلے ہی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہا تھا اور شیمانے کا رویہ اس کے لیے مشکلات میں اضافہ ہی کرتا۔ وہ تیار ہو کر میس میں آیا۔ وہاں غلام سمیت سب موجود تھے۔ رفع بھی تھا اور آج خاصا تروتازہ لگ رہا تھا۔ قیصر غلام کے ساتھ اس کی میز پر آ گیا۔ رفع سے علیک سلیک کے بعد وہ بھی ناشتے میں لگ گیا۔ رفع نے بتایا کہ آج اس کا چیک اپ ہوگا اور اگر وہ کامیاب رہا تو وہ یہاں سے جاسکے گا۔ اس خیال نے اسے بہت خوش کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے یقین ہو کہ وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

ناشتے کے بعد وہ اور غلام اپنے کام میں لگ گئے۔ آج کام زیادہ تھا۔ تینوں عمارتوں کی مکمل صفائی کرنا تھی۔ تفصیلی صفائی مہینے میں دو بار کی جاتی تھی اور اس میں خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ آغاز انہوں نے رہائشی عمارت سے کیا۔ اس میں سب سے زیادہ وقت لگا۔ جب وہ میس کی صفائی کر چکے تو کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے باقی جگہوں کی صفائی شروع کی۔ اگلی باری دفتر کی عمارت کی تھی۔ ڈاکٹر اطہر، ڈاکٹر سیفی اور شیمانے اسپتال والی عمارت میں تھے۔ وہ سیفی کی صفائی کر کے باہر نکلے تو انہیں بالچل دکھائی دی۔ سلطان، رفیق اور ان کے ساتھ ٹمس بھی کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ قیصر نے ڈاکٹر سیفی سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”رفع غائب ہے۔ اسے چیک اپ کے بعد چند منٹ کے لیے کمرے میں چھوڑا گیا اور جب دوبارہ دیکھا تو وہ اپنی جگہ نہیں تھا۔“

وہ سب اسے احاطے میں تلاش کر رہے تھے مگر قیصر کا خیال کچھ اور تھا۔ اس نے غلام سے کہا۔ ”تم اسپتال کی صفائی شروع کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد شیمانے غلام کے پاس آئی۔ اس نے قیصر

# شکر سے مستقل نجات کیا آپ شوگر چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔

**المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ**  
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

**0300-6526061**  
**0301-6690383**

فون اوقات

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک



کے بارے میں پوچھا تو غلام نے اسے بتا دیا کہ وہ احاطے سے باہر گیا ہے۔ یہ سن کر شیما کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے بھی تیز قدموں سے احاطے سے باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

غلام کو سامان دے کر قیصر تیزی سے احاطے سے باہر آیا اور اس نے چٹان کا رخ کیا۔ بجلت میں اوپر جاتے ہوئے وہ معمول سے جلد اوپر پہنچ گیا تھا اور جیسے ہی وہ اوپر پہنچا اسے رفع نظر آ گیا۔ وہ چٹان کے ڈھلان والے کنارے پر خطرناک حد تک آگے کھڑا ہوا تھا۔ ذرا توازن بگڑنے کی دیر بھی اور وہ پلٹ کر واپس بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے قیصر کی آمد کی انہیں سن لی تھیں اور جب وہ اس کے پاس آیا تو وہ مڑے بغیر بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں زیادہ دن اپنے بیوی بچوں سے دور نہیں رہوں گا۔“ قیصر ممکن حد تک آگے آیا۔ ”تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

رفع نے ذرا سا سر موڑا۔ اس کا جسم ساکت تھا اور وہ اپنا زور توازن پر لگا رہا تھا۔ ”تم نہیں جانتے؟“

”جانتا ہوں۔“

”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تم اپنے بیوی بچوں کے پاس جانا چاہتے ہو لیکن وہ مر چکے ہیں۔ تم نے اپنے ہاتھ سے انہیں مارا تھا۔“

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ”یہ احمق سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو زندہ سمجھ رہا ہوں، ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

قیصر دم بہ خود رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”تو تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

”میں ایسا سمجھتا تو کیا فرار کی کوشش کرتا۔“ رفع کا لہجہ بدل گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ ”میں پاگل ہوں، میں نے اپنے بیوی بچوں کو مار دیا۔ مجھے شاہدہ کے کردار پر شک تھا۔ میں بچوں کو اپنے بچے نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے شک کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میں پاگل تھا مگر میرا پاگل پن انہیں مار کر ختم ہو گیا۔ اب میں ہوش مند ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“

”تم اب بھی غلط کر رہے ہو۔“

”یہ تمہارا اور دوسروں کا خیال ہے۔ مجھے جیسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہیے؟“

”تم اپنے بیوی بچوں سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔“

”مگر اس طرح تم خودکشی کر کے ان سے نہیں مل سکو گے۔“

رفع کا تنہا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ قیصر کی طرف گھوما اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ بھی ایک دھوکا ہے جو میں خود کو دیتا آیا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں خود کو اپنے کیے کی سزا دینا چاہتا ہوں۔ وہ سزا جو عدالت نے مجھے نہیں دی۔ مجھے ایک دنیاوی جہنم میں دھکیل دیا جبکہ میں اصل جہنم کا حق دار ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے قیصر کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے کہیں اچھے انسان ہو اور اس انجام کے مستحق نہیں ہو جو میرا مقدر بن چکا ہے۔ خدا حافظ۔“

”نہیں۔“ قیصر چلا یا مگر رفع پیچھے کی طرف جھکا اور اس کا جسم طویل خلا میں یوں گیا جیسے اسے کسی نے نیچے سے پھینچ لیا ہو۔ قیصر کو عقب سے چیخ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو شیما منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ وہ کب اوپر آئی قیصر کو پتا نہیں چلا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے شیما کا بازو تھاما تو وہ ہڈیاں لہجے میں بولی۔

”وہ نیچے کود گیا ہے، وہ مر گیا ہے۔“

”ہاں، وہ مر چکا ہوگا۔“ قیصر نے نرمی سے کہا۔ ”ہم اس کے لیے اب کچھ نہیں کر سکتے مگر دوسروں کو اطلاع دینا ضروری ہے۔“

دو گھنٹے بعد ایک نجی فلاحی تنظیم کے رضا کار رسیوں سے اسٹرینجر سے بندھی رفع کی لاش اوپر لارہے تھے۔ قیصر نے شیما کو نیچے پہنچا دیا اور خود واپس اوپر آ گیا تھا۔ وہ لاش کے ساتھ ہی واپس آیا۔ علاج گاہ میں یہ سوگ کا دن تھا۔ سب خاموش اور افسردہ تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کم ہو گیا تھا۔ رفع کے لواحقین آگئے تھے مگر ڈاکٹر اطہر نے پہلے پوسٹ مارٹم کرانے پر زور دیا اور پولیس لاش دوسرے کارمی اسپتال لے گئی تھی۔ لواحقین میں رفع زمان کی ایک بہن اور دو بھائی تھے۔ اسے شیما کے بارے میں پتا چلا کہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ چلی گئی تھی۔ جب وہ اسے چٹان سے نیچے چھوڑنے آیا تھا تب بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور وہ صدمے کی کیفیت میں تھی مگر اس نے قیصر سے کہا تھا کہ وہ خود چلی جائے گی۔ اب اسے پتا چلا کہ وہ گھر چلی گئی تھی۔ قیصر، ڈاکٹر اطہر کے پاس آیا۔

”ڈاکٹر شیما کی حالت اچھی نہیں تھی، ان کو ڈرائیو نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”میں بھی اسے منع کرتا مگر وہ بتائے بغیر چلی گئی۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ”میری ابھی اس سے بات ہوئی ہے، وہ گھر میں ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔“

اکست 2016

سپنس ڈائجسٹ



اپنی زندگی ختم کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔“  
ڈاکٹر اطہر نے سر ہلایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا، کسی انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی خود ختم کرے۔ موت اور زندگی پر صرف اللہ کا اختیار ہے اور جو اس حد کو توڑتا ہے اسے دائمی عذاب سہنا پڑتا ہے۔“  
”لیکن انسان اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے تب؟“

”کیسا فیصلہ؟“

”یہی کہ وہ اپنے ماضی میں جانا چاہے؟“

”ماضی میں جانا ناممکن ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ وہ چاہے کہ اس کی زندگی پہلے جیسی ہو جائے تو کیا یہ سوچ غلط ہوگی؟“

”اگر اس کی پہلی زندگی اس کے نزدیک زیادہ خوش اور مطمئن کرنے والی ہو تو اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”اگر اس میں کوئی مشکل ہو تب؟“

”اس کی مشکل حل کرنے کے لیے معاشرے میں ادارے اور افراد موجود ہیں، اسے ان پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

”لیکن رفیع زمان نے ایک ادارے میں اور آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے خودکشی کر لی۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”مجھے اجازت دیں، میں تھک گیا ہوں۔“

”بالکل، اب تم آرام کرو۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔

”تمہارے ذہن میں جو سوالات ہیں، تم بالکل فری ہو کر مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔“

”میں جلد آپ سے پوچھوں گا۔“ اس نے جواب دیا اور باہر نکل آیا۔ رفیع والے واقعے کے فوراً بعد تمام مریضوں کو ان کے کمروں میں بھیج دیا گیا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور سورج تقریباً غروب کے قریب تھا۔ وہ کیمین میں آیا تو خود کو سچ سج تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ دو دن سے ہونے والے واقعات اور حالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ رفیع کی خودکشی بھول جانے والی بات نہیں تھی جبکہ اس نے آخری گفتگو اس سے کی تھی اور اس کے سامنے ہی نیچے کود گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کیا اس کی منزل بھی خودکشی ہوگی؟ اس نے ڈاکٹر کے سامنے شدت سے اس کی مخالفت کی تھی مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کے سامنے کب زندگی کا دروازہ بند ہو جائے اور اس کے لیے سوائے موت کے اور کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ شاید رفیع کے لیے بھی زندگی کا

”کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟“ قیصر نے جھجک کر پوچھا۔

ڈاکٹر اطہر نے اپنا موبائل نکالا اور اس پر شیما کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”شیما! کیسی ہو... جہانگیر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے کہہ کر موبائل قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ موبائل لے کر ذرا قافلے پر آیا۔

”شیما! کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ بولی۔ ”تمہیں میرا خیال کیسے آگیا؟“

”تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی اور تم ڈرائیو کر کے چلی گئیں اس لیے مجھے فکر ہو رہی تھی۔“

”میں آرام سے پہنچ گئی تھی اور اب ٹھیک ہوں۔“

”بس مجھے یہی پوچھنا تھا۔“

”ایک منٹ رکو۔“ شیما جلدی سے بولی تو وہ ڈاکٹر کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

”کہو؟“

”مجھے تمہارا یوں فکر مند ہونا اچھا لگا۔“

”خدا حافظ۔“ قیصر نے کہہ کر موبائل ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

”تھینک یو ڈاکٹر۔“

پولیس نے قیصر سے بیان لے لیا تھا اور اس نے وہی سب بتایا جو ہوا تھا۔ پولیس کے بعد ڈاکٹر اطہر نے بھی اپنے دفتر میں اس سے سوالات کیے۔ ایک خاص سوال جو پولیس نے نہیں پوچھا مگر ڈاکٹر اطہر نے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے خیال آیا کہ وہ چٹان کی طرف گیا ہوگا؟“

”کیونکہ اسے ایک بار چٹان کے پاس سے پکڑا گیا تھا اور وہ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کے پاس جانے کی بات کرتا تھا۔ اس کے بیوی بچے مر چکے تھے اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ اس سے مجھے لگا کہ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ آج اس نے نیچے گرنے سے پہلے جو کہا، اس سے تصدیق بھی ہوئی کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔“

ڈاکٹر اطہر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے اس نے ٹھیک کیا؟“

قیصر حیران ہوا۔ ”بالکل نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں خودکشی کسی صورت درست قدم نہیں ہے۔“

”اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کا قاتل تھا۔“

”تب بھی اسے سزا دینا عدالت کا کام تھا۔ اسے خود



دروازہ بند ہو گیا تھا اور اس نے موت کا انتخاب کیا۔

☆☆☆

اپریل کا پہلا ہفتہ گرمی کا احساس لایا تھا۔ سردی ختم ہو گئی تھی۔ پودوں اور درختوں نے نئے پتوں کا مکمل پیراہن اپنالیا تھا اور خزاں کے تمام آثار مٹ گئے تھے۔ رنج زمان کی خودکشی کا سانحہ بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ سب کچھ معمول پر آ گیا تھا مگر اس کے لیے سب معمول پر نہیں آیا تھا۔ اس کے اندر جیسے بوجھل پن بڑھ گیا تھا۔ شیما سے اس کی تقریباً ہر روز بات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کے کیمین تک آ جاتی تھی مگر وہ کبھی کیمین کے اندر نہیں آئی تھی۔ صفائی کے دوران وہ اس کے دفتر میں اس سے مل لیتا تھا۔ وہ اسے کافی ضرور دیتی تھی۔ اس روز بھی اس نے اسے کافی پر روک لیا۔ قیصر کو اس کے ہاتھ کی بنی کافی اچھی لگتی تھی۔ اس نے کافی مشین میں ڈالی اور اس کی طرف دیکھا۔ ”ایک بات کہوں؟“

”تم یہ کام مت کرو۔“

”کیوں؟“

”یہ تمہاری شخصیت پر سبوتاژ نہیں ہے۔ تم اس سے کہیں

ادھر کے کام کے قابل ہو۔“

”میں اس کام سے مطمئن ہوں۔“

”لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

وہ خاموش رہا۔ شیما نے اس کے سامنے مگ رکھا۔ اس نے گھونٹ لیا اور پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”کوئی ایسا کام جو تمہاری شخصیت اور صلاحیت کے مطابق ہو۔“

”جب میں اپنی شخصیت اور صلاحیت کے مطابق کام

کر رہا تھا تب مجھے اس کا کیا فائدہ ہوا؟“

شیما ذرا آگے جھکی۔ ”ضروری نہیں ہے کہ انسان

کو ہمیشہ نقصان ہی ہو۔“

”میرے مقدر میں نقصان ہی ہے۔“ اس نے گہری

سانس لی۔ ”بچپن سے اپنے لیے نقصان ہی دیکھا ہے۔“

شیما نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور نرمی سے

بولی۔ ”قیصر! مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم مجھ پر اعتماد کر

سکتے ہو۔“

قیصر کئی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر بوجھ

بڑھ رہا ہے اور اگر اس نے یہ بوجھ کسی کے سامنے ہلکا نہ کیا تو

شاید اسے بھی رنج زمان کی طرح اپنی زندگی ختم کرنا پڑے

گی اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ جب شیما نے پوچھا تو اسے لگا کہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ بولنے لگا۔ اس نے بچپن کی پہلی یاد سے آغاز کیا اور جب وہ خاموش ہوا تو شیما کو اپنی زندگی کے ہر گوشے سے آگاہ کر چکا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی اور اس کا ہاتھ سہلاتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی مداخلت نہیں کی۔ جب قیصر خاموش ہوا تب بھی وہ چپ رہی۔ پھر اس نے خالی ہونے والے مگ اٹھالے۔ قیصر کھڑا ہو گیا۔ ”بہت دیر ہو گئی ہے، اب میں چلوں گا۔“

شیما اس کے قریب آ گئی۔ ”میں اور میرا وقت تمہارے لیے ہے۔“

تب بے اختیار قیصر کے بازو اس کے نازک وجود کے گرد حائل ہو گئے اور وہ اسے سمیٹتے ہوئے اس کے صبح چہرے پر جھک گیا۔ شیما نے مزاحمت نہیں کی بلکہ خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی اور جب وہ ہلکا سا کسمپاسی تو قیصر چونکا اور اسے چھوڑ دیا۔ شیما کا چہرہ انتہائی حد تک سرخ ہو رہا تھا مگر اس کی سرمی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ قیصر نے کہنا چاہا۔

”سوری میں.....“

اس نے قیصر کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”تو سوری۔“ قیصر باہر آیا تو خود کو بالکل بدلا ہوا انسان محسوس کر رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس نے ہما کے ہوتے ہوئے کیسے کسی دوسری عورت کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ محسوس کیا اور کیسے اس کے وجود پر اپنا حق جتایا۔ بے شک وہ اس کی طرف آئی اور اسے اپنی طرف متوجہ کیا مگر آج پیش قدمی اس نے کی تھی۔ اس کے اندر کا بوجھل پن غائب تھا اور وہ خود کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ بہار کے آغاز کے ساتھ ہی مالی آ گیا تھا۔ اس نے نئی کیاریوں اور پھول دار پودوں کی بوائی شروع کر دی تھی۔ پرانے اور خراب ہو جانے والے پودے اور درخت نکالنے کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ قیصر اور غلام اس کی مدد کر رہے تھے۔ کبھی کبھی براؤن بھی مدد کو آ جاتا اور شاخیں اور پتھر منہ میں دبا کر کچرے کے لیے مخصوص گڑھے میں پھینک آتا۔ ان کے ساتھ رہ کر اسے پتا چل گیا تھا کہ کچرا کہاں پھینکا جاتا ہے۔ عمارتوں کے درمیان والی جگہیں مکمل طور پر لان میں بدلنے کا فیصلہ ہوا تھا۔

کچھ پرانے اور خراب ہو جانے والے درخت کاٹے جا رہے تھے۔ ان سے ٹکڑی نکال کر جمع کی جا رہی تھی۔ مریضوں کے لیے مخصوص عمارت میں گرمائش اور گرم پانی



مڑا اور برقی آری اٹھانے لگا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ غلام نے کلہاڑی اٹھالی ہے اور وہ زیر لب کہہ رہا تھا۔  
 ”تم بھی دوسروں جیسے ہو۔ تم نے بھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔“

پہچھے سے عجیب سی آواز آئی تو قیصر نے مڑ کر دیکھا۔ غلام نیچے گرا ہوا لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کلباڑی چھوٹ گئی تھی۔ ایک طرف سے سلطان نمودار ہوا اور اس نے تیزر سگن کا تار غلام کے جسم سے الگ کیا تب اس کی تھر تھراہٹ ختم ہو گئی۔ قیصر نے چلا کر کہا۔ ”یہ تم نے کیا کیا ہے؟“

”یہ تم پر کلہاڑی سے وار کرنے والا تھا۔“ سلطان نے غلام کو الٹ کر اس کے ہاتھ پیچھے کر کے ٹائلوں کی فکس ہو جانے والی ڈوری سے باندھے۔

”تم غلط کہہ رہے ہو۔“ قیصر آگے آیا تو سلطان نے میز رگن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

”پچھے ہٹ جاؤ اور یہ نیچے رکھ دو۔“ اس کا اشارہ برقی آری کی طرف تھا۔ قیصر نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور برقی آری نیچے رکھ دی۔ اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ غلام ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ وہ اس پر کیوں حملہ کرنے لگا؟ مگر آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر اطہر کے دفتر میں اس کے کمپیوٹر مانیٹر پر سی سی ٹی وی کیمرے کی ریکارڈنگ دیکھ کر اسے یقین آ گیا۔ اس کے مڑتے ہی غلام نے کلباڑی اٹھالی تھی اور پھر سر سے بلند کر کے اس پر وار کرنے والا تھا کہ سلطان نے بروقت پہنچ کر اس پر ٹیڑھ مار لی۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو غلام اس پر وار کر دیتا۔ قیصر شاک میں رہ گیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر اطہر سے کہا۔

”میں یا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ غلام جیسا شخص کو پروار کر سکتا ہے، وہ بھی مار ڈالنے کے لیے۔“

”وہ بہ ظاہر بے ضرر ہے۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ”لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ صرف سولہ سال کے عمر میں اپنے باپ کو قتل کر چکا ہے۔ اس سے پہلے دو بار اس نے لوگوں پر قاتلانہ حملے کیے مگر ان کی خوش قسمتی کہ وہ زندہ نہ گئے۔ غلام کا باپ سخت گیر تھا اور اس نے غلام کی شخصیت کچل دی تھی۔ ایک شام گھر والوں نے غلام کو اس حالت میں پکڑا جب وہ اپنے باپ کے مردہ جسم پر چاقو سے وار کر رہا تھا۔ اس کا باپ شاید پہلے ہی وار میں مر گیا تھا مگر وہ اس کے بعد بھی اس پر وار کرتا رہا تھا اور ڈاکٹروں نے کلاں اڑتا لیس نشان بتائے جو احسان قادر کے جسم پر گردن سے پیٹ تک آئے تھے۔ غلام کو گرفتار کر لیا گیا مگر میڈیکل بورڈ

کی فراہمی ایک بجٹی سے کی جاتی تھی جو کلکڑی سے جلتی تھی۔ گرمائی درختوں کی کاٹ چھانٹ سے جو کلکڑی نکلتی وہ اس مقصد کے لیے جمع کر لی جاتی تھی۔ یہ کام قیصر اور غلام کر رہے تھے۔ ان کے پاس برقی اور دستی آریاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ سامنے والے لان سے چند درخت کم ہوئے تو یہاں سے ہائی وے کے ساتھ بنے مکان نظر آنے لگے۔ بعض مکان پورے نظر آ رہے تھے اور بعض کی صرف اوپری منزل نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک درخت کے گرے تنے کو کلکڑوں میں کاٹ رہے تھے۔ اچانک غلام نے کچھ کہا تو اسے برقی آری کے شور میں سنائی نہیں دیا۔ اس نے آری روکی اور پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟“

غلام کے جسم میں پھر اضطرابی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ نگرانی کر رہے ہیں۔“

قیصر نے آس پاس دیکھا۔ ”کہاں؟“  
 ”وہ دیکھو۔“ غلام نے ہائی وے کے مکانات کی  
 طرف اشارہ کیا اور قیصر نے دیکھا تو اسے ایک مکان کی  
 سائڈ والی دیوار پر ایک شخص سیڑھی سے چڑھا کچھ کرتا نظر  
 آیا۔ چند لمحے دیکھنے کے بعد قیصر نے اندازہ لگایا کہ وہ رنگ  
 کر رہا تھا۔ اتنی دور سے اس کے ہاتھ میں برش تو واضح نہیں  
 تھا مگر اس کی جسمانی حرکات بتا رہی تھیں کہ وہ رنگ کر رہا  
 ہے۔ قیصر کا اچھا خاصا موڈ خراب ہونے لگا مگر اس نے نرمی  
 سے کہا۔

”وہ رنگ کر رہا ہے۔“  
 ”نہیں۔“ غلام نے اصرار کیا۔ ”وہ نگرانی کر رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی ہماری نگرانی کرتا ہے۔“  
 قیصر کو غصہ آنے لگا مگر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“

غلام نے ہاتھ میں موجود کلکھاڑی نیچے پھینک دی اور تیز لہجے میں بولا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

قیصر آگے آیا۔ اس نے غلام کے شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا لیا اور سخت انداز میں کہا۔ ”سنو، یہ سب تمہارا وہم ہے۔ کوئی ہماری نگرانی نہیں کر رہا ہے..... ستائم نے، کوئی نگرانی نہیں کر رہا ہے۔“

غلام کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اگر  
نے زیر لب کہا۔ ”تم مجھ پر اعتبار نہیں کر رہے۔“  
”ہاں اگر تم احقانہ بات کرو گے تو میں کبھی تسلیم  
نہیں کروں گا۔“ قیصر نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔ و



یہاں سے نکل جائے تو کسی کو کیا پتا چلے گا؟ اس نے اٹھ کر جوتے پہنے اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا تو براؤن اس کے پاس آ کر دم ہلانے لگا۔ رات ہو چکی تھی اور وہ یقیناً بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے براؤن کا سر سہلایا اور آہستہ سے بولا۔  
”تم یہیں رکو۔“

وہ مروجہ راستے کے بجائے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا گیٹ کی طرف آیا۔ تب اس نے خلاف معمول پہلی بار گیٹ بند دیکھا اور شمس وہاں چوکس موجود تھا۔ گیٹ بند کرنے سے ظاہر تھا کہ اس وقت کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اور روشنی سے بچتے ہوئے گیٹ کے پاس جا رہا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس پہنچا تھا کہ اسے عمارتوں کی طرف سے کوئی آتا دکھائی دیا اور قیصر جلدی سے ایک بڑے تنے کی آڑ میں ہو گیا۔ آنے والا سلطان ثابت ہوا اور اس نے آتے ہی شمس سے پوچھا۔  
”قیصر یہاں تو نہیں آیا؟“  
”نہیں وہ یہاں نہیں آیا۔“ شمس نے جواب دیا۔  
”ہوشیار رہنا، وہ کہیں سے نکل گیا ہے۔ اگر اس طرف آئے تو مجھے اشارہ دینا۔“

”تم بے فکر رہو۔“ شمس نے جواب دیا تو سلطان واپس چلا گیا۔ قیصر کو لگا جیسے اس کے اندر طوفان آ گیا ہو۔ وہ درختوں سے ہوتا ہوا اور دوڑتا ہوا کہیں تک آیا۔ کہیں کے پاس آ کر اس نے کسی چیز کی تلاش شروع کی مگر وہ اسے نہیں ملی۔ اسے مضطرب دیکھ کر براؤن نے بھی بھونکنا شروع کر دیا۔ پھر وہ کہیں کے سامنے زمین کو بچنوں سے کھودنے لگا۔ قیصر اندر آیا۔ اس نے ایک بار پھر چیخ سے ریک کے نیچے تصویر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر تصویر باہر نہیں آئی۔ تب اس نے انگلیاں ریک اور دیوار کے درمیانی خلا میں پھنسا لیں اور زور لگایا۔ جہ جڑا ہٹ کے ساتھ ریک دیوار سے الگ ہونے لگا اور پھر وہ الگ ہو گیا۔ تب اس نے دیکھا فرش پر تختے لگے تھے اور تصویر غائب تھی۔ یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں تصویر غائب ہو جاتی۔ کسی نے اسے یہاں سے نکالا تھا اور کسی کو صرف ایک صورت میں یہاں تصویر کا علم ہو سکتا تھا۔

اس نے کہیں میں ایک ایک جگہ دیکھنا شروع کر دیا اور بالآخر اسے..... وہاں لگے چھوٹے سے فانوس کے اوپر وہ کیمرا نظر آ گیا جو یہاں کے مناظر کہیں دکھا رہا تھا۔ اسے کرسی پر چڑھ کر دیکھنا پڑا تھا۔ اس کی ایک تار نکل کر چھت

نے اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا اور وہاں سے یہ میرے پاس آیا۔“  
قیصر حیران ہوا۔ ”جب وہ اس حد تک خطرناک ہے تو اسے اتنی آزادی کیوں دی گئی؟ اس کے مقابلے میں رفع کو یہ آزادی نہیں دی گئی۔“  
”رفع اپنی جان لینا چاہتا تھا۔“  
”اور غلام؟“

”وہ جب سے یہاں آیا ہے اس نے ایک بار بھی جارحانہ رویہ نہیں دکھایا۔“ ڈاکٹر اطہر نے مبہم انداز میں جواب دیا اسی لمحے اس کی کال آگئی اور اس نے ریسیور کے قیصر سے کہا۔  
”تم سے پھر بات کروں گا۔“  
قیصر اس کا مطلب سمجھ کر اس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ غلام خطرناک نہیں رہا تھا تو اسے آزادی دی گئی مگر اس نے ثابت کر دیا کہ وقت پڑنے پر وہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ سلطان کیسے... بروقت پہنچ گیا تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ غلام خطرناک ہو رہا ہے اور وہ اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بالکل درست وقت پر پہنچا اور اس نے اسے تیز رگن سے قابو کر لیا۔ اس واقعے کے بعد تمام مریضوں کو ان کے کمروں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ وہ باہر آیا تو رفیق اس کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔  
”تمہیں اپنے کہیں تک محدود رہنا ہے۔“  
”کیوں؟“

”بس کچھ حالات ایسے ہو گئے ہیں۔“ رفیق نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ عارضی حکم ہے۔“  
قیصر نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے جب حکم ختم ہو جائے تو مجھے بتا دیا جائے۔“  
”تم فکر مت کرو۔“

وہ کہیں کی طرف آیا جہاں براؤن موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بھونکا جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ بے وقت کیوں آیا ہے۔ قیصر نے اس کا سر سہلایا اور اندر آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اسے یوں کوئی حکم ملا ہو اور وہ اپنے کہیں تک محدود کر دیا گیا ہو۔ شاید غلام کی حرکت کی وجہ سے ایسا ہوا تھا لیکن وہ یہاں مریض نہیں تھا ورنہ اسے بھی اسی عمارت میں رکھا جاتا مگر اب تک وہ آزاد تھا اور پہلا موقع تھا کہ اسے پابند کیا گیا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے کہیں میں رہنے کا حکم ملا ہے لیکن کوئی اسے یہاں قید نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی نگرانی ہو سکتی تھی کیونکہ یہاں کیمرے نہیں لگے تھے۔ اگر وہ



کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے کمر پکڑ کر کھینچا تو وہ تار سے نکل آیا۔ قیصر نے اسے فرش پر پٹخ کر توڑ دیا۔ وہ کیمین سے باہر آیا اور اس نے برآمدے کے سامنے لگا تختہ اکھاڑنے کی کوشش کی۔ وہ بہت مضبوط تھا۔ تب اس کی توجہ براؤن کی کھودی ہوئی زمین کی طرف گئی۔ اس نے گڑھ میں جھانکا تو اسے اندر کوئی سیاہ سی چیز نظر آئی۔ اس نے اسے پکڑ کر کھینچا تو وہ تار نکلا۔ ایک طرف یہ کیمین میں جا رہا تھا اور دوسری طرف مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اس نے زور لگا کر زمین سے تار کھینچنا شروع کیا۔ وہ زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ مشکل سے سات آٹھ انچ کی گہرائی تھی اس لیے آرام سے یہ کام ہو رہا تھا۔ ہر بار جھکے سے کئی گز تار زمین سے باہر آ جاتی تھی۔

زمینی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے تار کو مضبوط بلاسٹک کے خول میں رکھا گیا تھا اس لیے تار ٹوٹ نہیں رہی تھی اور یہ فون کی تار کی طرح مضبوط تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا عمارتوں کے درمیان والے بارغ تک آیا اور جب اس نے یہاں چند بار تار کھینچی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ تار کا رخ دفتر والی عمارت کی طرف تھا۔ وہ ابھی عمارت سے کچھ دور تھا کہ مرلیضوں والی عمارت سے سلطان اور رفیق برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی قیصر نے تار پھینکا اور دفتر کی طرف بھاگا۔ وہ بھی لپکے مگر قیصر تیز ثابت ہوا وہ دروازہ کھول کر اندر گھسا اور اسے اندر سے لاک کر دیا۔ فوراً ہی باہر سے دروازے پر زور آزمائی ہونے لگی مگر اسے کھولنا یا توڑنا آسان نہیں تھا۔ قیصر نے کمروں میں جھانکا مگر اسے تینوں کمروں میں کوئی نظر نہیں آیا۔ تب اس کا خیال سرنگ کی طرف گیا۔ اس کا دھاتی دروازہ بند تھا۔ اس نے ایک طرف دیوار پر لگے فائر فائٹر کے باکس کا شیشہ کھنی کے دار سے توڑا اور اندر سے کلباڑی نکال لی۔

اب باہر والے دروازے پر ضربیں لگنا شروع ہو گئی تھیں۔ سلطان اور رفیق لاک توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ان کی طرف توجہ دیے بغیر کلباڑی گھما کر پوری قوت سے دروازے کے لاک والے حصے پر ماری۔ کلباڑی اندر گھس گئی تھی۔ اس نے کلباڑی واپس کھینچی اور پھر ماری۔ تیسری ضرب پر دروازے کا لاک جواب دے گیا اور اس نے لات ماری تو دروازہ کھل گیا۔ وہ کلباڑی بدست اندر داخل ہوا اور سرنگ سے مڑ کر اس حصے میں آیا جو اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سرنگ کے آخری حصے میں ایک دروازہ تھا اور وہ بند ثابت ہوا۔ کھولنے میں ناکامی کے بعد

اس نے یہاں بھی کلباڑی آزمائی۔ اس دروازے کا لاک دو ضربوں میں ٹوٹ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر اطہر، ڈاکٹر سیفی اور شیدا وہاں موجود تھے۔ ایک طرف دیوار پر درجن بھر اسکرینیں لگی تھیں اور ان پر احاطے میں لگے مختلف کیمروں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر اطہر اور ڈاکٹر سیفی کے چہروں پر خوف تھا مگر شیدا سر جھکائے کھڑی تھی۔

”کیوں.....“ اس نے شدت جذبات سے گھٹ جانے والی آواز میں کہا۔ ”میرے ساتھ ایسا کیوں؟“

”قیصر! میری بات سنو۔“ ڈاکٹر اطہر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ ذرا احتیاطاً پیچھے سرک گیا تھا۔ قیصر کے تاثرات اور اس کے ہاتھ میں موجود کلباڑی نے اسے ڈر دیا تھا۔

”کیا سنوں اور اب تمہیں میرا اصل نام بھی یاد آ گیا۔“ قیصر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”مجھے دھوکے سے یہاں رکھا گیا اور یہ ظاہر مجھے آزادی دی گئی۔“

”اس کی وجہ ہے.....“ ڈاکٹر اطہر نے کہنا چاہا۔ ”بکواس..... یہ سب مجھے میری بیوی بچی سے دور رکھنے کی سازش تھی۔“ قیصر نے چلا کر کہا اور کلباڑی گھما کر سامنے میز پر رکھے آلات پر ماری۔ ڈاکٹر سیفی لرز گیا۔ ”ایسا نہیں ہے۔“ شیدا پہلی بار بولی۔

”تم..... تم چپ رہو۔“ قیصر نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ تم ان لوگوں کے ساتھ ملی ہو گی۔ اسی لیے تم کیمین میں نہیں آتی تھیں تمہیں معلوم تھا کہ وہاں کیمرا لگا ہوا ہے۔“

”قیصر پلیز ٹھنڈے دماغ سے میری بات سن لو۔“ ڈاکٹر اطہر نے پھر کہا۔

”مجھے یہ توقف مت بناؤ۔ تم صرف مہلت لے رہے ہو تاکہ تمہارے گر گئے آجائیں اور مجھے بے بس کر کے دوبارہ قید کر دیا جائے۔ سچ سچ قید کر دیا جائے۔“

”اوکے۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ”تم میری بات نہیں سنا چاہ رہے تو جو تمہارا دل کرے وہ کرو۔ مجھے مار دو، یہاں موجود ہر فرد کو مار دو۔“

”ڈاکٹر۔“ سیفی چلا یا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ سچ سچ ہمیں مار دے گا۔“

”تب ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر اطہر نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ”یہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔“

شیدانے ایک بار پھر کہا۔ ”قیصر پلیز! ایک بار سن لو۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کہو لیکن اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی مجھ پر قابو پالے گا۔ جب تک یہ کلباڑی میرے



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                   |                  |                  |
|---------------|-------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد   | صائمہ اکرام       | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز       | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار     | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار      | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض        | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل           | عنیزہ سید        | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ       | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد  | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | اُم مریم          | نایاب جیلانی     | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



اور تمہیں اس صدمے کو سہارنے کے قابل بنایا جائے جس سے تمہیں بچانے کے لیے تمہارے دماغ نے یہ کہانی تخلیق کی ہے۔“

”کیسا صدمہ..... کیا میرے ساتھ کچھ ہوا تھا؟“

”ہاں۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ”بہت برا ہوا تھا۔ اس شام جب اپنے خیال میں تم نے آغا نجم الدین کو قتل کیا، تم دفتر سے نکل کر گھر آئے تھے۔“

”مجھے ایسا کچھ یاد نہیں ہے۔“ اس نے جھٹلانے والے انداز میں کہا۔

”یہ سچ ہے۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا تو شیما نے مداخلت کی۔

”ڈاکٹر! کیا اسے بتانا مناسب ہوگا؟ آپ جانتے ہیں اس کا شدید ری ایکشن ہو سکتا ہے۔ اسے ری ایکشن سے بچانے کے لیے آپ نے یہ سارا سیٹ اپ کیا تھا۔“

”لیکن اس سچویشن میں ہمارے پاس سوائے سچ بولنے کے اور کیا راستہ رہ گیا ہے؟“

”ہاں ڈاکٹر! ہمیں اسے سچ بتا دینا چاہیے۔“ ڈاکٹر سیفی نے تائید کی اسے اپنی فکر لگی تھی۔ ڈاکٹر اطہر نے اس کی طرف دیکھا۔

”قیصر! میں واضح کر دوں کہ تمہارے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہوگا۔“

اس کا دل تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ”کیسا صدمہ؟“

”سب سے بڑا صدمہ جو تمہیں اپنی زندگی میں ہو سکتا ہے۔“

”میری تو کوری چھوٹ گئی تھی، آغا نجم الدین نے مجھے ملازمت سے نکال دیا تھا؟“

”نہیں، بات اس سے کہیں بڑی ہے۔“ ڈاکٹر اطہر نے ہچکچا کر کہا۔ ”تم سوچ سکتے ہو کہ تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کس چیز کی ہے؟“

”میری بیوی اور بچی کی۔“ قیصر نے کہا۔ ”ان کو کیا ہوا ہے؟“

”تم اسی شام انہیں گھمانے کے لیے لے کر نکلے تھے۔ تم اپنی کار پہاڑی کے اوپر لے گئے تھے۔“

”مجھے یہ سب کیوں یاد نہیں آ رہا؟“ اس نے اپنا ماتھا مسلا۔

”واپسی میں تمہاری کار کو حادثہ پیش آیا اور.....“

”میں سب بھول گیا۔“

”ہاں لیکن یہ یادداشت کی گم شدگی نہیں بلکہ اصل کے بجائے ایک فرضی یادداشت کی تخلیق کا کیس ہے۔“ ڈاکٹر اطہر نے اعتماد سے کہا۔ ”تم اس حادثے کو بھول گئے اور تم نے فرض کر لیا کہ اس روز تم دفتر سے آئے ہی نہیں تھے اور تم

ہاتھ میں ہے کوئی میرے پاس نہیں آ سکتا۔“

ڈاکٹر اطہر ذرا آگے آیا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ تم یہاں ایک پشینت کی حیثیت سے موجود ہو مگر تمہارا کیس اتنا منفرد ہے کہ تمہیں یہ ظاہر آزادی دی گئی۔“

”مگر میری پوری طرح نگرانی ہوتی تھی۔ غلام ٹھیک کہتا تھا۔“

”ظاہر ہے، ہم تمہیں آزاد کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔“

”اگر ایسا ہی تھا تو ڈاکٹر عزیز نے مجھے پھانسی کے پھندے سے کیوں بچایا، یہاں کیوں پہنچایا؟“

”یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ تمہیں نہ پھانسی کے پھندے سے بچایا گیا ہے اور نہ یہاں پہنچایا گیا ہے۔“

قیصر کا چہرہ تن گیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے، تم وقت گزاری کی کوشش کر رہے ہو۔“

”یہ سچ کہہ رہے ہیں۔“ شیما بولی۔ ”تم نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس پر تمہیں پھانسی دی جاسکتی۔“

”میں نے آغا نجم الدین کو قتل کیا تھا۔“

”میں نے کہا تھا یہ تمہارا خیال ہے۔ آغا نجم الدین آج بھی زندہ ہے۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔

”بکواس، مجھے سب یاد ہے۔“

”تمہیں جو یاد ہے، وہ سب تمہارے دماغ کی تخلیق ہے۔ اس نے اصل حقیقت تم سے چھپا کر تمہیں ایک ایسی کہانی دے دی جس نے تمہیں یقین دلایا کہ تم پھانسی کے پھندے سے بچ کر یہاں آئے ہو۔“

قیصر چند لمحے کو چکرا گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے، مجھے کوئی سزا نہیں ہوئی اور نہ پھانسی کے تختے پر لٹکا یا گیا؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔“

”ڈاکٹر عزیز نے مجھے بچایا، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”ڈاکٹر عزیز بھی تمہارا خیال ہے۔ ڈاکٹر عزیز کا تین سال پہلے ایک انزکریٹس میں انتقال ہو چکا ہے۔“

قیصر نے اپنا سر تھام لیا۔ ”یا تو میں پاگل ہوں یا تم مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”تمہارا کیس اتنا منفرد ہے کہ اس نے ماہرین کو بھی حیران کر دیا اور اسی وجہ سے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ میں تمہارا علاج کرنا چاہتا تھا۔“

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور مجھے سزا نہیں ہوئی تو پھر میں یہاں کیوں موجود ہوں؟“

”تا کہ تمہیں اصل حقیقت سے روشناس کرایا جائے“



حالانکہ وہ بھی کار میں تھے۔ وہ اپنے خدشے کو جھٹلا رہا تھا اور خود کو یقین دلارہا تھا کہ ہمارا رومائیت سے ہیں۔ اس نے خود ان کو تصویر میں دیکھا ہے مگر ڈاکٹر اطہر اور اس سے زیادہ شیمیا کے تاثرات اور انداز بتا رہا تھا کہ شاید وہ خیریت سے نہیں تھیں۔ وہ بھی بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ قیصر نے بہ مشکل پوچھا۔ ”اور کار میں دوسرے جو تھے؟“

ڈاکٹر اطہر نے اس سے نظریں چرا لیں۔ شیمیا آگے آئی، اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کسی بھی موقع پر اس سے خوفزدہ نظر نہیں آئی تھی بلکہ اس کے تاثرات شرمساری کے تھے۔ شیمیا نے آہستہ سے کہا۔ ”قیصر! کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟“

”کیا یاد نہیں ہے؟“ اس کا لہجہ وحشت زدہ ہو گیا۔

”اے ذہن پر زور دو۔“ شیمیا کا لہجہ بچی ہو گیا۔ ”یہ ضروری ہے اگر ہم نے بتایا تو تمہیں شک لگ سکتا ہے۔“

”میں..... میں۔“ قیصر کہتے ہوئے رک گیا۔

اچانک اسے لگا جیسے وہ کہیں اور ہو۔ وہ کار پر کپڑا پار رہا تھا اور رومائیت سے اچھلتی کودتی آرہی تھی اور چلا رہی تھی کہ وہ

آج بہت سارا گھومے گی۔ پھر وہ آئس کریم پارلر میں آئس

کریم کھا رہے تھے۔ پھر وہ پہاڑی پر تھے اور کار نیچے جا

رہی تھی۔ وہ بریک دبا رہا تھا اور بریک کام نہیں کر رہے

تھے۔ پھر اس کے سامنے آگ بھڑک رہی تھی۔ آگ کار

میں لگی تھی اور اس کے اندر ہمارا رومائیت تھیں۔ وہ سیٹ بیلٹ

سے بندھی تھیں اور خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر

بدحواسی میں یا کسی وجہ سے وہ خود کو آزاد نہیں کر پا رہی

تھیں۔ وہ آگ میں جلتے ہوئے مدد کے لیے چلا رہی تھیں۔

وہ سڑک پر گرنا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی چیخیں اور

فریادیں سن رہا تھا۔ ہمارے پکار رہی تھی۔ روماء، بابا..... بابا

کہہ رہی تھی مگر وہ ان کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اسے لگ

رہا تھا کہ اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہے۔ آگ میں تیزی آ

رہی تھی۔ ہمارا روماء کی چیخیں اب مدھم پڑ گئی تھیں اور پھر وہ

غائب ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی جیسے تاریکی میں

ڈوب گیا۔ وہ چونکا تو شیمیا سامنے تھی۔ اس نے وحشت زدہ

لہجے میں کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے خود ان کی تصویر

اخبار میں دیکھی اور اپنے پاس تراشا بھی کاٹ کر رکھا تھا۔“

”تم اس تراشے کی بات کر رہے ہو۔“ ڈاکٹر اطہر

نے تراشا آگے کیا۔ ”اس میں موجود عورت اور بچی ہمارا اور

روما نہیں ہیں بلکہ تمہارے خیال نے انہیں ہمارا روماء کی

صورت میں دکھایا ہے۔“

نے آغا نجم الدین کو قتل کر دیا پھر تمہیں سزائے موت ہوئی اور تمہیں ڈاکٹر عزیز نے موت کے پھندے سے بچا کر یہاں پہنچا دیا۔ تمہاری شناخت بدل دی گئی۔“

”جبکہ ایسا کچھ نہیں ہوا؟“ اس نے پھر بے یقینی سے کہا۔

”ہاں، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“

”تب حقیقت میں کیا ہوا تھا؟“

”تم اس کار حادثے میں بچ گئے مگر ہوش میں آنے

کے بعد تم یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے تم نے آغا نجم الدین کو قتل

کر دیا ہے اور تم اب پولیس کی تحویل میں ہو۔ پھر تمہیں عدالت

سے سزائے موت ہوئی۔ تمہاری بیوی بچی سے تمہاری آخری

ملاقات کرائی گئی اور تمہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔“

”ایسا بچ میں ہوا تھا۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، یہ قطعی خیال ہے۔ ہمارے ملک میں گزشتہ

کئی سالوں سے کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی گئی ہے۔“

اب قیصر کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ ”میں نے ایسا

کیوں سوچا؟ بھلا کوئی انسان اس حد تک مکمل فرضی بات

سوچ سکتا ہے؟“

ڈاکٹر اطہر نے سر ہلایا۔ ”میں ماہر نفسیات ہوں اور

گزشتہ تیس سال سے اس شعبے میں ہوں۔ میں نے ہزاروں

مریضوں کا علاج کیا ہے۔ بے شمار ایسے حیرت انگیز واقعات

اور کیسز دیکھے ہیں جن میں سے ہر ایک منفرد ہے۔ تمہارا

کیس بھی ایسا ہی ہے۔ انسانی دماغ دنیا کی طاقتور ترین

مشین ہے جبکہ یہ اپنی پوری استعداد سے کام بھی نہیں کرتا

ہے۔ ذہین ترین افراد اپنے دماغ کا مشکل سے دس فیصد

استعمال کرتے ہیں۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ انسانی دماغ

کیسے اور کتنا کام کرتا ہے۔“ قیصر بولا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ

میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کس صدمے نے مجھے اس حال میں

پہنچایا۔“

ڈاکٹر اطہر نے گہری سانس لی۔ ”پہاڑی سے اترتے

ہوئے تمہاری کار بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرائی اور

اس میں آگ لگ گئی۔“

”میں جل گیا تھا مگر میرے جسم پر کوئی نشان نہیں ہے۔“

”نہیں، تم بچ گئے تھے۔ تم جھٹکے سے دروازہ کھلنے

سے باہر جا گئے تھے اور کسی بڑی چوٹ سے بھی محفوظ

رہے تھے۔“

اب تک وہ شعوری طور پر اس بات کو نظر انداز کر رہا

تھا۔ اس نے ہمارا روماء کے بارے میں نہیں پوچھا تھا



ڈاؤن سے لے کر ہمیشہ کے لیے دماغی معطلی جیسا کوئی بھی نقصان ہو سکتا تھا۔“

قیصر سوچ رہا تھا کہ وہ باہر جا کر کیا کرے گا۔ اب تک وہ خود کو بہلاتا آیا تھا کہ باہر اس کی بیوی، بچی ہے اور شاید وہ کبھی ان کے پاس جا سکے مگر اب وہ جانتا تھا کہ باہر کوئی اس کا منتظر نہیں ہے۔ شیماس کی کیفیت نوٹ کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”قیصر! باہر دیکھو، یہ شاخ چند مہینے پہلے خشک اور خالی تھی۔ آج یہ ہری اور پتوں سے بھری ہے۔ وقت سب بدل دیتا ہے۔“

”ہاں لیکن جو انسان سے چھن جاتا ہے، وقت اسے لوٹا نہیں سکتا۔“

شیماس نے گہری سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ بات میں نے بھی بہت مشکل سے سمجھی ہے۔“

قیصر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”تمہارے ساتھ کیا ہوا؟“

”میں نے اپنا منگیتر کھو دیا۔ وہ صرف منگیتر نہیں میرا کزن بھی تھا۔ ہمارا بہت طویل ساتھ تھا۔ شادی سے صرف دو مہینے پہلے گھر سے دفتر جاتے ہوئے ایکسڈینٹ کا شکار ہو گیا۔ میں بکھر گئی تھی۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ مجھے بہت مشکل سے زندگی کی طرف واپس لایا گیا۔ مجھے واپس لانے میں ڈاکٹر اطہر کا اہم کردار ہے۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے ہاں کام کرنے کی پیشکش کی اور جب میں پہلی بار یہاں آئی اور میں نے تمہیں دیکھا.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

”تم نے مجھے دیکھا.....؟“

جواب میں شیماس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ قیصر کو ایک لمحے کو لگا کہ یہ اسی کی تصویر ہے۔ مگر اس نے زندگی میں کبھی اس رنگ کی شرت نہیں پہنی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی اسپورٹس کار کے ساتھ تصویر کھینچوائی تھی۔ شیماس نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ میرے میرا منگیتر۔“

”مجھ سے مل رہا ہے۔“

”جب تمہیں دیکھا تو مجھے بھی یہی لگا تھا۔“

قیصر نے گہری سانس لی۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ شیماس کی طرف کیوں متوجہ ہوئی، اس کی طرف کیوں بڑھی تھی۔ اس نے تصویر رکھ کر شیماس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، وقت سب کچھ نہ سہی..... لیکن بہت کچھ بدل دیتا ہے۔“

قیصر نے تراشادیکھا۔ اس میں غورت اور بچی سچ سچ کوئی اور نہیں۔ باقی سب ویسا ہی تھا مگر وہ ہمارا رومان نہیں تھیں۔ اسے لگا کہ اس کا سر چکرار رہا ہے اور پھر تراشا اور پورا ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلانے لگا۔ آخری احساس یہ تھا کہ وہ گر رہا ہے اور کوئی اسے تھام رہا ہے۔

☆☆☆

وہ جاگا تو کھڑکی کے آگے درخت کی ہری سی شاخ پر ایک خوش رنگ پرندہ بیٹھا ہوا سریلی آواز نکال رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے تازہ ہوا کے ساتھ نباتات اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو بھی آرہی تھی۔ وہ اپنا ذہن اور جسم ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اسے ہمارا رومان کا خیال آیا تو اسے اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا مگر دکھ کا یہ احساس ایسا نہیں تھا کہ اس پر حاوی ہو جاتا۔ اس کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ پھر اسے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے سرگھمایا تو بستر کے پاس ہی ڈاکٹر اطہر اور شیماس موجود تھے۔ اسے جاگتے دیکھ کر شیماس آگے آئی اور اس کے بازو پر اپنا گلابی ہاتھ رکھا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”بہتر۔“ اس نے جواب دیا۔

ڈاکٹر اطہر نے جھجک کر پوچھا۔ ”کیا تمہیں سب یاد ہے؟“

اس نے سر ہلایا تو شیماس نے ڈاکٹر اطہر کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی شیماس بستر پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں سب یاد ہے اور تمہیں نقصان نہیں ہوا۔“

”اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہو گا۔“ قیصر نے گہری سانس لی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ شیماس کچھ دیر بعد بولی۔ ”صدمہ شدید تھا بھی تمہارے دماغ نے اسے بھلا دیا۔ ورنہ شاید تم پاگل ہو جاتے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا اب میں ٹھیک ہوں؟“

”امید تو یہی ہے۔“ شیماس نے جواب دیا۔ ”ورنہ جب تک تم ہوش میں نہیں آئے تب تک ڈاکٹر اطہر بھی یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔“

”کیا مجھے یہاں سے جانے کی اجازت ہو گی؟“ قیصر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔

”کیوں نہیں، تمہارا مسئلہ نفسیاتی نہیں بلکہ سیلف ڈیفنس کا تھا۔ ڈاکٹر اطہر اور دوسرے ماہرین کا کہنا تھا کہ تمہیں خود سب یاد آئے تو بہتر ہے۔ دوسری صورت میں تمہیں شدید نقصان کا خطرہ ہے۔ اس میں نروس بریک